اشارات

نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر

نیشنل فنڈا منٹل ایجوکیشن سنٹر جسے دراصل نیشنل سوشل ایجوکیشن سنٹر کہنا چاہیے، ابھی چند ہی سال ہوئے حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے زیر اہتمام قائم ہوا تھا۔ اس سنٹر نے سوشل ایجوکیشن کی تحریک کے بزرگ رہنما شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے کی رہنمائی میں اتنی قلیل مدت میں بہت کام کیا اور کام بھی ایسے جن کی تحریک کو بڑی سخت ضرورت تھی۔

شری دیش پانڈے ۳۱ دسمبر ۱۹۶۰ء سے ریٹائر ہو گئے ہیں اور اب سنٹر کی رہنمائی کا کام شری سوہن سنگھ جی کے سپرد ہوا ہے۔ شری سوہن سنگھ جی ہمارے تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ موصوف نے وزارت تعلیم کے مددگار مشیر تعلیم کی حیثیت سے سوشل ایجوکیشن کی تحریک میں جو اونچا کردار ادا کیا ہے، وہ سب پر روشن ہے۔ اب تک وہ وزارت کے ایک شعبے کے انتظامی افسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اب انھیں علمی اور تحقیق اور ریسرچ کی رہنمائی کا کام ملا ہے جو ہمارا خیال ہے، شری سوہن سنگھ جی کے ذوق سے نسبتاً زیادہ قریب ہے اور اس اعتبار سے نیشنل فنڈا منٹل ایجوکیشن کی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اسے ڈیش پانڈے جی کے بعد انھی کی سی علمی ذوق و شوق رکھنے والی ایک دوسری بلند مرتبت شخصیت کی خدمات حاصل ہوئیں۔ اس خوش نصیبی کے لئے ہم سنٹر کو مبارکباد دیتے ہیں۔

جی چاہتا ہے کہ اس تقریب سے فائدہ اٹھا کر چند تجاویز کا ذکر بھی کر ڈالیں جو ایک عرصے سے ہمارے دماغ میں بسی ہوئی ہیں۔

(۱)

ایک مجلس مشاورت کا قیام

سوشل ایجوکیشن کے میدان میں محاذ پر کام کرنے والے کارکن، ہمارا تجربہ ہے، قدم قدم پر مختلف مسائل سے دوچار ہوتے ہیں، اور کام کے چارٹ (جاب چارٹ) اور ہدایت نامے (مینول) بھی ایسے موقعوں پر ان کی مدد نہیں کر پاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں یا تو اپنے کام کی رپورٹیں افسانوں کی طرح تصنیف کرنی پڑتی ہیں یا پھر نالائقی کا الزام

اڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک میں یہ ایک ایسی اڑچن ہے کہ اس کی بدولت خود تحریک کے بدنام ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن یہ اڑچن ایسی نہیں ہے کہ اسے دور نہ کیا جا سکے۔ اسے دور کرنے کی ایک تدبیر ہمارے خیال میں یہ ہے کہ بروقت اصلاح مشورہ کی ایک سروس قائم کی جائے، اس کے لئے تجربہ کار اور منجھے ہوئے کارکنوں کی مجلس مشاورت بنے جس کے پاس محاذ پر کام کرنے والے بلاتکلف اور بغیر کسی قسم کے خوف وہراس کے اپنے مسائل لکھ کر بھیج دیا کریں۔ مجلس مشاورت میں ان مراسلات پر غور کیا جائے اور ایک متفقہ حل تجویز کر کے کارکنوں کے پاس بھیجا جائے۔

ہم نے ماہنامہ "تعلیم وترقی" کے ذریعے اس طرح کی ایک کوشش کچھ عرصہ ہوا کی تھی، مگر اس میں ہمیں کامیابی نہیں ہوئی۔ مسلسل درخواستوں کے باوجود ہمارے پاس کسی ساتھی کے پاس سے اپنے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کوئی خط نہیں آیا۔ چند خطوط غیر سرکاری سنستھاؤں میں کام کرنے والے کارکنوں کے پاس سے آئے تھے اور ہم نے اپنا جواب بھی شائع کیا تھا، مگر سرکاری اداروں کے ماتحت کام کرنے والے ساتھی مستقل خاموش رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری درخواست پر سرکاری اداروں میں تمام کام کرنے والے ساتھی اپنے مسائل سے متعلق کچھ لکھنے سے پرہیز کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ لیکن اگر یہ کام نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر اپنے ہاتھ میں لے تو چونکہ یہ بھی ایک سرکاری ادارہ ہے اس لئے شاید ساتھیوں کو یہاں کچھ لکھنے میں تکلف نہ ہو۔ اس کے علاوہ سنٹر وزارتی سطح پر گفت وشنید کر کے اس بات کا اہتمام کر سکتا ہے کہ اگر کوئی کارکن اپنی مشکلات اُسے لکھے تو اس کی گرفت نہ کی جائے۔ ضرورت ہو تو مشورہ لینے اور دینے کی پوری کارروائی صیغۂ راز میں رکھی جا سکتی ہے، اس لئے کہ مطلب تو کام کو آگے بڑھانے سے ہے، کام کس طرح آگے بڑھا، اس سے کسی کو کیا سروکار ہو سکتا ہے!

(۲)

خاتمۂ ناخواندگی کا تجربہ

جبل پور کا نیشنل سیمینار انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کا پہلا نیشنل سیمینار تھا۔ اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے یونیسکو کے اہتمام میں ایشیائی ملکوں کا ایک سیمینار میسور میں منعقد ہو چکا تھا جس کی ایک سفارش یہ تھی کہ تفصیلات کو طے کرنے کی غرض سے ہر ملک سیمینار کے انہی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے نیشنل سیمینار منعقد کیا کرے۔ ہندوستان میں یہ کام انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور خوشی کی بات ہے کہ وہ ابھی تک اس سلسلہ کو قائم کئے ہوئے ہے۔

ان تمہیدی سطروں کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ جبل پور سیمینار کی سفارشات جو ناخواندگی کے خاتمے سے متعلق تھیں بہت بڑی حد تک عملی سفارشات تھیں اور اس سے پہلے ملک بھر میں جتنا کچھ کام ہوا تھا، اس کا تجزیہ کرنے کے بعد مرتب کی گئی تھیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان سفارشات کی ترتیب میں جتنی محنت کی گئی تھی اسی قدر ان کی طرف سے سوشل ایجوکیشن کے حلقوں میں سرد مہری برتی گئی اور غالباً آج تک ان کے اوپر کسی جگہ تجربہ نہیں کیا گیا۔

نیشنل فنڈا منٹل ایجوکیشن سنٹر کے قیام کا مقصد ہی غالباً سوشل ایجوکیشن کے میدان میں تجربے کرنا اور ان تجربات کی بنیاد پر کارکنوں کی رہنمائی کرنا ہے۔ خواندگی کا مسئلہ ابھی تک ملک کے لئے جوں کا توں دردِ سر بنا ہوا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ اُسے پرانی بات کہہ کر آسانی سے ٹال دیا جائے۔ جبلپور سیمینار میں صفائی کے ساتھ یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ خواندگی کی مہموں کو ہر جگہ پھیلا کر منظم کرنے سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ اب ضرورت ہے کہ ایک ایک احاطہ بند (کمپیکٹ) علاقہ لے کر وہاں سے ناخواندگی کو ختم کرنے کی مہمیں منظم کی جائیں یہ پروگرام ترتیب دینے والوں کے ذہن میں اس بات کے پیچھے نفسیات کا یہ اصول تھا کہ انسان زبان سے کہی ہوئی بات کو سُن کر اس کا اتنا اثر نہیں قبول کرتا جتنا اُسے عملاً واقع ہوتے ہوئے دیکھ کر اس سے متاثر ہوتا ہے ایک احاطہ بند علاقے میں ناخواندگی کو ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کے آس پاس کے علاقوں کا اس سے اثر قبول کرنا یقینی ہوگا۔ یہی حقیقت تھی جس کی بنیاد پر ایک چنے ہوئے احاطہ بند علاقے میں خواندگی کے لئے پوری طاقت سے کام کرنے کا یہ پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔

ہماری تجویز ہے کہ سنٹر کو دلی کے قریب کسی دیہی علاقے میں اس سجھاؤ پر ضرور تجربہ کرنا چاہئے اور اس کی پوری داستان ملک بھر میں نشر کرنی چاہئے تاکہ دوسرے کارکنوں کو اپنے اپنے علاقوں میں اس کے مطابق کام کرنے کا حوصلہ ہو۔

(۳)

دلی کا ایک ڈیولپمنٹ بلاک سنٹر اپنے ہاتھ میں لے

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم کے اوپر خود پلاننگ کمیشن کی جائزہ کمیٹی کی طرف سے بھی اور دوسری مختلف کمیٹیوں کی طرف سے بھی اعتراضات ہوتے رہتے ہیں کہ اسکیم کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ سوشل ایجوکیشن کے حلقوں میں بھی اس باب میں بہت کچھ کہا سُنا جاتا ہے خاص طور پر یہ کہ لوگوں کے سوچنے کے طریقوں اور نقطۂ نظر میں تبدیلی اس وقت تک

آ ہی نہیں سکتی جب تک ان کے اوپر تعلیم کا عمل نہ کیا جائے اور یہی وہ عمل ہے جس کی طرف کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم میں توجہ نہیں دی جا رہی۔
نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر سوشل ایجوکیشن کی ایک آل انڈیا تجرباتی و تحقیقی تنظیم ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ حکومت ہند سے [illegible] دلی کے تین ڈیولپمنٹ بلاکوں میں سے ایک بلاک لے لے، اُسے اپنی نگرانی اور رہنمائی میں چلائے اور اُسے پورے ملک کے لئے نمونہ کا ڈیولپمنٹ بلاک بنا دے؟ اگر سنٹر یہ تجویز مان لے اور ایک بلاک "ریسرچ ایریا" کے طور پر اپنے ہاتھوں میں لے لے تو تین سال سے اس کے اندر وہ تمام تجربات کئے جا سکیں گے جن کا بار ہا ذکر ہو چکا ہے مگر آج تک ان کے اوپر توجہ نہیں کی جا سکی۔ [illegible] ڈیولپمنٹ آفیسر سوشل ایجوکیشن کا کوئی ماہر ہو، یا یہ کہ پیداوار بڑھانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ خواندگی، اڈلٹ ایجوکیشن اور سوشل ایجوکیشن کی سرگرمیوں کو بھی اُسی تیزی اور شدت کے ساتھ منظم کیا جائے۔ ایک تجویز حکومت ہند کی ڈنمارک ٹیم نے پیش کی تھی کہ ہر ڈیولپمنٹ بلاک میں ایک ایک لوک ودیا پیٹھ، جو کم و بیش ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں کے طرز کا ہو قائم کیا جائے۔ یہ تجویز آج تک کہیں بھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہوئی۔ اگر ایک بلاک سنٹر کی نگرانی میں آجائے تو اس تجویز کے اوپر بھی تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

ہماری یہ تجویز اگرچہ بظاہر شیخ چلی کا منصوبہ معلوم ہوتی ہے لیکن اگر اسے عملی شکل دے دی جائے تو کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے حلقوں میں دبے لفظوں میں جو یہ بات سنائی دے جاتی ہے کہ "میدان میں نکل کر کام کریں تب معلوم ہو کہ کتنے پانی میں ہیں یہ لوگ!" اس کا بھی جواب ہو سکتا ہے۔ ورنہ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جب سے سوشل ایجوکیشن کا پروگرام تعلیم کے محکموں سے نکل کر کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے ماتحت ہوا ہے، اُس وقت سے سوشل ایجوکیشن والوں کا تعلق اس پروگرام سے براہ راست نہیں رہ گیا ہے اور اس صورت میں اگر یہ لوگ (سوشل ایجوکیشن والے) کمیونٹی ڈیولپمنٹ والوں کے اوپر نکتہ چینی کریں تو اُن کا یہ طعنہ بیجا نہیں رہتا!۔

یہ بہرحال ہماری تجویزیں ہیں جن پر ہمیں امید ہے، سنٹر کے نئے ڈائرکٹر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔ ماہنامہ "تعلیم و ترقی" اتنی حیثیت تو نہیں رکھتا کہ ان تجاویز کو عملی روپ دینے کے سلسلے میں کسی قسم کی مدد کر سکے لیکن اس کے صفحات اس سلسلے میں — اور دوسرے معاملات میں بھی — ہمیشہ اور ہر وقت سنٹر کی خدمت کے لئے خوشی کے ساتھ کھلے رہیں گے۔

ادارہ تعلیم و ترقی سنٹر کو نئے سال کی اور اُسی کے ساتھ اُسے ایک اور تجربہ کار رہنما کی خدمات حاصل ہونے کی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

اب خواندگی پھیلانے کا وقت نہیں ہے ناخواندگی کو ختم کرنے کا زمانہ ہے

"تعلیم و ترقی" میں ہم نئے سال سے ایک نئے عنوان "گاہے گاہے بازخواں" کی ابتداء کر رہے ہیں جس کے ماتحت سوشل ایجوکیشن کی تحریک سے متعلق دس بارہ سال پہلے کے خیالات و افکار یا سفارشات و تجاویز شائع کی جائیں گی اور اگر ممکن ہوا تو ایڈیٹوریل کے صفحات میں ان کے بارے میں تنقیدی نوٹ بھی دیئے جائیں گے۔

ہمارا ملک تعمیرِ نو کی منزل میں ہے جس میں نئے نئے طریقے آزمائے جاتے ہیں اور نتائج کی روشنی میں ان میں ترمیم و تنسیخ اور ضرورت ہوئی تو اضافہ کیا جاتا ہے۔ تجربے اور آزمائش کے اس عمل کی مدت اچھی خاصی طویل ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک طریقے کو آزمایا جائے، اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو اپنے دامن کو تو دیکھا نہ جائے، اُلٹے اس طریقے یا خیال کو غلط قرار دے کر آگے بڑھ جایا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا کوئی تجربہ کامیاب نہ ہوگا۔ ہمارے یہاں (کم سے کم) سوشل ایجوکیشن کے میدان میں ان دنوں کم و بیش یہی صورتِ حال ہے۔

ان دس بارہ سال پرانے خیالات و افکار سے جو ہم ان صفحات میں وقتاً فوقتاً شائع کریں گے ناظرین کو اس بات کا اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی کہ آیا یہ خیالات اتنے پرانے ہوگئے ہیں کہ انھیں تاریخ کے اوراق میں جگہ ملنی چاہیے یا ان میں اتنی جان ہے کہ انھیں ہم ان حالات میں بھی اپنا سکتے ہیں۔

ذیل کا مضمون پہلے نیشنل سیمینار کا جو دسمبر ۱۹۵۱ء میں جبلپور میں منعقد ہوا تھا، ایک سبجیکٹ

جو ملک کے تجربہ کار سماجی معلموں کے غور و فکر کے بعد پیش کیا گیا تھا لیکن ابھی تک غالباً کہیں بھی اُسے پوری تیاری کے ساتھ آزمایا نہیں گیا ہے اور خواندگی کی مہمیں اب تک اُسی پرانی ڈگر پر منظم کی جاتی ہیں جسے اس سیمینار میں بے نتیجہ کہا گیا تھا۔

ایڈیٹر

بالغوں کی خواندگی کے سلسلے میں مختلف ریاستوں میں جو کام ہوا ہے اور غیر سرکاری اداروں نے جو کچھ کوششیں کی ہیں ان کی رپورٹوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اب وہ منزل آگئی ہے جب "ناخواندگی کا خاتمہ" ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہو جاتی ہے۔ اس ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے اور اس بات کے پیش نظر کہ ہمارے پاس قوت اور سرمائے کی کمی ہے مگر اس کے باوجود ہمیں عالمگیر خواندگی کی منزل پر جلد از جلد پہنچنا ہے، ہمیں سوچنا ہوگا کہ ہم خواندگی کی مہمیں اُسی طرح پورے علاقے میں پھیلا کر منظم کرتے رہیں، یا اُسے منتخب علاقوں میں سمیٹ سمیٹ کر منظم کرنا ہوگا تاکہ جس علاقے میں یہ منظم کی جائے وہاں سے ناخواندگی کی جڑ کٹ جائے۔

تجربے نے ہمیں بتایا ہے کہ بغیر کسی تنظیم یا منصوبہ بندی کے ملک بھر میں خواندگی کے درجے کھولنے سے وہ نتائج برآمد نہیں ہوں گے جو سرمایہ اور محنت کی اتنی مقدار صرف کرنے کے بعد برآمد ہونا چاہئیں اس لئے ضروری ہے کہ اس مہم کو تعاون بخش طور پر چلانے کے لئے اس طرح کا منصوبہ بنایا جائے کہ ہمارے پاس جو محدود وسائل موجود ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جا سکے، اور اس سلسلے کی انتظامی دشواریوں کو کم سے کم کیا جا سکے۔

خواندگی کی مہموں کے اس نظریئے کی روشنی میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اب تعلیم بالغان کے سنٹر ہر جگہ قائم کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ اس کے بجائے مناسب یہ ہوگا کہ سوشل ایجوکیشن کے سنٹر چنے ہوئے محدود علاقوں یا ایک دوسرے سے ملے ہوئے گاؤں کے مجموعوں میں قائم کئے جائیں۔ علاقے کے انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ وہاں ابتدائی تعلیم کا پہلے سے معقول انتظام ہو اور سماجی ترقی کا ماحول موجود ہو یا وہاں کے باشندوں نے اس قسم کی مہم چلانے کا ارادہ ظاہر کیا ہو۔ علاقے کا رقبہ کیا ہو، اس سلسلے میں کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں بنایا جا سکتا اس لئے کہ مختلف ریاستوں اور علاقوں میں مقامی حالات ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں اور انتخاب اور علاقے کے رقبے کے معاملے میں اس فرق کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔ اتنی بات اس ضمن میں بہرحال کہی جا سکتی ہے کہ علاقہ بس اتنا ہی بڑا ہو کہ مہم کی نگرانی اور رہنمائی آسانی سے کر سکے اور وہاں اس بات کا امکان ہو کہ چند سال کے اندر لکھے پڑھے بالغوں کی ایک مقررہ تعداد کم سے کم خرچ میں نکل آئے گی۔

اس طرح کے علاقے ملک کے ہر حصے میں منتخب کئے جانے چاہئیں۔ اس منظم مہم کے لئے علاقوں کو چنتے وقت
خصوصی ضلعے، حصۂ ملک یا اہل بیت کو ترجیح نہیں دینی چاہئے بلکہ صرف اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس میں انتظام
آسانی سے رہے گی اور کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم دی جاسکے گی ـــــ منصوبہ
اس طرح کا ہونا چاہئے کہ ایک مقررہ وقت میں اس طرح کی مہم کے لئے ملک کے ہر صوبے میں سے ایک ایک
علاقہ لے لیا جائے۔ یہ مہم اس چنے ہوئے علاقے میں ہمیشہ قائم نہیں رہے گی بلکہ صرف اس وقت تک
چلے گی جب تک صرف شدہ سرمایہ اور محنت کی مناسبت سے معقول تعداد میں ان پڑھ بالغ خواندہ ہوجائیں۔
چنانچہ جس وقت یہ منزل آجائے اسی وقت اس کا سلسلہ بند ہوجانا چاہئے۔ البتہ ان نوسکھ بالغوں کی آگے
کی تعلیم مشقی سرگرمیوں کی شکل میں جاری رہنی چاہئے جن میں کتب خانے کا قیام، مشقی کلاسیں اور دوسرے منصوبے
شامل ہیں جو مقامی لیڈروں کی مدد سے چلائے جاسکتے ہیں۔

اگرچہ سیمینار کی سفارش اس ضمن میں یہ ہے ـــ اور اس کا سبب وسائل کی کمی ہے ـــ کہ پوری طاقت کے ساتھ کی جانے
والی اس کوشش کے لئے پورے ملک میں ایک ایک احاطہ بند علاقہ منتخب کیا جانا چاہئے مگر اس کے باوجود سیمینار کو
یہ بات بھی تسلیم ہے کہ اس اصول کی وجہ سے ایسے گاؤں جو احاطہ بند تو نہیں ہیں مگر وہاں اس قسم کی مہم کے لئے لوگوں میں
جوش و خروش ہے، اور اس کی بنا پر وہاں سوشل ایجوکیشن اور خواندگی کے لئے جم کر کوشش کی جانی چاہئے، انھیں
بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بیحد ضروری ہے کہ اس طرح کے علاقوں کی ہر ممکن طریقہ سے حوصلہ افزائی کی جائے۔
خواندگی کے لئے پوری طاقت کے ساتھ کوشش کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایسے علاقوں کو جن میں ترقی کرنے کی خود خواہش ہے اس
مہم سے خارج کردیا جائے۔

اس مہم کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب ایسے احاطہ بند کسی علاقے میں جم کر کام ہوگا تو اس سے اِدھر اُدھر
کے بکھرے ہوئے گاؤں میں جو احاطہ بند علاقوں میں نہیں آتے، اپنے اپنے یہاں بھی اس طرح کی مہم چلانے کا شوق
پیدا ہوگا۔ چنے ہوئے احاطہ بند گاؤں کو باہم دوستانہ اور صحت مند مقابلہ کرنے کی دعوت بھی دینا چاہئے (یعنی
یہ کہ ہر گاؤں اس بات میں مقابلہ کرسکے دیکھیں ناخواندگی کس کے یہاں پہلے ختم ہوتی ہے) ان کوششوں اور
مقابلوں کا ایک صحت مند نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ آس پاس کے دوسرے گاؤں میں بھی اپنے پڑوسیوں کی دیکھا دیکھی جوش
پیدا ہوجائے گا۔ اس لحاظ سے ناخواندگی کے خاتمے کی مہم سمٹ کر اور پھیل کر، دونوں طرح منظم کی جانی چاہئے
مگر اصل زور بہرحال احاطہ بند علاقوں میں سمٹ کر کام کرنے ہی پر ہونا چاہئے۔ دونوں میں کیا تناسب ہو، اس کا

فیصلہ مقامی حالات کے اوپر منحصر ہوگا۔

ناخواندگی کے خاتمے کا مطلب تو اگرچہ یہ ہے کہ زیر مہم علاقے میں ایک شخص بھی ان پڑھ نہ رہ جائے چاہے اس کی عمر کچھ بھی ہو، مگر اس مفہوم کے باوجود فی الحال اسے ۱۴ سے ۴۵ سال تک کے لوگوں تک محدود رکھنا چاہئے لیکن پھر بھی ۴۵ سال سے اوپر کی عمر کا اگر کوئی شخص اپنے شوق سے شامل ہونا چاہئے تو اُسے روکنا نہیں چاہئے۔ البتہ ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں کو بالغوں کی کلاسوں میں نہیں آنے دینا چاہئے بشرطیکہ علاقے میں ابتدائی تعلیم کا معقول بندوبست پہلے سے موجود ہو۔ اسی طرح اگر کسی علاقے میں ۱۴ سے ۲۱ سال کی عمر کے لوگوں کی تعداد اتنی ہو کہ ان کی الگ سے ایک جماعت بن جائے تو وہاں بھی اس عمر کے طلبا کو اس سے اونچی عمر کے طلبا کی جماعت میں شامل نہیں کرنا چاہئے۔

ناخواندگی کا خاتمہ اس صورت میں کہ ان پڑھوں کا سلسلہ برابر جاری رہے، ناممکن ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ابتدائی تعلیم کا فروغ بھی اس مہم کے ساتھ ہی ساتھ ہو ورنہ ناخواندگی کے خاتمے کی مہم کی ناکامی یقینی ہو جائے گی کسی بالغ کو خواندگی کی جماعت سے کم سمجھ یا ٹھس ہونے کی بنیاد پر خارج کرنا مناسب نہیں ہوگا اس لئے کہ کسی علاقے میں ایسے بالغوں کی تعداد جو خواندگی کے معیار پر بھی نہ آسکتے ہوں بالکل نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔

اس مہم میں عورتوں کو خواندہ بنانے کے پہلو پر، اُن تمام دشواریوں کے باوجود جن کا اس سلسلے میں پیدا ہونا یقینی ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ زور دینا ہوگا جتنا مردوں کو خواندہ بنانے پر دیا جائے گا۔ عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت سب پر ظاہر ہے۔ کسی خاندان میں عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا اس بات کی ضمانت ہے کہ اس خاندان میں ناخواندگی کے جراثیم پیدا نہیں ہوں گے۔

مہم کی تنظیم۔ تفصیلات

ہندوستان کی آبادی کا تقریباً ۷۰ فیصدی حصہ ناخواندگی کا شکار ہے اور یہ مسئلہ روز بروز نزاکت اختیار کرتا جا رہا ہے اس لئے کہ آبادی میں تو سال بہ سال اضافہ ہو رہا ہے مگر اس کے مقابلے میں خواندگی کی رفتار بہت زیادہ سست ہے۔ اس طرح ان تمام کوششوں کے باوجود جو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور سنستھاؤں کی طرف سے کی جا رہی ہیں ان پڑھوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اگرچہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اگر بالغ پڑھنے لکھنے کا فن سیکھنے کے لئے راضی اور آمادہ ہو تو وہ اپنی مادری زبان

میں لکھنا پڑھنا چند ہفتوں میں سیکھ لیتا ہے مگر پھر بھی دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ خواندگی کی مہموں کی رفتار میں تیزی نہیں آتی اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے "خواندگی پھیلانے" کی مہموں کی بجائے "ناخواندگی کو ختم کرنے کی مہم" کو منظم کرنا ہماری توجہ کا اولین موضوع ہونا چاہئے تاکہ اس کام پر جو کچھ صرفہ آرہا ہے اُس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جاسکے۔

آج کے ہندوستان میں ناخواندگی نمایاں طور پر گاؤں کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا "خاتمۂ ناخواندگی کی مہم" کی کامیابی کا دارومدار محض اس اسکیم کو اپنا لینے ہی پر نہیں ہے بلکہ اس بات پر بھی ہے کہ اس کی تنظیم کرتے وقت چھوٹی سے چھوٹی تفصیل پر بھی پوری نظر رکھی جائے۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے مہم کی تنظیم کے بارے میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ یہاں کچھ اشارے کئے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب کی سب یا ان میں سے چند باتیں مہم کو منظم کرنے والے کارکن کے کام آجائیں۔ یہ باتیں سخت ضابطے نہیں ہیں بلکہ ان میں مقامی حالات کے فرق کے لحاظ سے کمی بیشی یا تبدیلی ہر وقت ممکن ہے۔

تنظیم کی تفصیلات

مہم کی تفصیلات اس لحاظ سے حسب ذیل کاموں کی شکل میں ہوسکتی ہیں:۔

(الف) بالغوں میں لکھنا پڑھنا سیکھنے کا جوش و ولولہ پیدا کرنے اور پڑھنے پڑھانے کا ماحول پیدا کرنے کے لئے شدومد سے کام کرنا۔ اس مقصد کو دھیان میں رکھ کر زیر مہم علاقے میں زور شور سے پروپیگنڈا کیا جائے اور اس کے لئے جلوسوں، بھجنوں، یکتارا گانوں، کتھا کلی، لوک گیت وغیرہ سے کام لیا جائے۔ ان کے علاوہ دیواری اخبار، سائن بورڈ، کارٹون وغیرہ بھی آویزاں کئے جاسکتے ہیں اور جہاں کہیں ممکن ہوں اور میسر آسکیں وہاں پروپیگنڈا کرنے والے دستے اور گاڑیاں بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔

(ب) بالغوں کی پڑھائی لکھائی کے سلسلے کی آسانیاں فراہم کرنا۔

(ج) علاقے کے پڑھے لکھے لوگوں اور مہم سے ہمدردی رکھنے والوں کو بھی جن میں وہاں کے با اثر مرد اور عورتیں بھی شامل ہوں، اس بات کے لئے آمادہ کرنا کہ وہ آپس میں مل کر علاقے کے لئے ایک سوشل (ایڈلٹ) ایجوکیشن ایسوسی ایشن بنائیں۔ جب ایسوسی ایشن بن جائے تو اس کی ایک انتظامی کمیٹی بنائی جائے جس میں علاقے کے سب سے بااثر لوگ اور دیش پریمی شامل ہوں جیسے پنچایت کے پردھان، تاؤں یا گاؤوں کے مکھیا، بھجن منڈلیوں کے نمائندے اور دوسرے سماجی کارکن۔

انتظامی کمیٹی کے کام حسب ذیل ہو سکتے ہیں :۔
(۱) پورے علاقے کا سروے کرے اور اپنے یہاں علاقے کی مردم شماری کا ایک رجسٹر رکھے جس میں تازہ ترین معلومات موجود ہوں ۔
(۲) مختلف محلوں یا بستیوں میں تعلیمی مرکز قائم کرے جہاں خواندگی کی کلاسیں بھی ہوں ۔
(۳) یہی تعلیمی مرکز گاؤں کے کلب اور کمیونٹی سنٹر بھی ہوں گے اور اگر ان کے اپنے گوں کی کوئی جگہ دستیاب نہ ہو تو اسکولوں کی عمارتوں میں قائم ہوں گے
(۴) ہر خواندہ اور پڑھے لکھے شخص سے یہ کمیٹی عہد نامے لکھوائے کہ وہ سال میں کم سے کم ایک ناخواندہ شخص کو خواندہ بنادے گا۔ کمیٹی کو چاہیئے کہ عہد کو پورا کرنے میں عہد کرنے والوں کی مدد بھی کرے ۔
(۵) مرکز کو کامیابی کے ساتھ چلانے میں تعلیمی مرکز کے انچارج کی مدد کرے جو اس طرح ہو سکتی ہے کہ بستی کے ان پڑھوں کو خواندگی کے درجے میں داخل کرائے اور انھیں کلاس میں پابندی سے حاضر ہونے کی تاکید کرتی رہے ۔ 279379 /1/12/11
(۶) بستی کے نوجوانوں کی بھرتی کرے اور انھیں اس مہم کو تیزی سے چلانے کی غرض سے پہیئے کے طور پر استعمال کرے ۔ ان کا پروپیگنڈا دستہ بنائے اور اس سے پروپیگنڈا کا کام لے ۔
(۷) بستی میں جو زندہ دل اور کلاکار لوگ ہوں ان کو منظم کر کے بستی میں تفریحی اور تہذیبی پروگرام منعقد کرنے کے لئے تیار کرے ۔
(۸) ہر علاقے میں سرکار کی طرف سے قومی ترقی کے کچھ محکمے کام کرتے ہیں کمیٹی ایسا بندوبست کرے کہ ان محکموں کا تعاون اور سہجوگ حاصل کیا جاسکے تاکہ اس وسیلے سے گاؤں یا بستی کی معاشی حالت بہتر ہو۔
(۹) لٹریسی کلاس میں داخلے کے لئے ان پڑھوں کی تصدیق کرے، نوسکھوں کو خواندگی کے امتحان میں شریک کرے اور انھیں سندیں اور انعامات دینے کے لئے پبلک جلسہ منعقد کرے ۔
(۱۰) تعلیمی مرکزوں کے لئے کام اور پڑھائی کے اوقات مقرر کرے اور ایک تعطیل نامہ مرتب کرے ۔
(۱۱) میلے ٹھیلے اور تہواروں کے موقعوں پر خواندگی کے لئے پروپیگنڈا کرے ۔
(۱۲) گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں کو ترقی دینے کے لئے صلاح مشورہ حاصل کرنے اور ان کے لئے مظاہر کرانے کا بندوبست کرے ۔

(۱۳) مہم کو خوبی اور کامیابی سے چلانے کی غرض سے سوشل ایجوکیشن فنڈ کے نام سے چندہ اکٹھا کرے اور اس کو خرچ کرے

(۱۴) خواندگی کے "دن" اور "ہفتے" منانے کا انتظام کرے۔

(۱۵) "اپنے گھر سے ناخواندگی کی لعنت کو دور کرو" کا نعرہ لگائے اور اسے کامیاب کرنے کی تدبیریں کرے

(۱۶) پورے گاؤں یا بستی کے پڑھ لکھ جانے کے لئے ایک تاریخ مقرر کرے۔ اور اس بات کی ہر ممکن کوشش کرے کہ وہ تاریخ ٹلنے نہ پائے

۱۷۔ گاؤں یا بستی کے کتب خانے کو لوگوں میں اس حد تک مقبول بنائے کہ ہر نوسکھ اور تعلیم یافتہ کے ہاتھ میں ایک کتاب ہو اور کوئی کتاب ایسی نہ رہے جو ایک نہ ایک بار پڑھی نہ گئی ہو۔

۱۸۔ ہر مکان کے سامنے موٹے حرفوں میں صاحب خانہ کے نام کا سائن بورڈ لگائے اور اس مکان کے سامنے کھلی جگہ پر جو گندی یا صاف ستھری چیزیں ہوں اُن کے اوپر بھی ان کے نام لکھ کر لگائے (اس سے مقصد یہ ہے کہ اگر گندی چیزیں ہوں گی تو اس مکان کے رہنے والے لحاظ کے مارے انھیں دور کریں گے اور صاف چیزیں ہوں گی تو ان سے اُن کا نام ہوگا اور دوسرے مکان والوں کو بھی شوق ہوگا کہ ان کے مکان کے سامنے بھی اچھی اور صاف چیزوں کے سائن بورڈ لگ جائیں۔

۱۹۔ "اس مکان میں اب کوئی ان پڑھ نہیں رہا"، "اس گلی میں اب کوئی ان پڑھ نہیں رہا" "اس گاؤں میں اب کوئی ان پڑھ نہیں رہا" ان الفاظ کے موٹے موٹے حرفوں میں بورڈ بنوا کر رکھ لے اور جہاں جس بورڈ کا موقع ہو، اُسے آویزاں کر دے۔ اور اس واقعے کا اخباروں میں پروپیگنڈا کرے۔

۲۰۔ جن رضاکاروں نے اس مہم میں نمایاں کارنامے انجام دیئے ہوں اُن کے ناموں کا بھی اخباروں میں اشتہار کرے۔

۲۱۔ کارنامے انجام دینے والوں کا ایک (آنر) بورڈ بنوا کر ایسوسی ایشن کے دفتر میں کسی نمایاں جگہ پر آویزاں کرے اور جن رضاکاروں نے کارنامے انجام دئے ہوں اُن کے نام اس بورڈ پر لکھواتی رہے۔

۲۲۔ عام گذرگاہوں اور کھیتوں کھلیانوں پر خواندگی کے چارٹ کے بڑے بڑے پوسٹر لگوائے تاکہ آتے جاتے چلتے پھرتے ان کے اوپر بالغ طالب علموں کی نظر پڑے اور وہ اس طرح اپنا اپنا سبق دہراتے رہیں۔ ان کے علاوہ اس چارٹ کے چھوٹے چھوٹے ایڈیشن چھپوا کر بچوں کے ذریعے گھروں پر تقسیم کرائے تاکہ پڑھنے والے

بالغوں کے دماغ ہمہ وقت خواندگی میں معروف رہیں۔

۲۳- بالغوں کے پڑھانے کے طریقوں کے جگہ جگہ مظاہرے کرائے تاکہ خواندہ لوگ اس طریقے سے ان پڑھ بالغوں کو پڑھانے کے فن سے واقف ہو جائیں۔

۲۴- پڑھے لکھے لوگوں کو آمادہ کرے کہ وہ ایک ان پڑھ کو پڑھا دیں اور ان پڑھوں کو اس بات کے لئے تیار کرے کہ وہ اپنے پڑوس کے پڑھے لکھے کسی شخص سے پڑھنا لکھنا سیکھ لیں۔

انتظامی مجلس اپنے کام کے لئے اپنے ہی وسائل سے سرمایہ اکٹھا کرے گی۔ اس سرمایہ کی ابتدا اس طرح ہو سکتی ہے کہ حکومت فی نوسکھ آٹھ آنے کے حساب سے گرانٹ دے۔ اس طرح جو سرمایہ اکٹھا ہوگا اسے حسب ذیل کاموں کے لئے خرچ کیا جائے گا:۔

(الف) مقامی زبان میں چھپنے والے اخبارات و رسائل منگوانا۔

(ب) خواندگی کے چارٹ، پرائمر اور اپنے طور پر پڑھے جانے والے دوسرے سامان کی فراہمی جو بچوں کے ذریعے گھر گھر تقسیم کیا جائے گا۔

(ج) ابتدائی درجے کی کتابوں کی خریداری جو ان نوسکھ بالغوں کو فراہم کی جائیں گی جنھوں نے ابھی ابھی پڑھنا لکھنا سیکھا ہوگا۔

د- تعلیمی مرکز کی آرائش کا انتظام کرنا تاکہ بالغوں کے لئے اس میں کشش پیدا ہو۔

ھ- مرکز میں اچھی روشنی کا انتظام کرنا۔

و- جن مکانوں میں سب کے سب لوگ پڑھ لکھ جائیں اُن کو کتابوں کی شکل میں انعام دینے کا بندوبست کرنا۔

ز- جن مقامی رضاکاروں نے مہم کو کامیاب بنانے میں نمایاں خدمات انجام دی ہوں انھیں کتابوں کی شکل میں انعام دینا۔

ح- خواندگی کے "دن" اور "ہفتے" منانے کا بندوبست کرنا۔

ط- خواندگی کے مرکزوں میں آنے والے بالغ مبتدیوں کو مفت کاپیاں اور پنسلیں فراہم کرنا۔

ی- تفریحی اور تہذیبی پروگرام منعقد کرنا۔

ک- گاؤں میں سماج سیوا کی جو غیر سرکاری سنستھائیں ہوں اور جنھوں نے خواندگی کی مہم کو کامیاب بنانے میں نمایاں

خدمت انجام دی ہو، انھیں چندہ دینا۔

ل ۔ ان کاموں کے علاوہ اور کوئی کام جس کا اس خواندگی کی مہم سے تعلق ہو اور جس کی اس مہم کا افسر اعلیٰ (یعنی سوشل ایجوکیشن افسر) سفارش کرے۔

اس انتظامی کمیٹی کا ایک پریسیڈنٹ ہوگا جو کمیٹی کے ممبروں میں سے چُنا جائے گا۔ سوشل ایجوکیشن کا مقامی کارکن اس کا سکریٹری ہوگا اور گاؤں کا مکھیا اس کا خزانچی۔

خزانچی ایسوسی ایشن کا تمام حساب کتاب رکھے گا اور پانچ روپے اپنے پاس رکھ کر باقی رقم پاس کے ڈاک خانے میں رکھے گا۔

نوٹ ۔ اس مہم میں نصاب کیا ہوگا، تعلیم کی مدت کیا ہوگی، بالغوں کو پڑھانے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے گا، ان باتوں کو سمجھنے کے لئے جلیبو رنیشنل سیمینار کی رپورٹ کا مطالعہ کیا جائے۔ ہندی اور اُردو جاننے والے ناظرین کی معلومات کے لئے اگر موقع ہوا، تو ہم اگلے پرچے میں ان باتوں کے بارے میں معلومات پیش کریں گے۔

ایڈیٹر

اڈلٹ اسکول کے ٹیچروں کی یک ماہی ٹریننگ

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے اڈلٹ اسکولوں کے تجربوں کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے جو گذشتہ تین سال سے ملک کے مختلف حصّوں میں کئے گئے تھے، فیصلہ کیا ہے کہ ان اسکولوں میں تعلیم دینے والے ٹیچروں کے لئے ایک مہینے کا ایک ٹریننگ کورس منعقد کیا جائے تاکہ وقت آنے پر تربیت یافتہ اُستادوں کی کمی محسوس نہ ہو

یہ کورس ایسوسی ایشن کے صدر مقام واقع ۱۷۔ بی ۔ اندر پرستھ مارگ میں ۹ جنوری سنہ ۱۹۷۱ء سے شروع ہوگیا ہے۔ (نامہ نگار)

واپس "اڈلٹ ایجوکیشن" کو

سیاست اور تعصب کو الگ کر کے سوچئے تو یہ بات صاف اور کھلے ہوئے موسم کی طرح ظاہر ہے کہ آج کل بالغوں کی تعلیم کا کام کرنے والوں کے دماغ بہت الجھے ہوئے ہیں اور شاید اسی الجھاؤ کا نتیجہ ہے کہ سوشل ایجوکیشن کی گاڑی آگے منہ کو نہیں بڑھ رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری سوشل ایجوکیشن کی مثال شاہی محل کی اُس داشتہ کی ہے جو کسی ایسے دیار سے آئی ہو جہاں زندگی اقدار و روایات سے خالی ہو یا جسے بادشاہ نے اس کے ناک نقشے کی موزونیت اور رنگ کی ملاحت پر فریفتہ ہو کر کمسنی ہی میں رکھ لیا ہو۔ بادشاہ کی بادشاہی بھی نئی نئی ہے اور وہ اُسے آراستہ و پیراستہ کرنے کی غرض سے ہر وہ بات اور ساز و سامان قبول کر لیتا ہے جس میں کچھ آب و تاب ہوتی ہے۔ بادشاہ بھی نیا اور یہ داشتہ بھی نئی۔ دونوں نئے نئے سامانِ آرائش قبول کرتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ بادشاہ نے اپنی حوصلہ مندی سے بادشاہی حاصل کی ہے اس لئے اس کے دربار میں ہر ملک کے سفیر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جمع ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اس داشتہ کے لئے جو بادشاہ کی چہیتی محبوبہ ہونے کی وجہ سے دربار عام میں بھی ان کے پہلو بہ پہلو بیٹھتی ہے، اپنے ملک کی تحفہ تحفہ چیزیں، پوشاکیں، اور زیور پیش کرتا ہے اور اُن کو زیب تن کر کے جب وہ دربار میں آتی ہے تو ہر طرف سے واہ وا، واہ وا، کا شور اُٹھتا ہے اور بادشاہ اور اس کی محبوبہ دونوں سمجھتے ہیں کہ بس یہ ہے اس کے بدن پر کھلنے والی چیز!

ہندوستان میں آزادی سے پہلے اڈلٹ ایجوکیشن کے نام سے اشخاص اور ادارے اپنے اپنے طور پر کچھ کام کرتے تھے۔ ملک میں ناخواندگی کا غلبہ تھا، اس لئے ان مخلص اور بے لوث اشخاص اور اداروں نے بجا طور پر سوچا کہ اڈلٹ ایجوکیشن کا پہلا کام خواندگی پھیلانا ہے۔ اُن کا یہ استدلال غلط نہیں تھا کہ پہلے کھیت کو تیار کر لیا جائے، جبھی تو اس میں بیج ڈالے جائیں گے اور پُر بہار فصل کا خواب دیکھا جائے گا! اسی درمیان میں آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ ملک کی قسمت اس کے اپنے ہاتھ میں آئی۔ خیال آیا "صرف خواندگی سے کیا ہوتا ہے۔ ہمیں اس سے کچھ زیادہ کی اور جلد ضرورت ہے" اڈلٹ ایجوکیشن کے نام سے خواندگی کے کام کا اتنا

چرچا ہو گیا تھا کہ خواندگی ہی کو اڈلٹ ایجوکیشن کہنے لگے تھے۔ ملک کے سوچنے والوں نے سوچا "اڈلٹ ایجوکیشن تو صرف خواندگی کو کہتے ہیں۔ ہمیں خواندگی سے کچھ زیادہ کی اور جلد ضرورت ہے اس لئے ہم اپنی تحریک کا نام سوشل ایجوکیشن رکھیں گے۔"

اس فیصلے کے ساتھ ہی ساتھ سوشل ایجوکیشن کی تحریک کا جھنڈا خود حکومت نے اُٹھا لیا پھر تو وہ غلغلہ اُٹھا اور وہ دھوم دھام ہوئی کہ "دیکھا کرے کوئی"۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج نہیں تو کل ہندوستانی سماج یقیناً معراج کمال پر پہنچ جائے گا۔ تعجیل پرسوں جانے کی اس ہوس میں تحریک کے لیڈر یہ بھی بھول گئے کہ سوشل ایجوکیشن کا نعرہ دینے میں جن چیزوں کو صف اوّل میں جگہ دی جا رہی ہے وہ دراصل مقاصد نہیں ذرائع ہیں مقاصد کو حاصل کرنے کے، اور جس چیز کو دور ایک کنارے جگہ دی گئی ہے، دراصل وہی منزل نہیں تو منزل پر پہنچنے کا صحیح راستہ ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں کے دوش بدوش کھڑے ہونے کے اس چھوٹے شوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ اڈلٹ ایجوکیشن کی جگہ سوشل ایجوکیشن کا فیشنیبل نعرہ لگا کر ہم خواندگی کی ضرورت کو بھول بیٹھے اور ایسا بھولے کہ اس کا نام لینا دقیانوسی گفتگو قرار پائی اور اس کا ذکر کرنے والوں کے اوپر انگلیاں اُٹھنے لگیں۔ اس کے مقابلے میں لیکن ہوا کیا؟ سوشل ایجوکیشن کے کارکن بالغوں کے خالی اوقات کے صحت مند استعمال پر دم دینے لگے۔ تفریحی اور تہذیبی سرگرمیوں کی تنظیم، مفید اور منافع بخش مشغلے اور رہابیاں، صحت و صفائی کی مہمیں، گھریلو دستکاریوں کی کلاسیں، اور انھی کے ساتھ "اگر بالغ اپنی مرضی سے اور کسی ضرورت کی تحریک پا کر خواندگی کا مطالبہ کریں تو" خواندگی کی چند کلاسیں ——— یہ مختصراً سوشل ایجوکیشن کے کام قرار پائے، اور اس کے جواز میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ بالغوں کو تعلیم دینے کے لئے خواندگی تو محض ایک ذریعہ ہے اور وہ بھی دیر طلب۔ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر منزل تک پہنچنے کا تریپٹ راستہ دوسرا ہے اور وہ بالواسطہ اور غیر رسمی تعلیمی ذرائع ہیں جن کے استعمال سے اُن کے دماغوں کی تربیت کی جا سکتی ہے۔

ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ حکومت نے چونکہ اس پروگرام کو براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، اس لئے سرکاری مشنری کا تقاضا ہوا کہ جس کام پر روپیہ لگایا جا رہا ہے اس کا حاصل اور نتیجہ بھی نکلنا چاہئے چنانچہ وقت بے وقت کاموں کی رپورٹیں طلب کی جانے لگیں۔ کارکن بیچارا کیا کرتا۔ اُسے کام دکھانا پڑتا تھا اس لئے بھی اور کچھ اپنی لیاقت کی سطح کی وجہ سے بھی اس نے پورے پروگرام سے ایسے آئٹم چُننے شروع کئے جن کے اعداد و شمار آسانی سے مرتب ہو سکتے تھے اور جن کے لئے محنت بھی کم سے کم کرنی پڑتی تھی یعنی کتنے ڈرامے دکھائے گئے، کتنے بھجن اور

کیرتن منظم کئے گئے، ان اجتماعات میں کتنے لوگ شریک ہوئے، کتنے فرشی اور میدانی کھیلوں کے مقابلے ہوئے کتنے لیکچر ہوئے وغیرہ۔

یہ سلسلہ کچھ ایسا بڑھا کہ سوشل ایجوکیشن کھیل تماشے منظم کرنے کا دوسرا نام پڑ گیا۔ اسی دوران میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم پر عمل شروع ہوا اور کچھ عرصے کے بعد سوشل ایجوکیشن کا پروگرام بھی اسی کی ماتحتی میں آ گیا۔ یہاں اس کا جو کچھ حشر ہوا، اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے حلقوں میں اسے جن القاب سے موسوم کیا گیا ان سے بھی لوگ واقف ہیں لیکن اس بات کے لئے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے لوگ ہی ذمہ دار نہیں ہیں، بلکہ جیسا اوپر ذکر کیا گیا، خود سوشل ایجوکیشن کے اندر ہی اس مرض کے جراثیم موجود تھے، کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں آکر ان کی نشو ونما ہوئی اور وہ از کار رفتہ قرار دیدی گئی۔

کچھ عرصہ پہلے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے حلقوں میں یہ چرچا بڑی سرگرمی سے چلا تھا کہ یہاں سے سوشل ایجوکیشن اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو خارج کر کے ان کی جگہ کمیونٹی آرگنائزیشن اور کمیونٹی آرگنائزر کو رواج دیا جائے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کو اس معاملے میں بھی تنہا موردِ الزام قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ سوشل ایجوکیشن کی تحریک اس سے پہلے جس راستے پر چلتی رہی تھی، وہ خود بھی اس کی ذمے دار ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابتدا میں کہا، سوشل ایجوکیشن کی اپنی روایات تو کچھ تھیں نہیں، چنانچہ اس نے اقدار و روایات سے عاری کسی سپاٹ دیہاتی شہر میں آئی حسینہ کی طرح جو چیز بھی چمکتی ہوئی نظر آئی، اپنی زینت افزائی کی غرض سے اُسے دھڑا دھڑ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ کمیونٹی سنٹر، فوک ہائی اسکول، کمیونٹی ہال، کو آپریشن، پیشے کی ٹریننگ، ڈیولپمنٹ کاونسل، کمیونٹی آرگنائزیشن، اور نہ جانے کیا کیا کچھ ایک کے بعد ایک سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں شامل ہوتا رہا اور لطف کی بات یہ کہ ان میں سے کہیں کسی وقت کسی تجربے پر وقت صرف نہیں کیا گیا جس سے روایات قائم ہوتیں، بلکہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی ہوس میں ایک تجربے کو چند دن چلانے کے بعد اُسے ادھورا چھوڑ کر دوسرے کو ہاتھ میں لے لیا۔ اس تمام بدیسی مال میں کمیونٹی آرگنائزیشن کے اندر زیادہ آب و تاب تھی اور اس کا فنشن (FINISH) بھی اچھا تھا۔ قدرتی بات ہے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کو اپنے ہم وطن سے ہی دلچسپی ہوتی جا تی

سوشل ایجوکیشن کی رفتار کا ہم نے جو کسی قدر مفصل جائزہ لیا، اس سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ موجودہ دور میں سوشل ایجوکیشن کی اسکیم جو اڈلٹ ایجوکیشن کی ڈگر سے ہٹ کر ایک دوسرے راستے پر پڑ گئی تھی، اور چونکہ اس راستے کا پہلے سے کوئی تعین نہیں تھا، لہٰذا وہ جہاں جہاں سے گذری وہاں کا تمام رنگ روپ اختیار کرتی چلی گئی۔

ان حالات میں اس کی شکل بہروپئے کی بن گئی ہے اور یہ متعین کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اس کا کون سا روپ اصلی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم سوشل ایجوکیشن کا سہارا لے کر "خدا" سے ملنے چلے تھے، وہ تو ملا نہیں اور نہ ملنے کی توقع ہے، ادھر ہم "وصالِ صنم" کے امکان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ سماج کو تو معراج کیا حاصل ہوتی، اڈلٹ ایجوکیشن کے ذریعے ہم اتنا بھی نہ کر سکے کہ اٹھارہ بیس فیصدی پڑھے لکھوں میں جو لوگ جواں عمر تھے اور کچھ غوں غاں کر سکتے تھے، وہی کچھ محنت کر کے آگے منہ کو بڑھ جاتے اور ہم اس آٹھ دس سال کی کوشش کے بعد کہہ سکتے کہ "اگرچہ ہمارے یہاں بیس فیصدی ہی تعلیم ہے مگر یہ بیس فیصدی سب کے سب تعلیم یافتہ ہیں، ایسا نہیں ہے کہ ان میں صرف اپنا نام پڑھ اور لکھ سکنے والے "تعلیم یافتہ" بھی شامل ہوں۔

میرا خیال ہے کہ اڈلٹ ایجوکیشن کو چھوڑ کر اس کی جگہ سوشل ایجوکیشن کی اصطلاح ایجاد کرنے میں جو مصلحت پیش نظر تھی، اس کی حیثیت تعلیمی سے زیادہ سیاسی تھی، اور اسی نقطۂ نظر کے مطابق تمام دنیا کے تجربات کی طرف سے منہ موڑ کر اس اسکیم کو براہ راست حکومت کے اہتمام میں چلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ملک کو آزاد ہوئے ابھی دو ہی ڈیڑھ سال ہوئے تھے۔ اس وقت بجا طور پر ضرورت تھی کہ پورے ملک میں خصوصاً دیہی علاقوں میں کچھ دھوم دھام اور چہل پہل نظر آئے اور عوام کے جن طبقوں نے آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا تھا، وہ مایوس نہ ہونے پائیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کا اس قدر جلد بس یہی ایک طریقہ تھا کہ جب تک رسوئی خانہ گرم ہو اور پیٹ بھر کر کھانے کے لئے دال روٹی ہی سہی تیار ہو، اس وقت تک کئی دن کے بھوکے بچوں کے شور و غل سے بچنے یا ناتوانی کی وجہ سے ان کے سو جانے کے اندیشے کو مٹانے کے لئے ان کے سامنے کچھ چبینا ڈال دیا جائے۔ یہ واقعی ضرورت تھی، اور اس وقت کی نفسیات کے عین مطابق تھی۔

ملک کو بے چینی یا مایوس القلبی سے بچانے کے لئے یہ ترکیب کئے اب دس بارہ سال ہو چکے ہیں سوشل ایجوکیشن کے سپرد جو کام کئے گئے تھے، انہیں اس نے پورا کر دیا اور اوپر کی مثال کو دہراتے ہوئے اب کہا جا سکتا ہے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ، انڈسٹریل ڈیولپمنٹ، کوآپریشن، پنچایتی راج، اور اسی طرح کی دوسری بہت سی خدمات کی شکل میں "دال روٹی" تیار ہو چکی ہے اور ان کی موجودگی میں "چبینے" کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ یوں بھی دال روٹی کی موجودگی میں قدرتی بات ہے، بچے اس کی طرف رُخ نہیں کریں گے چنانچہ سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کی موجودہ کیفیت کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اُسے نہ منصوبہ بندی کرنے والے کچھ زیادہ اہمیت دے رہے ہیں اور نہ جن کے لئے منصوبے بنائے جاتے ہیں، انہی کے لئے اس میں جاذبیت رہ گئی ہے۔

جب حالات کا رُخ ایسا ہو تو دانشمندی کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ ہم بات کی پچ کے پیچھے اپنے سابقہ فیصلے ہی پر بدستور اڑے رہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ اگر ہم سوشل ایجوکیشن کی اصطلاح کو ترک کرکے اپنے کام کا عنوان اڈلٹ ایجوکیشن ہی مقرر کرلیں جسے ہم نے مصلحت کی بنا پر چھوڑ دیا تھا تو دنیا ـــــــ اور سب سے زیادہ امریکی ذہن رکھنے والے لوگ ہمارے اوپر دقیانوسیت اور قدامت پسندی کا الزام لگائیں گے۔ لیکن اگر کام جاندار ہو اور صرف نام قدامت پسندانہ ہو تو اس سے کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ یہاں مجھے برطانیہ اور فرانس کی روایتی چشمک یاد آرہی ہے جس میں فرانس والے جب برطانیہ کو قدامت پرستی اور دقیانوسی قسم کے ناموں اور عنوانات کی بنا پر طنز و ملامت کا نشانہ بناتے ہیں تو انگریز انھیں جواب دیتے ہیں "جی ہاں! نام ضرور نئے نئے اور فیشنیبل قسم کے رکھئے کام چاہے صفر ہی ہو! ہم اپنی قدامت پرستی ہی میں خوش ہیں، کام تو کر لیتے ہیں!!"

سوشل ایجوکیشن کی اصطلاح وضع کئے ہوئے ہمیں گیارہ بارہ سال ہو چکے ہیں۔ اس پروگرام کو موٹے حساب سے پانچ طرح کے کام سپرد کئے گئے تھے: (۱) خواندگی (۲) شہریت کی تعلیم (۳) تفریحی اور تہذیبی پروگرام (۴) معاشی بحالی اور (۵) صحت و صفائی کی تربیت۔ سوشل ایجوکیشن نے ان فرائض کی انجام دہی میں جیسا کچھ بھی کام کیا، اس سے اتنا تو ضرور ہوا کہ عوام میں کچھ سوچنے اور کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان پانچوں کاموں میں سے خواندگی اور شہریت کی تعلیم کو چھوڑ کر باقی ہر منصب کے لئے نہایت منظم قسم کی خدمات قائم ہو گئی ہیں مثلاً معاشی ترقی کے لئے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم جس میں صحت و صفائی کی تربیت کے لئے بھی گنجائش موجود ہے۔ اس کے علاوہ سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ ہے جو عورتوں اور بچوں کی بہبود کے لئے کام کر رہا ہے جس میں عورتوں کو گھریلو دستکاریاں سکھانا، ان کی اور ان کے بچوں کی صحت کو بحال رکھنے کے لئے تدبیریں کرنا اور ننھے بچوں کے لئے نرسری ایجوکیشن کا انتظام کرنا خاص کام ہیں۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم اگر سیتیوں اور گروہوں کی تنظیم (کمیونٹی اینڈ گروپ آرگنائزیشن) کا کام شروع کر دے جیسا کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزیشن کے ماتحت وہی کام کر بھی رہی ہے تو تفریحی اور تہذیبی پروگراموں کی ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے۔ غرض ہندوستان اب اس منزل میں ہے جب سماجی بہبود اور معاشی ترقی (سوشل ویلفیر اینڈ اکنامک ڈیولپمنٹ) کی خدمات بڑے پیمانے پر منظم ہو چکی ہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں جو یہ صورت حال دیکھنے میں آتی ہے کہ اڈلٹ ایجوکیشن کے سپرد صرف بالغوں کی تعلیمی سطح کو بلند کرنے اور انھیں جمہوریت کے آداب و اطوار کی تربیت دینے کا کام ہوتا ہے، اس کا یہی سبب ہے کہ انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے مختلف قسم کی خدمات باضابطہ منظم ہوتی ہیں۔

ان حالات کے اس تجزئے کی روشنی میں سوشل ایجوکیشن کی تحریک کے رہنماؤں کو سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ آیا یہ تحریک جو دراصل اڈلٹ ایجوکیشن ہی کی تحریک ہے، اسی معمّے اور کنفیوژن کی حالت میں بدستور قائم رہے گی یا اُسے اس طویل آوارہ گردی کے بعد اپنے اصل مقام پر واپس آجانا چاہیے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کو، جہاں تک قرائن سے اندازہ ہوتا ہے، تعلیم کا کام اپنے ہاتھ میں لینے کا کچھ بہت زیادہ شوق نہیں ہے۔ اگر سوشل ایجوکیشن کی تحریک اپنے آپ کو چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارنے کے بجائے اَن پڑھ بالغوں کو معقول حد تک پڑھا لکھا بنانے اور نیم تعلیم یافتہ اور نوسکھ بالغوں کی تعلیمی سطح کو بلند کرنے کی حد تک محدود کر لے تو شاید کمیونٹی ڈیولپمنٹ کو یہ دعویٰ کرنے کا موقع نہیں رہے گا کہ یہ اُس کے دائرۂ عمل میں آنے والا کام ہے۔ اس طرح یہ تحریک بہ یک وقت دو شوہروں کی بیوی بننے سے بھی بچ جائے گی اور اپنے آبائی وطن "قومی نظامِ تعلیم" میں آکر بڑی آب و تاب سے برگ و بار لا سکے گی۔

نوٹ۔ یہ ایک نیا خیال ہے جو اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔ ہم ناظرینِ تعلیم و ترقی کو دعوت دیتے ہیں کہ اس سلسلے میں وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔ "تعلیم و ترقی" کے صفحات ان کے مضامین کے لئے کھلے رہیں گے۔

ایڈیٹر

لٹریسی ہاؤس لکھنؤ کے اہتمام میں نوسکھوں کے لئے جونیئر ہائی سکول

لکھنؤ کا لٹریسی ہاؤس ۱۹۵۸ء سے سن ۱۹۶۱ء تک تجربے کے طور پر مستقل اڈلٹ اسکول چلاتا رہا تھا۔ اس دو سالہ کورس کے اختتام پر اُتر پردیش کے محکمۂ تعلیمات کی طرف سے ایک امتحان ہوا جس کا نتیجہ بہت اطمینان بخش تھا۔

ان اسکولوں سے نکلے ہوئے نوسکھ بالغوں نے مطالبہ کیا کہ اب وہ ابتدائی منزل سے آگے کی تعلیم بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس مطالبے پر لٹریسی ہاؤس نے نوسکھوں کے لئے مڈل تک کی تعلیم دینے کی غرض سے ایک جونیئر ہائی اسکول (سابق ورناکیولر مڈل اسکول) چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ (انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن)

شفیق صاحب کا خط

شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے کے نام

فردوس آباد عالم آخرت
یکم جنوری ۱۹۶۱ء

محبی دیش پانڈے جی،

آداب و نیاز۔ یہاں خبر آئی ہے کہ آپ آج سے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں اور آپ کی جگہ سوہن سنگھ جی آب نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر کے ڈائرکٹر ہوں گے۔ اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟ وکالت تو میرے خیال میں اب آپ کریں گے نہیں! کیونکہ اس پیشے کو آپ قربان کر چکے ہیں، اور خدا کے فضل و کرم سے میرے خیال میں اب اس کی آپ کو ضرورت بھی نہ ہوگی اگر منوجی کے قانون کے بارے میں میرا علم غلط نہیں ہے تو آپ اس وقت بان پرستھ آشرم میں ہیں جب آدمی رہتا تو اپنے گھر اور بال بچوں میں ضرور ہے مگر ان سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ زندگی کے بارے میں اپنے تجربات سے انھیں اور اُن کے متعلقین کو فیض پہنچاتا رہتا ہے۔

آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے کہ آپ کا خاندان ملک کے وہ ۸۰ فیصدی پسماندہ لوگ ہیں جن کی سیوا کے لئے آپنے اپنے قانونی پیشے کی قربانی دی تھی۔ اور اس بات سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس قربانی نے آپ کو وہ طاقت بخشی جس سے کام لے کر آپنے ملک میں تعلیم بالغان کی تحریک کی جڑ جما دی۔ جس زمانے میں سوشل ایجوکیشن کے اوپر سنکٹ آگیا تھا، اُس وقت میں تو دُنیا میں موجود نہیں تھا، مگر سُنا ہے کہ یہ آپ ہی کی وکالت کا زور تھا جس کی بدولت وہ سنکٹ دُور ہو گیا۔ دیکھئے میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا! کہہ یہ رہا تھا کہ آپ کا خاندان ملک کے یہی ۸۰ فیصدی پسماندہ لوگ ہیں انھی کی تعلیم و تربیت کا بوجھ آپنے اُٹھایا تھا، اور اس کا آپنے جس طرح حق ادا کیا، خدا دوسروں کو بھی توفیق دے وہ بھی اُسی طرح اپنے فرائض کا حق ادا کریں۔

آپنے مگر دیش پانڈے جی اب تک جو کچھ کیا، وہ سرکار کے قواعد و ضوابط کا پابند رہ کر کیا۔ یہ تو صحیح ہے کہ آپنے ان قواعد و ضوابط کی غلامی کرنے کے بجائے خود قواعد و ضوابط کو اپنی مرضی کا پابند بنایا، خلوص اور سچائی

کا یہی سب سے بڑا انعام ہے جو آپ کو ملا۔ مگر ان سب کے باوجود، یہ بات تو مجھے بھی معلوم ہے کہ حکومت کے ماتحت ہو کر کام کرنے میں آپ اپنے تئیں بندھا بندھا سا محسوس کرتے تھے، اور شاید یہی احساس تھا جس کے اثر سے آپ جو کچھ اور جتنا کچھ کرنا چاہتے تھے، اتنا کر نہیں پاتے تھے۔

اب بہرحال اس بندھن سے آپ آزاد ہو گئے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق جو کچھ اور جیسا کچھ چاہیں کر سکتے ہیں۔ یہ خط میں آپ کو اس وقت جبکہ آپ ملازمت سے ریٹائر ہو گئے ہیں، ایک مصلحت سے لکھ رہا ہوں جب میں آپ لوگوں کے ساتھ دنیا میں تھا تو میری بہت دنوں سے خواہش تھی کہ اپنی نگرانی میں ایک فوک اسکول کا تجربہ کروں، اس لئے کہ اس تحریک نے ڈنمارک میں جو کارنامے انجام دیئے تھے ان کا میرے اوپر بہت اثر تھا، مگر حالات نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی چنانچہ وہ خواہش میرے ساتھ ہی دفن ہو گئی جس زمانے میں شری ماوجی گاوڈا کام کاج سے ریٹائر ہوئے۔ اُس وقت میرا جی چاہا کہ ان کو اس سلسلے میں لکھوں لیکن وہ بیچارے اپنے خانگی مسائل میں اُلجھ گئے اس لئے انھیں تکلیف دینے کا ارادہ میں نے چھوڑ دیا، اور انتظار میں رہا کہ آپ کو فرصت ملے تو آپ سے اپنی خواہش بیان کروں مجھے اس کا بہرحال یقین ہے کہ آپ کے خانگی حالات ایسے نہ ہوں گے کہ آپ کو ان کی طرف سے خواہ مخواہ پریشانی ہو۔

میں نے دلیش پانڈے جی! اپنی یہ خواہش آپ سے آپ کے ریٹائر ہونے پر ظاہر کی ہے۔ یہ میں نے یوں ہی بے سبب نہیں کیا ہے بلکہ اس کے پیچھے دو بنیادی باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ فوک اسکول کا سرکاری اہتمام میں چلنا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جانا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ڈنمارک میں یہ خالصتہً عوام کی تحریک تھی اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہندستان میں یہ حکومت کے اہتمام میں کیسے کامیاب ہو جائے گی! اور دیکھئے نا، سوشل ایجوکیشن ہی کی تحریک حکومت کے ہاتھوں میں جا کر کون سی کامیاب ہو گئی!! تو یہ خواہش آپ کے ریٹائر ہونے پر میں اس لئے ظاہر کر رہا ہوں کہ اب آپ کا یہ تجربہ حکومت کی دخل اندازی سے پاک ہو گا اور آپ اسے کامیاب بنا سکیں گے۔

دوسری مصلحت اس وقت آپ کو لکھنے کی یہ ہے کہ آپ کا شمار تجربہ اور عمر، دونوں حیثیتوں سے بزرگوں میں ہے۔ آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ ڈنمارک میں یہ تحریک زندگی کا تجربہ رکھنے والے بزرگوں نے چلائی تھی، چنانچہ اس کے کامیاب ہونے کا یہی واحد راز تھا۔ اس بات کی اتنی اہمیت تھی کہ کرسٹن کولڈ نے جو فوک ہائی اسکولوں کی "عملی" تحریک کا باوا آدم تھا، اپنا اسکول کھولنے سے پہلے سال ڈیڑھ سال تک اٹھارہ بیس سال کے چند نوجوان طالب علموں کا ٹیوشن محض یہ اندازہ کرنے کے لئے کیا تھا کہ "آیا میں اپنی باتوں سے نوجوانوں کو متاثر (انسپائر) کر سکونگا یا نہیں" ہمارے یہاں اس کے برخلاف یہ ہوا کہ جنتا کالجوں میں پڑھانے اور رہنمائی کرنے کا کام نوجوان تعلیم دانوں

کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ جس کام میں اٹھارہ سے پچیس تیس سال کی عمر کے بالغوں سے واسطہ ہو، اور واسطہ بھی تعلیم دینے اور انسپائر کرنے کے سلسلے میں اس میں اُنھی کی عمر کے معلموں اور پرنسپلوں کا کتنا اثر ہوگا! پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ہندوستان کے لوگ روایتاً اتنے بزرگ پرست واقع ہوئے ہیں کہ اتنے دنیا کے کسی ترقی یافتہ ملک میں نہ ہوں گے۔ اس لئے یہاں تو بالغوں کو انسپائر کرنے کا کام خاص طور سے زندگی کا تجربہ رکھنے والے بڑے بوڑھوں ہی کے ہاتھ میں ہونا چاہئے جنھیں عمر اور تجربے نے اٹھارہ سے پچیس تیس سال کے بالغوں کو بیٹا، بابو، بھیا، میاں، کے القاب سے خطاب کرنے کا اختیار دے دیا ہو تو دیش پانڈے جی، آپ اس وقت تجربے اور عمر کی جس منزل میں ہیں وہ ایک کامیاب جنتا کالج، یا لوک ودیا پٹھ یا فوک اسکول کا پرنسپل بننے کے لئے ہر اعتبار سے موزوں اور مناسب ہے۔

تو میری دلی خواہش ہے کہ اس وقت جب کہ آپ کے اوپر گھر گرہستی یا کسی سرکاری منصب کی کوئی ذمے داری نہیں ہے، اپنے ہی صوبے یا ہندوستان کے کسی دیہاتی گوشے میں دھونی رما کر بیٹھ جایئے اور ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں کے طرز کا ایک لوک ودیا پٹھ قائم کر ڈالئے۔ مجھے خدا کی ذات سے اور آپ کے تجربہ اور قابلیت سے پوری امید ہے کہ آپ کا یہ لوک ودیا پٹھ ہندوستان کی سوئی ہوئی جنتا کو جگانے میں کامیاب ہو جائے گا اور پھر ملک کے کونے کونے میں آپ جیسے دوسرے دیش پریمی اسی کے نمونے پر لوک ودیا پٹھ بنانے لگیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی جبکہ ملک کو آزاد ہوئے بارہ تیرہ برس ہو چکے ہیں جنتا کو جگانے کی ضرورت باقی ہے اور کرسٹن کولڈ کے الفاظ میں روشنی (ENLIGHTENMENT) سے زیادہ زندگی کی حرارت (ENLIVENMENT) کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت میری سمجھ کے مطابق اسی قسم کی کسی تحریک سے پوری ہو سکتی ہے۔

آپ سوچیں گے کہ اس شخص کو کوئی کام تو ہے نہیں، جنت میں بڑا مزے کر رہا ہے، اتنا لمبا چوڑا "چٹھا" لکھ مارا۔ مجھے خط کی طوالت کے لئے معاف کر دیجئے۔ مگر جناب والا آپ کو بھی تو اب فرصت ہی فرصت ہے اسی لئے تو میں نے بھی ہمت کر لی۔ مگر یہ یہاں کا حال کچھ نہ پوچھئے، بڑے بڑے جغادری جو اپنے اپنے زمانے کے فرعون، نمرود اور راون تھے، کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہیں۔ کوئی اُن کی بات بھی نہیں پوچھتا، بیچارے منہ لٹکائے مارے مارے پھرتے ہیں۔ مولانا آزاد کی رہنمائی میں ہم لوگوں نے جن میں پنڈت امرناتھ جھا، میں اور ہری سروتما راؤ جی وغیرہ شامل ہیں، ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کی ایک مہم چلا رکھی ہے۔ ہم انہیں یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ بھائی، تم لوگوں نے اللہ اور اُس کے بندوں دونوں کا حق مارا ہے اپنی نافرمانی کے لئے تو اگر تم توبہ کر لوگے، تو اللہ معاف بھی کر دے گا، اس کے بندوں سے رو رو کر معافی مانگو تاکہ وہ لوگ تم کو معاف کر دیں۔ اس ترکیب سے تم لوگوں کی تکلیفیں شاید کچھ کم ہو جائیں۔

ابھی مہم شروع ہی ہوئی ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی کی رپورٹ پھر کبھی بھیجیں گے۔ شفیق

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ

ایک سال کا کام

جولائی ۱۹۵۹ء تا جون ۱۹۶۰ء

ذیل میں ہم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ادارۂ تعلیم و ترقی (جامعہ انسٹی ٹیوٹ آف اڈلٹ ایجوکیشن) کی سالانہ رپورٹ شائع کر رہے ہیں۔ جامعہ کا سال جولائی سے شروع ہو کر جون میں ختم ہوتا ہے اس لئے یہ رپورٹ بھی اسی مدت کے کام پر مشتمل ہے۔

ادارۂ تعلیم و ترقی کے چار سیکشن شعبۂ دیہی مراکز[1]، شعبۂ تصنیف و تالیف[2] بالغاں ناخواندگان[3] اور رسالہ تعلیم و ترقی[4] الگ الگ کام کرتے ہیں۔ ان چاروں شعبوں کی رپورٹیں بہت ضخیم ہیں اس لئے اس پرچے میں ہم پہلے شعبۂ دیہی مراکز کی رپورٹ دے رہے ہیں۔ اگلے پرچے میں باقی تین شعبوں کی رپورٹیں یکجا شائع کی جائیں گی۔

—— ایڈیٹر

شعبۂ دیہی مراکز

پچھلے سال کے شروع میں جناب شیخ الجامعہ صاحب کی موجودگی میں دیہی مراکز کی اسٹاف میٹنگ میں یہ بات طے ہو گئی تھی کہ ہم لوگوں کے وسائل ایسے نہیں ہیں کہ ہم نمونے کے کمیونٹی سینٹر قائم کر سکیں۔ معمولی درجے کے کمیونٹی سینٹر چلا کر اس میں کام کرتے رہنے سے تعلیم و ترقی کا معیار قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے ہمیں علاقے کی مختلف کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ساتھ کام کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ سماجی بہبود کے دوسرے کاموں کو ہاتھ میں لینا چاہئے۔ اس پالیسی کی بنیاد پر ہم نے اپنے کام کے لئے تین جگہوں اوکھلا گاؤں، سرائے کالے خاں اور اوکھلا ٹینک کی بستیوں کا انتخاب کیا۔

اوکھلا ٹینک

اوکھلا ٹینک کی بستی میں وہاں کی سوسائٹی "دی اوکھلا ٹینک کسان ملٹی پرپز کوآپریٹیو" کے ساتھ کام شروع کیا گیا اس سوسائٹی کے ۳۶۰ ممبروں میں سے تقریباً ۱۰۰ ممبر اس بستی میں رہتے ہیں۔ یہیں ایک جھونپڑی میں سینٹر کی ابتدائی شکل بناکر کام کی ابتداء کی گئی۔

اس سے پہلے سوسائٹی کا کام صرف چند لوگوں کے ہاتھ میں تھا کسی کو یہ نہ معلوم تھا کہ سوسائٹی مقروض ہے یا قرضخواہ اور اگر مقروض ہے تو اس پر کس قدر قرض ہے اور اس کی ادائیگی کی کیا صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں اور اس سوسائٹی سے عام ممبروں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے مگر اب سوسائٹی کے روزمرہ کے کام کاج کے سلسلے میں عام ممبروں کی رائے لی جانے لگی ہے اور لوگوں کو ان کی رائے کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ قرض اور دوسرے اثاثے کی فہرست مرتب کی جا چکی ہے اور ممبروں کو اس سے آگاہ کیا گیا ہے۔ سوسائٹی پر بنک کا کافی قرض ہو گیا تھا، اسکی ادائیگی کی صورتوں پر غور کیا گیا۔ جن ممبران پر سوسائٹی کا قرض تھا وہ وصول کیا گیا اور اس رقم سے بینک کی اچھی خاصی رقم ادا ہو گئی ہے۔ سوسائٹی کے پاس چھ سو بیگھہ کا ایک فارم تھا جس پر پہلے سے چند لوگ قابض ہو گئے تھے اور آج بھی ہیں۔ کسی ممبر کو یہ پتہ نہ لگ سکتا تھا کہ زمین کب تک کے لئے اور کن شرائط پر دی گئی ہے۔ فارم جو دراصل عام ممبران کے پاس زمین کی کمی کو پورا کرنے کے لئے لیا گیا تھا صرف چند لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اب یہ بات کم از کم طے ہو گئی ہے کہ سوسائٹی نے ایک خاص مدت کے لئے یہ زمین چند ممبران کو پٹے پر دی تھی اور اب ۲ سال کے بعد ان کی مدت پٹہ ختم ہو جائے گی اور اس کے بعد عام ممبران اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ حکومت نے سوسائٹی کے ممبروں کی کافی زمین اوکھلا ٹینک کے علاقے میں ایکوائر کر لی ہے۔ سوسائٹی اور زمیندار اور سوسائٹی اور ممبران کے درمیان بہت سے جھگڑے اور غلط فہمیاں راہ پا گئی تھیں، انھیں باہم بات چیت کے ذریعے طے کرایا گیا، اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

سرائے کالے خاں

اسی طرح سرائے کالے خاں کی ملٹی پرپز کوآپریٹیو کے ساتھ بھی مل کر کام شروع کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں کے یوتھ کلب کی نئی تنظیم کا کام بھی ہاتھ میں لیا گیا ہے۔

نئے سال کے آغاز میں شعبے نے ۴ کارکنوں کے ساتھ کام شروع کیا تھا لیکن اسی اثناء میں ایک صاحب طویل رخصت پر چلے گئے اور دوسرے صاحب دسمبر ۱۹۶۰ء سے شعبہ سے مستعفی ہو گئے۔ اس طرح شعبے میں بجائے چار کے ۲ کارکن رہ گئے اور انھیں کے

اوپر کل کام کا بار پڑا۔ بہرحال اس صورت حال کے پیش نظر کاموں کو اس طرح ترتیب دیا گیا کہ اوکھلا ٹیننگ کے کارکن کو اوکھلا کمیونٹی سینٹر میں منتقل کیا گیا، اور میں نے شعبے کے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ دوسرے باہر کے کام اپنے ہاتھ میں لئے۔

اوکھلا

اوکھلا مٹی پیرپزکو آپریٹیو سوسائٹی کے متعلق جو رپورٹ ہم نے پچھلے سال دی تھی اس کے بعد اس سوسائٹی میں نمایاں اور قابل ذکر ترقی ہوئی ہے۔ اس سال اوکھلا گاؤں کے کاشتکاروں، بھینسیں پالنے والوں اور دوسرے پیشہ وروں کو ۳۵ ہزار روپے کی رقم دلائی گئی۔ اس رقم کی قسطیں وصول ہو رہی ہیں اور امید ہے کہ ستمبر کے آخیر تک کل روپیہ وصول ہو جائے گا اور ہم دوبارہ اس رقم کو ضرورت مند ممبروں میں تقسیم کر سکیں گے۔ اس سال اس سوسائٹی نے تقریباً چار ہزار روپے کا کیمیاوی کھاد آس پاس کے علاقے کو سپلائی کیا۔ اس سال سے کاشتکاروں کی ضرورت کی دوسری چیزیں مثلاً بیج، ٹین کی چادریں وغیرہ سپلائی کرنے کا انتظام بھی سوسائٹی ہی کرے گی۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ سینٹرل گورنمنٹ ڈیری ڈیولپمنٹ کے لئے جو قرض دیتی ہے، وہ بھی اس سوسائٹی کو مل جائے اور اس کے ممبر اس مزید رقم کے سہارے اپنے کاروبار کو بڑھا سکیں۔ اس کے لئے ۲۴ ہزار روپے کے قرض کی درخواست کوآپریٹیو ڈیپارٹمنٹ کو بھیج بھی دی گئی ہے۔

اوکھلا ویجیٹیبل گروئنگ سوسائٹی اس سوسائٹی نے تقریباً ۱۸۰۰ روپے کے سبزی کے دیسی اور ولائتی بیج اپنے ممبران میں دہلی اسٹیٹ ریجنل فیڈریشن کی معرفت خرید کر سپلائی کئے۔ اس میں خاص طور پر قابلِ ذکر ولائتی گوبھی کا بیج ہے جس کی قیمت بازار میں ۱۲۰ روپے سے ۱۵۰ روپے فی پونڈ تک تھی لیکن اس سوسائٹی کی معرفت یہ بیج کسانوں میں ۸۰ روپے فی پونڈ کی درسے سپلائی کیا گیا۔

اوکھلا فشرمین کوآپریٹیو اس سوسائٹی کے ساتھ ہم پہلے ہی سے کام کر رہے ہیں۔ ان کی مشکلات میں برابر ساتھ رہتے ہیں مچھلی پکڑنے والوں کو لیسنس دلانے کے سلسلہ میں منسٹری آف فوڈ دہلی اور یو۔ پی گورنمنٹ سے ہم برابر خط و کتابت کرتے رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ منسٹری آف فوڈ نے دہلی ایڈمنسٹریشن کی معرفت ہم سے ان تمام ممبران کی فہرست منگائی ہے جن کو اس سے پہلے لائسنس دیئے گئے تھے۔ امید ہے کہ ان کو شکار کھیلنے کے لئے اب آسانی سے لائسنس مل جائیں گے اور یہ لوگ خوش حالی سے زندگی بسر کر سکیں گے۔ اس پیشے کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ بیکاری کے زمانے میں سوسائٹی کے ممبروں کے لئے کچھ جزوی آمدنی کی صورت نکالی جائے۔ اس کے لئے دہلی اسٹیٹ فشریز ڈیپارٹمنٹ سے کوشش کر کے اس سال جال سے مچھلی پکڑنے کے ٹھیکے دلائے گئے ہیں جس پر یہ لوگ آجکل کام کر رہے ہیں۔

اوکھلا پولٹری کوآپریٹیو سوسائٹی ۔ اس سوسائٹی کا کام پچھلے سال کے مقابلے میں آگے نہیں بڑھا ہے۔ اس سال نئے

پہلے سے بھی نہیں خریدے جاسکے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایک ماجلا پولٹری فارم بنانے کی تجویز زمین نہ ملنے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی، اور دوسرے اس کے عہدہ داروں کے درمیان تعلقات بھی اچھے نہیں ہیں۔ یہ کام بہرحال کرنے کا ہے اور ان کی طرف سے ہم بے خبر نہیں ہیں۔

مسیح گڈھ بستی کا مسئلہ

مسیح گڈھ بستی کا ذکر ہم نے پچھلی رپورٹ میں کیا تھا کہ وہاں کے لوگ زمینوں کے نکل جانے کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ یہاں کے عیسائی مشن اور کسانوں کے درمیان اس قدر جھگڑا تھا کہ روز روز کی فوجداری سے فریقین تنگ آگئے تھے۔ عدالت نے مسیح گڈھ کے باشندوں کو زمین سے بے دخل کرنے کا فیصلہ کر دیا تھا۔ دوسرے فریق نے ان کسانوں کو روزمرہ کے جھگڑوں میں اس قدر الجھایا تھا کہ اچھے اور ذمہ دار لوگ اس معاملے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ہم نے پچھلے سال اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور گاؤں کے لوگوں کو ساتھ لے کر جمہوری طریقوں سے ان کے معاملات کو پبلک، حکومت اور پریس کے نمائندوں کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ پہلے اس معاملہ کو خاصا مذہبی رنگ دیا جا رہا تھا اور اس کی وجہ سے معاملہ دشوار ہو گیا تھا۔ آریہ سماج جو اس گاؤں میں کام کر رہا تھا ہم نے سب سے پہلے اس کے کارکنوں سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے کو مذہبی بحث سے خارج کر دیں۔ گاؤں والوں نے اس میں ہمارا ساتھ دیا اور اس طرح اس معاملے پر جو مذہبی رنگ چڑھا ہوا تھا وہ اتر گیا اور اصل کیس سامنے آگیا۔ اب ہم نے دہلی فارمرز فورم کو ساتھ لے کسانوں کی ضروریات کے روپ میں اس معاملے کو آگے بڑھایا۔ دہلی پبلک ریلیشن کمیشن کے چیرمین دہلی فارمرز فورم اور دوسرے اداروں نے اور پریس نے ہمارا ساتھ دیا۔ روز مرہ کے جھگڑے ختم ہو گئے۔ جن معاملات میں کسان خواہ مخواہ الجھے تھے، وہ ختم ہو کر اصل معاملہ کی طرف کام شروع ہوا اور ۲ سال کی متواتر کوششوں کے بعد بغیر کسی جھگڑے فساد کے کسانوں کو کامیابی کی امید نظر آئی۔ ابھی ایک میٹنگ میں پبلک ریلیشن کمیٹی کے چیرمین نے کسانوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ مسیح گڈھ کے لوگ زمین سے بے دخل نہیں کئے جائیں گے۔ اس پر لوگوں کو اطمینان نصیب ہوا ہے اور ہمارے کام سے لوگ بہت مطمئن ہیں۔ دہلی کرشنک سماج اور دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے ہمارے کاموں سے واقف ہیں اور وقت پڑنے پر ساتھ بھی دیتے ہیں۔

ٹیلی وژن پروگرام

یہ تجربہ ہندوستان میں پہلی بار کیا جا رہا ہے اور اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے مختلف اداروں میں ٹیلی وژن سیٹ

گئے ہیں شاہدرہ بلاک کے بی۔ ڈی۔ او اور آل انڈیا ریڈیو کے اصرار پر ادارہ تعلیم و ترقی کی طرف سے ہم نے بھی ایک سیٹ کی ذمہ داری لی ہے۔ اس تجربے کے سلسلے میں ہر سینٹر پر ایک ٹیلی کلب بنایا گیا ہے جس میں آس پاس کے علاقے کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس کلب کا معمول یہ ہے کہ ہر پروگرام سے متعلق ہفتے میں دوبار اپنی رائے سے آل انڈیا ریڈیو کو مطلع کرتا ہے ہمارے کلب کے ممبروں میں خواتین، مرد، گاؤں اور دوسرے علاقوں کے نمائندے سب شامل ہیں۔ پروگرام دیکھنے کے لئے آس پاس کے تقریباً چار گاؤں کے بچے، بالغ، عورتیں اور مرد سب آتے ہیں، یہاں تک کہ گاؤں اور بعض اوقات شہر کی برقعہ پوش عورتیں بھی اس میں شریک ہوئی ہیں اور ان کے تاثرات ہمیں معلوم ہوتے رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو والوں کا کہنا ہے کہ جامعہ کا ٹیلی سینٹر دہلی کے چند بہترین سینٹروں میں سے ہے۔

پہلے پہل جب یہ سیٹ ہمیں دیا گیا تھا اس وقت یہ کہا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن ہمارے یہاں پروگرام دیکھنے والوں کی تعداد ۲۰۰ اور ۲۵۰ کے درمیان ہوتی ہے۔ اس سال ہم نے ۸۲ پروگرام دکھانے کا انتظام کیا۔ اس کے علاوہ ملک میں جب بھی باہر کے خصوصی مہمان آتے ان کا پروگرام بھی ٹیلی ویژن سیٹ پر دکھایا گیا۔ اسی طرح ۲۶ جنوری کا پروگرام بھی ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔ اس کے علاوہ اس سیٹ پر نویں جماعت کے بچوں کی تعلیم کا انتظام چھ ہفتے کیا جا چکا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو نے ٹیلی ویژن پروگرام کے لئے ہمارے کلب کے ممبروں کو اور اسٹاف کے دو ساتھیوں کو بھی جامعہ سے بلایا۔ سیٹ کو ہمارے آدمی خود چلاتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ۲ کارکنوں اور ایک چپراسی کو آل انڈیا ریڈیو پر ۲ دن کی ٹریننگ دلائی گئی ہے۔ جناب چترسیج صاحب کارکن شعبہ تصنیف و تالیف انتہائی شوق اور محنت سے سکریٹری کے فرائض شروع ہی سے انجام دے رہے ہیں۔

<u>اوکھلا کمیونٹی سینٹر</u>۔ اگرچہ ہم اپنے وسائل کی کمی کی وجہ سے اس سینٹر کا ارادہ ترک کر چکے تھے تاہم جائزہ کمیٹی کی سفارش کی بنیاد پر اور اس وجہ سے بھی کہ تعلیم و ترقی کی کمیونٹی سینٹرس کی تنظیم کے بارے میں شہرت رہ چکی ہے، ہم نے سوچا کہ زیادہ نہیں تو کم از کم ایک سینٹر ضرور قائم کرنا چاہیے۔ چنانچہ اس سال جون میں ہم نے اس کام کو پھر اوکھلا گاؤں میں شروع کیا ہے اور دو کارکن اس کام پر لگائے ہیں۔ پہلے تو گاؤں کا ایک سروے کیا گیا اور پھر باقاعدگی سے سینٹر چلنے لگا۔ ابھی کام ابتدائی حالت میں ہے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ یہ ایک نمونے کا سینٹر بن جائے اور ان لوگوں کے لئے ایک مثال ہو جو یہ کہتے ہیں کہ دیہات میں کمیونٹی سینٹر نہیں قائم کیا جا سکتا۔

متفرق کام

مندرجہ بالا کاموں کے علاوہ ہم نے اس سال دہلی فارمرز فورم کے ساتھ مل کر کسانوں کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ یہ

کانفرنس کسانوں کے مسائل کو حل کرنے سے متعلق تھی۔ اس پر تقریباً بارہ سو روپے خرچ ہوئے تھے جسے کسانوں نے خود چندہ کر کے برداشت کیا۔ اس کانفرنس میں دہلی کے مقامی لیڈروں کے علاوہ جناب پی۔ این دآتار صاحب منسٹر ہوم منسٹری نے شرکت کی اور اس کا بہت اچھا نتیجہ برآمد ہوا۔

اس سال تعلیمی میلے کے موقع پر ہم نے ایک ڈراما پیش کیا۔ دنگل کا انتظام کیا اور دہلی کوآپریٹیو انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ مل کر کوآپریٹیو ہفتے کا افتتاحی جلسہ جامعہ میں منعقد کیا جس میں دہلی کے مقامی کارکنوں کے علاوہ جناب مرارجی ڈیسائی صاحب وزیر خزانہ حکومت ہند، شریمن نرائن صاحب ممبر پلاننگ کمیشن نے بھی شرکت فرمائی تھی۔

بلاک ڈیولپمنٹ کے ساتھ مل کر اس سال ہم نے وکاس میلہ منعقد کیا۔ شاہدرہ بلاک کے تمام گاؤں سے لوگوں نے اس میں شرکت کی اور میلہ بہت کامیاب رہا۔ اس سال امریکہ کے کسان ہندوستان آئے۔ ان کو ہم نے ادارے میں مدعو کر کے مقامی کسانوں سے ملایا۔ امریکی اور ہندوستانی کسانوں کی یہ ملاقات دو تین گھنٹے تک نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز رہی۔

اس سال جمنا پار فروٹ اینڈ ویجیٹیبل شو جامعہ میں منعقد کیا گیا۔ دہلی کے تمام گاؤں نے اس میں حصہ لیا۔ اس تقریب میں دہلی کے افسران کے علاوہ جناب ڈپٹی ایگریکلچر منسٹر صاحب بھی تشریف فرما تھے۔

نتیجہ

ہماری رپورٹ سے ظاہر ہوگا کہ ہم نے جتنے بھی کام کئے ہیں وہ بیشتر ایسے ہیں جو ہم نے دوسرے اداروں کے ساتھ مل کر کئے ہیں۔ اس سے دو باتیں ذہن میں آتی ہیں: ایک یہ کہ ہم دوسروں کو مدد دینے اور دوسروں کی مدد لینے میں کامیاب رہے اور اس طرح دیہات کے لوگوں کو ہماری ناچیز خدمات سے فائدہ پہنچا ہے۔ دوسرے یہ کہ شاید ہم خود اکیلے کسی کام کو کرنے کے لائق نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم دوسروں کا سہارا لیتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اول تو ہمارے وسائل ایسے نہیں ہیں کہ بڑے بڑے کام جن میں زیادہ روپیہ اور وسائل کی ضرورت ہے خود کر سکیں۔ دوسرے اب ملک کے بیشتر حصوں میں کمیونٹی پروجیکٹ کی اسکیم نافذ ہے۔ اس کے علاوہ ترقی کے جتنے بھی کام ہیں ان کو حکومت نے خود سنبھال لیا ہے اور اب صورت حال یہ ہے کہ ہم بغیر حکومت کا سہارا لئے کوئی کام اپنے بل بوتے اور فیصلے پر نہیں کر سکتے۔ اسکیمیں سب حکومت کی ہیں؛ اور ہم سوشل ایجوکیشن کا کام کرنے والوں کا منصب یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ ان سے زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز طور پر کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ ہم اگر جامعہ کے لئے کوئی ڈیولپمنٹ بلاک الگ سے منظور کرا لیں اور اس پر ہمارا ہی کنٹرول ہو تب بھی ہم حکومت سے ہر قدم پر امداد لینے پر مجبور ہوں گے اور یہ کوئی بُری بات نہیں ہے۔ رہا سوال کریڈٹ کا تو اس پر آپس میں اچھے اچھے اداروں کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔ ہم تو اس اصول پر کام کرتے ہیں کہ کام اچھے سے اچھے طریقے پر ہونا چاہئے۔ کریڈٹ اس کا خواہ جامعہ کو ملے یا حکومت کو۔ حکومت کی طرف سے دیہات کی ترقی کے سلسلہ میں ہر ہر کام کے لئے امداد کے مواقع موجود ہیں مگر گاؤں کے لوگوں کو اس بات کا پتہ بھی نہیں چلتا چنانچہ وہ رقم یا تو خزانے میں واپس چلی جاتی ہے یا بااثر لوگ اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ہمارا اس سلسلے میں یہ کام ہونا چاہئے کہ حکومت جس قدر سہولتیں گاؤں کے لئے دیتی ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا گر گاؤں کے لوگوں کو بتا دیں۔

سوشل ایجوکیشن ڈے

دہلی

دہلی میں سوشل ایجوکیشن ڈے کے سلسلے میں چند سال سے "سوشل ایجوکیشن ویک" منایا جاتا ہے جو ۲۵ ر نومبر سے شروع ہو کر یکم دسمبر پر ختم ہوتا ہے۔ اس موقع پر دہلی ایڈمنسٹریشن کی طرف سے اس کا اہتمام سوشل ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ کرتا ہے۔ پورے ہفتے مختلف مقامات پر مختلف قسم کی تقریبیں منعقد کی جاتی ہیں مثلاً ڈرامے، فلم شو، جلسے جلوس، پربھات پھیریاں وغیرہ

اس سال اس تقریب کا افتتاحی جلسہ ۲۵ ر نومبر کو دہلی پبلک لائبریری میں منعقد ہوا جس میں وزارت تعلیم کے نئے سکریٹری شری پریم کرپال صاحب نے تقریر فرمائی جس میں موصوف نے سوشل ایجوکیشن کی تعریف بیان کرتے ہوئے ملک کے لئے اس کی اہمیت واضح کی۔

سوشل ایجوکیشن ڈے (یکم دسمبر) کا جلسہ علی پور جنتا کالج میں منعقد ہوا تھا جس میں تقریر کرنے کے لئے دہلی ایڈمنسٹریشن کے چیف کمشنر شری بھگوان سہائے کو دعوت دی گئی تھی۔ یہ جلسہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے اشتراک میں ہوا تھا اس لئے اس کی حیثیت "وکاس میلہ" کی ہو گئی تھی جو پورے چار دن تک جاری رہا۔ میلے میں ڈیولپمنٹ کے سلسلے کی نمائشیں بھی لگی تھیں جن میں چیف کمشنر صاحب نے خاص دلچسپی لی، یہاں تک کہ ان کی تقریر جو گیارہ بجے ہونے والی تھی کہیں ڈیڑھ بجے شروع ہو سکی۔ جلسے میں شرکت کے لئے جو لوگ وہاں موجود تھے چیف کمشنر صاحب کی اس دلچسپی سے بہت متاثر ہو رہے تھے حتی کہ انھیں بھوک پیاس کا بھی خیال نہیں رہ گیا تھا

شری بھگوان سہائے نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ گاؤں والوں کو ترقی کے کاموں میں دلچسپی نہیں ہے ان کا خیال صحیح نہیں ہے اس لئے کہ میں جہاں جہاں بھی گیا ہوں اور گاؤں والوں کو دیکھا ہے، ان کے چہروں پر اطمینان اور مسرت کی کیفیتیں نمایاں طور پر جھلکتی دیکھی ہیں۔

اس موقعے پر دلّی کے سوشل ایجوکیشن ڈائرکٹر شری نیکی رام گپتا نے "دہلی میں سوشل ایجوکیشن کی رفتار" کے عنوان سے ایک تعارف نامہ (بروشیور) بھی شائع کیا تھا جس سے اس سلسلے میں دہلی کے بارہ سال کے کام پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ (نامہ نگار تعلیم و ترقی)

لکھنؤ

لکھنؤ میں سوشل ایجوکیشن ویک دوسری دسمبر سے منایا گیا۔ اس تقریب کا اہتمام یہاں لٹریسی ہاؤس لکھنؤ نے کیا تھا۔ جہاں اس کی افتتاحی تقریب کی صدارت اُتر پردیش اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی نے کی تھی اور افتتاح ریاست کے ڈائرکٹر تعلیمات شری سی۔ این چک نے کیا تھا۔

ڈاکٹر رادھا کمل مکرجی نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اب زمانہ آگیا ہے جب ہمیں ملک سے ناخواندگی کو یک لخت ختم کر دینے کے لئے ایک تاریخ مقرر کر لینا چاہئے۔ آپ نے تجویز پیش کی کہ ۱۹۷۵ء تک ایسا ہو جانا چاہئے کہ ملک میں کوئی مرد یا عورت ناخواندہ نہ رہ جائے۔

اسی سلسلے میں موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ ناخواندگی کو ختم کرنے کی مہم کے لئے یونیورسٹیوں کے گریجوائٹوں کو آمادہ کرنا چاہئے ہندوستان کے پانچ لاکھ گاؤوں کے لئے جو اوہام پرستی، جہالت اور مایوسی کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں امید کا پیغام اگر لا سکتے ہیں تو وہ یونیورسٹیوں کے یہی نوجوان ہیں۔

اس مرکزی تقریب کے علاوہ سوشل ایجوکیشن ڈے کی تقریب اُن تمام اڈلٹ اسکولوں میں بھی منائی گئی جو لٹریسی ہاؤس کے اہتمام اور نگرانی میں چل رہے ہیں۔ (انڈین جرنل آف ایڈلٹ ایجوکیشن)

نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر

(۱)
چوتھے ٹریننگ کورس کی اختتامی تقریب

سنٹر کے چوتھے ٹریننگ کورس کے اختتام پر ۲۸ر دسمبر ۱۹۶۰ء کو ۴ بجے سہ پہر میں اس کی آخری تقریب منعقد ہوئی اس موقعے پر طلبا، کو خطاب کرنے کے لئے نیشنل پلاننگ کمیشن کے ایڈیشنل سکریٹری شری ترلوک سنگھ آئی۔ سی۔ ایس تشریف لائے تھے۔ شری ترلوک سنگھ نے اپنے خطاب میں بڑی دور رس اور فلسفیانہ باتیں کہیں اور منجملہ اور باتوں کے یہ بھی فرمایا کہ "میں کچھ اس طرح بھی سوچتا ہوں کہ اگر سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں کچھ علمی اور تعلیمی رنگ ہوتا تو ملک کے ممتاز تعلیمی ادارے اسے اپنے ہاں یقیناً جگہ دیتے، ورنہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے اونچے تعلیمی ادارے اس کی طرف سے بے نیاز رہے ہیں اور اب تک ہیں"۔ شری سنگھ کے خطاب سے پہلے سنٹر کے ڈائرکٹر محترم اے۔ آر۔ دیش پانڈے نے ایک مختصر سی رپورٹ پڑھی جس میں آپ

نے سنٹر کے قیام کے اغراض و مقاصد اور اس کے مختلف کاموں کا تعارف کراتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ "عملاً فنڈامنٹل ایجوکیشن اور سوشل ایجوکیشن ایک ہی چیزیں ہیں۔ لہٰذا واقعے کے اعتبار سے نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر دراصل نیشنل سوشل ایجوکیشن سنٹر ہے اس کے لئے فنڈامنٹل ایجوکیشن کا لفظ اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ وہ تعلق ظاہر ہو جائے جو سوشل ایجوکیشن کو فنڈامنٹل ایجوکیشن کے بین الاقوامی تصور سے ہے۔ اب یو۔ این۔ او میں "کمیونٹی ڈیولپمنٹ" کے عنوان سے چونکہ ایک نئے موضوع کو اختیار کیا جانے والا ہے اس لئے یونیسکو فنڈامنٹل ایجوکیشن کے بجائے اڈلٹ ایجوکیشن کی اصطلاح کو اختیار کرنے کی بات سوچ رہا ہے۔ اس تبدیلی کے نتیجے کے طور پر ممکن ہے اس سنٹر کا نام بدل کر نیشنل سوشل ایجوکیشن سنٹر رکھنے کی ضرورت پیش آئے۔"

آخر میں شری دیش پانڈے نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس معاملے میں بھی خیالات میں اختلاف ہے کہ ڈیولپمنٹ بلاکوں میں جو سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کام کرتے ہیں، ان کے ذمے کیا کام کیا جائے۔ ایک عرصے تک یہ چرچا رہا کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو صرف کمیونٹی آرگنائزیشن کا کام دینا چاہیے۔ اب یہ سننے میں آرہا ہے کہ بلاک کے اندر سوشل ایجوکیشن آرگنائزر اور پنچایت انسپکٹر کے کاموں کو ملا دیا جائے۔ یہ خیال بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے اور اس کے بارے میں بڑی مستعدی کے ساتھ سوچ بچار ہو رہا ہے۔ اگر یہ خیال عمل کی صورت اختیار کر گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے اوپر جو پہلے ہی سے کاموں کے بارسے لدا ہوا ہے پنچایتوں کی تنظیم اور نگرانی کا بوجھ بھی آن پڑے گا۔ اس مزید بوجھ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سوشل ایجوکیشن کی طرف سے لاپروائی برتی جانے لگے گی۔ ان حالات میں اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے سابقہ تصور کی معنویت کو برقرار رکھنے اور اس جامع پروگرام کو انجام دینے والے کارکن کی حیثیت کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے کی جم کر کوشش کی جائے۔"

یہ سنٹر اب تک ۶۷ ڈسٹرکٹ سوشل ایجوکیشن افسروں کو ٹریننگ دے چکا ہے جن میں ۱ خواتین بھی شامل تھیں آخری گروپ میں ۱۲ افسر شامل تھے جن میں دو خواتین بھی تھیں۔ اس گروپ میں سب سے زیادہ نمایاں کامیابی میسور سے آئی ہوئی مس وشالاکشی تھیں جنھیں ایک کتاب کی شکل میں اول آنے کا انعام بھی ملا تھا۔ (نامہ نگار تعلیم و ترقی)

(۲)
سنٹر کے نئے ڈائرکٹر

یکم جنوری ۱۹۶۱ء سے سنٹر کے ڈائرکٹر شری اے۔ آر۔ ڈیش پانڈے کے ملازمت سے سبکدوش ہو جانے پر شری سوہن سنگھ جو وزارت تعلیم میں اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر (سوشل ایجوکیشن) تھے، ان کی جگہ ڈائرکٹر مقرر ہوئے ہیں۔

(نامہ نگار تعلیم و ترقی)

پرنٹر و پبلشر برکت علی فراق نے کوہ نور پریس، لال کنواں دہلی میں چھپوا کر ۱۰۰۔۱۰ تعلیم

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

فروری سنہ ۱۹۶۱ء

جلد ۱۲ ــــ شمارہ ۲

بانی :- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر :-

پروفیسر محمد مجیب
برکت علی فراق
رفیق محمد شاستری

دفتر :- ماہنامہ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر، نئی دہلی

قیمت

سالانہ چار روپے — فی پرچہ ۳۰ نئے پیسے

ٹیلیفون :- ۴۴۶۴۴

اشارات

افکار و مسائل

گاہے گاہے باز خواں

ادارہ تعلیم و ترقی سنہ ۱۹۶۰ء

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر برکت علی فراق نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

اشارات

سوشل ایجوکیشن کی آل انڈیا کاونسل

حکومت ہند کے تعلیمی مشاورتی بورڈ نے اپنی ۱۰ جنوری ۱۹۶۱ء کی نشست میں سفارش کی ہے کہ "سوشل ایجوکیشن" کی ایک آل انڈیا کاونسل بنائی جائے۔ اس سفارش کی تحریک غالباً اس بات سے ہوئی ہے کہ بورڈ کی ماتحت کمیٹی جو سوشل ایجوکیشن کمیٹی کے نام سے قائم ہے اس کا دستورِ عمل اب کچھ ایسا بن گیا ہے کہ اس کے اہتمام میں وہ کام انجام نہیں دیئے جا سکتے جو ایک کاونسل کی طرف سے کئے جا سکتے ہیں۔ تحریک کسی بات سے ہوئی ہو، یہ فیصلہ بہرحال مبارک ہے اور ہم اس وقت کے منتظر ہیں جب اس سفارش پر عمل ہوگا اور سوشل ایجوکیشن کی آل انڈیا کاونسل بن جائے گی۔

لیکن جہاں ہمیں اس کاونسل کی تشکیل کا انتظار ہے وہاں یہ معلوم کرنے کا بھی اشتیاق ہے کہ اس کاونسل کے کام کیا ہوں گے۔ اور اس کی حیثیت کیا ہوگی۔ سوشل ایجوکیشن کی تحریک میں ایک عرصے سے اس کے لئے ایک خودمختار بورڈ کے قیام کا چرچا ہے۔ کیا یہ آل انڈیا کاونسل اس مجوزہ خودمختار بورڈ کے بدل کے طور پر قائم کی جائے گی؟ اس کے فیصلے محض مشاورتی حیثیت کے ہوں گے یا کچھ اور؟ اس کے ممبروں میں سرکاری اور غیر سرکاری عناصر کا کیا تناسب ہوگا؟ اس کا قیام پارلیمنٹ کے ایکٹ کی بنیاد پر عمل میں آئے گا یا محض ضرورتاً اور مصلحتاً کہ آل انڈیا کاونسل آف سکنڈری ایجوکیشن کی طرح اسے ختم بھی کیا جا سکے؟ یہ باتیں ایسی ہیں کہ انھیں معلوم کرنے کی قدرتاً خواہش ہوتی ہے اور جب تک یہ نہ معلوم ہو جائیں اس وقت تک محض قیام کی سفارش کی اطلاع پر کوئی قطعی بات کہنا یا رائے دینا نہ مناسب ہے نہ آسان، سوائے اس کے کہ دعا کریں کہ اس کاونسل کا قیام سوشل ایجوکیشن کی تحریک کے لئے جو اس وقت چوراہے پر کھڑی پریشان ہے کہ کون سا راستہ اختیار کرے جو خضر راہ ثابت ہو اور اسے صحیح راستے پر ڈال دے۔

ایک اور ساتھی چل بسا

سوشل ایجوکیشن کی تحریک ۱۵ رفروری ۱۹۶۱ء کو اپنے ایک اور سرفروش کی خدمات سے محروم ہو گئی۔ دہلی پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر شری من موہن لال ٹنڈن جو ابھی زندگی کی صرف پینتالیس بہاریں دیکھ پائے تھے، ہارٹ اٹیک کے زیرِ اثر دلی کے ترتھ رام نرسنگ ہوم میں راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

شری من موہن لال ٹنڈن ان لوگوں میں تھے جو کام کو عبادت سمجھتے ہیں اور اس میں ایسے ڈوبتے ہیں کہ دن اور رات کی تمیز اٹھ جاتی ہے؛ کام ہی ان کا اوڑھنا بچھونا، دال روٹی ہوتی ہے، وہ کام سے پیچھا چھڑا کے نہیں کام کا پیچھا کر کے خوش ہوتے ہیں۔ دہلی پبلک لائبریری کتب خانوں کے منصب کے باب میں ایک نیا خیال لے کر قائم ہوئی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے شری من موہن لال ٹنڈن جیسے وارفتہ مزاج کارکن کی خدمات حاصل ہوئیں اور اس نے اپنا سکہ پورے جنوب مشرقی ایشیا میں جما لیا۔

شری من موہن لال ٹنڈن کی وفات اس اعتبار سے تحریک کے لئے ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی بڑی مشکل سے ہوگی۔ اب بہر حال یہ بات سوشل ایجوکیشن کی تحریک کو دیکھنی ہے کہ دہلی پبلک لائبریری جو ٹنڈن صاحب کی دیوانہ وار خدمت کی یادگار رہے نہ صرف قائم رہے بلکہ اپنی روز افزوں افادیت سے ان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھے۔

ہماری دعا ہے کہ ٹنڈن صاحب کی روح کو سکون ابدی نصیب ہو اور ان کے پسماندگان کو صبر و شکر کی توفیق اور حوصلہ۔

فارم نمبر ۴

(رول نمبر ۸ دیکھئے)

۱۔ اشاعت کی جگہ ـــــ جامعہ نگر نئی دہلی

۲۔ اشاعت کی مدت ـــــ ماہنامہ

۳۔ پرنٹر کا نام ـــــ برکت علی فراق
قومیت ـــــ ہندوستانی
پتہ ـــــ جامعہ نگر، نئی دہلی

۴۔ پبلشر کا نام ـــــ برکت علی فراق
قومیت ـــــ ہندوستانی
پتہ ـــــ جامعہ نگر، نئی دہلی

۵۔ ایڈیٹر کا نام ـــــ برکت علی فراق
قومیت ـــــ ہندوستانی
پتہ ـــــ جامعہ نگر نئی دہلی

۶۔ ان لوگوں کا نام اور پتہ جن کا اس اخبار میں حصہ ہے۔ ـــــ ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی

میں برکت علی فراق اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات میرے یقین میں درست ہیں۔

دستخط برکت علی فراق (پرنٹر) ۲۲ر فروری ۱۹۶۱ء

افکار و مسائل

اڈلٹ ایجوکیشن کسے کہتے ہیں

گذشتہ پرچے میں ہم نے "واپس اڈلٹ ایجوکیشن کو" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں یہ بحث کی گئی ہے کہ حالات و اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، سوشل ایجوکیشن کے معاملے میں خیالات الجھ گئے ہیں۔ یوں بھی سوشل ایجوکیشن کا نعرہ جن مصلحتوں کی بنیاد پر لگایا گیا تھا، وہ مصلحتیں اب باقی نہیں رہیں، سوشل ایجوکیشن سے جن خدمات کی امید کی گئی تھی اُن میں سے قریب قریب سب اب بڑے اور منظم پیمانے پر مہیا کر دی گئی ہیں۔ ان حالات میں سوشل ایجوکیشن سے اہل ملک کے بڑھے ہوئے حوصلوں کی تسکین بھی نہیں ہو سکتی۔

اس تجزیے سے آخر میں یہ نتیجہ نکالا گیا تھا کہ اب سوشل ایجوکیشن کا نعرہ چھوڑ کر ہمیں اڈلٹ ایجوکیشن کی طرف واپس لوٹ چلنا چاہئے تاکہ اس کے مفہوم اور منشا کے صاف اور واضح ہونے کی وجہ سے خیالات میں الجھاؤ پیدا نہ ہو اور بالغ عوام کی تعلیم کا کام سکون اور اطمینان کے ساتھ ہو سکے۔

اس مضمون کے مطالعے سے قدرتاً یہ سوال پیدا ہو گا کہ "پھر اڈلٹ ایجوکیشن کیا ہے جس کی طرف واپس لوٹ چلنے کی دعوت دی جا رہی ہے؟" زیرِ نظر مضمون میں اسی شبہے کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

——— ایڈیٹر

ہندوستان میں جس وقت اڈلٹ ایجوکیشن کے خیال کا رواج ہوا، اُس وقت ناخواندگی کا پہاڑ جیسا مسئلہ اس کے سامنے ایسا آن کھڑا ہوا کہ اس کے مفہوم کی وسعت اس پہاڑ کے سامنے دب کر رہ گئی، اور چونکہ حکومتِ وقت کی اُسے پشت پناہی حاصل نہیں تھی اس لیے وہ اس کے دامن ہی سے ٹکریں مارتی رہی۔ ظاہر ہے اس کوہِ گراں کے مقابلے میں اس تنہا کوشش کی کوئی حیثیت نہیں تھی چنانچہ مدتوں ٹکریں مارتے رہنے کے باوجود یہ پہاڑ تو جہاں تھا، وہیں رہا، البتہ اڈلٹ ایجوکیشن کی بے آبروئی خوب ہوئی یہاں تک کہ جب ملک آزاد ہوا اور آزاد حکومت نے اس فلک بوس پہاڑ کی طرف توجہ کی تو اڈلٹ ایجوکیشن اُسے بھی اُسی آبرو باختہ شکل میں نظر آئی اور حکومت نے اُسے کم قیمت شے سمجھ کر اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں۔ اور اس کے بجائے اپنے خیال میں اس سے زیادہ وسیع المعنیٰ

اور جامع اصطلاح "سوشل ایجوکیشن کے" نام سے ایجاد کی۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی اڈلٹ ایجوکیشن کی وہی شکل ہے جس میں وہ ناخواندگی کے خلاف اپنی ناکام کوشش کی وجہ سے ہمارے تعلیمی مفکروں کو نظر آتی تھی یا اس کا رنگ روپ کچھ اور ہے جو اس کی خستہ حالی کی وجہ سے نظر ہی نہیں آیا

پرائمری اور سیکنڈری ایجوکیشن کی کمی کی تلافی

سردار کے۔ ایم۔ پانیکر نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے کانپور کے اجلاس میں جو ۱۹۵۷ء میں منعقد ہوا تھا اپنے خطبۂ صدارت میں اڈلٹ ایجوکیشن کے زیرعنوان کہا تھا:۔

"ابتدائی تعلیم ہر جگہ، حصول تعلیم کا بہت معمولی درجہ کا ساز و سامان بہم پہنچاتی ہے۔ مگر ہندوستان میں ثانوی منزل کی تعلیم کا بھی قریب قریب یہی معیار ہے۔ ان حالات میں یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ ہم اپنے یہاں اڈلٹ ایجوکیشن کا ایک ہمہ گیر نظام قائم کریں تاکہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے حصول علم کا جو ساز و سامان حاصل ہوتا ہے اس کا استعمال کارآمد طریقہ پر کیا جاسکے۔

"میرے نزدیک ایڈلٹ ایجوکیشن کا منشا بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں کو خواندہ بنانا ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ ان لوگوں کو، جنھوں نے ابتدا میں کچھ تعلیم پائی تھی اور اب ازسرنو ناخواندہ ہوئے جارہے ہیں، یا جنھوں نے مقامی طور پر کچھ ترقی کرنے کے موقعے حاصل کرلئے ہیں۔ مگر تعلیم کی کمی کی وجہ سے آگے نہیں بڑھ پارہے ہیں۔۔۔ ان لوگوں کو مزید تعلیم کا موقع فراہم کرنا ہے۔"

تعلیم کے تسلسل کا نظریہ بیان کرتے ہوئے سردار صاحب نے آگے چل کر فرمایا تھا

"اس طرح کے تسلسلی کورس صرف انھی لوگوں کے لئے ضروری نہیں ہیں جنھوں نے اسکول کی تعلیم پانے کے بعد تعلیم کا سلسلہ ترک کردیا تھا اور اعلیٰ تعلیم کے فیض سے بہرہ اندوز نہیں ہوسکے تھے، بلکہ ان سے زیادہ یہ ان لوگوں کے لئے بھی ضروری ہیں جو معقول حد تک تعلیم پاچکے ہیں اور اور مختلف حیثیتوں سے سماجی زندگی میں سرداری اور پیشوائی کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ دراصل ہم سب کو ضرورت ہے کہ آپس میں خیالات کا تبادلہ ہوتا رہے۔ جو باتیں اور عقیدے دماغ میں راہ پاگئے ہیں، ان کی جانچ ہوتی رہے، آدرشوں اور نصب العینوں میں تازگی پیدا ہوتی رہے، اور اس طرح ہمارے دماغ تازہ دم اور جوان ہوتے رہیں۔ ایک لمحے کے لئے کچھ عرصہ پیچھے کی طرف مڑکر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس

وقت ہم نے یونیورسٹیاں چھوڑی تھیں، اس وقت ہم میں سے اُن باتوں کا کسی کو علم نہیں تھا جن پر آج ہم فخر کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان تعلیمی اداروں نے جہاں ہم نے تعلیم پائی تھی، ہمیں علم و تہذیب کے خزانے کی صرف کنجی دی تھی، اس کے بعد اگر ہم کامیاب یا ناکام ہوئے تو اس کا سبب یہ تھا کہ ہم نے علم و تہذیب کے اس خزانے کو کھولنے میں اس کنجی سے کام لیا یا نہیں لیا۔ یہ ہے میرے خیال میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعلیم کی اصل روح۔

"پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ انسان کی اصل تعلیم اُس وقت شروع ہوتی ہے جب دماغ پختہ ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے محض گُر سکھائے جا سکتے ہیں۔ اب سے بہت پہلے یہی بات ارسطو نے کہی تھی۔ "کچی عمر کے نوجوان سیاسیات کی طالب علمی کے لئے موزوں نہیں ہوتے اس لئے کہ انھیں زندگی اور اُس کے آداب کا تجربہ نہیں ہوتا" اسی نظریئے کا اطلاق اُس نے فلسفے کی تعلیم کے بارے میں بھی کیا تھا۔ اور اگر آپ ذرا اِس واقعے پر غور کریں کہ شعر و ادب کا شعور زندگی کی مختلف منزلوں میں مختلف درجے کا ہوتا ہے تو ہم اور آپ خود اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ علوم انسانی (HUMANITIES) کا مطالعہ محض سنِ شعور ہی کو پہنچ کر ہو سکتا ہے۔ اسکول اور یونیورسٹیاں اس باب میں زیادہ سے زیادہ دماغ کی ٹریننگ کر سکتی ہیں جسے اگر آگے کی عمر میں استعمال کیا جائے تو وہ بہت فائدہ مند رہتی ہے اس اعتبار سے تسلسلی تعلیم ہی ایک طریقۂ کار ہے جس کے ذریعے وہ محنت اور سرمایہ جو کسی قومی نظامِ تعلیم پر صرف ہوتا ہے، کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔"

پکی عمر میں تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت جس کی طرف اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے اس کا اندازہ ایک انگریز مصنف باسِل اے۔ ایکسلی کی حسب ذیل بات سے بھی ہو گا جو اس نے اپنی کتاب (AN EDUCATED NATION) میں بڑوں کے لئے تعلیم بالغان کی ایک ہمہ گیر تحریک کی حمایت کرتے ہوئے لکھی ہے:

"...... اس اعتبار سے اڈلٹ ایجوکیشن کا منصب کسی معنی میں ابتدائی تعلیم کی کمیوں یا سکینڈری اور یونیورسٹی ایجوکیشن سے محرومی کی تلافی کرنا نہیں ہے۔ کانٹی نویشن اسکول (تسلسلی تعلیم) کی اسکیم کو کتنا ہی جامع اور ہمہ گیر کیوں نہ بنا دیا جائے۔ جس کے ماتحت لڑکوں اور لڑکیوں کو اٹھارہ سال کی عمر تک ان اسکولوں میں جُز وقتی طور پر تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے ـــ اڈلٹ ایجوکیشن کی ضرورت ختم نہیں ہو سکتی۔ اڈلٹ ایجوکیشن کا اصل راز یہ ہے کہ واقعات و نظریات کے معاملے میں جو پہلے سے

معلوم ہوں یا آگے چل کر سامنے آئیں؟ انسان کا نقطۂ نظر نابالغی کی زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے وہی بلوغت کی زندگی میں نہیں ہوتا بلکہ بالغ زندگی کے تجربات کی روشنی میں ان کی حیثیت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ نابالغی کی زندگی میں علم تو حاصل ہو جاتا ہے مگر دانائی اس وقت تک نہیں آپاتی جب تک فیصلہ کرنے کی قوت اور سوجھ بوجھ میں پکا پن نہ آجائے اور اس کی عملی مشق نہ ہو جائے صحیح یا عملی تعلیم طالب علم کو اصول و قواعد رٹا دینے یا اس کے دماغ کو واقعات و حقائق سے بھر دینے کا نام نہیں ہے۔ صحیح اور عملی تعلیم نام ہے طالب علم کی مختلف قوتوں —— قوتِ مُمیّزہ، پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی قوت، فیصلہ کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی قوت کو بیدار کرنے کا تاکہ جس وقت وہ عملی زندگی میں قدم رکھے اور اس کی ذمّے داریوں کو اُٹھائے، اس وقت اس کے سامنے جو بھی صورت حال واقع ہو، اس سے وہ کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکے اور اس قابل ہو کرنئے سے نئے حالات و واقعات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکے۔ اس طرح وہ پہلے سے ڈھلے ڈھلائے کسی عزم و ارادے پر کاربند نہیں ہوتا بلکہ اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو فوراً تیار کرے۔ غرض عملی تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ بالغ بھی ہو اور وسیع بھی؛"

تریب قریب اسی طرح کا نظریہ اڈلٹ ایجوکیشن کا دوسرا انگریز ماہر رابرٹ پی ارس نے بھی ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

"غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بعض علوم کا مطالعہ تعلیم کی اُس منزل میں مناسب ہوتا ہے جب طالب علم بالغ ہوتا ہے جب آدمی بلوغت کی عمر میں قدم رکھتا ہے تو شخصی حوصلے اور جواں سالی کے جذبات کے طوفان میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ اُس وقت مذہب و اخلاق، سیاست و معیشت، غرض ہر اُس چیز میں جو روزانہ کی زندگی میں اثر انداز ہوتی ہوتی ہے۔ نئی نئی باتیں اور قدروں کا ایک نیا شعور سامنے آتا ہے۔ اکثر اوقات جواں سالی کے زمانے کا اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور وہ شکست طلسم اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے اس کی آنکھیں کھل چکی ہوتی ہیں اور وہ مسائل کی یلغار میں اپنے آپ کو تنہا اور بے سہارا محسوس کرنے لگتا ہے۔ تعلیم بالغان کا منصب ہے زندگی کے میدان کے ان نو واردوں کی اس آزمائش میں مدد کرنا اور مدد اس طرح کہ وہ خود اپنی کوشش سے اپنے لئے ایک واضح مقصد حیات جو نئے اور وسیع تر مطالعے پر مبنی ہو، متعین کریں۔ کائنات میں اپنا مقام تلاش کریں

اور ایک ایسا فلسفہ ڈھونڈ نکالیں جو انھیں انفرادی واجتماعی دونوں حیثیتوں میں زندگی کے
مسائل کو حل کرنے کا اہل بنا دے۔"

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے لئے ایک کامیاب اور مطمئن زندگی گذارنے میں اس کی وہ تعلیم اتنی کار آمد ثابت نہیں ہوتی جتنی وہ تعلیم جو وہ زندگی میں قدم رکھنے کے بعد حاصل کرتا ہے اور یہ تعلیم ظاہر ہے، اڈلٹ ایجوکیشن ہی ہو سکتی ہے۔

مہارت خصوصی کے تقاضوں کی تکمیل

یہی مصنف (رابرٹ پی ارس) اڈلٹ ایجوکیشن کے مقصد ومنشا پر بحث کرتے ہوئے ایک دوسری جگہ لکھتا۔

"یہ دور مہارت خصوصی کا دور ہے جو صرف معاشی سرگرمیوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ علم کی ہر شاخ میں اس کا چلن ہو گیا ہے۔ علم کی اس وسعت کو دیکھتے ہوئے کیا یہ ممکن ہے کہ جماعت کے ہر فرد کو جو معقول معیار کی تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، یہ یقین دلایا جا سکے کہ اُسے عملی زندگی میں قدم رکھنے کی منزل سے پہلے پہلے اس معیار کی تعلیم مل جائیگی؟ تعلیم میں بہت آگے کی بات تو دور رہی۔ وہ لوگ بھی جو ثانوی منزل کو پار کرکے یونیورسٹی یا کالج میں داخلہ لیتے ہیں۔ انھیں بھی علم کی ایک مقررہ سمت ہی کی طرف اپنی توجہ کو مرکوز کرنا پڑتا ہے خاص کر ایسی حالت میں جب کہ اُن کا اوّلین مقصد اپنے آپ کو کسی پیشے کے لئے تیار کرنا ہو۔ اسکول یا کالج سے نکلنے کے بعد جب آدمی کام پر لگ جاتا ہے تو ابتدائے ملازمت کی مصروفیتیں اُسے اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ اپنے مخصوص ذوق کی تسکین کا کچھ سامان کر سکے البتہ جب ان مصروفیتوں کی شدت میں کمی واقع ہوتی ہے اُس وقت کہیں جا کر وہ علم اور فن کے وسیع تر میدانوں کی طرف توجہ کرتا ہے۔ غرض تعلیم کی ضرورت صرف بدنصیب طبقے ہی کو نہیں ہے بلکہ سب کو ہے اور تعلیم بالغان کو ان سب کی ضرورتیں پوری کرنی ہوتی ہیں۔"

"یہ صورت حال تعلیم بالغان کے ایک اور اہم مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ تعلیم کی ابتدائی منزلوں میں علم چند غیر مربوط "مضامین" کی شکل میں طالب علم کے سامنے آتا ہے ان مضامین کی تحصیل کے دوران میں علم کے الگ الگ تار، ہو سکتا ہے، بہت وسیع حدوں کو چھو لیں لیکن

ان سب کے میل سے علم کی جو شکل بنتی ہے، وہ اُسی وقت ظاہر ہو سکتی ہے جب ان تاروں کو ملا کر بٹ دیا جائے اور تجربے کے تانے بانے سے ایک ذات کر دیا جائے۔

"بہت سے لوگ جنھیں اپنے خصوصی علوم کا ماہر کہا جاتا ہے کچھ عجیب بے فیض سے ہوتے ہیں ان کی یہ بے فیضی اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں مختلف علوم کو سمونے میں ناکام رہتے ہیں۔ ہر شخص کے دماغ میں خیالات کا ایک فطری نظام ہوتا ہے۔ جو علم اس نظام خیالات میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتا، وہ فرد کے لئے بیکار محض ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے اڈلٹ ایجوکیشن کا اصل رشتہ علم کی مختلف شاخوں کے باہمی تعلق سے ہونا چاہئے۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد میں اُسی وقت کامیابی ہو سکتی ہے جب علوم کے اس "کل" کی اہمیت پر زور دیا جائے۔"

بوڑھوں اور جوانوں کے درمیان مفاہمت

یہی مصنف اڈلٹ ایجوکیشن کو انحطاط پذیر اور جواں سال نسلوں کے درمیان پُل کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "اڈلٹ ایجوکیشن اِن پریکٹس" میں لکھتا ہے:

"تعلیم بالغان کا ایک اور پہلو ہے جو عہدِ جدید میں علم کی ترقی کی تیز رفتاری اور تیزی سے بدلتے ہوئے معیاروں کی روشنی میں دیکھئے تو بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک نسل پختگی کی عمر کو پہنچ جاتی ہے تو دوسری اُسی راستے پر چلتی ہوئی، مگر اس کے مقابلے میں علم کے وسیع تر مواقع سے بہرہ اندوز ہوتی ہوئی زندگی میں داخل ہو رہی ہوتی ہے۔ نیا علم اور نئی قدریں عہدِ ماضی کے قائم کئے ہوئے رسم و رواج اور روایات و اقدار کو خاطر میں نہیں لاتا اور اس وجہ سے وہ لوگ جن کے سوچنے کے طریقے میں لچک باقی نہیں رہ جاتی اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ جواں سال لوگ قدامت پسندی کو جوان کے سامنے اپنا جواز ثابت نہیں کر سکتی جھیلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں نسلوں کے درمیان ناچاقی اور غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ چیز ایسی ہے جو تعاون و اشتراک اور ترقی کے منظّم و مرتّب منصوبوں کو ناممکن بنا سکتی ہے۔ اس صورت حال کا علاج صرف اسی طرح ممکن ہے کہ تعلیم کو ایک کبھی نہ ختم ہونے والے عمل کی حیثیت دی جائے تاکہ سن رسیدہ

نسل کے لوگ علم کے معاملے میں نئی نسل کے دوش بدوش رہ سکیں اور تجربہ اور علم باہم شیر و شکر ہوکر جماعت کو اونچے سے اونچے مقامات پر پہنچا دیں۔"

اڈلٹ ایجوکیشن کا یہ منصب ہندوستان جیسے ملک کے لئے جہاں بڑے بوڑھوں کو گھر کا سردار مانا جاتا ہے خواہ عملی زندگی میں اُن کا کوئی کردار باقی نہ رہ گیا ہو، خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے کہ یہاں تو ابھی سماجی تنظیم کی وہ منزل نہیں آئی ہے ــــ اور نہ ابھی مستقبل قریب میں آنے کی امید ہے ــــ جب بڑوں بوڑھوں کو سماج سے خارج کرکے ان کے لئے دنیا ہی میں جنت بنادی جاتی ہے۔ میرا اشارہ ان اداروں کی طرف ہے جنھیں یورپ میں (OLD PEOPLEL'S HOME) کہا جاتا ہے اور جن کا چلن وہاں کے قریب قریب ہر ملک میں عام ہوگیا ہے۔

یہ تو ہے تعلیم بالغان کا مقصد و منشا، اس حیثیت سے کہ فرد کے لئے وہ زندگی کی تعلیم ہے، جس کی ضرورت اس وقت تک رہتی ہے جب تک خود زندگی باقی رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا ایک اچھی کامیاب اور مسرت بخش زندگی گذارنے کا فرد کو آرٹ سکھانا اڈلٹ ایجوکیشن کا منصب ہے۔

مگر فرد کی زندگی اُس وقت تک مکمل زندگی نہیں ہے جب تک اس کا رشتہ اس کے سماج سے نہ ہو۔ اور رشتہ وہ جس کے اثر سے فرد سماج کے لئے اور سماج فرد کے لئے قوت و حیات کا باعث بنتا ہے۔ آیئے اسی صحبت میں سرسری طور پر یہ بھی دیکھتے چلیں کہ اڈلٹ ایجوکیشن کا سماج کی نشو و نما میں کیا کردار ہوسکتا ہے۔ لیکن سماج اور تعلیم بالغان کی اس بحث کو اپنے مقصد کے پیش نظر جمہوری سماج تک محدود کرلینا چاہئے یعنی یہ دیکھنا چاہئے کہ جمہوری سماج میں اڈلٹ ایجوکیشن کا کیا کردار اور عمل ہو سکتا ہے، ورنہ بحث عملی سے زیادہ نظری رنگ اختیار کرلے گی اور ممکن ہے ہماری بحث کا مقصد فوت ہوجائے۔

اس باب میں بھی وہی انگریز مصنف مسٹر ہکسلی جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر آچکا ہے، لکھتا ہے:

> "تعلیم کا اصل مقصد انسان کو زندگی گذارنے کا اہل بنانا ہے اور اس اعتبار سے ایک مہذب سماج میں اس کا مقصد ہوا انسان کو اس قابل بنانا کہ اس سماج میں اس کا جو مقام ہے اس کا وہ اہل ثابت ہو۔
>
> "جمہوریت کی روح یہ ہے کہ سماج کا ہر فرد اس میں تماشائی کے روپ میں نہیں بلکہ کردار ادا کرنے والے کی حیثیت سے آگے بڑھ بڑھ کر حصہ لے۔ اس لحاظ سے ایک جمہوری سماج میں تعلیم کی توجہ صرف اسی طرف نہیں ہونی چاہئے کہ سماج کا ہر فرد اپنے شخصی خانگی اور پیشہ ورانہ فرائض کو انجام دینے کے قابل ہوجائے، بلکہ سب سے بڑھ کر یہ ہونی چاہئے کہ سماج کا ہر فرد شہریت کے فرائض کو انجام دینے کے قابل بن جائے جن کے لئے شخصی خانگی اور پیشہ ورانہ ذمے داریوں کی انجام دہی ابتدائی

حیثیت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر فرد کو جاننا چاہئے کہ (۱) جس قوم کا وہ فرد ہے، وہ کیا ہے، اس کی تاریخ اور اس کا ادب کیا ہے، اور آج کی دنیا کی اقوام میں اس کا کیا مرتبہ اور مقام ہے (۲) اس کا فرد ہونے کے رشتے سے قوم کی طرف سے اس کے اوپر کیا ذمے داریاں عاید ہوتی ہیں ــ یعنی قوم کے تحفظ اور بچاؤ کی تدبیروں میں حصہ لینے اور اس کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی کی ذمے داری اور اس سے آگے بڑھ کر اس کے اقدار و معیارات کو بحال رکھنے بلکہ ان میں اور زیادہ بلندی پیدا کرنے کی کوششوں میں مدد کرنے کی ذمے داری وغیرہ (۳) وہ اقتصادی سیاسی اور بین الاقوامی حالات کیا ہیں جن کے اوپر قوم کی خوشحالی اور قوت و حیات کا انحصار ہے۔"

رابرٹ پی ارس اس سلسلے میں لکھتا ہے:

"سماج کے اعتبار سے دیکھئے تو اڈلٹ ایجوکیشن کو ایک وسیلہ ہونا چاہئے۔ علم کی ان بنیادوں کو نسلاً بعد نسلٍ محفوظ رکھنے کا جس کے اوپر تہذیب کی عمارت کھڑی ہے۔ اسی کے ساتھ اسے نئے علوم کی کھوج لگانا چاہئے اور سماج کے اندر میل ملاقات اور سمجھنے سمجھانے کا ایک مشترک ماحول پیدا کرنا چاہئے۔

"تعلیم کا مقصد قدامت پسندانہ اور متحرک ہونا چاہئے (یعنی رفتار کو قابو میں رکھتے ہوئے آگے کو بڑھانا) اسے یوں سمجھئے کہ اگر ایک سماج کی تشکیل ایسی ہو کہ اس کی رو سے جماعت کے ایک بڑے طبقے کو تعلیمی ترقی کے مواقع سے محروم رکھا جانے جس کے نتیجے کے طور پر اچھی زندگی گذارنے کے امکانات سے بھی محروم ہو جائے تو تعلیم کا یہ بجا طور پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سماجی تنظیم کو سرے سے بدل دے تاکہ فرد کی نشوونما کے راستے میں اس موجودہ تنظیم کی وجہ سے جو رکاوٹیں حائل ہو گئی ہیں، وہ دور ہو جائیں۔"

اوپر کی سطروں میں ہم نے بیشتر صرف بیرونی مفکروں کی رائیں اور نظریئے پیش کئے ہیں مصلحت یہ ہے کہ ہم اڈلٹ ایجوکیشن کو انھی لوگوں کے خیالات کی روشنی میں دیکھیں جن کے یہاں سے ہم نے اُسے درآمد کیا ہے اور پھر فیصلہ کریں کہ اڈلٹ ایجوکیشن کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکنے کی ہم نے جو جدت کی ہے۔ اس میں ہم کہاں تک حق بجانب رہے ہیں۔

نوٹ۔ ہم کوشش کریں گے کہ اڈلٹ ایجوکیشن کے ان تصورات کی بنیاد پر جو کام ہو سکتے ہیں ان کا ایک مختصر سا خاکہ بھی ان صفحات میں پیش کیا جائے اور آئندہ اس کے اوپر بحث ہو۔ ایڈیٹر

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام میں گاؤں کے اسکولوں کا تعاون

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام گاؤں میں بیداری اور نئی امنگ اور حوصلہ پیدا کرنے کی ایک منظم اور مربوط کوشش کا نام ہے۔ اس کی تنظیم اور اس کے پروگرام کی موجودہ شکل ملک میں کئے گئے مختلف تجربوں کا نتیجہ ہے۔ یہ پروگرام ملک گیر منصوبہ بندی کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ اس کی ابتدا ابھی پہلے پنج سالہ پلان کے ساتھ کی گئی تھی۔ اس میں کچھ حد تک ہمیں گاندھی جی کے بنیادی اصولوں کی جھلک بھی مل جاتی ہے۔ پلاننگ کمیشن نے پہلے پنج سالہ پلان کے خاکے میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے بنیادی تصور کی وضاحت ان لفظوں میں کی ہے۔

"کمیونٹی ڈیولپمنٹ ایک طریقہ اور نیشنل ایکس ٹنشن اس کا وسیلہ ہے جن کے ذریعہ پنج سالہ پلان کے تحت گاؤں کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں تبدیلی لانے کا ایک عمل جاری کرنا ہے۔"

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ گاؤں کی جمہوری اور سہکاری انجمنوں کے تعاون سے گاؤں اور علاقے کو خوش حال اور ترقی یافتہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حکومت اس کوشش میں فنی صلاح ومشورہ اور قرض وغیرہ کی شکل میں سہولتیں دے کر شریک ہوتی ہے۔ اس کا مقصد بستی کے سرگرم تعاون کے سہارے اور جہاں تک ممکن ہو ان کی ہی پیشقدمی سے سارے سماج کے معیار زندگی کو اونچا اُٹھانا ہے۔ عوامی سنستھاؤں کی نگرانی میں انجام پذیر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ یہ پروگرام گاؤں کے لوگوں کو ترقیاتی پروگراموں کی اہمیت اور اس ترقیاتی پروگرام میں سرگرم تعاون دینے کی ضرورت کو سمجھاتے ہوئے جمہوریت کی بنیادوں کو مضبوط بناتا ہے۔ عوام کی زندگی سے براہ راست اس کا تعلق ہونے کی وجہ سے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی حیثیت لازمی طور سے ایک تعلیمی اور تنظیمی طریق کار کی ہے کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں ایکس ٹنشن پروگرام کی بڑی اہمیت ہے۔ "ایکس ٹنشن" پروگرام کے ذریعہ لوگوں کے سوچنے اور کام کرنے کے طریقوں میں تبدیلی لائی جاتی ہے' یہ ایک طرح کا تعلیمی کام ہے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے بارے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اس پروگرام کی کامیابی عوام کے تعاون پر منحصر ہوتی ہے اور یہ پروگرام اُسی حد تک کامیاب مانا جاتا ہے جس حد تک عوام کا تعاون اسے حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف مادّی شکل میں حاصل ہونے والے نتائج کی بنیاد پر ہی اس پروگرام کی کامیابی

کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ اس پروگرام کی کامیابی اور ناکامی بیشتر اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ اس نے گاؤں کے رہنے والوں کے دل و دماغ پر کہاں تک اثر ڈالا ہے اور مقامی لوگوں اور مقامی سنستھاؤں نے کس حد تک اس پروگرام کو اپنایا ہے۔ اس لئے اس پروگرام کو ٹھوس بنیادوں پر کھڑا کرنے اور اس میں استحکام پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا انتظام گاؤں کے بنیادی اداروں کے ہاتھ میں سونپا جائے۔ پلاننگ کمیشن، کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی آبو کانفرنس، بلونت رائے مہتہ کمیٹی اور نیشنل ڈیولپ منٹ کونسل کی سفارشات میں بھی اسی خیال کے حق میں رائے ظاہر کی گئی ہیں۔ ہمارے ہر دلعزیز وزیر اعظم نے گاؤں کی بنیادی سنستھاؤں کو مضبوط بنانے کی ضرورت پر بار بار زور دیا ہے جب کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کا خاص مقصد گاؤں کی زندگی کی ہمہ گیر ترقی کی بنیاد پر ایک منظم دیہی سماج کی تشکیل کرنا ہے تو اس حالت میں مقامی سنستھاؤں کو مضبوط بنانا ضروری ہو جاتا ہے۔

تین بنیادی سنستھائیں

گاؤں کی سطح پر تین بنیادی سنستھائیں ہیں (۱) پنچایت (۲) کوآپریٹو سوسائٹی اور (۳) گاؤں کا اسکول پنچائت ایک ابتدائی بنیادی ادارہ ہے۔ ان کے سہارے کوآپریٹو سوسائٹی اور اسکول کو مدد ملتی ہے۔ پنچایت کو اپنے علاقے کے اندر منصوبے بنانا اور ان پر عمل درآمد کرنے کی ذمہ داری لینی پڑتی ہے۔ کوآپریٹو سوسائٹی اقتصادی پروگراموں کو تکمیل دینے کا ایک معاون ادارہ ہے۔ گاؤں کا اسکول اس تپائی کا تیسرا اہم پایہ ہے جس پر نئے ہندوستان کی تعمیر کی بنیاد رکھی جارہی ہے۔

اسکول اور کمیونٹی ڈیولپ منٹ

کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام میں گاؤں کے اسکول کی بڑی اہمیت ہے۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور نیشنل ایکسٹنشن سروس کے پروگراموں کو گاؤں میں ایک نئی اور ذمہ دار لیڈرشپ ابھارنے میں اسی وقت کامیابی مل سکتی ہے جب گاؤں کے اسکول کو مرکز بنا کر یہ کام کیا جائے جس سے کہ گاؤں کے لوگ ہوشمندی کے ساتھ فیصلے کر کے قومی تعمیر کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ تعاون دے سکیں۔ دیہی تعمیر کا جو بھی نقشہ بنایا جائے وہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں گاؤں کا اسکول بستی کے لوگوں کی تعلیم و ترقی کا ایک اہم مرکز بن سکے کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام اب جس نئے دور سے گذرنے والا ہے اس میں اسکول تین طرح سے شریک ہو سکتے ہیں۔

(۱) دیہی زندگی سے مطابقت رکھتے ہوئے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرنا۔

(۲) اسکول کے اوقات میں نوجوانوں اور بالغوں کی تعلیم کا انتظام کرنا۔

(۳) کمیونٹی سینٹر کے قیام کے لئے گاؤں والوں سے ربط ضبط پیدا کرنا۔

گاؤں کے اسکول کے کاموں کو اب اس طرح ترتیب دینے کی ضرورت ہے کہ اس میں ساری بستی کی زندگی کی جھلک ملنے لگے۔ گاؤں کے اسکول سے مراد صرف وہ عمارت نہیں ہے جس میں اسکول لگتا ہے بلکہ اس سے اصل مراد اس کے استا طالب علم اور تحصیل علم کا سارا ماحول ہوتا ہے۔ اس طرح اسکول محض بچوں کو خواندہ بنانے کی جگہ کا نام نہیں رہ جاتے ہیں بلکہ وہ ایک ایسا مرکز بن جاتے ہیں جہاں سے گاؤں کے لوگوں کو روشنی ملے گی۔ وہاں بالغوں کے پڑھنے لکھنے کا انتظام بھی ہوگا اور کتب خانہ اور دارالمطالعہ بھی ہوگا۔

آج گاؤوں میں سماجی اور تہذیبی زندگی کا توازن کچھ بگڑ سا گیا ہے۔ پرانی قدریں کمزور پڑ گئی ہیں تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں قدریں بھی تیزی سے بدلتی اور کمزور پڑتی جارہی ہیں گاؤں کے اسکولوں سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ سماجی تعمیر کے اس پہلو پر بھی دھیان دیں۔ گاؤں، جہاں پنچایت مقامی انتظام کا کام سنبھالتی ہیں اور کوآپریٹو سوسائٹی ترقی کے مواقع فراہم کرتی ہے، تو وہاں اسکول سے یہ بجا طور پر امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ابتدائی تعلیم کے انتظام کے ساتھ ساتھ سارے گاؤں کے لئے سماجی تعلیم کی درسگاہ، اخلاق و آداب کا گہوارہ اور تہذیبی ترقی کا سرچشمہ بن جائیں۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ کا ایک بنیادی مقصد لوگوں کے سوچنے کے ڈھنگ میں اس طرح کی تبدیلی لانا ہے کہ وہ اپنے مسائل پر غور کرنے کے بعد انھیں منظم طریقے پر حل کرنے کی تدابیر بھی کرنے لگ جائیں۔ گاؤں کا اسکول اس مقصد کی تکمیل میں سب سے زیادہ مدد دے سکتا ہے

ہمارے ملک میں پرانے زمانے میں گاؤں کے ادھیاپک کو بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ سبھی لوگ اس پر بھروسہ کرتے تھے اور وہ سماج کی تعمیر میں ایک دوست، ایک دانشور اور ایک رہنما کی حیثیت سے پیش پیش رہتا تھا۔ آج بھی اگر استادوں کو بلند مقام دیا جائے اور ان کی اچھی طرح تربیت کی جائے تو وہ اسکول کو ساری بستی کے مرکز کی شکل دے کر ترقیاتی کاموں میں عوام کا سرگرم تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اسکول آج جوان کاموں کو پورا کرنے میں اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ سماج کی توجہ اس کی طرف سے ہٹ گئی ہے۔ استادوں کو مناسب تربیت نہیں ملتی۔ ان کی تنخواہ بہت قلیل ہے۔ رہنے سہنے کا معقول انتظام نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب اس کی وہ عزت نہیں رہی۔ اگر اسکولوں کو گاؤں کا ایک بااثر ادارہ بنانا ہے جس سے وہ اپنی نئی ذمہ داریوں کو پورا کرسکیں اور گاؤں کی متوازن ترقی کی راہ میں معاون اور مددگار بن سکیں تو استادوں کو اچھی تربیت

بنی ہوگی، ان کی تنخواہ اور رہنے سہنے کا معقول انتظام کرنا ہوگا اور معزز شہریوں کے طبقے میں ان کا شمار کرنا ہوگا۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کو دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کی طرف بھی توجہ کرنی پڑے گی۔ صرف اسی صورت میں ہم اپنے اس پروگرام کے ذریعہ گاؤں کے لوگوں کے دل و دماغ کو روشن کرکے وہ ذہنی انقلاب لاسکیں گے جو دیہی سماج کو منظم اور مستحکم بنانے کے لئے لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

معلم ایک سماجی خدمت گار ہے۔ اس کے پاس طالب علموں کی ایک بڑی فوج ہوتی ہے جن کے ذریعے اس کا سارے سماج سے تعلق قائم رہتا ہے۔ تعلیم جوں جوں بڑھے گی، گاؤں کے ہر خاندان سے اس کا ربط ضبط قائم ہوتا جائے گا۔ طالب علموں کی مدد سے کچھ ایسے اجتماعی کام کئے جاسکتے ہیں جس سے گاؤں میں صحت مند ماحول پیدا ہو۔ مثال کے لئے سڑکوں، کنووں اور تالابوں کی صفائی کا کام یا گاؤں میں اکھاڑے قائم کرنا وغیرہ۔ اسکول صرف گاؤں کی سماجی اور تہذیبی زندگی کو اونچا اُٹھانے کا ذریعہ ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے ذریعہ زراعت اور صنعتوں کو فروغ دینے میں بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ سیاسی میدان میں یہ لوگوں کو سچی جمہوریت کی تربیت دے سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا باتوں کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ دیہی تعمیر و ترقی کے کام میں گاؤں کے اسکولوں سے بہت مدد لی جاسکتی ہے۔ مگر اس کے لئے تعلیمی پروگراموں کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس میں سدھار کرنے کی ضرورت بھی ہوگی۔ اُستادوں کے موجودہ تربیتی پروگراموں کو اعادی نصابوں اور دوران ملازمت کے ٹریننگ کورسوں کے ذریعہ اور بہتر بنانا ہوگا۔ اسی طرح کتابوں کی تیاری میں بھی بہت سی باتوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ بچوں میں ابتداء سے سائنٹفک اور اجتماعی نقطۂ نظر کی تربیت کرنے کے لئے درسی کتابوں کو نئے ڈھنگ سے ترتیب دینا ہوگا۔ ان میں حُب وطن، منصوبہ بندی کی ضرورت اور طریقے کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کے مقاصد، گاؤں کی سنستھاؤں کا علم، جسمانی محنت کی عظمت، صحت و صفائی اور سائنس کی بنیادی باتوں پر مشتمل اسباق شامل کرنے ہوں گے۔ آج گاؤں کے بیشتر اُستادوں کو کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام اور پنج سالہ منصوبے کی بنیادی باتوں کا بھی علم نہیں ہے۔ عوام کا مفاد بھی اسی بات میں ہے کہ انھیں اس پروگرام میں زیادہ سے زیادہ شامل کیا جائے، جس سے ان کا تعاون ان کاموں میں برابر حاصل ہوتا رہے۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کے جن خاص خاص پہلوؤں میں اُستاد بہت مؤثر طریقے پر کام کرسکتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) دیہی بستی کی تعلیم: اسکول کے اُستاد، بلاک ڈیولپ منٹ افسر کی مدد سے ترقیاتی پروگراموں کے مختلف پہلوؤں پر تقریر تیار کرسکتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ گاؤں کے لوگوں کی بھاشا میں اپنے خیال ظاہر کرسکتے ہیں بلکہ وہاں کے لوگوں کو بھی طرح جانتے پہچانتے بھی ہیں، اس لئے وہ دوسرے افسروں کے مقابلے میں گاؤں والوں کو اپنی باتوں سے زیادہ

متاثر بھی کرسکتے ہیں۔ گاؤں پنچایتوں اور کوآپریٹو سوسائٹی کی بیٹھکوں میں ایسی تقریروں کے لئے اچھا موقع رہتا ہے۔

(۲) کمیونٹی کے پروگراموں میں بچوں کو شامل کرنا :- اسکول کا اُستاد بہت ہی مفید اور بااثر طریقے سے طالب علموں کو صفائی کی مہموں، انسداد ملیریا کے پروگراموں، رضاکارانہ محنت (شرم دان) وغیرہ میں لگا سکتا ہے۔

(۳) بالغوں کی کلاس چلانا :- اس کام کے لئے گاؤں کا اُستاد ہی سب سے اچھا کارکن ہے۔ بالغوں کی کلاسیں عموماً رات میں لگتی ہیں، اس لئے ان کلاسوں کو چلانے سے اُن کے منصبی کاموں پر بھی کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس فاضل کام کے لئے اُسے کچھ اعزاز اور مشاہرہ دینا ضروری ہوگا۔

اسکول ہی میں کمیونٹی سینٹر بنانے کا منصوبہ ابھی تک تکمیل نہیں پا سکا ہے۔ اس طرف بھی توجہ دی جا سکتی ہے اور مندرجہ ذیل کام کئے جا سکتے ہیں :-

(ا) کتب خانے اور دار المطالعے۔ ہر اسکول میں ایک ریڈنگ روم اور ایک چھوٹے سے کتب خانے کا انتظام ہو۔ ریڈنگ روم میں نمایاں جگہوں پر ایسے چارٹ اور نقشے آویزاں ہوں جن میں گاؤں، ڈیولپمنٹ بلاک کے منصوبوں اور ان کی کامیابی اور ترقی کی موٹی موٹی باتیں بتائی گئی ہوں۔

(ب) اچھے رہن سہن کے مظاہرے ہر اسکول میں نئے ڈھنگ کے بنے ہوئے پاخانے، پیشاب خانے اور سوختہ گڑھے وغیرہ بنے ہونے چاہئیں۔ اسکول کے صحن میں باغبانی اور کسانی کے ترقی یافتہ طریقوں کا مظاہرہ بھی کرنا چاہئے۔

(ج) تہذیبی پروگرام کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے مختلف پہلوؤں سے متعلق چھوٹے چھوٹے ڈرامے کرانا اور انہیں مقبول بنانا۔

(د) والدین سے ربط ہر اسکول میں مہینے میں ایک بار والدین کا جلسہ کرنا چاہئے، جس میں گاؤں کے دوسرے کارکنوں جیسے گرام سیوک، پنچایت منتری، کوآپریٹو انسپکٹر، اسٹاک مین وغیرہ کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔

(ہ) نوجوان برادریوں کا پروگرام گاؤں میں اگر کوئی نوجوان برادری قائم ہو تو اسکول کو اس برادری سے قریب کا ربط رکھنا چاہئے۔

مندرجہ بالا باتوں سے ظاہر ہے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام میں گاؤں کے اسکول بہت نمایاں اور اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ تعلیم کی نئی تنظیم کے ماتحت ہر نوتنظیم شدہ جونیر ہائی اسکول، اور ہائر سکنڈری اسکول[۱] میں ایک ایکسٹنشن ٹیچر کا تقرر عمل میں آیا ہے ان کا کام ہے کہ وہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے کاموں سے متعلق لوگوں سے ربط پیدا کریں اور گاؤں کے ترقیاتی پروگراموں میں مندرجہ بالا طریقے سے سرگرم حصہ لیں۔

---

[۱] اُترپردیش میں

ناخواندگی کو ختم کرنے کی مہم

نصاب اور طریقۂ تعلیم

ہم نے جنوری ۱۹۶۱ء کے شمارے میں ناخواندگی کو ختم کرنے کی مہم سے متعلق جیلپور نیشنل سیمینار کی سفارش کا وہ حصہ شائع کیا تھا جو مہم کے نظریاتی اور تنظیمی پہلو کے بارے تھا۔ زیر نظر شمارے میں سفارش کا وہ حصہ شائع کیا جا رہا ہے جو اس مہم میں نصاب اور طریقۂ تعلیم سے متعلق ہے۔

—— ایڈیٹر

۱۔ نصاب اور مدت

خواندگی کی مہم —— خواہ وہ پورے علاقے میں پھیلا کر منظم کی جانے والی ہو یا ایک احاطہ بند علاقے میں سمیٹ کر منظم کی جانے والی ہو —— شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کے اغراض و مقاصد طے کر لئے جائیں ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ایک نصاب مرتب کر لیا جائے اور یہ سوچ لیا جائے کہ نصاب کو پورا کرنے کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی اور سال کے دوران میں کتنے سیشن منعقد کئے جائیں گے۔

اس سے پہلے "اڈلٹ ایجوکیشن میں خواندگی کا مقام" والے باب میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ محض حروف اور چند سادے الفاظ کا پڑھنا اور لکھنا جان جانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ اگر خواندگی کی صلاحیت کو کام کی چیز بنانا ہے تو توجہ اس بات کی طرف ہونی چاہئے کہ ان پڑھ بالغ اپنی مادری زبان میں لکھی ہوئی صاف اور سلیس عبارت کو روانی اور سمجھ کے ساتھ پڑھنا سیکھ جائے یعنی یہ کہ اسے اتنی صلاحیت ہو جانی چاہئے کہ وہ کم سے کم پہلی کتاب، اخباروں کی سرخیاں اور آسان زبان میں صاف صاف لکھی ہوئی عبارت کو سمجھ کر اور روانی کے ساتھ پڑھ لے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے حروف صحیح اور حروفِ علت کے جوڑوں کا پورا پورا علم ہو۔ ممکن ہے لکھنے کی صلاحیت کا معیار کسی قدر پست ہو لیکن

اتنا تو ہو ہی جانا چاہیئے کہ وہ اپنا نام صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک لکھ لے اور وقت پڑنے پر معمولی خطوط یا رقعے لکھ لے
بالغ دماغ میں اعداد کا شعور پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ تعلیم حاصل کرکے اُسے اس قابل ہو جانا چاہیئے کہ ایک سے سو تک
کی گنتی گن لے، پڑھ لے اور لکھ لے پچاس تک جوڑنا اور گھٹانا سیکھ لے اور معمولی ضرب تقسیم کر سکے۔ اُسے معمولی طریقے پر روپے
پیسے کا حساب کتاب رکھنا آجائے اور ہزار، دس ہزار اور لاکھ گنتیوں کو سمجھ سکے۔ اُسے چالو سکوں اور نوٹوں کی پہچان اور بازار
میں اچھے ناپ اور تول کی باتوں اور روزمرہ کی زندگی میں ان کے حساب کتاب جوڑنے کی جو ضرورت ہوتی ہے ان کا معمولی
علم ہونا چاہیئے۔

سیمینار کی رائے میں ایڈلٹ ایجوکیشن کے پروگرام کو سماجی تعلیم سے علیحدہ نہیں رکھا جانا چاہیئے یہاں تک کہ لوگوں کو
پڑھنا لکھنا اور معمولی حساب کتاب سکھانے میں بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس میں ان کی سماجی زندگی سے متعلق مضامین
بھی شامل ہو جائیں۔ مثال کے لئے صحت و صفائی کے بنیادی اصول، عام معلومات، شہریت، تاریخ کے اہم واقعات،
لوک کہانیاں، ابتدائی جغرافیہ، روزمرہ کی سائنس، امداد باہمی کے اصول اور اُس کی اہمیت، زراعت کے ترقی یافتہ طریقے
(خاص طور سے دیہی علاقوں میں) اور نئی نئی دستکاریوں اور دھندوں سے متعلق معلومات بھی اس کے ذریعہ لوگوں کو دی جا
سکے۔ صحت و صفائی کی تعلیم میں Mother craft اور بچوں کی نگہداشت و بہبود پر خاص توجہ دی جانی چاہیئے
مندرجہ بالا مضامین بڑی آسانی کے ساتھ تفریحی سرگرمیوں کے ساتھ مربوط کرکے پڑھائے جا سکتے ہیں۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہوگی کہ اچھی درسی کتابیں اور اُستادوں کی رہنمائی کے لئے ہینڈ بک
وغیرہ تیار کی جائیں جن کی مدد سے استاد زیادہ موثر طریقے پر پڑھا سکے۔

لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے اور انھیں سماجی تعلیم دینے کے لئے کتنا وقت دیا جانا چاہیئے۔ اس بارے میں
کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں پیش کیا جا سکتا۔ یہ بات بہت کچھ مخصوص حالات اور ضرورت پر منحصر ہوگی۔ مگر اپنی آسانی کے لئے
ہم اپنے سامنے یہ ایک اندازہ رکھ سکتے ہیں کہ نصف وقت پڑھنا لکھنا سکھانے کے کام پر صرف کیا جائے اور نصف وقت
سماجی تعلیم کے لئے۔ اس میں عام طور پر پڑھنا لکھنا سکھانے کا کام درمیانی وقت میں ہو یعنی پڑھائی سے پہلے اور بعد کے
اوقات میں۔

یہ کورس کتنی مدت کا ہو اور کتنے سیشنوں پر مشتمل ہو' اس کا فیصلہ بھی بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا۔ اس میں سب سے
زیادہ قابل لحاظ بات یہ ہوگی کہ علاقے کی ضرورت اور وہاں کے حالات کیا ہیں۔ کھیتی کسانی کے کام میں مصروفیت اور شدید
موسم کے ایام بہر حال پڑھائی کی مدت میں نہیں شامل کئے جانے چاہیئں۔ اگر اسٹیٹ میں خواندگی کی مہم کو پھیلا کر چلانے کا بھی

فیصلہ کیا جاچکا ہو تو اس کے لئے بھی کچھ مدّت نکال دینی ہوگی جس میں اُستاد رضاکارانہ طور پر طالب علموں کی مدد سے خواندگی کی مہم سارے علاقے میں چلائیں گے۔

یہ تو صحیح ہے کہ مدّت تعلیم سے متعلق بھی کوئی قطعی فیصلہ کرنا ناممکن ہے جو ہر علاقے پر یکساں طریقے پر لاگو کیا جاسکے مگر اس کے باوجود تجربہ یہ بتاتا ہے کہ بالغوں کی تعلیم کے لئے کلاس کی مدّت چار مہینے سے کم نہیں ہونی چاہئے۔ یہ بات اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایک بالغ انسان کے لئے کلاس میں پابندی کے ساتھ آنا ایک خاصا مشکل کام ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک ذہین اور محنتی اُستاد مجوزہ نصاب اس سے کم مدّت میں بھی پورا کرادے۔ مگر مدّت تعلیم طے کرنے میں ہمیں عام اُستادوں کی صلاحیتوں، ان کی کمزوریوں اور مجبوریوں اور اس سارے ذہنی اور مادّی حالات کو بھی مدنظر رکھنے کی ضرورت ہوگی جس میں اُستاد اور بالغ طالب علموں کو کام کرنا ہوتا ہے۔ پڑھائی کا وقت روزانہ ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ تک ہوسکتا ہے اور یہ وقت اُس زمانے میں جب کہ ساری بستی کے لوگوں کو فرصت ہو مزید بڑھایا جاسکتا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی پہلے سے طے نہیں کی جاسکتی کہ تمام کلاسوں کو ایک مقررہ تاریخ اور وقت میں ہی شروع کیا جائے یہ بات حالانکہ صحیح ہے کہ کسی علاقے میں تمام کلاسیں ایک ساتھ شروع کی جائیں تو اس سے انتظام میں سہولت ہوتی ہے مگر اس کے باوجود اس اصول پر ہمہ وقت کاربند نہیں ہوا جاسکتا۔ طالب علموں کی ایک قابل لحاظ تعداد مل جانے پر یہ کلاس اُسی وقت یا جلد سے جلد جب بھی ممکن ہو شروع کی جاسکتی ہے۔ اس طرح کی کلاسوں سے مختلف مدت کے اعداد و شمار، متعلقہ ادارے کے پاس پہنچتے رہنے چاہئیں جس سے کام کی رفتار اور ترقی کا صحیح اندازہ ہوتا رہے اور ان کی نگرانی اور رہنمائی کا مناسب اور معقول انتظام کیا جاسکے۔

جہاں تک مکمل نصاب تعلیم کو مختلف چھوٹے چھوٹے کورسوں میں تقسیم کرنے کا سوال ہے، اس سلسلے میں کوئی قطعی رائے اس وقت تک نہیں قائم کی جاسکتی جبتک کہ کچھ علاقوں میں اس پر تجربہ کرکے دیکھ نہ لیا جائے۔ سیمینار نے بہرحال یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ نصاب تعلیم کو مختلف چھوٹے چھوٹے کورسوں میں تقسیم کر دینے سے پڑھائی کے تسلسل میں خلل واقع ہوسکتا ہے اور اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ بالغ آدمی ایک مختصر کورس ختم ہونے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیں۔ اس لئے زیادہ بہتر یہی ہوگا کہ ایک مسلسل کورس میں سارا نصاب پڑھا دیا جائے۔

طریقۂ تعلیم اور اصول فن

بالغوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق انسانوں سے ہوتا ہے اور اس لحاظ سے بالغوں کو پڑھانے

کے طریق کار اور اصول فن ایک بڑی حد تک انسانی فکر و عمل پر منحصر ہوتے ہیں مگر انسانی فکر و عمل سے متعلق کوئی بھی تحقیق اس طرح کسی یقینی نتیجے پر نہیں پہونچ سکتی جس طرح طبعی علوم سے متعلق یقینی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بالغوں کو پڑھانے کے طریق کار اور ان کی نفسیات سے متعلق ہمارے تجربات اب بھی بہت محدود ہیں اور اس لحاظ سے اس سلسلے میں ابھی کوئی بات بہت یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی اور نہ ابھی ایسے حالات ہی پیدا ہوئے ہیں جبکہ ان سب پر باقاعدہ طور پر تفصیل کے ساتھ تحقیقات کی جاسکیں۔ اس ضمن میں جو کام ہم موجودہ صورت میں آسانی کے ساتھ کرسکتے ہیں اور جس سے ہم بہت کچھ سیکھ بھی سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم خود اپنے کاموں کا وقتاً فوقتاً جائزہ لیں اور اپنے ہی تجربات کو اپنے لئے راستہ ڈھونڈ نکالنے کی بنیاد قرار دیں۔

کس عمر تک کے لوگوں کو پڑھایا جائے

موجودہ حالات میں ہم نے بالغوں کی خواندگی کی مہم کے لئے ۱۴ سے ۴۵ سال تک کے لوگوں کو ہی لیا ہے۔ عمر کے لحاظ سے اس گروپ کے اندر آنے والے لوگوں کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے مختلف گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے لئے ۱۷ سال سے کم عمر والوں اور ۱۷ سے ۲۰ یا ۲۵ سال کے نوجوانوں کا علاحدہ علاحدہ گروپ بن سکتا ہے۔ اسی طرح سے ۲۵ سے ۳۵ سال والوں کا اور ۳۵ سال سے اوپر عمر کے لوگوں کا علاحدہ علاحدہ گروپ بنایا جاسکتا ہے۔ موجودہ حالت میں ہمارے ذرائع اتنے محدود ہیں کہ ہم اتنی تفصیل کے ساتھ یہ تقسیم نہیں کرسکتے ہیں پھر بھی ۲۰ سال سے اوپر اور ۲۰ سال سے کم عمر کے لوگوں کو دو گروپ میں تقسیم کرنا بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ بات بالکل ممکن ہے کہ کچھ خاص حالات میں ۱۷ سال سے کم عمر کا ایک لڑکا اور ۴۵ سال کا ایک بوڑھا آدمی ایک ساتھ بیٹھکر پڑھنا لکھنا خوشی سے پسند کریں۔ اسی لئے یہ بات زیادہ ضروری ہے کہ اس تقسیم میں لوگوں کی عمر سے زیادہ ان کے مزاج اور انفرادی خصوصیات پر توجہ دی جائے۔

موجودہ صورت حال میں پڑھائی کے مختلف مراحل کے لحاظ سے درجہ وار تقسیم شاید زیادہ مناسب ہوگی۔ ایک بالغ انسان اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ وہ زبردستی لکھنا پڑھنا نہیں سیکھ سکتا۔ وہ کلاس میں پابندی سے حاضر نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ اس پر انفرادی توجہ دی جائے۔ اگر پڑھائی کے معیار کے لحاظ سے تقسیم کی جائے تو اس سے اس کام میں بہت مدد لی جاسکتی ہے۔ بالغوں کی ذہنی اور طبعی افتاد سے متعلق بہت سی باتیں پہلے سے معلوم ہیں۔ وہ اکثر احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے۔ اُسے ہر دم یہ احساس رہتا ہے وہ جاہل اور ناخواندہ ہے اور اب اس کی عمر پڑھنے لکھنے کی نہیں رہی۔ وہ بہت حساس ہوتا ہے۔ اسی لئے ضرورت ہوتی ہے کہ برابر اس کی ہمت افزائی کی جاتی رہے۔ ایک اُستاد کو اپنی کلاس میں ہر وقت ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

بچوں کے مقابلے میں بالغ انسان کو زندگی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اُس کے الفاظ کا خزانہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ اس کی قوت استدلال

نکھر چکی ہوتی ہے وہ ہر بات کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس میں کچھ حاصل کرنے کی زبردست بھوک ہوتی ہے۔ وہ ہر کام کی قدر و قیمت کو اس کے ٹھوس نتائج کی شکل میں آنکنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی روزی کے لئے دن بھر کام کرتا ہے اور عموماً تھکا ماندہ اور تفکرات سے گھرا ہوتا ہے۔ اُسے تفریح اور دل بہلانے کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں میں ایک بالغ انسان بچے سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اسی لئے بالغوں کے درمیان کام کرنے کا طریقہ بچوں کے درمیان کام کرنے سے مختلف ہونا چاہئے۔

بغیر کسی تیاری کے بالغوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے کی طرف ہم براہ راست نہیں بڑھ سکتے۔ سینٹر کھولنے سے پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اُستاد کو بستی کے لوگوں کے بارے میں واقفیت ہو۔ یہ کام وہ مختلف طریقوں سے کر سکتا ہے۔ سینٹر کھولنے سے پہلے علاقے کی مردم شماری کرنی ہوتی ہے اور سینٹر کے کاموں کے لئے پروپیگنڈا کرنا ہوتا ہے۔ اُستاد ان موقعوں سے فائدہ اُٹھا کر بستی کے لوگوں سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ کام سینٹر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ باقاعدہ کلاسوں کے شروع ہونے پر بھی جاری رہتا ہے۔ اُستاد کو چاہئے کہ کلاس میں پڑھائی شروع کرنے سے پہلے وہ کچھ وقت اس بات پر صرف کرے کہ وہ اپنے آپ کو لکھنے پڑھنے کے لئے تیار کر سکیں اور وہ اپنی دن بھر کی تکان اور تفکرات کو بھول کر پڑھنے لکھنے میں دل لگا سکیں۔ اس مقصد کے لئے گانے بجانے، بھجن کیرتن، ہلکے پھلکے تفریحی اور کلچرل پروگراموں سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

بالغوں کو پڑھانے کا طریقہ ایسا ہونا چاہئے جو ان کی زندگی سے مربوط ہو۔ ایک سپاٹ اور بے رنگ طریقۂ تعلیم جو ان کی زندگی اور اُن کے مسائل سے میل نہ کھاتا ہو ان کی دلچسپی کو قائم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ملک میں مختلف ترقی یافتہ زبانیں رائج ہیں۔ ان کا رسم الخط بھی الگ الگ ہے اور وہ ایک دوسرے سے انتہائی مختلف بھی ہیں۔ اسی لئے یہاں طریقۂ تعلیم سے متعلق بہت تفصیلی جائزہ نہیں لیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اگر طالب علم کے اندر سیکھنے کی خواہش اور معلّم کے اندر کچھ کام کرنے کا حوصلہ ہے تو پھر اس کے راستے میں کوئی دشواری حائل نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ بات ہر حالت میں ممکن بھی نہیں ہے۔ بالغوں کے طریقۂ تعلیم پر غور کرتے وقت ہمیں ایک عام بالغ انسان اور ایک عام اُستاد کی مثال ہی اپنے سامنے رکھنی چاہئے اور اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ لکھنا پڑھنا سکھانے کا کام جہاں تک ممکن ہو دلچسپ ہو۔

یہ تو صحیح ہے کہ بالغوں کی تعلیم کے طریق کار اور اصول فن فیلڈ میں کام کرنے والے کارکنوں کے تجربات کی بنیاد پر آہستہ آہستہ متعین ہوں گے۔ مگر پھر بھی بالغوں کی تعلیم سے متعلق کچھ عام باتوں کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس میں مخصوص حالات، تعلیم کے مقاصد اور افراد کی خصوصیات کے اعتبار سے کچھ فرق ہو سکتا ہے

یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ پڑھنے والے بالغ افراد کلاس میں دیر سے پہونچتے ہیں۔ استاد کو چاہئے

کہ وہ صبر کے ساتھ آنے والوں کا انتظار کرے۔ اُسے کچھ تھوڑے سے طالب علموں سے کلاس شروع کردینی چاہیے۔ پڑھائی شروع کرنے سے پہلے اگر استاد ان سے بے تکلف انداز میں گفتگو کرے اور ان سے تعلقات بڑھائے تو یہ بات ان کے کام میں مددگار ثابت ہوگی۔ شروع میں وہ ان کی گھر گرہستی کی زندگی اور کام کاج سے متعلق بات چیت کرے۔ بچوں کی خیریت اور صحت معلوم کرے۔ کھیت یا کارخانے میں کام کیسا چل رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

سبق کا تعارفی حصہ بالغوں کے اپنے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہونا چاہیے اس میں حقیقت کا سا رنگ روپ لانے کے لیے جہاں تک ممکن ہو ان کی زندگی کے گرد و پیش کے ماحول سے مربوط بھی ہونا چاہیے سبق کے درمیان میں بھی ان کی روزمرہ کی زندگی کی مثالیں پیش کرنا مفید ثابت ہوگا جیسے ارثمیٹک سکھاتے وقت مقامی بازار کے نرخوں سے مثال پیش کرنا، اسی طرح جغرافیہ پڑھاتے وقت اس گاؤں کی مصنوعات اور شہریت سے متعلق سبق میں گاؤں کے معاملات یا شہری زندگی کے کسی واقعے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ غرض سبق کا تعارفی حصہ اور جہاں تک ممکن ہو سارا کا سارا سبق بالغوں کی زندگی اور ماحول سے براہ راست متعلق ہونا چاہیے۔

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ
ایک سال کا کام
(جولائی ۱۹۵۹ئہ تا جون ۱۹۶۰ئہ)

گذشتہ پرچے میں ہم نے ادارہ تعلیم و ترقی کی سالانہ رپورٹ ۱۹۵۹ئہ کی ایک قسط دی تھی جو ادارہ کے "دیہی تعلیمی سیکشن" کی کارگذاری پر مشتمل تھی اس سیکشن کے علاوہ ادارے کے تین سیکشن اور ہیں جن کے کام کی رپورٹ کا خلاصہ اس شمارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔

—— ایڈیٹر

شعبۂ تصنیف و تالیف

(محمد خلیق)

الف ۔ بالغوں کا ادب

اس سال شعبۂ تصنیف و تالیف کو یونیسکو سے مبلغ سولہ ہزار روپے کی امداد ملی تھی جس سے آٹھ کتابیں تیار کرنی تھیں اور اس پورے کام کو دسمبر ۱۹۵۹ئہ تک ختم کرنا تھا۔ دراصل مجوزہ کام کے لئے جتنی مدت درکار تھی اس کا اندازہ کچھ غلط ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شعبے کے کارکنوں کو دن رات ایک کر کے اس ذمّے داری کو پورا کرنا پڑا۔ خوشی کی بات ہے کہ ہماری محنت کامیاب ہوئی اور یہ کتابیں دسمبر ۱۹۵۹ئہ کے آخری ہفتے میں چھپنے کے لئے پریس بھیج دی گئی تھیں۔ اس سے بھی زیادہ خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ یونیسکو نے ان کتابوں کو پسند کیا اور ہمارے کام کو سراہا۔

یونیسکو کی اس رقم کے علاوہ شعبے کے اپنے بجٹ میں کتابوں کی تیاری کے لئے تین ہزار روپے رکھے گئے تھے جو بعد میں کٹ کٹا کر

صرف ڈیڑھ ہزار رہ گئے تھے۔ اس طرح ساڑھے سترہ ہزار کی رقم سے ہم نے سال بھر میں پندرہ نئے مسودے تیار کئے، ۶ مسودوں کا ہندی سے اُردو یا اُردو سے ہندی میں ترجمہ کیا گیا اور گیارہ کتابیں چھاپیں۔ اس کام کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

اُردو کی ۸ کتابیں

۱۔ چاند: ہمارا پڑوسی ۲۔ زمین کے ساتھی ۳۔ پرندوں کا سفر ۴۔ خشکی کے جانور ۵۔ زمین کے خزانے۔ حصہ اول۔ سخت زمین یا پتھر ۶۔ حصہ دوم۔ ایندھن ۷۔ حصہ سوم۔ قیمتی دھاتیں ۸۔ حصہ چہارم۔ سستی دھاتیں

ہندی کی ۷ کتابیں

۱۔ پرتھوی ۲۔ چاند ۳۔ سوریہ ۴۔ سوریہ کا پریوار ۵۔ مانو کا وکاس ۶۔ سمندر کے جیو ۷۔ یاترا کے سادھن۔

جن پانچ کتابوں کا ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا گیا، ان کے نام یہ ہیں:

ہندی سے اُردو میں

۱۔ زمین ۲۔ چاند ۳۔ سورج ۴۔ سورج کا خاندان۔

اُردو سے ہندی میں

۱۔ خشکی کے جانور

ان میں سے حسبِ ذیل گیارہ کتابیں چھاپی گئیں جن میں سے آٹھ ہندی کی ہیں اور تین اُردو کی۔

ہندی

۱۔ پرتھوی ۲۔ چاند ۳۔ سوریہ ۴۔ سوریہ کا پریوار ۵۔ سمندر کے جیو ۶۔ دھرتی کے جیو ۷۔ مانو کا وکاس ۸۔ یاترا کے سادھن

اُردو

۱۔ زمین کی گردش اور موسم کی تبدیلی ۲۔ اُلٹی دوا ۳۔ تاؤ کی نصیحتیں

یہ کتابیں ہماری عام کتابوں سے کئی گنا ضخیم ہیں اب تک عموماً ہم سولہ سے بتیس صفحے کی کتابیں چھاپتے رہے ہیں لیکن ان کتابوں میں سے ہر ایک اوسطاً ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے اور کل صفحات ۷۸۴ ہیں۔ اسی طرح دوسری کتابیں جو ابھی مسودے کی شکل میں ہیں، وہ بھی قریب قریب اتنی ہی ضخیم ہیں

ب۔ آڈیو ویژول ایڈس

آڈیو ویژول ایڈس (دکھا سنا کر تعلیم دینے کے سامان) کی تیاری میں اس سال ہم نے فلم اسٹرپ پر خاص توجہ دی۔

ہمارا کام صرف لکھے ہوئے مضمون (اسکرپٹ) کے مطابق ڈرائنگ تیار کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اپنے محدود وسائل کے مطابق تصویر لینے (شوٹنگ) اور ان کی چھپائی (پرنٹنگ) کے مسائل کو بھی حل کرنا تھا۔ اس سلسلے میں ہم نے محض اٹھارہ فریم (تصویروں) کی ایک تجرباتی فلم اسٹرپ "چاند کی بدلتی ہوئی شکلیں" کے عنوان سے بنائی۔ شوٹنگ اور فلموں کے کیمیاوی عمل میں ہمیں کئی فلم ضائع کرنے پڑے لیکن خوشی کی بات ہے کہ ٹکنیک کے اعتبار سے ہماری یہ پہلی کوشش کامیاب رہی۔

اس تجربے کے بعد دوسری فلم اسٹرپ کے لئے ہم نے "چیچک" کا موضوع منتخب کیا۔ اسکرپٹ کو تیار کرتے وقت متعلقہ لوگوں سے ہر طرح کی مدد حاصل کی گئی۔ اس طرح کی ساری تصاویر جو تعداد میں پینتالیس ہیں مکمل ہو چکی ہیں۔ بڑے پیمانے پر ان کے پرنٹ نکالنے کے لئے ہمارے پاس سامان نہیں ہے۔ خرچ اور وقت بچانے کے لئے یہ تصویریں بمبئی بھیجنا پڑیں گی۔

ہم نے تعلیمی میلے کا چار رنگ کا پوسٹر چھاپ کر سلک اسکرین پرنٹنگ کے مختلف مدارج بالترتیب پیش کئے اور تقریباً بارہ آسان ٹیکنیک کے سلائیڈ کے نمونے تیار کئے اور وقتاً فوقتاً ان کے بنانے کی ترکیبوں کے مظاہرے کئے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ جامعہ کے اساتذہ آڈیو وژول میٹیریل سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ بعض چیزیں اگر وہ چاہیں تو کم سے کم خرچ میں آسانی سے بنا سکیں۔ چنانچہ نہ صرف جامعہ بلکہ باہر کے اسکولوں کے اساتذہ نے بھی ہمارے اس کام سے دلچسپی کا اظہار کیا۔

اسٹاف کی کمی کے باوجود اس سال ہم نے انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ ایجوکیشن کے ڈائرکٹر کی درخواست پر ان کے یہاں کے سینئر طالب علموں کے لئے دو ہفتے کا ایک مختصر کورس کیا اور ان کو سلک اسکرین پرنٹنگ کے طریقے بتائے اور عملی کام کرا کے اس قابل کر دیا کہ وہ اپنے اسکول میں جا کر اس کام کو آسانی سے کرا سکیں۔

آڈیو وژول پروڈکشن کے کام کو جاری رکھتے ہوئے ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنی خدمات جامعہ کے دوسرے تعلیمی اداروں کو پیش کر کے انھیں ان چیزوں کے استعمال کی ٹریننگ بھی دیں لیکن موجودہ اسٹاف کے پیش نظر جس میں صرف دو آرٹسٹ ہیں اس طرح کا کوئی کام شروع کرنا ابھی آسان معلوم نہیں ہوتا۔ آڈیو وژول جیسے ہمہ گیر پروگرام کو چلانے کے لئے دو آرٹسٹوں سے توقع رکھنا کہ وہ کام کی پلاننگ بھی کریں، خود ہی تصویریں بھی تیار کریں ان کی شوٹنگ، دھلائی اور پرنٹنگ بھی کریں اور ساتھ ہی وسائل کے محدود ہونے کی وجہ سے ہر طرح کے ٹیکنیکل مسائل کو جن سے ہر لمحے دوچار ہونا پڑتا ہے حل کر کے کام کو آگے بڑھائیں بہت مشکل ہے۔

اس طرح کے تعلیمی سامان کی تیاری کے لئے صرف ٹیکنیک ہی سے اچھا کام نہیں ہوتا بلکہ اسکرپٹ جیسے بنیادی کام کی تیاری میں اس کے موضوع کے ماہروں سے مدد لینا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس قسم کی مدد کی توقع ہمیں جامعہ کے ساتھیوں سے ہونی چاہئے لیکن بد قسمتی سے یہ ساتھی خود اپنے کاموں اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے اس بنیادی کام میں ہر وقت ہماری مدد نہ کر سکے۔ ٹیکنیکل مسائل کو حل کر لینے کے بعد یقین تھا کہ اس سال ہم کچھ اور مفید تعلیمی سامان پیش کر سکیں گے لیکن اس طرح کی دقتوں پر ہم اب تک

قابو نہ پاسکے۔

ماہنامہ تعلیم و ترقی

ماہنامہ تعلیم و ترقی کی سالانہ رپورٹ عام طور پر بہت مختصر ہوتی ہے جسے چند سطروں میں ختم کیا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ آیا رسالہ پورے سال پابندی سے شائع ہوتا رہا یا نہیں اور یہ کہ ہر ماہ اس کی اشاعت کتنی رہی۔ اس کے علاوہ دوران سال میں اگر سیکشن کو کچھ انتظامی مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہو تو اس کا بھی مختصراً ذکر کر دیا جائے۔

اور یہی گذشتہ چند سال سے معمول بھی رہا ہے۔ مگر زیر تبصرہ سال میں سیکشن کو چند نئے اور غیر معمولی واقعات سے دوچار ہونا پڑا چنانچہ رپورٹ کے عام معمول کے ساتھ ان نئے حالات کا ذکر بھی بطور خاص ضروری ہے۔

(الف) معمول کے کام ۱۹۵۵ء سے سیکشن ہر سال ماہنامے کے ایک خاص نمبر کی تالیف و اشاعت کی شکل میں ایک بڑا مشکل کام اپنے ہاتھ میں لیتا رہا ہے۔ جسے اگر ان حالات کی روشنی میں دیکھا جائے جن میں رسالہ شائع ہو رہا ہے تو یہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اسپشل نمبر ہم معمولاً نیشنل سیمیناروں کے موقع پر ان کے پانچ چھ روز پہلے شائع کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیمیناروں کے نمایندوں کو زیر بحث موضوعات سے متعلق مطالعے کے لئے مستند قسم کا مواد فراہم ہو جائے ہم معمولاً ان اسپشل نمبروں کے نسخے سیمیناروں میں نمایندوں کو تقسیم کر دیتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ یہ نسخے عام طور پر خالی اوقات میں نمایندوں کے زیر مطالعہ ہوتے ہیں اور ان کے مضامین کو وہ غور سے پڑھتے ہیں۔

اس معمول پر اس سال بھی حسب دستور عمل ہوا۔ اس سال ۱۹۵۹ء کے اسپشل نمبر کا موضوع بھی حسب معمول وہی تھا جس پر گا رگوٹی نیشنل سیمینار میں بحث ہوئی تھی یعنی "سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کے انتظام کا مسئلہ" اس میں زیر بحث موضوع پر شری موہن سنگھ شری ایم۔ سی۔ ناناوتی ڈاکٹر ٹی۔ اے۔ کوشش، شری شالک رام پتھک۔ اور شری ایس۔ راگھون جیسے اہل رائے احباب کے مضامین شامل تھے۔ اردو ایڈیشن .. اصفحات اور ہندی ایڈیشن ۱۲۰ صفحات پر مشتمل تھا۔

۲۔ بات چیت کی نشستیں ہم نے گذشتہ سال کی رپورٹ میں لکھا تھا کہ فیلڈ کے اہم ترین مسائل پر سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کے خیالات و آرا حاصل کرنے اور انھیں رسالے کے واسطے سے دوسرے کارکنوں تک پہنچانے کی غرض سے ہم نے "بات چیت" کے نام سے جامعہ اور دلی کے حلقوں میں کام کرنے والے احباب اور بزرگوں کی بے تکلف نشستوں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ یہ سلسلہ ہمارے ناظرین میں بہت مقبول ہوا تھا۔

اس سلسلے کو ہم نے اس سال بھی حسب معمول جاری رکھا۔ اس سال کی یہ بحثیں ان کے شرکا کے مقام و مرتبے کے

اعتبار سے بہت نمایاں تھیں۔ اس لئے کہ ان بحثوں میں بڑی بلند مرتبہ شخصیتیں مثلاً شری اے۔ آر۔ دلیش پانڈے۔ شری سوہن سنگھ شری نیکی رام گپتا۔ شری شالگ رام پاٹھک شری ایم۔ ایم۔ ایل ٹنڈن اور پروفیسر گنگراڈے شریک ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ جامعہ کے احباب مشتاق احمد صاحب۔ شمس الرحمٰن محسن صاحب۔ محمد حسین حسان صاحب۔ دھرم ویر صاحب اور دوسرے کارکن پابندی سے اپنی شرکت سے ہمیں نوازتے رہے۔

زیر تبصرہ سال کے دوران میں حسب ذیل موضوعات پر بحث اور بات چیت رہی۔

۱۔ سوشل ایجوکیشن کے انتظامی مسائل۔

۲۔ ہمارے کمیونٹی سنٹر

ان دونوں بحثوں کے خلاصے رسالے میں شائع ہوئے اور ناظرین میں مقبول ہوئے۔

پچھلے پرچوں کی فروخت

ہم ایک عرصے سے ریاست اتر پردیش کے پنچایت راج ڈیپارٹمنٹ کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ مقامی پنچایتوں کے افسروں مثلاً پردھانوں اور سکریٹریوں کے مطالعے کے لئے رسالہ تعلیم و ترقی کی کاپیاں خریدا کرے۔ مجھے یہ رپورٹ دیتے ہوئے خوشی ہے کہ ہماری کوششیں بار آور ہوئیں۔ پنچایت راج ڈیپارٹمنٹ اتر پردیش کے ڈائرکٹر نے (چند مہینے ہوئے) تمام ضلع پنچایت افسروں کے نام ایک سرکلر جاری کیا ہے جس کے ذریعہ انھیں ہدایت کی گئی ہے کہ

> "رسالہ تعلیم و ترقی کے گذشتہ تین سال کے پرچوں کے دو دو مجموعے خرید لئے جائیں اور انھیں پنچایت انسپکٹروں اور پنچایتوں کا کام کرنے والے مددگار ڈیولپمنٹ افسروں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور اگر ممکن ہو تو بغیر کسی قسم کا دباؤ ڈالے مقامی پنچایتوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ خود بھی رسالے کے مستقل خریدار بن جائیں"

اس سرکلر کے نتیجے کے طور پر ضلع پنچایت افسروں کے یہاں سے ہمارے پاس گذشتہ پرچوں کے لئے آرڈر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور ہم نے ایسا انتظام کر لیا ہے کہ ان آرڈروں کی تعمیل وقت پر ہو جائے۔

یہ ہے رسالہ تعلیم و ترقی کے کاموں کی مختصر سی کیفیت۔ اگر میں یہ کہوں کہ رسالہ تعلیم و ترقی کی رپورٹ سوشل ایجوکیشن کی پوری ملک گیر تحریک پر تبصرہ کرنے کے ہم معنی ہے تو یہ بات حق بجانب ہو گی اس لئے کہ یہ رسالہ مرقع ہے اس پوری کیفیت کا جو سوشل ایجوکیشن کے میدان میں ملک میں سال بھر تک واقع ہوتی رہی ہے۔ اور چونکہ یہ تصویر اپنے اندر بہت زیادہ وسعت

دکھتی ہے اس لئے اس کا رُخ بھی ظاہر ہے اس سے کم وسیع کیا ہو گا۔لیکن اس مختصر رپورٹ میں اس تصویر کو دکھانے کا موقع نہیں تھا اس لئے محض اس کے انتظامی اور اداراتی مسائل ہی تک اسے محدود رکھا گیا۔

بالک ماتا سنٹر

(محترمہ حبیبہ قدوائی)

بالک ماتا سینٹر نے آج اپنی عمر کی سات منزلیں طے کر لیں۔ اتنا عرصہ گذرنے کے بعد اس بات کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ اس موقع پر بالک ماتا سینٹر کے مقاصد اور اس کے کام کا تعارف کرایا جائے۔ یہ تمام باتیں سال گذشتہ کی رپورٹوں میں واضح طور پر بیان کر دی گئی ہیں۔ اس ایک سال کے دوران میں جو کچھ ہم نے کیا اس میں کہاں تک ہم کامیاب ہوئے اور کہاں تک ناکامی ہوئی یہ سب آپ کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں۔

یہ سال کام کی کامیابی کے اعتبار سے زیادہ بہتر گذرا ہے۔ خاص طور پر مٹیا محل کے مرکز میں کام کی رفتار اور ہمارے لائحہ عمل میں قابل اطمینان اضافہ ہوا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مٹیا محل میں کام تین طرح سے ہوتا ہے۔ اول نرسری دوئم تعلیم بالغان اور سوئم دستکاری اور سلائی۔ اجازت دیجئے مختلف مرکزوں کے اعداد و شمار پیش کروں تاکہ کام کی رفتار کا اندازہ ہو سکے۔

	نرسری کے بچوں کی تعداد	دستکاری اور تعلیم بالغان کی طالبات کی تعداد
مٹیا محل	۱۳۵	۴۵
بیری والا باغ	۶۵	۴۲
قصاب پورہ	۶۷	۳۵

اس سال ابتدائی اور ادیب کے امتحان میں شرکت کرنے والی طالبات کی تعداد ۱۲ رہی اور ۵ طالبات نے ہائی اسکول کا امتحان دیا۔ ۳ لڑکیوں نے سلائی و کڑھائی کا امتحان پاس کیا۔

نرسری کی موجودہ تعداد کے بارے میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ اول تو یہ کہ اتنی بڑی تعداد کی مناسب تعلیم اور ذہنی تربیت کے سلسلے میں بڑی دشواری ہو جاتی لیکن سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کی گرانٹ سے اتنی رقم مل گئی کہ تعلیم اور کھیل کا سامان اچھی تعداد میں مہیا ہو گیا۔ دوئم ہماری سب سے بڑی دقت ایک نرسری کی اُستانی کی کمی ہے۔ ۱۳۵ بچوں کو باقاعدہ طور پر مصروف رکھنا یہ ایک اُستانی کے لئے بہت مشکل ہے۔

بیری والاباغ کے مرکز میں ہم نے اس بات کی کوشش کی کہ مٹیا محل کی طرح وہاں بھی تعلیم بالغان اور سلائی کڑھائی کا کام شروع کیا جائے۔ چنانچہ سلائی وکڑھائی کی کلاس میں دس طالبات نے داخلہ لیا ہے امید ہے کہ آیندہ سال ہم بہتر طور پر اس کام کو کرسکیں گے۔ اس کے علاوہ شام کو بستی کے غریب اور پسماندہ طبقے کے بچّوں کی صحت مند تفریح کے لئے ہم نے ایک بچّوں کا کلب بھی شروع کیا ہے اور اس کے لئے تفریح کے لئے کچھ سامان مہیّا کر دیا گیا۔ نگرانی کے لئے ایک اُستانی کی خدمات رضاکارانہ طور پر حاصل کرلی گئی ہیں۔ تعلیم بالغان کے لئے ہمارے پاس کوئی بجٹ نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کام کی ابتدا اس امید پر کردی گئی ہے کہ شاید آگے چل کر کچھ وسائل مہیّا ہوسکیں۔ ایک اُستانی رضاکارانہ طور پر اس کام کو کررہی ہیں اس حلقہ میں طالبات کی تعداد ۱۵ ہے۔

قصاب پورہ میں ہم نے سوائے نرسری کے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس علاقے کے مخصوص حالات ہیں اور دوسری وجہ جگہ کی تنگی ہے۔ اس لئے یہاں کام جہاں تھا وہیں ہے۔ اس علاقے میں ہم کوئی ترقی نہیں کرسکے اس کا ہمیں اعتراف ہے۔

لائبریری ۔ مٹیا محل میں لائبریری کی ابتدا باقاعدہ طور پر کردی گئی ہے۔ اس وقت ہمارے پاس تقریباً چھ سو کتابیں ہیں۔ لائبریری کو فروغ دینے کے سلسلے میں ہم جو کوشش کر رہے ہیں اس کے پس منظر میں ہمیں یقین ہے کہ آیندہ سال ہم لائبریری کا کام تسلی بخش طور پر انجام دے سکیں گے۔ لائبریری کے لئے سینٹرل سوشل ویلفیر بورڈ سے امداد کی درخواست کی گئی ہے اور امید ہے کہ آئندہ سال کتابوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوجائے گا اور اس کام کو ہم بہتر طور پر انجام دے سکیں گے۔

صحت وصفائی ۔ نرسری کے بچوں اور طالبات کی صحت کی دیکھ بھال کے لئے ایک لیڈی ڈاکٹر کی خدمات حاصل ہیں جو ہفتہ میں ایک بار تینوں مراکز کے بچّوں اور طالبات کا ڈاکٹری معائنہ کرتی ہیں۔ ضروری ادویات اور روزمرّہ استعمال میں آنے والی دواؤں پر مشتمل تینوں سینٹروں میں ایک ایک چھوٹی ڈسپنسری کا انتظام کیا گیا ہے۔ بچّوں کی صحت کے بارے میں لیڈی ڈاکٹر کی رپورٹ کی روشنی میں ان کے والدین کو ضروری ہدایات اور مشورے بھی دیئے جاتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر انھیں دوائیں بھی مہیّا کی جاتی ہیں۔

سماجی تقریبیں ۔ تعلیمی کام کے ساتھ ساتھ سوشل اور کلچرل سرگرمیوں پر بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔ حسب دستور ڈرامے پکنک ۔ سیریں ۔ جلسہ میلاد النبی ۔ یوم آزادی اور جشن جمہوریہ کے علاوہ ایک خاص اضافہ یوم اجل کا کیا گیا ہے۔

اس سال غیر ملکی ماہرین تعلیم اور سفارت خانوں کے کلچرل نمایندے ہمارے کام کو دیکھنے آئے انھوں نے کام کو پسند

کیا اور حوصلہ افزائی کی۔ امریکہ کی ایک کمپنی نے ہمارے کام کی دو فلمیں تیار کیں۔ یہ دونوں فلمیں بچوں کے کام سے متعلق ہیں۔
جامعہ کے تعلیمی میلے میں دستکاری کے نمونوں کی نمائش اور مصنوعات کی دُکان لگائی گئی۔ دکان کا سارا سامان طالبات اور اُستانیوں کا تیار کیا ہوا تھا۔ ہمارا زیادہ تر سامان فروخت ہوگیا اور نرسری کے بچوں کے پروگرام کو بہت پسند کیا گیا۔

یہ ہمارے کام کی مختصر روئداد تھی لیکن اس سے قبل کہ میں اپنی بات ختم کروں ایک دو باتیں ایسی ہیں جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ بالک ماتا سینٹر کو چلانے کی ذمہ داری جب میرے سپرد کی گئی تھی تو میں نے اسے اس لئے بخوشی منظور کرلیا تھا کہ ادارے میں میرے ساتھ ایسے ساتھی ہیں جو تجربہ کار ہیں اور اس میدان میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ مجھے توقع تھی کہ اپنے کام کے سلسلے میں ان کی رہنمائی اور تعاون ضرور ملے گا اور ہم باہمی اشتراک سے مل جل کر کام کریں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوسکا چنانچہ میں نے اپنی اہلیت اور بساط کے مطابق تنہا ہی اس کام کو انجام دینے کی کوشش کی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس حد تک اس میں کامیاب ہوں۔

اتنے عرصے تک کام کرنے کے بعد جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے ادارہ تعلیم و ترقی کے مختلف کام جو کبھی ایک ہی سلسلے کی کڑی تھے اب منتشر ہو چکے ہیں۔ یوں رسمی طور پر ہم سب ادارہ سے منسلک ہیں لیکن عملی طور پر ایک دوسرے کے کاموں میں کوئی ہم آہنگی نہیں معلوم ہوتی۔ اس طریقے سے ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ یہ صورت حال میری سمجھ کے مطابق ادارے کے لئے مفید نہیں ہے۔

رفتارِ کارواں (خبریں)

سوشل ایجوکیشن کی آل انڈیا کاؤنسل

معلوم ہوا ہے کہ تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ (حکومتِ ہند) نے اپنی ۲۸ جنوری ۱۹۶۱ء کی نشست میں سفارش کی ہے کہ سوشل ایجوکیشن کی ایک آل انڈیا کاؤنسل قائم کی جائے۔ اسی کے ساتھ بورڈ نے یہ سفارش بھی کی ہے کہ جو رضا کار ادارے اڈلٹ اسکول چلائیں انھیں "گرانٹ اِن ایڈ" کی شکل میں امداد بہم پہنچائی جائے۔

(انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن)

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن میں جلسہ تقسیم اسناد

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے اہتمام میں پچھلے دنوں یکے بعد دیگرے دو ٹریننگ کورس منعقد ہوئے تھے۔ پہلے مزدوروں کی تعلیم اور اس کے بعد اڈلٹ اسکولوں میں پڑھانے والے ٹیچروں کے لئے۔ دونوں کورسوں میں سب ملا کر تقریباً ۵۲ طالب علم تھے۔

آخر الذکر کورس کے اختتام پر دونوں کورسوں کے لئے ۱۵ فروری ۱۹۶۱ء کو مشترک جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا تھا جس میں طلبا کو سرٹیفکٹ دینے اور خطاب کرنے کے لئے سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کی چیرمین شریمتی درگا بائی دیشمکھ تشریف لائی تھیں۔

شریمتی دیشمکھ نے اپنے خطاب میں بہت صفائی کے ساتھ تعلیم خصوصاً سوشل ایجوکیشن کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اس کی شکایت کی۔ آخر میں موصوف نے اڈلٹ ایجوکیشن کی ضرورت واہمیت کا ذکر کیا اور خود اپنی شخصی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ "اڈلٹ ایجوکیشن کے فیض سے معجز نما نتیجے برآمد ہو سکتے ہیں۔ موصوف نے انکشاف کر کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا کہ میں نے ۲۴ سال کی عمر سے نجی طور پر پڑھنا شروع کیا اور اسی نجی مطالعہ کے فیض سے نہ صرف ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی بلکہ قانون کا مطالعہ کر کے وکالت بھی شروع کی"!

(زمانہ نگار تعلیم و ترقی)

دہلی پبلک لائبریری میں شری ٹنڈن کا سوگ

۱۵ فروری ہی کو ایک جانکاہ سانحہ بھی پیش آیا۔ دلی پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر شری من موہن لال ٹنڈن دلی کے تیرتھ رام

نرسنگ ہوم میں ہارٹ اٹیک کی نامراد بیماری کے ہاتھوں رحلت فرما گئے۔

مرحوم ٹنڈن صاحب کا سوگ منانے کے لئے ۱۸ فروری ۱۹۶۱ء کو دلی پبلک لائبریری میں ایک جلسۂ تعزیت منعقد ہوا جس میں
لائبریری بورڈ کے حالیہ اور سابق چیرمین پنڈت گوپی ناتھ امن اور ڈاکٹر یدھ ویر سنگھ جی، مجلس کے دوسرے ممبران، نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن
سنٹر کے ڈائرکٹر شری سوہن سنگھ شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے اور ٹنڈن صاحب مرحوم کے دوسرے احباب شریک تھے۔ لائبریری بورڈ
کے نمائندے اور لائبریری کے اسٹاف کے ایک نمائندے کی تقریروں کے بعد شری سوہن سنگھ نے ٹنڈن صاحب کی خدمات کا ذکر کیا
اور فرمایا "ٹنڈن کی محنت و لیاقت کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ابھی کچھ عرصہ پہلے یونیسکو کے اہتمام میں پبلک لائبریری کے
موضوع پر جو سیمنار یہیں دلی میں منعقد ہوا تھا، اس کے ڈائرکٹر کا بیان ہے کہ سیمنار میں ٹنڈن نے جو کانٹری بیوشن پیش کیا وہ کسی اور نے
نہیں کیا، اور اس اعتبار سے سیمنار میں ان کی شرکت اس کے لئے بے حد اہم اور گرانقدر تھی۔"

آخر میں ایک رسمی تجویز تعزیت صدارت کی طرف سے پیش کی گئی جسے سب لوگوں نے کھڑے ہو کر اور دو منٹ تک خاموش
رہ کر بہ اتفاق منظور کیا۔

(نامہ نگار تعلیم و ترقی)

شبینہ کالج اور مراسلاتی نصاب کا رواج اصولاً تسلیم

تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ (حکومت ہند) نے اپنی ۲۰ جنوری ۱۹۶۱ء کی نشست میں شبینہ کالجوں اور مراسلاتی کورسوں کی وہ
اسکیم بھی اصولاً منظور کر لی جو وزارت تعلیم نے مرتب کی ہے۔ وزارت تعلیم کی اسکیم یہ ہے کہ آرٹس، سائنس، اور پیشوں کی تعلیم دینے کے لئے
شبینہ کالج قائم کئے جائیں جن میں وہ طلبا داخل ہوں جو کام سے لگے ہوئے ہیں مگر ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اہتمام ایسا
ہو کہ ان کالجوں کی تعلیم کا معیار بھی وہی ہو جو دن میں چلنے والے عام کالجوں کا ہوتا ہے۔ سفارش کی گئی ہے کہ اس اسکیم کی تفصیلات
طے کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی کمیٹی بنائی جائے۔

اسی طرح وزارت تعلیم کی یہ اسکیم بھی کہ خط و کتابت کے ذریعے چلنے والے نصابوں کا رواج عام کیا جائے اصولاً مان لی گئی مگر
سفارش یہ کی گئی کہ قبل اس کے کہ اس اسکیم پر عمل کیا جائے، اس کی تفصیلات طے کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنا دی جائے۔

(انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن)

تعلیم و ترقی

(سوشل ایجوکیشن کا رسالہ)

March 1961

ادارۂ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر، نئی دہلی

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

مارچ ۱۹۶۱ء

جلد ۱۲ —— شمارہ ۳

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر

پروفیسر محمد مجیب

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر:- ماہنامہ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر،
نئی دہلی

قیمت

سالانہ چار روپے فی پرچہ ۴۰ نئے پیسے

ٹیلیفون:- ۴۴۴۶۴،

ترتیب

پرنٹر پبلشر برکت علی فراق نے محبوب المطابع برقی پریس اردو بازار دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

اشارات

اُلٹی بات

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے بارہویں نیشنل سیمینار کے لئے جو اس سال ستمبر کے مہینے میں کوئمبٹور میں منعقد ہونے والا ہے "سوشل ایجوکیشن اور جمہوری لامرکزیت" کو بحث کا موضوع قرار دیا ہے۔ اسی کے ساتھ آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے لئے سمپوزیم کا عنوان "سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کو فروغ دینے میں سرکاری اور رضاکار انجمنوں کا اشتراک" طے کیا گیا ہے اور اس پر تقریر کرنے کے لئے شریمتی درگابائی دیشمکھ سے فرمائش کی گئی ہے۔

تعلیم بالغان کی تحریک میں جب سے نیشنل سیمناروں کا رواج ہوا ہے اُس وقت سے آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی اہمیت اور حیثیت بہت کم ہو گئی ہے اور محض خانہ پری کی غرض سے اس کا انعقاد ہوا کرتا ہے؛ اور سیمنار کی بحث و گفتگو کی تکنیک کو دیکھتے ہوئے یہ صورتِ حال کچھ زیادہ مضر بھی نہیں ہے اس لئے کہ اس تکنیک کے پیشِ نظر جس کی رو سے زیر بحث موضوع پر تفصیل سے بحث و گفتگو ہوتی ہے، کانفرنس کی ایک یا دو دن کی مدت اس طرح کی گفتگو کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ یہی سبب ہے کہ نیشنل سیمنار کے انعقاد کی حالت میں کانفرنس کی کم حیثیتی کا نہ کسی کو احساس ہوا نہ اس کے لئے کسی گوشے سے کوئی آواز اٹھائی گئی۔

لیکن ستمبر میں منعقد ہونے والے بارہویں نیشنل سیمنار کا موضوعِ بحث دیکھئے اور کانفرنس کی مجلس مقالات (سمپوزیم) کے عنوان پر غور کیجئے تو ایسوسی ایشن کے اس فیصلے پر حیرت ہوتی ہے۔ "سوشل ایجوکیشن اور جمہوری لامرکزیت" کے زیرِ عنوان اس سے زیادہ اور کیا گفتگو ہو سکتی ہے کہ سوشل ایجوکیشن کا پروگرام گاؤں کی مقامی پنچایتوں کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ اور یہ ایسی بات ہے جس پر کسی نہ کسی ڈھنگ سے راجستھان اور دوسری ریاستوں میں جہاں جمہوری لامرکزیت کے قانون بن چکے ہیں، عمل بھی شروع ہو گیا ہے اور جہاں شروع نہیں ہوا ہے وہاں جلد یا بدیر شروع ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ ابھی تیسرے سال کی بات ہے کہ گارگوٹی نیشنل سیمنار میں یہی بات "سوشل ایجوکیشن کے انتظامی مسائل" پر گفتگو کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہی جا چکی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب وہ کون سی لمبی چوڑی بات ہے جس پر غور کرنا باقی ہے۔

اس کے مقابلے میں آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کی مجلسِ مقالات (سمپوزیم) کا عنوان ہے، جو اہمیت کے نقطۂ نظر

ایسا ہے کہ اس کے اوپر اب سے بہت پہلے سیمنار میں مفصل بحث وگفتگو ہو جانی چاہئے تھی (یعنی اب سے آٹھ نو سال پہلے جب حکومت نے سوشل ایجوکیشن کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کیا تھا) لیکن اُس زمانے میں اگر اس موضوع پر بحث نہیں ہوئی تو اب پھر اس کا وقت آیا ہے جب جمہوری لامرکزیت کے اصول کو تسلیم کر کے حکومت نے پردے ہی پردے میں اپنی اس غلطی کا اعتراف کر لیا ہے۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اس اہم اور وقت کے تقاضے سے ہم آہنگ گفتگو کو ایسوسی ایشن نے کانفرنس کے سمپوزیم کا موضوع قرار دے دیا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ کانفرنس میں شرکت کرنے والے بہت سے نمائندے سمپوزیم کے انعقاد سے پہلے ہی واپس روانہ ہو جاتے ہیں اور کانفرنس اس شان سے منعقد ہوتی ہے کہ عین سمپوزیم کے وقت بیشتر نمائندے اپنے اپنے بستر باندھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

ہونا یہ چاہیئے ——— اور ہم ایسوسی ایشن کے معزز عہدہ داروں سے اپیل کریں گے کہ وہ ہمارے اس سجھاؤ پر سنجیدگی سے غور کریں کہ ——— جو موضوع سمپوزیم کے لئے طے کیا گیا ہے، اس کے الفاظ میں تھوڑا سا رد و بدل کر کے اسے سیمنار کا موضوعِ بحث قرار دیا جائے اور کانفرنس کے سمپوزیم کے لئے کوئی دوسرا موضوع تلاش کیا جائے یا سیمنار کے موجودہ موضوع کو اُدھر منتقل کر دیا جائے جہاں ریزولیوشن کی شکل میں حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ جمہوری لامرکزیت کے اصول کو جسے وہ اصولاً تسلیم کر چکی ہے، عملاً بروئے کار لانے میں تیزی سے قدم اٹھائے اور جن ریاستوں میں ابھی تک اس باب میں قانون نہیں بن پائے ہیں، انھیں اس مقصد کے لئے آمادہ کرے۔

رہی شریمتی درگا بائی دیشمکھ کی شخصیت اور اس باب میں ان کا تجربہ، تو ہمیں اس سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے اور محترمہ سے فرمائش کرنا چاہیئے کہ وہ اس سیمنار کی ڈائرکٹری قبول فرمائیں۔ اگر کسی وجہ سے وہ اس کے لئے تیار نہ ہوں تو یہ درخواست کرنی چاہیئے کہ کم سے کم سیمنار کے پہلے دن گروپوں میں بات چیت کا سلسلہ شروع ہونے سے پیشتر اپنے خیالات اور تجربات سے نمایندوں کو فیض پہنچائیں تاکہ بات چیت کا صحیح رخ متعین ہو جائے۔

ہم ایسوسی ایشن کی خدمت میں یہ سجھاؤ اس لئے پیش کر رہے ہیں کہ ابھی اس فیصلے پر نظرثانی کرنے کا موقع ہے اور مجلس عاملہ کی کارروائی چلانے کے لئے دلی ہی میں اس کے اتنے ممبر موجود ہیں کہ کم سے کم اس کا کورم پورا ہو سکتا ہے۔ ورنہ ایک بار ابتدا میں جب بات الٹی پڑ جاتی ہے تو آخر تک الٹی ہی پڑتی رہتی ہے اور جو فیصلہ ہوتا ہے وہ بھی الٹا ہی ہوتا ہے۔

حکومتِ ہند کا نیک فیصلہ

حکومت ہند کے وزیر تعلیم محترم ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شری مالی نے پارلیمنٹ کے بجٹ سشن میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ تیسرے پنج سالہ پلان میں "نیشنل اسکالرشپ اسکیم" کے ماتحت ذہین طلبا کو وظیفے دے کر اعلیٰ تعلیم دلانے کا بندوبست کیا جائے گا۔ وظیفے منظور

کرنے کا معیار طے کرنے کی غرض سے میٹرک کی منزل پر ایک امتحان ہوگا جس میں پورے اترنے والے طلبا کو وظیفہ دے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا جائے گا اور انھیں ریاست کی سرپرستی میں تعلیم پانے والے "نیشنل اسکالر" قرار دیا جائے گا۔ اس مالی امداد کے علاوہ ان وظیفہ یاب طلبا کو ان کے تعلیمی کیریر کو تابناک بنانے کے لئے دوسری قسم کے مشورے بھی دیئے جائیں گے۔ اس نیشنل اسکالرشپ اسکیم کے علاوہ، وزیر تعلیم نے فرمایا، یہ تجویز بھی حکومت کے سامنے ہے کہ وہ ریاستیں جو میٹرک سے نیچے کے طلبا کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے وظیفے دیں گی ان کو بھی اس کام میں مرکزی حکومت مدد دے گی۔ اور اس مقصد کے لئے اپنے وظیفے کے دائرے کو وسیع کرکے ۶ سے ۱۱ سال کی منزل تک بڑھا دے گی جس کے ماتحت اس منزل کے ذہین اور ہونہار طلبا کو منتخب کرکے انھیں حکومت کے خرچ پر ثانوی تعلیم کے اقامتی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا جائے گا۔

لائق وزیر تعلیم نے مزید فرمایا کہ اس اسکیم پر عمل کرنے کی غرض سے ایک خودمختار بورڈ کی تشکیل کی جائے گی اور وظیفوں کے ایک جامع پروگرام کو فروغ دینے میں غیر سرکاری اداروں کی خدمات بھی حاصل کی جائیں گی۔

براہ راست وظیفوں کی اس اسکیم کے علاوہ وزیر تعلیم نے ایک اور اسکیم کا بھی اعلان فرمایا جو ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے استادوں کے بچوں کو وظیفہ دے کر تعلیم دلانے کے سلسلے میں ہے۔ وظیفوں کی یہ اسکیم بھی مرکزی سطح پر میٹرک کی منزل کے بعد سے قابل نفاذ ہوگی اور انھی طلبا کے لئے ہوگی جو غیر معمولی قابلیت و ذہانت کا ثبوت دیں گے۔ ریاستی سطح پر ان استادوں کے بچوں کو میٹرک سے نیچے کی منزل میں بھی وظیفے دیئے جائیں گے۔"

ان اسکیموں کا ذکر کرتے ہوئے وزیر موصوف نے آگے چل کر امید ظاہر کی کہ وہ وقت دور نہیں ہے جب ہمارے وسائل میں اضافہ ہوگا، اور ہم آسانی سے یہ دعویٰ کر سکیں گے کہ ذہین اور ہونہار طلبا تعلیم کی کسی منزل میں اپنی غربت و افلاس کی وجہ سے تعلیم کے فیض سے محروم نہیں ہونے پائیں گے۔"

تعلیم کے باب میں حکومت ہند کا یہ نہایت نیک اور ترقی پسندانہ قدم ہے اور اُس کی اِس تمنا میں ہم دل سے شریک ہیں کہ خدا وہ دن جلد لائے جب ہم ایسا انتظام کرنے کے قابل ہو جائیں کہ ملک کے ذہین دل و دماغ اور جوہر قابل اس بنا پر پیچھے نہ رہ جائیں کہ انھیں خدا نے غریب ماں باپ کی گود میں جنم دیا تھا۔ ملک کے نہ جانے کتنے عالی دماغ افراد آج محض اس بنا پر جہالت اور گمنامی کے غار میں پڑے ہوئے ہیں کہ انھیں تعلیم کے فیوض سے بہرہ مند ہونے میں ان کے افلاس نے رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ اس اعتبار سے یہ فیصلہ نہایت مبارک فیصلہ ہے اور اس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ حکومت وقت فیصلے کی غلطیاں تو چاہے کرتی ہو مگر نیت اس کی ہمیشہ نیک اور خیر اندیشانہ رہتی ہے۔

اگرچہ ان اسکیموں پر عمل کرنے کی غرض سے ایک خودمختار بورڈ بنے گا اور وہ یقیناً اس کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے غور کرنے کے بعد عملی پروگرام مرتب کرے گا، تاہم اس موقعے پر ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں ایک نکتے کی طرف اشارہ کر دیں جو اگرچہ ہو...

دائرے سے باہر رہ گیا تو اسکیم کے پیچھے جو بنیادی خیال ہے اسی کی موت واقع ہو جائے گی۔

ہندوستان کے دیہی اور شہراتی علاقوں کے درمیان ہر نقطۂ نظر سے جو فرق ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ اس فرق کا اثر جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں نظر آتا ہے، وہاں تعلیم کے باب میں بھی محسوس ہی نہیں ہوتا بلکہ کھٹک بھی پیدا کرتا ہے۔ شہروں میں بھی میٹرک تک کی تعلیم کے عام ادارے تو کثیر تعداد میں ہوتے ہی ہیں، پبلک اسکولوں کی بھی یہاں کمی نہیں ہوتی۔ ان دونوں اداروں میں تعلیم کے معیار کا جو فرق ہے، اس سے سب لوگ واقف ہیں۔ وظیفے کے لئے امتحان میں شریک ہونے والے طلبا کے درمیان شہری اور دیہاتی کا فرق تو چھوڑیئے خود شہروں میں فرق نمایاں رہے گا، اور عین ممکن ہے کہ پبلک اسکول جیسے اداروں کے طلبا ذہانت سے زیادہ اپنی مشق کی بدولت بازی لے جائیں اور جو واقعی ذہین ہیں وہ پیچھے رہ جائیں۔

ذہانت کی پہچان کے معاملے میں غلطی ہونے کا یہ اندیشہ تو خود شہر کے طلبا کے باب میں ہے شہراتی اور دیہاتی طلبا کے باب میں خصوصاً جب کہ گیارہ سال کی منزل پر ذہانت کی پہچان کا معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہے اور اس کا بہت زیادہ اندیشہ ہے کہ وظیفوں کی اس اسکیم سے اکثر و بیشتر شہراتی طلبا ہی فیضیاب ہوں اور دیہاتی بچے منہ تکتے رہ جائیں۔

ہمیں یقین ہے کہ محترم وزیر تعلیم وظیفوں کی ان اسکیموں کے معاملے میں ان خطرات پر پوری پوری نگاہ رکھیں گے اور کچھ ایسا اہتمام فرمائیں گے کہ حق حقدار ہی کو پہنچے اور اس سے وہ بچے جو قدرت کے خزانے سے تو جوہر قابل لے کر آئے تھے، مگر دنیا میں آکر سماج کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو گئے ہیں، ریاست کے ان فیاضانہ انعامات سے محروم نہ ہونے پائیں۔

اڈلٹ ایجوکیشن کا پروگرام

زیرِ نظر مضمون سے پہلے "واپس اڈلٹ ایجوکیشن کو" کے عنوان کے ماتحت دو مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے مضمون کا عنوان تھا "واپس اڈلٹ ایجوکیشن کو" اور دوسرے مضمون کا "اڈلٹ ایجوکیشن کسے کہتے ہیں"۔ بات ادھوری رہ جاتی ہے اگر اس سلسلے میں اس کی طرف اشارہ نہ کیا جائے کہ اس متعدد مفہوم کے پیشِ نظر کام کا کیا نہج ہوگا۔ اس مضمون میں بات کے اسی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

واضح رہے کہ اس طرح کے مختصر مضامین میں صرف خیال اور اس کے عملی پہلو سے متعلق چند موٹی موٹی باتیں پالیسی کے اعلان کے طور پر کہی جا سکتی ہیں۔ تفصیل کا موقع اس وقت آتا ہے جب اس خیال اور پالیسی کو تسلیم کر لیا جائے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا فیصلہ ہو جائے۔ اس لئے کوشش کی گئی ہے کہ تفصیلات کی طرف صرف اشارہ کر دیا جائے۔" ——— ایڈیٹر

۱۔ ناخواندگی کا خاتمہ

ہندوستان کے حالات کے پیشِ نظر اس مسئلے میں دو رائیں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتی ہیں کہ اڈلٹ ایجوکیشن کے چشمۂ فیض سے کوئی جماعت اُس وقت تک بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی جب تک اس کے سر پر ناخواندگی کا بھوت مسلط ہے۔ ہندوستان میں اڈلٹ ایجوکیشن کی بدنامی کا سبب یہی ہوا کہ اس بھوت سے ٹکر لئے بغیر اس نے اپنا کام کرنا چاہا۔ ظاہر ہے نتیجہ شکست فاش اور بدنامی کی شکل میں نکلا۔ روس اور چین کی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ روس نے سب سے پہلے ناخواندگی کو دور کرنے کی مہم سر کی۔ اڈلٹ اسکول یا اڈلٹ ایجوکیشن کے اسی طرح کے دوسرے ادارے اس مرحلے کے بعد کی منزل میں وجود پذیر ہوئے اور اب تک قائم ہیں۔ یورپ کے ممالک خصوصاً برطانیہ، جرمنی اور اسکینڈی نیویا کے ممالک جو اڈلٹ ایجوکیشن کے فیوض و برکات سے مالامال ہوئے ہیں اُن کے یہاں

لازمی تعلیم کا سلسلہ چونکہ بہت پہلے قائم ہو چکا تھا اس لئے ناخواندگی کی لعنت کا وجود ہی نہیں تھا۔

ان نظیروں کو اپنے سامنے رکھئے تو یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں اڈلٹ ایجوکیشن کی راہ سے کام کرنے کے لئے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ناخواندگی کی جڑ کاٹی جائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا اڈلٹ ایجوکیشن یا سوشل ایجوکیشن کے کام کے اوپر جو کچھ محنت اور سرمایہ لگایا جائے گا، سب رائگاں جائے گا۔

یہ مہم کس طرح سر کی جائے، اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے سامنے ایسے ملکوں کی مثالیں موجود ہیں جو ہماری ہی طرح ناخواندگی کی نحوست سے دوچار رہ چکی ہیں اور جب موقع ملا تو اس نحوست کو دور کرنا اپنا پہلا کام سمجھا۔ ان مثالوں کے علاوہ اس منحوس سائے کو دور کرنے کے مفصل پلان ہم خود ترتیب دے چکے ہیں۔ صرف ان کو آزمانا اور آزمائش کے بعد ڈھیلی چولوں کو کس کسا کر اس کے مطابق عمل کرنا باقی ہے۔

البتہ اس موقع پر اس سلسلہ میں ایک بات ضرور کان میں ڈالنے کی ہے اور وہ یہ کہ ناخواندگی کو ختم کرنے کی مہم قبل اس کے کہ اُسے آزما کر دیکھا گیا ہو، حکومت اپنے ذمے نہیں لے سکتی اور نہ اُسے لینا چاہیئے۔ اس سے پہلے کسی تجربہ کار اور معتبر غیر سرکاری ادارے کو تجربے کا یہ کام انجام دینا چاہیئے اور پھر حکومت کو اس کے نتائج کی طرف متوجہ کرنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام خود انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کو کرنا چاہیئے، اس لئے کہ اُسے اس میدان کا تجربہ بھی ہے، وہ معتبر جماعت بھی ہے اور حکومت کے یہاں بھی اس کا وقار اور آواز ہے۔

۲۔ تسلسلِ نصاب

ہمارے یہاں ایسا بھی نہیں ہے کہ ابتدائی منزل کی تعلیم کا رواج نہ ہو۔ اور نہ یہ کہ اس کا رواج اسی آزادی کے زمانے سے ہی شروع ہوا ہے۔ آزادی ملنے کے بہت عرصہ پہلے سے اگر گاؤں گاؤں نہیں تو چار چار پانچ پانچ گاؤں پر ایک کے حساب سے ابتدائی مدرسے موجود تھے اور آباد بھی رہتے تھے۔ پھر اس صورتِ حال میں سال بہ سال اصلاح اور ترقی ہی ہوتی رہی۔ لیکن ان سب کے باوجود دلچسپی کی بات یہ ہے کہ لٹریسی کا اوسط مدتوں ایک ہی حال پر قائم رہا ہے۔ مگر یہ واقعہ نہ کوئی کرتب ہے نہ کرامات۔ صرف ایک نکتے کا کھیل ہے اور وہ یہ کہ ایک طرف لوگ ابتدائی اسکولوں میں تعلیم پا کر فارغ ہوتے رہے۔ مگر دوسری طرف اگلی مردم شماری کا زمانہ آتے آتے جوں کے توں ان پڑھ ہوتے گئے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے اور اگر اسے روکنے کی کوشش نہ کی گئی تو اسی طرح آئندہ بھی جاری رہے گا۔

شیطان کی اس آنت کو کاٹنے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں۔ جن میں سے بنیادی بات یعنی آزادی کی فضا تو حاصل ہو گئی ہے

اور اس کے نتیجے کے طور پر علم اور تعلیم کا ایک صحت بخش ماحول پیدا ہو گیا ہے لیکن اس سے یہی ہوا ہے ـــــ اور اتنا ہی ہو سکتا ہے ـــــ کہ مریض کے علاج کے لئے صحت بخش فضا میسر ہو گئی ہے۔ مگر جب تک علاج شروع نہ ہو صرف صحت بخش فضا سے شفا کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔ علاج کے سلسلے میں سب سے مفید اور زود اثر نسخہ وہ ہے جسے اس میدان میں تسلسلی تعلیم CONTINUATION EDUCATION) کی اصطلاح سے جانا جاتا ہے اور چونکہ بہت سے ممالک کا آزمایا ہوا ہے اس لئے مجرب بھی ہے۔

کام کے اس مجوزہ پلان میں اس تسلسلی تعلیم کی دو شکلیں بہت اہم ہیں اور ان کی ضرورت اتنی شدید ہے کہ اس میں جتنی ہی دیر کی جائے گی قومی نقصان کی مقدار اسی حساب سے بڑھتی جائے گی۔

(الف) ابتدائی تعلیم کے بعد کا تسلسلی نصاب

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، ہمارے یہاں خواندگی کے اوسط کے ایک ہی نقطے پر قائم رہنے کی وجہ تعلیم کی کمی اتنی نہیں ہے جتنی ابتدائی تعلیم کی کم معیاری اور اس سے زیادہ تعلیم کے سلسلے کا عمر کی بالکل ہی کچی منزل میں کٹ جانا ہے۔ یہ بات اڈلٹ ایجوکیشن کی تعریف و تشریح کے باب میں واضح کی جا چکی ہے، کہ تعلیم زندگی اور عمل کی تعلیم کا درجہ اُس وقت اختیار کرتی ہے جب انسان بلوغت کی منزل میں قدم رکھتا ہے۔ اگر لکھنے پڑھنے کا وہ فن جو دس سے چودہ سال کی عمر میں ایک فرد حاصل کرتا ہے، سلسلۂ تعلیم کے کٹ جانے کی وجہ سے ختم ہو جائے تو وہ بلوغت کی عمر میں پہنچ کر اس فن سے کیا اور کس طرح فائدہ اٹھا سکے گا؟ کیا وہ فائدہ اٹھانے کے بجائے اوندھے منہ ناخواندگی کے کنویں میں نہ گر جائے گا۔؟

ان حالات میں اگر خواندہ لوگوں کو ازسرنو ناخواندگی کا شکار ہونے سے بچانا ہے تو کچھ اس طرح کا انتظام کرنا لازمی ہوگا جس سے گیارہ بارہ سال کا نوعمر طالب علم جو لازمی ابتدائی تعلیم کی منزل سے آگے بڑھنے کی سکت نہ رکھتا ہو، اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے تک لازمی طور پر گھنٹہ دو گھنٹے روزانہ اسکول میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔

اس انتظام سے اور کچھ نہیں تو اتنا تو ہو ہی جائے گا کہ خواندگی کا اوسط، دھیمی رفتار ہی سے سہی، آگے ہی منہ کو بڑھتا جائے گا۔ آج کی طرح ایک ہی نقطے پر قائم نہ رہے گا۔

(ب) خواندگی کی تعلیم کے بعد کا تسلسلی نصاب

اس نصاب کی بھی حیثیت اور ضرورت اُسی طرح کی ہے جیسی ابتدائی تعلیم کے بعد کے تسلسلی نصاب کی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اول الذکر کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہوگا جو لازمی ابتدائی تعلیم کے مدرسوں سے نکلیں گے، اور یہ ان بالغوں کے لئے ہوگا جو بالغوں کی خواندگی کی کلاسوں سے نکلیں گے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ چونکہ بالغوں کی ابتدائی درجے کی تعلیم ایک بہت ہی مختصر مدت کی کوشش کا نتیجہ ہوگی اس لئے حافظے کی تختی پر سے اس کے مٹ جانے کا اندیشہ نسبتاً زیادہ ہوگا۔ بچے کی ابتدائی تعلیم تو مٹتے مٹتے بھی آٹھ دس سال لے

لے گی اس لئے کہ اس کی تحصیل میں محنت اور مدت دونوں کی مقدار زیادہ صرف ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے جس علاقہ میں خاتمۂ ناخواندگی کی مہم منظم کی جائے، وہاں خواندگی کی جماعتوں سے نکلے ہوئے بالغ مردوں اور عورتوں کے لئے ایک مقررہ مدت کا تسلسلی نصاب ضروری ہوگا۔ جو خواندگی کی تازہ تازہ صلاحیت میں پختگی اور استواری پیدا کرنے کی غرض سے پڑھایا جائے گا۔

بالغوں کے اس تسلسلی نصاب کے کامیاب انتظام میں ایک رکاوٹ پیش آسکتی ہے جس کا پہلے ہی سے کوئی حل سوچ لینا ہوگا۔

بالغوں کی تعلیم کی سب سے نمایاں اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اختیاری ہوتی ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کو ابتدائی یا اس کے بعد کی تسلسلی تعلیم کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے لیکن بالغ کو اس کام کے لئے مجبور کرلے کے معنی تعلیم کی طرف سے اسے متنفر کرنے کے ہوں گے۔ اس لئے بالغوں کے تسلسلی نصاب کی کامیابی کے راستے میں یہ صورت حال رکاوٹ ڈال سکتی ہے، اور جو لوگ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیں، انھیں اس مقصد کے لئے بڑی باریک بینی کے ساتھ منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔

۳ - بالغوں کی تعلیم کے اقامتی ادارے

اڈلٹ ایجوکیشن کی تاریخ میں اقامتی اداروں کی بڑی نمایاں حیثیت رہی ہے اور اب تک ہے۔ اسکینڈے نیویا کے فوک ہائی اسکول اور انہی کے نہج پر بنے ہوئے برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے مزدوروں کے اسکول ان اقامتی اداروں کی مثالیں ہیں۔ یہ اقامتی ادارے نفس تعلیم بالغان کا الگ کوئی تصور پیش نہیں کرتے بلکہ اس کے ایک طریقہ کار منہاج عمل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان اداروں کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے قیام سے کسی مخصوص بات، خیال، یا نقطۂ نظر کی اتنی گہری تربیت مقصود تھی کہ وہی بات خیال یا نقطۂ نظر طالب علم کا اوڑھنا بچھونا اور دال روٹی بن جائے۔ اسکینڈے نیویا کے فوک ہائی اسکولوں کا مقصد اولین ذکر شٹن کولڈ کے بقول "ان کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرنا اور انھیں روشنی دکھانا" تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ فوک ہائی اسکول ڈنمارک کے لوگوں کی زندگی سے بے عملی اور سماجی بے گانگی کے خیالات کو دور کرنے اور انھیں زندگی کے جوش سے معمور اور تہذیبی یک جہتی کے جذبات سے سرشار کرنے کی غرض سے وجود میں آئے تھے۔ ضرورت اس بات کی اتنی شدید تھی کہ تعلیم کے عام سست رو راستے سے وہ مقصد پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ عوام کی توجہ کو ہر طرف سے ہٹا کر اسی ایک نقطے پر مرکوز کر دیا جائے۔ یہ مقصد ظاہر ہے اسی حالت میں پورا ہو سکتا ہے ــــ اگرچہ اس کے لئے اور باتیں بھی شرط ہیں مثلاً وہ شخص جس کی رہنمائی میں یہ چوبیس گھنٹے کی زندگی گذرے گی، اس کی شخصیت کی تاثیر وغیرہ ــــ جب لوگ کچھ عرصے تک ایک خاندان کی طرح چوبیس گھنٹے ایک ساتھ رہیں سہیں، کھائیں پئیں، پڑھیں لکھیں، کھیلیں کودیں، گائیں بجائیں ــــ غرض وہ سب کچھ جو انسانی زندگی کا معمول ہوتا ہے۔ مل جل کر ایک ساتھ رہ کر با جماعت کریں اور اس طرح اس مخصوص خیال یا نقطۂ نظر یعنی ایک عملی جماعت وجود میں آجائے اور

نظریے کو عمل کے روپ میں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ہو۔ اسکینڈی نیویا اور برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں انیسوی صدی کے آخری نصف میں عوام اور مزدوروں کی تعلیم کے جتنے بھی اقامتی ادارے قائم ہوئے ان سب کے پیچھے یہی ایک بات کارفرما نظر آئے گی۔

ہندوستان میں ہم نے بالغوں کی تعلیم کے لئے ایسے اقامتی اداروں کا تجربہ تو کیا لیکن اوّل تو ان تجربوں کی مدت بہت کم تھی دوسرے چند بنیادی غلطیاں بھی ہم سے سرزد ہوئیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم تعلیم بالغان کے اس طریقۂ عمل کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں سماجی ارتقاء کے راستے میں ایک چھوڑ درجنوں روڑے اٹکے پڑے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کوہ ہمالیہ معلوم ہوتا ہے، اس طرح کے اقامتی اداروں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، یہ اقامتی ادارے اڈلٹ ایجوکیشن کا الگ سے کوئی تصور پیش نہیں کرتے بلکہ اس کی ایک ایک شاخ کے لئے طریقۂ کار پیش کرتے ہیں، اس لئے انھیں متعدد صحت مند نظریات کی تربیت اور ٹریننگ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً چھوت چھات، ذات پات، اونچ نیچ، امیر غریب وغیرہ کے بھید بھاؤ کو دور کرنے کے لئے، ملک کے مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان محبت و یگانگت اور رواداری کے جذبات کی پرورش کے لئے، غلامی کے زمانے کی تنگ نظری، خودستائی، بداندیشی، خودغرضی اور اقتدار پرستی جیسی بیماریوں کو دور کرنے اور ان کو جمہوری طرز زندگی کے آداب و روایات کی تربیت اور عملی مشق بہم پہنچانے کے لئے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بات اپنی جگہ اٹل اور مسلّم ہے کہ اس قسم کے اقامتی اداروں کی سرداری معمولی ہاتھوں میں نہیں ہونی چاہئے بلکہ اس کی مثال قدیم زمانے کے رشی آشرموں، خانقاہوں اور وہاروں کی سی ہونی چاہئے اور ان کے سربراہوں کی حیثیت مانے ہوئے رشیوں منیوں صوفیوں اور عالموں اور بھکشوؤں کی ہونی چاہئے۔ جن کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ ہندوستانی تہذیب کا مزاج ہے۔ اور مزاج کے خلاف کوئی بات چاہے وہ کتنی ہی وزنی کیوں نہ ہو جی کو لگتی نہیں ہے۔ ہمارے جنتا کالج یا لوک ودیاپیٹھ جو ناکام ہوئے ہیں، اس کا ایک بڑا سبب یہی تھا کہ ان کے پرنسپل یا آچاریہ اور دوسرے اساتذہ اتنے کم حیثیت لوگ تھے کہ اپنی بات کا نقش اپنے طالب علموں کے اوپر نہیں بٹھا سکتے تھے۔

اڈلٹ ایجوکیشن کے اس مجوزہ پلان کے مطابق اٹھارہ سال سے اوپر مگر ۳۰ سال سے نیچے کی عمر کے بالغوں کو زندگی اور جمہوریت کی تربیت دینے کی غرض سے اس طرح کے پانچ پانچ چھ چھ مہینے کے اقامتی اسکول قائم ہونے چاہئیں اور اس شان سے قائم ہونے چاہئیں کہ وہ لوگوں کے لئے زیارت گاہیں بن جائیں جن سے فیض حاصل کرنے کی مسرت تو ہو ہی، اس سے زیادہ ان کے فیض سے محروم رہنے کا لوگوں کو غم اور افسوس ہو۔ میرے خیال میں اس طرح کے اقامتی ادارے (جیسا کہ ڈنمارک، ٹیم کی

رپورٹ میں کہا گیا ہے) تین سو گاؤں والے ہر کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک میں ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔

اس مقام پر ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب ہوگا اور وہ یہ کہ یہ اقامتی ادارے" زیارت گاہیں" ہرگز نہیں بن سکیں گے اگر وہ براہ راست سرکار کے اہتمام و انصرام میں قائم ہوں گے۔ زیارت گاہ یہ اسی وقت بنیں گے۔ جب ان کا تعلق کسی "باباجی" یا "پیرجی" سے جوڑا جائے گا، جس طرح زورل انسٹی ٹیوٹوں کا تعلق باباجی یا پیرجی ٹائپ کے غیر سرکاری اولیاء سے قائم کیا گیا ہے۔ (مسلسل)

نوٹ۔ اس "پروگرام" کی دوسری قسط اگلے پرچے میں شائع کی جائے گی۔ جس میں حسب ذیل عنوانات کے تحت "پروگرام" تجویز کیا جائے گا۔

۱۔ بالغوں کی تعلیم کے مختلف مدتوں کے کورس اور اسکول

۲۔ بالغوں کی تعلیم میں یونیورسٹیوں کا تعاون

۳۔ کمیونٹی سنٹر اور کلب وغیرہ

۴۔ نتائج۔

خواندگی کی مشقی سرگرمیاں

کچھ خیالات

خواندگی کی مشقی سرگرمیوں کے باب میں واقعاتی اور باضابطہ تحقیقاتوں کی اتنی کمی ہے کہ یہ بات آسانی سے صاف صاف نہیں کہی جا سکتی کہ خواندگی سے ناخواندگی کی طرف رجعت[1] کی کیا کیفیت ہے۔ جامعہ ملیہ کی ایک تحقیقات میں بتایا گیا ہے کہ ایک سال کے اندر اندر رجعت کا اوسط تقریباً ۶۰ فی صدی ہوتا ہے۔ ایک دوسری تحقیقات جو راجکوٹ میں کی گئی تھی اس سے پتہ چلا ہے کہ ایک سے تین سال کی مدت میں ۳۰ فی صدی رجعت پوری تھی اور ۵۰ فی صدی جزوی۔ اس میدان میں کام کرنے والے کارکنوں کا بہرحال تجربہ یہ ہے کہ یہ رجعت بہت بڑی مقدار میں واقع ہوتی ہے اور چونکہ مشقی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی ناقص اور ناکافی ہوتی ہے اس لئے خواندگی کی وہ صلاحیت جو بالغوں کو ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے بعد نصیب ہوتی ہے، ریت کی دیوار کی طرح دیکھتے دیکھتے برابر ہو جاتی ہے۔

ان مشقی سرگرمیوں کے دو خاص مقصد ہوتے ہیں (الف) سیکھی ہوئی بات کو محفوظ و برقرار رکھنا۔ یا دوسرے الفاظ میں فرد کو ناخواندگی کی طرف رجعت کرنے سے بچانا اور (ب) جو صلاحیت اور علم پہلے سے حاصل ہو، اس کی مزید نشوونما کرنا۔ اسے یوں کہئے کہ فرد کو جہالت کی طرف رجعت کرنے سے باز رکھنا۔

اس سلسلے میں جن سرگرمیوں کو کارکنوں نے آزمایا اور کارگر پایا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) گاؤں میں سرکاری عمارتوں کی دیواروں کے اوپر طرح طرح کے اقوال، نعرے، اشعار، حروف تہجی اور ہندسے صاف اور موٹے خط میں لکھوانا تاکہ یہ الفاظ، حروف اور ہندسے ہر وقت گاؤں والوں کی نظروں کے سامنے رہیں۔

(۲) نوخواندوں میں بغیر ٹکٹ کے پوسٹ کارڈ تقسیم کرنا اور انھیں آمادہ کرنا کہ وہ اپنے عزیزوں، رشتے داروں کو خط لکھ کر بھیجیں اور ان کے پاس جو خطوط آئیں، ان کے جواب لکھیں۔ نوخواندہ لوگوں سے آپس میں ایک دوسرے کو بھی خط لکھوائے گئے ہیں۔

---

[1] RELAPSE کے لئے ہم نے رجعت کا لفظ منتخب کیا ہے چنانچہ اس مضمون میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس کے یہی معنی ہیں۔

(۳) جو لوگ پڑھنے سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کی اور جو صرف لکھنا چاہتے ہیں، ان کی ٹولیاں، کلب اور اسٹڈی سرکل بنانا، اور ان کی ہفتہ وار نشستیں کرا کے بات چیت اور تبادلۂ خیالات کے ذریعے ان میں نئے نئے اور اُپج والے کام کرنے کا ذوق پیدا کرنا۔

(۴) دیواری اخبار اور اخباری پوسٹر۔ کہیں کہیں اخبار بینی کا بھی تجربہ کیا گیا ہے۔

(۵) مختلف چیزوں کے مقابلے منعقد کرانا اور انعامات تقسیم کرنا۔

(۶) ریڈنگ روم اور مرکز اطلاعات (جو کمیونٹی سنٹر کا کام بھی کرے) منظم کرنا۔

(۷) گشتی اور مستقل کتب خانے قائم کرنا اور کتابوں کی "نمائش" منعقد کرنا۔

(۸) "یوم خواندگی"۔ "یوم کتب خانہ" اور "سوشل ایجوکیشن ڈے" منانا اور اسی طرح کی دوسری تقریبیں منعقد کرنا۔

(۹) آسان عبارت اور موٹے حرفوں میں چھپے ہوئے رسالے شائع کرنا اور نو خواندوں کو اس میں مضمون لکھنے کے لئے اُبھارنا اور آمادہ کرنا۔

(۱۰) مندر یا کمیونٹی سنٹر جو جگہ بھی موزوں ہو، وہاں رامائن، مہابھارت اور دوسری رزمیہ داستانوں اور مذہبی صحیفوں کی تلاوت کا انتظام کرنا۔

(۱۱) بستی کے مختلف منظمین جیسے ریڈیو سننے والوں کی ٹولی، نوجوان برادری، مہیلا منڈل، ڈراما کلب وغیرہ، ان کے عہدہ داروں اور ممبروں کو آمادہ کرنا اور حوصلہ دلانا کہ اپنی بیٹھکوں کی پوری پوری کارروائی قلمبند کیا کریں اور دوسرے جلسے میں اسے پڑھ کر سنایا کریں۔

(۱۲) سرکاری محکموں اور دوسرے رضاکار اداروں کے شائع کئے ہوئے پوسٹروں، چارٹوں، خاکوں اور نقشوں وغیرہ کی تقسیم، اور لوگوں کو انھیں پڑھنے، سمجھنے اور ان کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کرنے کی دعوت دینا۔

"خواندگی کا دوسرا درجہ" کے نام سے خواندگی کے بعد کی کلاسوں کا تجربہ بھی کیا گیا ہے۔ یہ کلاسیں ان بالغوں کے لئے تھیں جنھوں نے خواندگی کا پہلا درجہ پاس کر لیا تھا۔ اور اس کے آگے کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس تجربے کی تحریک غالباً اس سے ہوئی کہ کمیونٹی پروجیکٹ ایڈمنسٹریشن (جسے اب کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور تعاون کی وزارت کہتے ہیں) اس کے کتابچے "سوشل ایجوکیشن مینول" اور وزارت تعلیم کی مطبوعہ کتاب "ٹیچرز ہینڈ بک آف سوشل ایجوکیشن"۔ دونوں میں خواندگی کا ایک معیار ٹھہرا دیا گیا تھا اور خواندگی کے بعد کی تعلیم کے لئے نصاب تجویز کئے گئے تھے۔ ان نصابوں میں لکھائی پڑھائی اور معمولی حساب کے علاوہ دوسرے مضامین بھی شامل تھے۔ جیسے صحت و صفائی، عام معلومات، امداد باہمی کے اصول اور طریق کار، کھیتی باڑی، تفریح اور دل بہلاؤ، اور مقامی صنعتیں اور دستکاریاں وغیرہ۔

(مشورہ)

خواندگی کی کلاس میں جو کچھ پڑھانا یا بتانا ہو وہ دلچسپ، بے تکلف اور بات چیت کے انداز میں بتانا چاہیئے۔ اس کام کا ایک طریقہ ٹولیوں کی آپس کی بحث و گفتگو بھی ہے جسے اس مقصد کے لئے بھی آزمانا چاہیئے۔ مگر اس بحث و گفتگو کا اصل محور ہر حالت میں مقامی حالات ہونے چاہئیں اور ان کا سیکھنے والے کی زندگی کی واردات سے براہ راست تعلق ہونا چاہیئے۔ پھر معلومات کی یہ تبلیغ صرف انہی لوگوں تک محدود نہ رہنی چاہیئے جو خواندگی کی کلاسوں میں حاضر ہوتے ہیں، بلکہ ان کی پہنچ گاؤں یا بستی کے تمام لوگوں تک ہونی چاہیئے اور اس مشن کو پورا کرنے میں خواندگی کے اساتذہ، طلباء، مقامی لیڈروں اور گرام سیوکوں، سب کی خدمات حاصل کرنی چاہیئے۔ پڑھنے پڑھانے کا یہ بے ضابطہ اور بے تکلف طریقہ صرف یہی نہیں کہ نوخواندہ لوگوں کے لئے ایک باثر اور کارگر تفریحی مشغلہ ثابت ہوگا، بلکہ جو ناخواندہ بالغ اب تک خواندگی کے درجے میں شریک نہیں ہیں، انھیں اس میں کھینچ بلانے کا نہایت زبردست محرک بھی ہوگا۔

رفتارِ کارواں ———— بقیہ صـ ۳۲

ریاست آندھرا میں جبری ابتدائی تعلیم کا قانون پاس

پی۔ ٹی۔ آئی کی اطلاع ہے کہ آندھرا لجیسلیٹو کاونسل میں جبری ابتدائی تعلیم کا بل پاس ہو گیا۔ ریاست کے وزیر تعلیم شری ایس۔ بی۔ بی پٹابھی راما راؤ نے، جنھوں نے یہ بل پیش کیا تھا، فرمایا کہ "آندھرا پہلی ریاست ہے جس نے دستور کے رہنما اصولوں (ڈائرکٹیو پرنسپلز) کے مطابق جبری ابتدائی تعلیم کا نفاذ کیا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "مجھے امید ہے کہ اس قانون کو کامیاب بنانے میں سماج کے ہر طبقے سے اشتراک و تعاون حاصل ہوگا اور اس منصوبے میں غریب طالب علموں کو دوپہر کا کھانا، کپڑا اور کتابیں مفت فراہم کرنے کا جو عزم کیا گیا ہے وہ پورا ہو گا۔"

(اسٹیٹسمین مورخہ ۲ مارچ ۱۹۷۱ء)

تعلیم میں

اساتذہ اور والدین کا اشتراک

پرانے زمانے میں ہمارے ملک میں رشیوں اور مہاتماؤں کے آشرم ہی اسکول ہوا کرتے تھے۔ فطری مناظر کی گود میں تعلیم و تربیت کا کام ہوتا تھا۔ اس زمانے کے اساتذہ آج کے پیشہ ور معلموں کے مقابلے میں بہت اونچے اور مہان تھے۔ وہ بے لوث خدمت کے جذبے سے تبلیغ علم کا کام کرتے تھے اور اُسے ودیا دان کا نام دیتے تھے۔ "دان" جو بے لوث جذبے کے تحت دیا جاتا ہے، جس میں پیشہ ورانہ لین دین کا شبہ بھی نہیں ہوتا۔ سماج مجموعی طور پر ان کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا اور ان کی ضروریات کو پورا کر کے اپنی ذمہ داری کو سمجھاتا تھا۔ استاد اور طالب علموں کا رشتہ بہت ہی پاک رشتہ ہوا کرتا تھا۔ طالب علم حتی الوسع استاد کی خدمت کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک استاد کا "آشرواد" ہی تمام علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ طالب علموں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی کہ طالب علم اور اُستاد کے درمیان شخصی رابطہ میں کسی قسم کا خلل آسکے۔ بدنظمی، بدتمیزی اور گستاخی کی بات تو کوئی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ سارے طالب علم ایک ہی خاندان کے فرد کی حیثیت سے زندگی گذارتے تھے۔ اساتذہ اور ان کی بیویاں ان سے ماں اور باپ کی طرح پیش آتے تھے۔ اور اس حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں وہ پوری مستعدی دکھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں طالب علموں کے والدین انھیں ایسے اساتذہ کی خدمت میں بھیج کر مطمئن ہو جاتے تھے۔ جہاں اُن کے بچوں کو تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ والدین کی شفقت بھی ملتی تھی۔

مگر آج حالات اس سے بالکل مختلف ہیں۔ چند گنے چنے پبلک اسکول کی قسم کے اداروں اور دیہی گروکلوں (ہندوستانی مکتبوں) کو چھوڑ کر تمام دوسرے اسکولوں کا ماحول سماج کے غلط اثرات سے نہیں بچ پاتا۔ تبلیغ علم اساتذہ کا ذریعۂ معاش بن چکی ہے۔ اور وہ کافی حد تک اجرت پر کام کرنے والوں کی طرح پیش آنے کے لئے مجبور ہیں۔ وہ اپنے مقام کی بلندی سے بہت پہلے ہی گر چکے ہیں۔ اُن کی دعائیں (آشیرواد) بے اثر ہو چکی ہیں۔ ایک ایک استاد کے ساتھ طالب علموں کی اتنی بڑی تعداد لگ چکی ہے کہ شخصی رابطہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ اُن کے آپسی رشتوں کے درمیان دیواریں حائل ہو گئی ہیں۔ آج کا نظام تعلیم اس قسم کا ہے کہ ۹۰ فی صدی اسکولوں میں طالب علم اساتذہ کے ساتھ سال میں صرف ۹ مہینے رہ پاتے ہیں اور ان ۹ مہینوں میں بھی وہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ۵ گھنٹے سے زیادہ وقت اساتذہ

کے درمیان نہیں گذارتے۔ طلباء اور اساتذہ کے درمیان محبت، دیانت اور اعتماد ختم ہو چکا ہے۔ اسکولوں میں دن دونی رات چوگنی بڑھتی ہوئی بدنظمی اور بے چینی نے اسکولوں کے اساتذہ اور منتظمین کو پریشان کر رکھا ہے۔ اور آج یہ مسئلہ اسکول اور کالج کا مسئلہ نہ رہ کر تمام ملک اور سارے سماج کے لئے خطرہ بنا ہوا ہے۔

اس نازک صورتِ حال کے کئی سبب ہیں اور ان سب کے لئے صرف استاد کو قصوروار ٹھہرانا اس کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوگی اور اسی کے ساتھ یہ کہنا کہ اس صورتِ حال کو بہتر بنانے کی ذمّہ داری اکیلے استاد ہی کے اوپر ہے، میرے خیال میں ایک بہت بڑی حماقت ہوگی۔ اس کے لئے اصل میں ان حالات کو بدلنے کی ضرورت ہوگی جو آج پھیلی ہوئی بے چینی اور بدنظمی کے لئے ذمّہ دار ہیں۔ اس کے لئے بہت سے وسائل مہیا کرنے ہوں گے اور ہر ممکن طریقہ اختیار کر کے اساتذہ کو اس کام میں مدد دینی ہوگی۔ اُسی وقت ہم اپنے ملک کے ان مستقبل کے علم برداروں کو تباہیوں کے اندھے کنویں میں گرنے سے بچا سکیں گے اور ملک کے شان دار مستقبل کا خواب دیکھ سکیں گے۔

مندرجہ بالا حقائق پر طائرانہ نظر ڈال لینے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگر والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے زندگی میں کامیاب ہوں تو ان کا یہ فرض صرف بچے کو اسکول میں داخل کرا دینے، ان کے لئے کتاب کاپیوں اور دیگر ضروری سامان اور فیس وغیرہ مہیا کر دینے سے ہی پورا نہیں ہو جاتا ہے بلکہ اس سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ اساتذہ سے برابر تعاون کرتے رہیں۔ اسی مقصد کے لئے آج ہر اسکول میں والدین اور اساتذہ کی ملی جلی انجمن بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ملک میں ملٹی پرپز اسکولوں کے کھلنے سے اس طرح کی انجمنوں کا قیام اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ اب آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہر طالب علم کے سامنے ایک سوال آتا ہے کہ وہ علم و فن کی مختلف شاخوں میں سے اپنے لئے کون سی شاخ منتخب کرے۔ یہ فیصلہ کرنے میں اگرچہ طالب علم کی ذہنی استعداد، مختلف دھندوں اور کاموں کی مانگ اور ملک اور سماج میں مخصوص کاموں کی ضروریات پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے تاہم یہ تمام فیصلے بیشتر والدین کی مرضی پر ہی منحصر ہوتے ہیں اور چاہے اس کا کچھ بھی نتیجہ نکلے اس کی مرضی ہی ان کے لئے آخری فیصلہ ہوتی ہے۔ اس لئے اساتذہ اور والدین اگر برابر ملتے جلتے رہیں اور اس طرح ان میں ایک دوسرے پر بھروسہ اور اعتماد پیدا ہو تو وہ آپس میں مل کر طالب علم اور اس کے مستقبل کے تمام پہلوؤں پر تبادلۂ خیالات کر سکیں گے۔ اپنا نظریہ ایک دوسرے کے سامنے رکھ سکیں گے اور بالآخر ایک ایسے نتیجے پر پہنچ سکیں گے جو طالب علم کی زندگی اور اس کے مستقبل کو سنوارنے کی ضمانت ہو سکتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کی انجمن اس سلسلے میں سب سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

والدین اور اساتذہ کی انجمن کا ایک اہم کام ہوتا ہے بچوں کے والدین کو مختلف دھندوں اور کاموں سے باخبر رکھنا۔ اس اعتبار سے ہندوستان کے اسکولوں میں ان انجمنوں کے قیام کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ہمارے ملک میں جو بچے آج پڑھ رہے ہیں، ان میں سے بیشتر بچوں کے والدین علم کی دولت سے بے بہرہ رہے ہیں اور انھیں اس سلسلے میں بہت کم واقفیت ہے

ہر طالب علموں کی زندگی کے روز مرہ کے مسائل جیسے کلاس میں دیر سے آنا، اسکول سے غائب رہنا، گھر کا کام پورا نہ کرنا، پڑھائی میں دلچسپی نہ لینا، مار پیٹ اور گستاخی کرنا یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں اساتذہ اور والدین مل کر سلجھا سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان مسائل پر انجمن کے جلسوں میں ہر طالب علم کے مسائل پر الگ الگ غور کرنا ممکن نہیں ہے اور ان مسائل پر ایک عام بحث اور غور و خوض ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود یہ انجمن والدین اور اساتذہ کے ملنے جلنے اور انھیں ایک دوسرے کو سمجھنے اور ان پر اعتماد پیدا کرنے کا موقع دیتی ہے جو ان کے لئے الگ سے فرداً فرداً ملتے جلتے رہنے کی ایک راہ کھولتی ہے۔

اساتذہ اور والدین کی انجمنوں کا تجربہ کچھ اقامتی درسگاہوں میں بہت کامیابی کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ وہاں بہت مفید بھی ثابت ہوا ہے۔ ایسی درسگاہیں جو اقامتی نہیں ہیں وہاں یہ تجربہ اور بھی زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ جہاں طالب علم سال میں سات مہینے اور دن میں ۹ گھنٹے والدین کے ساتھ گذارتے ہیں۔

ایک مسئلہ

پچھلے سال کی بات ہے میں نے اپنے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے سامنے اسکول میں والدین اور اساتذہ کا ایک جلسہ بلانے کی تجویز رکھی تھی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب یہ تجویز سنتے ہی چونک اٹھے اور کہنے لگے "بھئی میں یہ بے وقوفی نہیں کرتا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار یہ حماقت کر چکا ہوں اور اب مجھ میں یہ ہمت نہیں ہے کہ اسے پھر سے دہراؤں"۔ جب میں نے بہت اصرار کیا تو انھوں نے اپنا تلخ تجربہ بیان کیا کہ "اسکول کی دعوت پر والدین کافی تعداد میں اسکول پہنچے مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کتنے لوگ دعوت کھانے کے خیال سے آئے تھے اور کتنے گانا بجانا سننے کے خیال سے۔ کیونکہ ان کے سامنے جیسے ہی طالب علموں کی زندگی اور ان کے مسائل کا خشک موضوع سامنے آیا تو ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ ایک ایک کر کے لوگ کھسکنا شروع ہوئے...... اور بعد میں انھیں یہ کہتے سنا گیا کہ "ماسٹر لوگ ٹیوشن کرنے کے لئے کیا کیا جال بچھاتے ہیں"۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی اس مثال کو ہم ایک استثنا قرار دے کر بڑی آسانی سے ٹال سکتے ہیں اور والدین کے اس رویہ کو ان کی جہالت اور کم فہمی پر محمول کر کے اس کے لئے حل بھی تلاش کیا جا سکتا ہے مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی جیسے بڑے شہر لکھنؤ ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ لوگوں کے شہر کے اسکولوں میں بھی اسی طرح کے واقعات سامنے آتے ہیں تو پھر ہمیں اس کے اوپر سوچنا پڑتا ہے۔ وہاں بھی دیکھا گیا ہے کہ اکثر اسکولوں کے ذمہ دار حضرات والدین اور اساتذہ کی انجمنوں کے قیام سے کتراتے ہیں اور ان کے جلسے بلانے سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے کہ یہ جلسے اکثر و بیشتر محبت اور اعتماد کی فضا میں بات چیت کی مجلس بننے کے بجائے ایک دوسرے پر الزام تراشی کے اکھاڑے بن جاتے ہیں اور والدین اور اساتذہ اپنے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے شکوک و شبہات لے کر رخصت

ہوتے ہیں۔

ایک حل:-

باتیں تو یہ سب ٹھیک ہیں مگر اسی کے ساتھ یہ سوچنا کہ چونکہ اس راستے میں یہ ساری دشواریاں ہیں اس لئے اساتذہ اور والدین کی انجمن کا قیام فضول ہے تو یہ ایک بہت بڑی بھول ہوگی۔ اس طرح کی انجمنیں اکثر جگہوں پر بہت کامیابی سے چل رہی ہیں اور وہ بہت مفید بھی ثابت ہوئی ہیں جہاں جہاں یہ انجمنیں ناکام رہی ہیں وہاں اس کی بنیاد میں صرف یہی ایک بات ملتی ہے کہ اساتذہ اور والدین میں باہم یگانگت اور اعتماد کا جذبہ پیدا ہوئے بغیر طالب علموں کے مسائل سامنے لے آئے جاتے ہیں۔ اس سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلتی ہیں۔ اساتذہ اور والدین کی انجمن کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے یہاں میں کچھ تدابیر کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ اساتذہ اور والدین کی انجمن کا جلسہ تعلیمی سال میں تین یا چار بار ضرور بلایا جائے جس سے کہ دونوں فریق کو باہم ملنے جلنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع مل سکے۔

(۲) وقتاً فوقتاً اسکول میں کچھ سماجی اور تہذیبی تقریبیں منانا اور اس میں والدین کو شرکت کی دعوت دینا۔ اس سے والدین اسکول کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے لگیں گے اور رفتہ رفتہ اس کے معاملات کو بھی سمجھنے لگیں گے اور اس بہانے ان کے اندر اساتذہ سے ملنے جلنے اور انھیں سمجھنے بوجھنے اور ان پر اعتماد کرنے کا موقع ملے گا۔

(۳) اسکول میں سماجی اور قومی مسائل اور منصوبہ بند ترقی کے بارے میں تقریریں کرانا اور اسکول کے کتب خانوں میں والدین کی دلچسپی کی کتابیں رکھنا۔ والدین کو ان کتابوں سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا موقع دینا۔

(۴) بچوں کے والدین کو طالب علموں کے بارے میں غور و خوض کرتے وقت شریک کرنا اور انھیں پوری آزادی سے اپنے خیالات ظاہر کرنے کا موقع دینا۔ ان کے شکوک و شبہات دور کرنے کی کوشش کرنا۔

(۵) اکثر دیکھا گیا ہے کہ والدین اس کام کو جو اسکول میں بچوں کی رہنمائی کے نام سے کیا جاتا ہے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لئے کرنا چاہئے کہ وقتاً فوقتاً ان کے سامنے "بچوں کی رہنمائی" کے کاموں کا خاکہ پیش کیا جائے اس سے متعلق ضروری کتابچے اور ادب فراہم کئے جائیں اور اس موضوع پر تقریریں کرائی جائیں۔

(۶) اسکول میں بچوں کی رہنمائی کے کاموں کے لئے جو کمیٹی تشکیل کی جائے اس میں والدین کے نمائندے بھی شریک کئے جائیں۔

(۷) اسکول میں والدین کا عزت و احترام سے خیر مقدم کیا جائے اور ان کے مسائل پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ ان کی

(باقی ص ۲۲ پر)

جنت سے

شفیق جیب ضا کا خط

شری ایس سی دتا کے نام

فردوس آباد۔ عالم آخرت

محبی دتا صاحب

امید ہے آپ مع اپنی ایسوسی ایشن کے خوش اور بخیریت ہوں گے۔ آپ کی ایسوسی ایشن کے بارے میں جب بھی کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہے تو بڑی خوشی ہوتی ہے چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ آپ کی ایسوسی ایشن نے اب بالغوں کے لئے مراسلاتی نصاب چلانے کا فیصلہ کیا ہے تو بڑی راحت ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اُدھر برکت صاحب نے "واپس اڈلٹ ایجوکیشن کو" کے عنوان سے مضمون لکھا اور ادھر آپ نے مراسلاتی نصاب چلانے کا مبارک فیصلہ کیا! گویا آپ دونوں نے بہ یک وقت قریب قریب ایک ہی سمت میں سوچا۔ مبارک ہو! آخر آپ دونوں ہی بڑے آدمی جو ٹھہرے!

مجھے دتا صاحب برکت صاحب کے اندازِ فکر سے اتفاق ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اڈلٹ ایجوکیشن کے بجائے سوشل ایجوکیشن کا جو نعرہ لگایا گیا تھا، اس کے پیچھے کم و بیش یہی مصلحت تھی جو ادارے کا نام "ادارہ تعلیم بالغان" رکھنے کے بجائے "ادارہ تعلیم و ترقی" رکھنے میں میرے پیش نظر تھی یعنی یہ کہ "بالغوں کی تعلیم اس نقطۂ نظر سے کہ ان کی شخصیت کی پوری پوری نشوونما ہو جائے اور تعلیم کے نقص یا کمی کی وجہ سے ان کی زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پُر ہو جائے اور وہ ایک مکمل انسان کی حیثیت سے سماج میں اپنی جگہ پیدا کر سکیں" لیکن سوشل ایجوکیشن کی تحریک نے جو راستہ اختیار کیا وہ میرے خیال میں صحیح راستہ نہیں تھا چنانچہ یہ قافلہ اب بھٹک کر رہ گیا ہے اور اب اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ نظر نہیں آتی کہ آپ ایسوسی ایشن کی رہنمائی میں اسے پیچھے کی طرف لے چلئے اور جہاں سے دریٹ چلنے کے لالچ میں راستہ کاٹا تھا، وہاں بیٹھ کر اپنے چاروں طرف خوب نظر دوڑائیے۔ مجھے یقین ہے کہ قافلہ پھر ٹھیک راستے پر چل پڑے گا!

میرے خیال میں دتا صاحب، سوشل ایجوکیشن کی تحریک کی یہ کیفیت اس لئے بھی ہوئی کہ آپ کی انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن

کامزاج بدل گیا ہے۔ میں ایسی بات کہہ گیا کہ شاید آپ کو گراں گذرے۔ آپ سے آج باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے اس لئے اس بات کو انجمنوں اور پاٹھ شالاؤں کا "کٹ موشن" سمجھ لیجئے تاکہ اس کی بنیاد پر باتیں ہو جائیں۔ رہا کٹ موشن تو وہ تو گر ہی جائے گا۔

آپ کو شاید وہ فلسفیانہ بحث یاد ہو جو غالباً ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی اور ٹیگور کے درمیان نان کوآپریشن کی تحریک کے بارے میں چلی تھی۔ ٹیگور نسل انسانی کی وحدت کے نظریے کی بنا پر اس تحریک کے خلاف تھے اور کہتے تھے کہ اب اس نئے دور میں اگر کوئی قوم ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے صرف اپنے ملک کی بات سوچے تو اس کا یہ عمل نئے دور کی روح اور اس کے تقاضوں کے منافی ہوگا اور اسے شانتی نصیب نہیں ہوگی۔ اب زمانہ یہ ہے کہ ہر قوم کے دل میں پوری دنیا، پوری انسانی آبادی کے لئے وہی گنجائش اور تڑپ ہونی چاہئے جو اس کے اپنے ملک کی فلاح وبہبود اور تحفظ کے لئے ہے۔" اس کے جواب میں گاندھی جی نے لکھا تھا کہ "ایک ایسا شخص جو خود ڈوب رہا ہو، دوسروں کو ڈوبنے سے نہیں بچا سکتا۔ دوسروں کو بچانے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ہمیں پہلے اپنے آپ کو بچانا ہوگا۔ ہندوستانی قومیت نہ خود غرض ہے نہ ظالمانہ اور نہ تخریبی۔ یہ صحت بخش ہے، پاکیزہ ہے اور اس وجہ سے پوری انسانیت کے لئے ہے۔ انسانیت کے لئے قربان ہونے کا دم بھرنے سے پہلے ہندوستان کو خود اپنے لئے زندہ رہنے کا گُر سیکھنا ہوگا۔"

میں جو اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ جہاں کہیں بھی بالغوں کی تعلیم وترقی کا جو کچھ بھی کام ہو رہا ہے، وہ میرا اپنا کام ہے، تو میرے قول کی بنیاد گاندھی جی کا یہی فلسفہ تھا۔ آپ بھی غور کریں تو سمجھ لیں گے کہ یہ بات میں اس وقت کہتا تھا جب میرا ادارہ "تعلیم وترقی" میرا اپنا تھا اور اس کے اندرونی معاملات میں کسی کو کسی قسم کا دخل دینے کا حق و اختیار نہیں تھا اور نہ میں اسے پسند کرتا تھا۔ آپ اپنے گھر میں پوری دنیا کو جگہ نہیں دے سکتے جب تک اس کے اندر آپ کو مکمل آزادی حاصل نہ ہو اور آپ بلا شرکت غیرے اس کے مالک و مختار نہ ہوں۔

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن' آپ بھی جانتے ہیں، بالغوں کی تعلیم کا کام کرنے والے دیوانوں، فقیروں اور قلندروں کا گھر تھا جیسے صوفیوں اور سادھوؤں کی خانقاہ یا کٹی ہوتی ہے۔ خانقاہ یا کٹی تو آپ جانتے ہیں، خانقاہ اور کٹی ہی ہوتی ہے۔ یہاں کے باسی خود کسی کے در پر نہیں جاتے بلکہ امیر امراء کی تو کیا حیثیت ہے، خود بادشاہ اُن کی زیارت اور اکتساب فیض کے لئے ان کے پاس اپنے محلوں سے چل کر آیا کرتے تھے؛ دور کیوں جائیے، خود ایسوسی ایشن کی تاریخ ہی اٹھا کر دیکھ لیجئے، جب تک ایسوسی ایشن کی یہ آن بان رہی اُس وقت تک اس کے فیصلوں اور اس کی سفارشوں میں بھی جان رہی۔ مگر اب کیا ہے، دیکھئے، بات کا پاس نہ کھینچے گا، دل پر ہاتھ رکھ کر کہئے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ یہ سرکاری پالیسیوں اور منصوبوں پر صاد کرنے والی جماعت بن کر رہ گئی ہے؟ میرا تو خیر یہ ایمان تھا، آپ کا بھی یہی کچھ عقیدہ ہے کہ عوام کی تعلیم حکومت کے تعاون کے ساتھ خود عوام کا اپنا کام ہونا چاہئے، اور اگر میرا حافظہ غلط نہیں ہے تو آپ کی اس ایسوسی ایشن کی بنیاد بھی یہی عقیدہ تھا۔ مگر جس وقت حکومت نے سوشل ایجوکیشن کے نام سے عوام کی تعلیم کا کام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا، اُس وقت

بجائے اس کے کہ وہ اس کے خلاف جہاد کرتی، ایسوسی ایشن نہ صرف خاموش رہی بلکہ اپنے عمل سے اس پالیسی کی تائید بھی کی۔

میرے فردوس نگر چلے آنے کے کچھ عرصے کے بعد جب حکومت نے سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کو باضابطہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اسکیم میں مدغم کر دیا تو اُس وقت ایسوسی ایشن کو کمر کس کر میدان میں نکل آنا چاہئے تھا اور حکومت سے مطالبہ کرنا چاہئے تھا کہ یہ عوام کا اپنا کام ہے، انھی کے ہاتھ میں رہنا چاہئے۔ ڈیولپمنٹ بلاک اس کام کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں نہ لیں بلکہ انگلستان کی لوکل ایجوکیشن اتھارٹیوں کی طرح یہ کام کریں اور عوام کی مقامی انجمنوں اور سنستھاؤں کو مالی اور فنی امداد دے کر اس کام کے لئے آمادہ کریں۔ ان مقامی انجمنوں اور سنستھاؤں کو ایسوسی ایشن بھی سینے سے لگاتی، اور ان کی رہنمائی کے لئے گاؤں گاؤں محلے محلے پہنچ کر مختصر مختصر مدت کی تربیت گاہیں قائم کرتی؛ اور ڈیولپمنٹ بلاک یا مقامی تعلیمی محکمے اُن کے کام میں خلل ڈالتے تو وہ اُن کی پشت پناہی کرتی۔ اس صورت میں جب ایسوسی کے سیمنار منعقد ہوتے اور ان میں ان مقامی سنستھاؤں اور انجمنوں کے نمائندے شریک ہوتے تو ان اجتماعات میں اور ان کے فیصلوں اور سفارشوں میں جان ہوتی اور حکومت اور اس کے ماتحت ادارے ان کو کان لگا کر سننے پر مجبور ہوتے۔

مگر اب تو معاف کیجئے گا، آپ کی ایسوسی ایشن انگریزوں کے زمانے کا ہندوستان بن گئی ہے جب انگریز ہندوستانیوں سے کہتے تھے کہ "ملک تو تمہارا ہی ہے، مگر اس پر قبضہ ہمارا ہے اور قبضہ بھی ناجائز نہیں بلکہ قانونی۔ گھر تمہارا ضرور ہے مگر تم اپنی مرضی سے اس کا کاروبار نہیں چلا سکتے۔ "ملک شہنشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا، تمہارا کام 'ہم جو کچھ کہیں، اُس پر صرف ہاں کہنا ہے'۔" مگر آپ تو تاریخ کے طالب علم ہیں، جانتے ہیں کہ انگریز سے ہماری لڑائی صرف اسی بات کے لئے تھی۔ اگر وہ یہاں اس شرط پر رہنا چاہتے کہ گھر کے مالک ہم ہوں گے اور ان کی حیثیت مہمان کی ہوگی تو شاید اس قل غپاڑے کی نوبت ہی نہ آتی۔ ہم اُن کے کام آتے اور وہ اپنے علم و تہذیب کے ذریعے ہمارے کام آتے۔

میں جانتا ہوں ایسوسی ایشن کے سامنے دشواریاں تھیں اور اب تک ہیں۔ لیکن ان دشواریوں کا مطلب خود دار جماعتوں کے نزدیک یہ نہیں ہوتا کہ زندہ رہنے کی خاطر اپنے آپ کو بیچ دیا جائے۔ عیش کی زندگی کا سامان اگر ہم نہ پہنچ سکے تو ہاتھ پر سمیٹ کر روکھی سوکھی پر گذر کرنا چاہئے اور اچھے دنوں کا انتظار کرنا چاہئے، نہ یہ کہ اپنے وجود کو دوسروں کے سپرد کر کے مجبوری کے پردے کی آڑ لینا۔ اب تو آپ بُرا نہ مانئے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ بالغوں کی تعلیم کا کام سارے کا سارا حکومت نے خود سنبھال لیا ہے اور رضاکارانہ ادارے نہ رہ گئے ہیں اور نہ آئندہ نئے اداروں کے اُبھرنے کا امکان ہے اس لئے انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے، کیونکہ ایسوسی ایشن تو رضاکار اداروں کی ایک وفاقی جماعت ہے۔ اب جب یہ ادارے ہی نہ رہے تو اُن کے وفاق کے کیا معنی! رہ گئے سرکاری ادارے تو سرکاری اداروں کا وفاق نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر کے ساتھ اچھی طرح ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بھی سرکاری ادارہ ہے۔ آپ کی ایسوسی ایشن کے اور نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر کے بیک وقت موجود ہونے کا ایسوسی ایشن کے موجودہ حالات کے پیش نظر یہ مطلب ہوا کہ سرکاری اداروں کے نمائندوں کے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں، یہاں بھی وہی، وہاں بھی وہی، "جدھر دیکھتا ہوں، اُدھر تو ہی تو ہے" [illegible]

بھارت ماما کی جے!!

سوہن سنگھ جی کو میرا اسلام کہیے گا اور انھیں نئے عہدے پر فائز ہونے کی مبارکباد دیجیے گا۔ ماتھر صاحب سے بھی ملاقات ہو تو آداب کہہ دیجیے گا۔ بڑے ہشیار ہیں حضرت، ایسوسی ایشن کو ایسا چھوڑا کہ اس طرح سے گاندھی جی نے کانگریس کو نہ چھوڑا ہوگا۔ رائٹ جو ٹھہرے۔ یہ کانگریسی، کمیونسٹ، پھر کیا، انڈیپنڈنٹ! موسم پر رُخ پہچاننے میں سیسموگراف سے کم نہیں ہیں۔

بھئی یہ بڑا اچھا کیا کہ ایسوسی ایشن کی زیرِ تعمیر عمارت سے میرے نام کا تعلق ختم کر دیا۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے سر سے بوجھ اتر گیا ہو، دیکھیے نا، جب دنیا سے منہ موڑ لیا تو پھر اُس سے کسی قسم کا تعلق باقی رکھنے کے کیا معنی! فقیر آدمی ٹھہرا، جیتے جی کون سا جھونپڑا بنا پایا تھا جو مرنے کے بعد اپنے نام کا محل تعمیر ہونے سے خوشی ہوتی!

اچھا خدا حافظ! آپ کو آج بہت تنگ کیا، معاف کیجیے گا۔

آپ کا

شفیق

بقیہ صـ۱۸

اساتذہ اور والدین کا اشتراک

ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے والدین کے دل میں اساتذہ کی طرف سے عزت اور احترام کا جذبہ پیدا ہوگا۔

اگر اساتذہ کو والدین کا اعتماد حاصل ہو تو اس انجمن کی کامیابی ان کے ہاتھ میں ہے اور صرف اسی وقت اساتذہ اور والدین کی انجمن کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ بات نہ صرف یہ کہ طالب علموں کے حق میں مفید ثابت ہوگی بلکہ اساتذہ اور والدین بھی بہت سے مسائل سے نجات پا جائیں گے اور ان کے کاموں میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

ٹیلی ویژن — عوام کی تعلیم کا ایک ذریعہ

اکتوبر ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب دہلی کے رہنے والوں نے بین الاقوامی صنعتی میلے کے موقع پر پہلی بار چلتی پھرتی اور بات چیت کرتی ہوئی تصویروں والا ریڈیو دیکھا تھا۔ یہ ریڈیو ہی ٹیلی ویژن تھا اور اس وقت اس کی حقیقت میلے ٹھیلے کے ہنگاموں سے کچھ زیادہ نہیں تھی۔ میلے میں جگہ جگہ ٹیلی ویژن سیٹ آویزاں تھے، ہر سیٹ کے پاس سیکڑوں آدمیوں کی بھیڑ ہر وقت جمع رہتی تھی اور سب کے دلوں میں یہی خواہش انگڑائیاں لے رہی تھی کہ کاش یہ عجیب و غریب ایجاد ان کی زندگی کا بھی حصہ بن جائے۔

ہندوستان میں ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کا دن ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، جس دن ہمارے راشٹرپتی جی کے مبارک ہاتھوں دہلی میں "بھارتیہ دور درشن" (ٹیلی ویژن) کا افتتاح ہوا تھا۔ دہلی کے عوام نے اس اقدام کا بہت کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور اپنے خوابوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے اس طرح حقیقت میں بدلتا دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھی۔ شروع میں دہلی کے بیس مرکزوں پر یہ سیٹ آویزاں کئے گئے تھے اور ہر مرکز پر اُس دن ایک ہجوم اس عجیب و غریب ایجاد کو دیکھنے جمع ہو گیا تھا۔

فضا میں چلتی پھرتی اور بات چیت کرتی ہوئی تصویروں کو اُڑا کر اس طرح بھیجنا کہ وہ دور دراز رکھے ہوئے سیٹوں پر اسی طرح بولتی اور چلتی پھرتی دکھائی دے، ایک ایسی بات ہے، جس پر کوئی مشکل ہی سے یقین کرے گا۔ مگر یہ حقیقت دہلی کے سینکڑوں اور ہزاروں آدمیوں پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ہندوستان کو تعمیر و ترقی کے راستے پر گامزن کرنے اور عوام تک بیداری کا سندیش پہنچانے میں اس عجیب و غریب ایجاد سے شاید سب سے زیادہ مدد لی جا سکتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ لفظ اور آواز بے جان چیزیں ہیں۔ کتنی ہی اچھی بات کتابوں یا رسالوں میں شائع کی جائیں یا انھیں ریڈیو اور مائکروفون کے سہارے نشر کیا جائے، ان کا وہ اثر نہیں ہوتا جتنا اس کا کہ اُس بات کو کہنے والی شخصیت ہمارے روبرو موجود ہو اور ہم اُس سے اپنا شخصی رابطہ محسوس کر سکیں۔ بات میں سب سے زیادہ اثر شخصیت کا ہوتا ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ اس کے اثر سے بے جان لفظ اور آواز میں جان پڑ جاتی ہے۔

ٹیلی ویژن کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے اور خوشی کی بات ہے کہ دہلی میں ٹیلی ویژن کی تجرباتی اسکیم میں اس بات کا بہت خیال رکھا گیا ہے اور اسے لوگوں کی تفریح اور دل بہلاؤ سے زیادہ ان کی تعلیم و تربیت کا ایک وسیلہ مان کر اس کے پروگرام مرتب

کئے جا رہے ہیں۔

آج دنیا میں جس قدر جہالت کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے اس کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ تعلیم کی روشنی دنیا کے تاریک ترین گوشوں میں پھیلائی جائے۔ ناخواندگی اور جہالت آج ایک عالمگیر مسئلے کی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمارے پاس جو وسائل ہیں، وہ اتنے محدود ہیں کہ ان سے ہمارے حوصلے کچل کر رہ جاتے ہیں۔ یونیسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق ۵ سے ۱۴ سال تک کی عمر کے تقریباً ۲۵ کروڑ بچے ایسے ہیں جن کا اسکولوں کی چہار دیواری میں گذر نہیں ہے۔ دنیا کی آبادی جس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اس سے ہمارا یہ اندیشہ یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اگلے چند سال کے اندر ہماری بڑھتی ہوئی توجہ کے باوجود یہ تعداد کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جائے گی۔ پھر جو لوگ اوائل عمر میں اسکولوں کی چہار دیواریوں سے باہر رہ جاتے ہیں ظاہر ہے انھیں بعد کی زندگی ہی میں لکھنے پڑھنے کا کیا موقع مل سکے گا۔ اس طرح دنیا کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ زندگی بھر جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا۔ یہ دنیا کے سامنے ایک بڑا چیلنج ہے جس پر ہر ملک کے بہی خواہوں کو بہت سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا ہوگا۔ دنیا کی اس بڑی آبادی کو کس طرح علم کی روشنی سے روشناس کرایا جائے۔ اُن کی زندگی کے تاریک گوشوں میں کس طرح روشنی پھیلائی جائے؟

ٹیلی ویژن ایک ایسا آلہ ہے جو اندھیرے میں لوگوں کے سامنے روشن تصویریں پیش کرتا ہے۔ یہ فضا کی تاریکی میں اپنی روشنی پھیلا کر لوگوں کی زندگی کو روشن اور منور کر سکتا ہے۔ وہ ان کی زندگی میں روشنی بن کر ان کا رہنما، معاون اور دوست ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کی مدد سے کم سے کم وقت میں بیداری کا سندیش لوگوں کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے، علم کی روشنی پھیلائی جا سکتی ہے اور انھیں دنیا کے حالات اور ان حالات میں ان کی اپنی زندگی اور اس کے تقاضوں سے واقف کیا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کیا کچھ اور کہاں کیا ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں وہ خود کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ ان کاموں میں انھیں دوسری جگہوں سے کیا مدد مل سکتی ہے، یہ سب معلومات انھیں ٹیلی ویژن کے ذریعہ پہنچائی جا سکتی ہے۔ انھیں ایک اچھا انسان اور ایک اچھا شہری بنانے میں اس سے بہت زیادہ مدد مل سکتی ہے۔

ابھی جو باتیں میں نے اوپر کہی ہیں وہ میرے اپنے تجربے میں آ چکی ہیں۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو جب دہلی میں ٹیلی ویژن کی تجرباتی اسکیم شروع ہوئی اس وقت سے ادارہ تعلیم و ترقی میں بھی ٹیلی ویژن کا ایک سیٹ آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے رکھا گیا ہے۔ اس پر ہفتے میں دو دو دن ایک ایک گھنٹے کے پروگرام ہوتے ہیں۔ اسکول کے لڑکوں کے لئے اکثر دن میں پروگرام چلائے جاتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ ان پروگراموں میں کتنی دلچسپی لیتے ہیں اور ایسے لوگ جو اس سے پہلے الف کا نام ب بھی نہیں جانتے تھے، ان پروگراموں کو دیکھ دیکھ کر دنیا اور اس کے حالات سے اتنے باخبر ہو گئے ہیں کہ جیسے کوئی پابندی کے ساتھ اخبار پڑھ کر دنیا کے حالات اور اپنی زندگی کے مسائل

اور اس کے تقاضوں سے باخبر رہتا ہے۔ اسی بنیاد پر مجھے یہ بات کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ٹیلی ویژن کی مدد سے عوام کی تعلیم و تربیت کا ایک ملک گیر پروگرام تیار کیا جا سکتا ہے۔

مگر ہمارا ملک ایک غریب ملک ہے۔ اس کے پاس اتنے وسائل کہاں کہ وہ ٹیلی ویژن کا جال سارے ملک میں پھیلا سکے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمیں ایک بار پھر سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ایک دوسرا سوال یہ بھی سامنے آتا ہے وہ یہ کہ اس آزاد ملک کو عوام کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے اوپر لینی ہے یا نہیں؟ اگر اس کا جواب یہ ہو کہ ہاں! یہ ذمہ داری اسے لینی ہے تو پھر اس کی تدابیر پر غور کرنا ہوگا۔ اس کے لئے کتنی کتابیں، کتنی سلیٹیں، کتنی پنسلیں، کتنی لالٹینیں، کتنی جگہیں اور کتنے اُستادوں کی ضرورت ہوگی۔ پھر ان استادوں کی تربیت اپنی جگہ خود ایک اہم مسئلہ ہے۔ رات کی رات اُستادوں کو تیار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اکثر لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ عوام میں پھیلی ہوئی جہالت صرف تعلیم کے پرانے اور روایتی طریقوں سے دور نہیں کی جا سکتی۔

اگر ٹیلی ویژن کی برکات سے فیضیاب ہونے کا موقع ہمارے ملک میں ہو، تو اس کے فیض سے تعلیم کم وقت اور کم خرچ میں ملک گیر پیمانے پر پھیلائی جا سکتی ہے۔ یونیسکو نے اپنی حالیہ کانفرنس میں پسماندہ ملکوں میں تعلیم پھیلانے کے جو نئے طریقے تجویز کئے ہیں ان میں ٹیلی ویژن کے سہارے خواندگی پھیلانے کے امکانات پر غور کرنے کی تجویز بھی کی ہے۔

ایک تجویز مجھے اس بات کا احساس ہے کہ ہمارے موجودہ وسائل اتنے نہیں ہیں کہ سارے ملک میں ٹیلی ویژن کا جال بچھانا ممکن ہو سکے۔ مگر اب جب کہ دہلی میں ٹیلی ویژن کی ایک تجرباتی اسکیم محدود پیمانے پر چلائی جا رہی ہے کیا ہی اچھا ہو کہ اس اسکیم میں لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے کا تجربہ بھی شامل کر لیا جائے اور یہ دیکھ لیا جائے کہ عوام کو خواندہ بنانے میں یہ کس قدر مددگار ہو سکتا ہے۔ دہلی کے علاقے میں ہندی اور اردو کے خواندگی کے کورس چلائے جا سکتے ہیں اور اس طرح سارے ہندی کے علاقے میں ٹیلی ویژن کے ذریعہ عوام کو خواندہ بنانے کے امکانات پر ٹھوس بنیادوں پر غور کیا جا سکتا ہے، اسی طرح یہ اسکیم جب اور علاقوں میں پھیلے تو وہاں بھی اس طرح کے کورس چلائے جائیں۔ اگلے پنجسالہ پلان میں حکومت کو یہ تو کرنا ہی چاہیئے کہ وہ ملک کی چند خاص زبانوں والے علاقوں میں محدود پیمانے پر ہی ٹیلی ویژن کی اسکیم شروع کرے اور وہاں ان کے ذریعہ خواندگی پھیلانے کا تجربہ کر کے دیکھ لے کہ یہ وسیلہ ہمارے لئے کس قدر کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔

ٹیلی کلب: سماجی تعلیم کا ایک تجربہ

ابھی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے کہ دہلی کیا بلکہ سارے ہندوستان میں پہلی بار ٹیلی ویژن پروگرام چالو کیا گیا۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء دہلی کے تاریخی شہر میں ایک اہم دن مانا جائے گا، جس دن یہاں راشٹرپتی جی نے ٹیلی ویژن پروگرام کا افتتاح فرمایا تھا۔

یہ پروگرام تجرباتی حیثیت سے شروع کیا گیا تھا اور شروع میں اس کے بیس سیٹ شہر اور دیہات کے مختلف حصوں میں رکھے گئے تھے۔ ان جگہوں کے انتخاب میں منجملہ اور باتوں کے ایک ٹکنکل بات کا بھی خیال رکھنا پڑا تھا کہ یہ سیٹ اے۔سی بجلی والے علاقوں میں ہی رکھے جائیں کیونکہ یہ سیٹ اے۔سی کرنٹ سے ہی چلتے ہیں۔

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ کا مرکز دیہی سماجی تعلیم ان بیس سنٹروں میں سے ایک ہے جہاں شروع سے ٹیلی ویژن پروگرام دکھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہاں چونکہ سماجی تعلیم کا کام ایک مدت سے ہو رہا ہے، اس لئے ٹیلی ویژن کے پروگرام کو تجرباتی حیثیت سے جانچنے کے لئے یہ جگہ بہت مناسب سمجھی گئی ہے۔

ٹیلی ویژن اگر آپ دیکھئے تو وہ ریڈیو کے قسم ہی کی ایک مشین ہے۔ ان دونوں کی شکل و صورت میں بس اتنا فرق ہے کہ ریڈیو میں سامنے جہاں کپڑا سا لگا رہتا ہے ٹیلی وژن سٹ میں اس کی جگہ سفید شیشے کا پردہ ہوتا ہے۔ بغل کی طرف نیچے ایک سوئچ ہوتا ہے جس کے کھولنے سے شیشے کے پردے میں روشنی دوڑنے لگتی ہے۔ دوسرے پہلو میں ایک اور سوئچ ہوتا ہے جس سے آڑی ترچھی لائنوں کو قابو میں کیا جاتا ہے ان کے علاوہ ایک اور سوئچ ہوتا ہے جس کے کھولنے سے آواز آنے لگتی ہے۔ ان دنوں دہلی میں جو سیٹ لگے ہیں وہ ایک عام ریڈیو سے دو تین گنا بڑے ہیں۔

اس ٹیلی ویژن پروگرام میں جو ایک نئی بات کی گئی ہے اور جو سماجی تعلیم اور عوامی تعلیم کا کام کرنے والوں کے لئے خاص طور سے دلچسپی کا باعث ہے، وہ ہے اس پروگرام کے ساتھ ٹیلی کلبوں کا قیام۔ اور سچ پوچھئے تو یہی وہ نئی بات ہے جس سے یہ امید بندھتی ہے کہ اگر ٹیلی ویژن پروگرام ہندوستان کے اور علاقوں میں اسی نہج پر چلایا جائے تو اس سے ہندوستان کے لوگوں کو تعلیم کی روشنی سے

مستفیض ہونے کا موقع مل سکے گا اور یہ پروگرام صحیح معنوں میں ہندوستان کی عوامی تعلیم کی اسکیم میں ایک نیا موڑ ثابت ہوگا۔

ٹیلی کلب بنانے کی ذمہ داری کچھ اداروں کو سونپی گئی تھی، جیسے دہلی اسٹیٹ کا سوشل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، دلّی کارپوریشن کا سوشل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ، بھارت سیوک سماج، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ٹیلی کلب دیہاتوں اور شہر کے محلوں دونوں علاقوں میں قائم کئے گئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کا بھی دھیان رکھا گیا کہ یہ کلب دلی کے ریڈیو اسٹیشن سے دس بارہ میل کی دوری کے اندر اندر رہیں۔ اس کلب میں ایک یا دو آرگنائیزر، ایک سکریٹری اور ۲۰ رکن رکھے گئے تھے۔

اب آیئے ذرا یہ بھی بتلادوں کہ یہ ٹیلی کلب جس کا میں نے یہاں ذکر کیا ہے وہ کیا ہے اور کس طرح کام کرتا ہے۔

ٹیلی کلب ۲۰ ممبروں کی ایک جماعت ہے جو ٹیلی ویژن کے پروگرام سے کچھ سیکھنا چاہتے ہیں اور ان سیکھی ہوئی باتوں پر اگر ہو سکے تو عمل پیرا ہونا چاہتے ہیں۔ یہ ٹیلی کلب صرف تفریحی کلب نہیں ہے۔ یہ تو ایک طرح سے سماجی تعلیم کا مرکز ہے جس کے اراکین بغیر کسی قسم کے دباؤ کے اپنی مرضی سے اپنے علم کے خزانے کو بڑھانا چاہتے ہیں اچھے شہری اور اچھے انسان بننا چاہتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی زندگی کے مسائل پر آزاد فضا میں پورے نظم و ضبط کے ساتھ بات چیت اور غور و فکر کرنا چاہتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں میں نے ٹیلی ویژن کے سیٹ اور ٹیلی کلب کے بارے میں کچھ باتیں بتلادی ہیں۔ اب آپ ٹیلی کلب کی کارروائی کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

ہر منگل کو شام کے وقت ۷ بجے سے ۸ بجے تک اور ٹھیک اسی وقت جمعہ کی شام کو ٹیلی ویژن پروگرام دکھایا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن کو دیکھنے کے لئے دہلی میں بیس جگہوں پر ٹیلی کلب قائم کئے گئے ہیں۔ کلب کے ممبروں کا کام یہ ہے کہ ایک بڑے کمرے میں یا کسی کھلی جگہ پر ٹیلی ویژن پروگرام دیکھیں، جو لوگ اس پروگرام کو دیکھنے آئیں انھیں باقاعدہ بٹھائیں، ان کے بیٹھنے کا انتظام کریں اور جب پروگرام ختم ہو جائے تو ٹھیک اس وقت جب کہ لوگ اٹھ کر چلے جائیں تو سارے پروگرام پر بات چیت کریں۔ اس کی افادیت کو جانچیں، اس کی خامیوں پر تنقید کریں، انھیں کون سی بات پسند آئی، کون سی بات کس طرح پیش کی جاتی تو وہ اور زیادہ بہتر شکل میں سامنے آتی۔ پروگرام ان کی روزمرہ کی زندگی میں کس قدر مددگار ثابت ہوگا، جو باتیں اس میں بتائی گئی ہیں وہ کہاں تک قابلِ عمل ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے دن اس ساری کارروائی کی رپورٹ کلب کا سکریٹری آل انڈیا ریڈیو کے پاس بھیج دیتا ہے جہاں اور کلبوں سے آئی ہوئی رپورٹوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جاتا ہے اور پروگرام کو اور زیادہ بہتر بنانے کی تدابیر پر غور کیا جاتا ہے اور اس میں اکثر و بیشتر ٹیلی کلب کے ممبروں کے مشورے بھی حاصل کئے جاتے ہیں۔

شری عبدالستار صاحب کی کوششوں اور شاہدرہ ڈیولپمنٹ بلاک کے بی۔ ڈی۔ او کی سفارش سے ٹیلی ویژن کا جو سیٹ ملا ہے وہ صحیح معنوں میں علاقے کے لوگوں کی تعلیم و تربیت کا ایک اہم ذریعہ بن گیا ہے اور اس سے گاؤں کے لوگوں کے دماغوں کی بند کھڑکیاں کھلنے لگی ہیں۔ ہم لوگوں کو جب سے ٹیلی ویژن کے پروگراموں کو دیکھنے سننے اور سب سے زیادہ ان پروگراموں پر بات چیت کرنے کا موقع ملا ہے ہم سب

سائنس کی اس عجیب و غریب ایجاد پر فخر کرنے لگے ہیں۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب لوگ ٹیلی ویژن پروگرام دیکھ کر جانے لگتے ہیں اس وقت ٹیلی کلب کے ممبر اُس پورے پروگرام پر بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ ٹیلی ویژن میں جو مختلف پروگرام اب تک دکھائے جاتے رہے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:۔ بھارت ناٹیم، مشاعرے، کوی سمیلن، فلم شہد کی مکھی پالنا، کھیتی باڑی سے متعلق پروگرام، لوک گیت، مختلف مقامات کے تہوار، مرغی پالنا، مچھلی اور بھیڑ بکریاں پالنا وغیرہ، تصویر کشی، مصوری، مشہور مصوروں اور فن کاروں سے ملاقات، کٹھ پتلی، اسنگیت سمیلن، ان کے علاوہ ٹیلی کلب کے ذریعہ گھریلو بجٹ، شہر کی صفائی، فیملی پلاننگ وغیرہ کے پروگرام پیش کئے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف طبقے کے لوگوں کے لئے کام کی باتیں، تفریحی اور معلوماتی ڈرامے، پُرانے زمانے کی یادگاریں، اور تعلیمی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ اسی کے ساتھ جب جب ممکن ہوا دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے مہمانوں کا استقبال، جلوس اور سیاسی جلسے سے متعلق پروگرام بھی ہم اس میں دیکھ چکے ہیں۔

ٹیلی ویژن پروگرام یہاں اس قدر مقبول ہوا ہے کہ بچے اور کبھی کبھی بوڑھے اور سیانے آدمی بھی شام سے ہی آ کر پوچھنے لگتے ہیں کہ ٹیلی ویژن کب چالو ہوگا۔ اُس وقت بچوں کی خوشی کی کوئی حد نہیں رہ جاتی جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب کٹھ پتلی کا تماشا ہونے والا ہے۔ کٹھ پتلی کے تماشے کا رواج ایک زمانے سے ہندوستان سے ختم ہوتا جا رہا تھا اور ڈر تھا کہ ایک دن کہیں یہ فن اس سرزمین سے اٹھ نہ جائے، مگر آج ٹیلی ویژن پروگرام پر اس کی افادیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہندوستان کا یہ فن اپنے اندر کتنی صلاحیتیں رکھتا ہے اور تعلیمی کام میں اس سے کس قدر مدد لی جا سکتی ہے۔ یہ فن اب پھر رفتہ رفتہ زندہ ہو رہا ہے۔

اب یونیسکو نے ٹیلی ویژن پر سوشل ایجوکیشن پروگرام کی ایک مخصوص اسکیم بھی جاری کی ہے۔ یہ اسکیم ٹیلی ویژن کے ذریعہ سوشل ایجوکیشن کا باقاعدہ پروگرام چلانے اور لوگوں کو اس کے ذریعہ تعلیم دینے سے متعلق ہے۔ یہ تجربہ ابھی تھوڑے دنوں سے شروع کیا گیا ہے۔ اگلے کسی شمارے میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈال سکوں گا۔

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کا

بارہواں نیشنل سیمنار

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی مجلسِ عاملہ نے اپنی ۲؍ فروری ۱۹۶۱ء کی بیٹھک میں طے کیا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کا بارہواں نیشنل سیمنار اس سال کوئمبٹور جنوبی ہند میں ۲۷ سے ۳۰ ؍ستمبر تک منعقد کیا جائے؛ اور اس کا موضوع بحث "سوشل ایجوکیشن اور جمہوری لامرکزیت" (سوشل ایجوکیشن اینڈ ڈیماکریٹک ڈی سنٹرالائیزیشن) رکھا جائے۔

ابھی تک سیمنار کے لئے ڈائرکٹر، ایسوسی ایٹ ڈائرکٹر اور سکریٹری جنرل کا تعین نہیں ہوا ہے۔

اسی بیٹھک میں مجلسِ عاملہ مذکور نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ ایسوسی ایشن کا سالانہ جلسہ یعنی آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کا اجلاس بھی پہلی اور دوسری اکتوبر کو اسی جگہ منعقد کیا جائے۔ اس اجلاس کے سمپوزیم کا عنوان "سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کو فروغ دینے میں سرکاری اور رضاکار جماعتوں کے درمیان ربط و اشتراک" مقرر کیا گیا ہے اور یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ سنٹرل سوشل ویلفیر بورڈ کی چیرمین اور ایسوسی ایشن کی نائب صدر شریمتی درگا بائی دیشمکھ سے درخواست کی جائے کہ وہ اس موضوع پر نمایندوں سے خطاب فرمائیں۔

(انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن)

ٹیگور ہال

ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ نے اپنے اسی جلسے میں یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ ایسوسی ایشن کی جلسہ گاہ (آڈیٹوریم) کا نام "ٹیگور ہال" رکھا جائے تاکہ شاعر ٹیگور نے دیہی سوشل ایجوکیشن کے میدان میں جو نمایاں کام انجام دیا تھا اس کی یادگار قائم ہو جائے۔

مجلس عاملہ کی اس نشست میں اس کے صدر ڈاکٹر موہن سنہا مہتا کے علاوہ شریمتی درگا بائی دیشمکھ، شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے، شری سوہن سنگھ، شری بجا داس گپتا، ڈاکٹر ٹی۔ اے کوشی اور شری ایم۔ سی۔ نانا وتی شریک تھے۔

اس جلسے سے پہلے مجلسِ عاملہ کے ایک جلسے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ ۳ اپریل ۱۹۶۱ء کو ایسوسی ایشن کی بلڈنگ کا رسمی افتتاح کیا جائے اور اس مقصد کے لئے شری جواہر لال نہرو کو مدعو کیا جائے۔ (انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن)

مزدوروں کے لئے مراسلاتی نصاب

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے مزدور پیشہ طبقے کے لئے مراسلاتی نصاب چلانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے کی ابتدا صرف دو نصابوں سے کی جائے گی؛ ایک "مزدور سبھائیت" (ٹریڈ یونین ازم) پر ہوگا اور دوسرا "مشترک سودا بازی" (کلیکٹیو بارگیننگ) پر۔ دونوں نصاب ہندی زبان میں ہوں گے۔ ہر نصاب ۲۴ اسباق پر مشتمل ہوگا اور ہر سبق ۱۵ دن میں پورا ہوگا۔ اس طرح امید کی جاتی ہے کہ پورا نصاب ایک سال کی مدت میں ختم ہوگا۔

ان نصابوں میں شرکت کرنے والے مزدوروں سے گیارہ روپے فیس تعلیم کے طور پر لئے جائیں گے۔ اس میں سے تین روپے تو فیس داخلہ کے طور پر ابتدا ہی میں پیشگی لے لئے جائیں گے اور باقی آٹھ روپے دو قسطوں میں ایک پانچویں سبق کے پورے ہونے پر اور دوسری دسویں سبق کے پورے ہونے پر وصول کئے جائیں گے۔

جن مزدوروں کو ان مراسلاتی نصابوں میں شرکت کی خواہش ہو وہ "جنرل سکریٹری انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن 17-B اندر پرستھا مارگ، نئی دہلی" کے پتے پر لکھا پڑھی کریں۔ (انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن)

بالغوں کے لئے جونیر ہائی اسکول

لٹریسی ہاؤس لکھنؤ کا تجربہ

لکھنؤ کے لٹریسی ہاؤس نے جو انڈیا لٹریسی بورڈ کے زیر اہتمام کام کر رہا ہے، بالغوں کے لئے ایک جونیر ہائی اسکول قائم کرکے تعلیم بالغان کے میدان میں بڑا حوصلہ مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ اس نے اپنی رپورٹ میں جو انڈیا لٹریسی بورڈ کے جلسے میں پیش کی گئی تھی، اس اسکول کے حسب ذیل اغراض و مقاصد قرار دیئے ہیں:

۱۔ پرائمری پاس معیار کے نوسکھ بالغوں کو اسکول میں داخل کرکے اس بات کا تعین کرنا کہ انھیں جونیر ہائی اسکول کے معیار تک پہنچنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کتنی مدت درکار ہوگی۔

۲۔ اڈلٹ اسکولوں میں پڑھائی کے مواد کا جائزہ لینا اور ان اسکولوں کے تجربے کی بنیاد پر بشرط ضرورت، اس طرح کے جونیر ہائی اسکولوں کے لئے درسی کتابیں تیار کرنے میں مدد بہم پہنچانا۔

۳۔ ایسے حالات و محرکات کا تعین کرنا جو کلاسوں میں زیادہ سے زیادہ حاضری کی ضمانت کریں۔

۴۔ ایسے اسکولوں کو رائج کرنے اور چلانے میں کس قسم کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں اور اس کے لئے کس قسم کے انتظامی ڈھانچہ کی ضرورت ہوگی اس کا تعین کرنا۔

۵۔ یہ تحقیق کرنا کہ اس منزل تک کی تعلیم سے طالب علم کی زندگی کی روش اس کے حالات و مواقع اور پیشے کے انتخاب وغیرہ کے باب میں کس طرح کے نتائج مرتب ہوں گے۔

لٹریسی ہاؤس کے اہتمام میں اس وقت لکھنؤ کے مختلف شہراتی اور دیہاتی علاقوں میں بالغوں کے ۹ پرائمری اسکول قائم ہیں اور کام کر رہے ہیں۔ اب تجویز یہ سامنے ہے کہ اسی طرح کے بالغ پرائمری اسکول کانپور کی مزدور بستیوں میں بھی قائم کئے جائیں۔

(انڈین جرنل آف اڈلٹ ایجوکیشن)

سوشل ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ

دہلی ایڈمنسٹریشن

سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کا اعادی نصاب

دہلی ایڈمنسٹریشن کے سوشل ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ کے اہتمام میں سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کے لئے دغالباً ۱۲ مارچ سے ۹ مارچ تک ایک اعادی نصاب (ریفرنشیر کورس) چلایا جا رہا ہے۔ یہ کورس ماہرین کے لیکچر دں اور آپس کے ڈسکشن اور بات چیت پر مشتمل ہے۔ لیکچراروں کی فہرست میں نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سینٹر، انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آڈیو ویژول ایجوکیشن اور رسالہ تعلیم و ترقی وغیرہ کے کارکن شامل ہیں۔

کورس غیر اقامتی ہے یعنی کارکن صرف دن کے وقت نو دس بجے سے چار پانچ بجے تک رہتے ہیں اور شام کو اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جاتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا انھیں ڈائرکٹریٹ کی طرف سے فراہم کیا جاتا ہے۔

(نامہ نگار)

تعلیم و ترقی: ہمارے خیال میں زیادہ اچھا یہ ہوتا کہ یہ کارکن نصاب کی مدت تک پورے وقت یعنی دن رات ایک ہی جگہ قیام کرتے۔ اس طرح انھیں ۔۔ تھوڑی ہی مقدار میں سہی ۔ وہ فائدہ حاصل ہوتا جو فوک ہائی اسکولوں کے طلبا کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہوتی اور اس کے اوپر جو خرچ آتا وہ فائدے کی مقدار کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہوتا۔

وزارت تعلیم حکومت ہند کی مجوزہ نیشنل اسکالرشپ اسکیم

حکومتِ ہند کے وزیر تعلیم محترم ڈاکٹر کے۔ ایل شری مالی نے ۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء کو پارلیمنٹ کے بجٹ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ذہین اور ہونہار طالب علموں کو وظیفے دینے کی ایک بڑی اسکیم کا اعلان کیا۔ موصوف نے فرمایا کہ "وزارت کا ارادہ ہے کہ نیشنل اسکالرشپ اسکیم کے نام سے ذہین اور ہونہار طلبا کو وظیفے دینے کا ایک ہمہ گیر سلسلہ شروع کرے۔

"اس اسکیم کے تحت وظیفے دینے کی غرض سے میٹرک کی منزل پر انتخاب ہوگا۔ جن طلبا کو وظیفہ ملے گا انھیں اس مالی امداد کے علاوہ ان کے تعلیمی کیریر کو تابناک بنانے کی غرض سے صلاح و مشورہ دینے کا بندوبست بھی کیا جائے گا۔ ان وظیفہ خوار طالب علموں کو ریاست کی سرپرستی میں تعلیم پانے والے نیشنل اسکالرز کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

"ان قومی وظیفوں کے علاوہ (جو خالصتہً مرکزی فنڈ سے دیئے جائیں گے) میٹرک سے نیچے کی منزلوں میں تعلیم پانے والے ذہین اور ہونہار طلبا کو بھی وظیفے دیئے جائیں گے۔ یہ وظیفے ریاستی سرکاروں کی طرف سے دیئے جائیں گے اور مرکزی حکومت اس کام میں ان کی امداد کرے گی۔ یہ وظیفے ۶ سے ۱۱ سال کی منزل تعلیم کے ختم پر اس سے آگے کی منزل میں دیئے جائیں گے۔ اس کی شکل یہ ہوگی کہ ریاستی سرکاریں ۶ سے ۱۱ سال کی منزل تعلیم کے ختم پر ذہین اور ہونہار طلبا کا انتخاب کرکے انھیں ثانوی منزل کی تعلیم دینے والے اقامتی (ریزیڈنشل) اداروں میں بھیجیں گے۔

"ان اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک خود مختار بورڈ بنایا جائے گا۔ اس کے علاوہ وظیفوں کا ایک جامع اور ہمہ گیر سلسلہ قائم کرنے اور اسے فروغ دینے میں غیر سرکاری اداروں کی خدمات بھی حاصل کی جائیں گی۔ یہ میرا خواب ہے کہ مزید وسائل کے بہم پہنچنے پر یہ دعویٰ کرنا ممکن ہوگا کہ کوئی ذہین اور ہونہار طالب علم کسی منزل میں بھی تعلیم کے مواقع سے اس وجہ سے محروم نہ ہونے پائے کہ خدا نے اُسے غریب ماں باپ کی گود میں جنم دیا ہے۔"

اُستادوں کے بچوں کی امداد

محترم وزیر تعلیم نے وظیفوں کی اس مجوزہ قومی اسکیم کے ذکر کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ "تیسرے پنجسالہ پلان میں ابتدائی اور ثانوی کے استادوں کے ایسے بچوں کو بھی جو میٹرک یا اس کے مساوی امتحانات میں غیر معمولی ذہانت اور لیاقت کا ثبوت دیں گے، وظیفے دینے کی ایک اسکیم چلائی جائے گی۔ اس کے علاوہ ہم نے ریاستی سرکاروں کو بھی لکھا ہے کہ وہ ان استادوں کے ایسے ہونہار بچوں کو جو میٹرک سے نیچے کی منزل میں زیر تعلیم ہوں، مالی امداد بہم پہنچانے کا بندوبست کریں۔ بہت سی ریاستوں میں آٹھویں جماعت تک کی تعلیم عام طور پر مفت کردی گئی ہے۔"

(اسٹیٹسمین مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۶۱ء)		(باقی صفحہ ۱۳۰ پر)

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

جلد ۱۲ شمارہ ۴

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر:-

پروفیسر محمد مجیب

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی۔ جامعہ نگر،
نئی دہلی

قیمت:- سالانہ چار روپے۔ فی پرچہ ۳۱ نئے پیسے

ٹیلیفون:- ۲۲۳۴۳

ترتیب

پرنٹر و پبلشر برکت علی فراق نے [illegible] پریس دلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

اشارات

بھارت سیوک سماج

کسی جماعت کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہے کہ اسے حکومت اور عوام دونوں کا اعتماد حاصل ہو۔ بھارت سیوک سماج ہندوستان کی ان خوش نصیب جماعتوں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح کی دوسری جماعت آل انڈیا کانگریس کمیٹی بھی ہے۔ مگر دونوں میں منصب کا فرق ہے اور وہ فرق بہت اہم ہے۔ کانگریس کا منصب خالصۃً سیاسی ہے یہاں تک کہ اگر وہ تعمیری کام کو اپنے منصب کا جزو بنانا بھی چاہے تو اس کے لئے مشکل ہوگا کہ اصل منصب ہی کی انجام دہی سے اُسے فرصت نہیں ملے گی۔ اس کے مقابلے میں بھارت سیوک سماج کا منصب یکسر تعمیری ہے اور یہ اتنا بڑا کام ہے کہ سماج کو دوسری سمتوں کی طرف آنکھ اٹھانے کی بھی فرصت نہیں مل سکتی۔

خوش نصیبی کی ان دو شرطوں کے علاوہ ایک تیسری بات بھی بھارت سیوک سماج کو حاصل ہے جو اس کے حق میں بہت مفید ہے اور اس کی کامیابی کی ضمانت کر سکتی ہے اور وہ ہے زندگی اور کام کے معاملے میں اس کا گاندھی وادی نقطۂ نظر۔ گاندھی واد کی اصل بنیاد امن اور محبت کے اوپر ہے جو سیاست سے زیادہ تعمیری کاموں کے لئے سازگار آب و ہوا پیدا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اس وقت ہند میں بس چند ہی جماعتیں ایسی ہوں گی جنھیں اس طرح کی موافق آب و ہوا نصیب ہوگی۔

ابھی پچھلے دنوں سماج کا دہلی میں ایک کنونشن منعقد ہوا تھا۔ اس کنونشن کی کارروائیوں کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوا کہ سماج کی توجہ زیادہ تر ان کاموں کی طرف ہے جو کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک انجام دیتے ہیں۔ ان کاموں کے سلسلے میں یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ان بلاکوں اور عوام کے درمیان رابطے کی ایجنسی کا کام دے اور بلاکوں کے حکام تک عوام کی ضرورتیں اور ان کے رجحانات پہنچاتا رہے خود انہی کاموں میں عملاً شریک ہو جانا جن کے لئے بلاکوں کے پاس کارکنوں کی ٹیمیں موجود ہیں ہمارے خیال میں اپنی قوت کو ضائع کرنا ہے۔

یہ کہنے سے ہماری مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ سماج اس قسم کے کام کرے ہی نہیں۔ ہمارا مقصد صرف اس بات پر زور دینا ہے کہ سماج کو ڈیولپمنٹ کے اس پہلو پر اپنی قوت صرف کرنی چاہئے جو کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاکوں میں بالعموم تشنہ رہتا ہے اور وہ ہے

کی تعلیم کا کام۔ یوں بھی یہ کام بھارت سیوک سماج کے گاندھی وادی مزاج سے بھی قریب ہے۔ گاندھی جی نے سب جانتے ہیں، اپنی شخصیت اور فلسفے کا زیادہ تر حصّہ عوام کو تعلیم دینے پر صرف کیا تھا۔

عوام کی تعلیم کا کام اس وقت تیزی سے آگے کو نہیں بڑھ رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک میں ایسی کوئی غیر سرکاری تعلیمی جماعت نہیں ہے جس کا ربط ضبط براہ راست عوام سے قائم ہو اور اس کی تنظیم گاؤں کی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک موجود ہو۔ یہ اتنی زبردست کمی ہے کہ اس کے بغیر ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ قوم کام نہیں کر سکتی۔ بھارت سیوک سماج اس حیثیت سے بھی خوش قسمت ہے اور اگر وہ عوام کی تعلیم کا کام اپنا پہلا اور بنیادی کام قرار دے لے تو ملک کی اس سے بڑھ کر اور کوئی خدمت نہیں ہوگی۔

بھارت سیوک سماج کی تحریک ملک کی جن عالی دماغ شخصیتوں کے ہاتھوں میں ہے اُن کے سامنے عوامی تعلیم کی تعریف و تشریح کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہوگا لیکن اس سلسلے میں اتنی بات بہرحال کہنا ضروری ہے کہ عوامی تعلیم کو سوشل ایجوکیشن کے موجودہ منصب کے ہم معنی قرار دینا صحیح نہ ہوگا اس لئے کہ یہ بات اب کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے مفہوم میں بہت زیادہ الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ عوامی تعلیم سے کم سے کم ہماری مراد اڈلٹ ایجوکیشن کا وہ وسیع مفہوم ہے جو ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ ملک میں جہاں بالغوں کی ناخواندگی کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے، آج بھی رائج ہے؛ اور جس کی طرف ہم "تعلیم و ترقی" کے صفحات میں پچھلے دو تین مہینے سے برابر اشارہ کرتے رہے ہیں۔

اڈلٹ ایجوکیشن کے اس وسیع مفہوم کے ایک پہلو عوامی کالجوں کی تحریک کو لیجئے۔ ملک میں جنتا کالج کے نام سے عوامی کالج کا جو تجربہ کیا گیا تھا، وہ ہمارے خیال میں صرف اس وجہ سے فیل ہوا کہ اسے حکومت نے براہ راست اپنے اہتمام میں چلایا اور اس کے اسٹاف میں ایسے اساتذہ کو رکھا گیا جن میں بالغ عوام کو متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے بھارت سیوک سماج ان دونوں رکاوٹوں سے آزاد ہے۔ وہ سرکاری جماعت بھی نہیں ہے اور گاندھی وادی ہونے کے لحاظ سے اس کے پاس ایسے لوگ موجود ہیں جو لوگوں کے سوچنے کے طریقے کو متاثر کر سکتے ہیں۔ — رکاوٹ اگر کوئی ہے تو اتنی کہ اس کام میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر لگنے کی ضرورت ہے جو عام آدمیوں کے لئے آسان نہیں ہوتا۔ لیکن اس اعتبار سے دیکھئے کہ بھارت سیوک سماج میں جان کھپا کر کام کرنے والوں کی کمی نہیں ہے اور ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو زمانہ قدیم کے سنیاسیوں اور صوفیوں کی طرح ایک جگہ دھونی رما کر بیٹھ جائیں اور مرکز علم بن جائیں تو یہ رکاوٹ بھی رکاوٹ نہیں رہ جاتی۔

اس وقت ملک کو سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا سیکھیں جس شدت کے ساتھ اپنی بات کہیں اُسی آمادگی اور رواداری کے ساتھ دوسرے کی بات سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہوں، اپنی غلطی سمجھ میں آجانے کے بعد اسے تسلیم کر لینے اور اس سے قطع تعلق کر لینے کو اپنی ہار سمجھنے کے بجائے اپنی شخصیت کی بلندی تصور کریں۔ ان معاملات میں عوام کی تربیت

اتنی ہی ضروری ہے جتنی ان کا پیٹ بھرنے کی ضرورت۔ یہی جمہوریت کی تربیت ہے اور جمہوریت وہ طرزِ زندگی ہے جسے ہم نے اپنی مرضی سے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔

یہ تربیت نہ کلاسوں میں دی جا سکتی ہے نہ کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے اس کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ ہے اس کی عملی مشق جو لوگوں کے باہم ملنے جلنے اور مل جل کر کام کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ باہم ملنے جلنے اور مل جل کر کام کرنے کی ٹھوس شکلیں جو عام طور پر مشہور و معروف ہیں، یہی عوامی کالج، کمیونٹی سنٹر، ویلج ہال اور تفریحی اور تہذیبی مشغلے وغیرہ ہیں جن کی تنظیم اڈلٹ ایجوکیشن کی راہ سے ہوا کرتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بھارت سیوک سماج اس اہم قومی ضرورت پر سنجیدگی سے غور کرے گا اور اس راہ پر چل پڑے گا جس میں کامیاب ہونے کے مادی اور نفسیاتی وسائل جتنے اس کے پاس موجود ہیں، اتنے کم کسی جماعت کے پاس ہوں گے۔

ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم

ہندوستان میں یوں تو تعلیم کا اوسط بہت کم ہے، مگر اس میں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں جو فرق ہے اس کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ لڑکیوں اور عورتوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی جائے۔

ذیل کے نقشے سے یہ فرق صاف ظاہر ہو رہا ہے۔

تعداد لاکھ میں

	پرائمری		مڈل		سکینڈری	
	لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں	لڑکے	لڑکیاں
۱۹۵۰-۵۱ء (پہلا پلان)	۱۳۶	۵۶	۲۵٫۴	۵٫۶	۱۰٫۳	۱٫۲
۱۹۵۵-۵۶ء (دوسرا پلان)	۱۶۷	۷۴	۳۳٫۴	۹٫۷	۱۷٫۵	۳٫۴
۱۹۶۰-۶۱ء (متوقع تعداد)	۲۳۴	۱۰۷	۴۷	۱۴	۲۳٫۹	۵٫۵

اڈلٹ ایجوکیشن کا پروگرام

(۲)

"واپس اڈلٹ ایجوکیشن کو" کے سلسلۂ مضامین کے تیسرے مضمون کی جو گذشتہ پرچے میں "اڈلٹ ایجوکیشن کا پروگرام" کے عنوان سے چھپا تھا یہ دوسری قسط ہے۔ پہلی قسط میں ہم نے اڈلٹ ایجوکیشن کے پروگرام کا خاکہ پیش کرتے ہوئے "ناخواندگی کا خاتمہ"، "تسلسلی نصاب" اور بالغوں کی تعلیم کے اقامتی اداروں کا ذکر کیا تھا۔ اس دوسری اور آخری قسط میں اڈلٹ ایجوکیشن کے مجوزہ مقصد و مفہوم کے مطابق پروگرام کی چند اور شقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

اڈیٹر

۴۔ بالغوں کی تعلیم کے مختلف مدتوں کے کورس اور اسکول

میں نے ابتدائی تعلیم اور خواندگی کی تعلیم کے بعد کے تسلسلی نصابوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ خواندگی کی تعلیم کے بعد چاہے بچے ہوں یا بالغ اپنی اس صلاحیت کو قائم نہیں رکھ سکتے جب تک اس منزل کے بعد دونوں کے لئے ایک خاص مدت تک تسلسلی نصابوں کا بندوبست نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں یہ تسلسلی نصاب خواندگی کی صلاحیت کو پختہ کرنے کے لئے ہوں گے۔ جہاں تک اصل تعلیم کا تعلق ہے جو زندگی کے لئے کارآمد ثابت ہو اس کا نمبر آئے گا بھی اور آنا بھی چاہیے اس وقت جب بچہ اٹھارہ سال کی عمر کے بعد بلوغت کی زندگی میں قدم رکھے گا اور بالغ کے اندر اتنا بھروسہ پیدا ہو جائے کہ وہ بے جھجک اپنی خواندگی کی صلاحیت سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے یہی وہ منزل ہوگی جب دونوں کو مختلف قسم کے علوم اور معلومات کی بھوک پیدا ہوگی۔ جس طرح خواندگی کی ابتدائی صلاحیت پیدا کرا دینے کے بعد دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا خطرناک ہے اسی طرح اس منزل پر بھی ان کی طرف سے منھ موڑ لینا مہلک ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس منزل تک لانے کے بعد

ان میں یک لخت چھوڑ دینے سے پورا سماج خطرے میں پڑ جائے اور تعلیم کی رسوائی ہونے لگے۔

اس منزل پر پہنچ کر آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ اس نوعمر طبقے میں کتنے نوجوان ایسے ہیں جو تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں کتنے ایسے ہیں جو زندگی کی الجھنوں میں پھنس جانے سے براہ راست تو آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتے لیکن موقع ملے تو زندگی کی ذمّے داریوں کو اٹھاتے ہوئے آگے کی اونچی تعلیم کی برکات سے بہرہ اندوز ہونے کے خواہش مند ہیں اور کتنے ایسے ہیں جنھیں ڈگری اور ڈپلوما کی بھوک تو نہیں ہے تاہم وہ علم کی روشنی سے اپنی زندگی کو پُر نور اور خوشنما بنانا چاہتے ہیں۔ اڈلٹ ایجوکیشن کے نظام کو کچھ اسی قسم کی تقسیم کے مطابق انتظامات سوچنے ہوں گے۔ اس تقسیم میں پہلے اور دوسرے طبقے کی تعلیم کے لئے تعلیم کے محکموں کے ساتھ ساتھ یونیورسٹیوں اور کالجوں کو بھی آگے آنا ہوگا البتہ تیسرے طبقے کی تعلیم خالصتہً تعلیمی محکموں کی ذمّے داری ہوگی۔

تعلیمی اداروں اور نصابوں کی تقسیم

ٹیوٹوریل اسکول

جو نوجوان ابتدائی تعلیم اور اٹھارہ سال کی عمر کے تسلسلی نصاب سے گذرنے کے بعد یہ سوچیں گے کہ انھیں براہ راست آگے کی تعلیم حاصل کرنی ہے ان کے لئے بھی ایک مدت تک امتحان کی تیاری کرانے والے اداروں کی ضرورت ہوگی جہاں انھیں باضابطہ پابندی کے ساتھ وقت پر حاضری دینی ہوگی۔ چونکہ یہ نوجوان اپنی مرضی سے ان اسکولوں میں داخل ہوں گے اس لئے ان میں تحریک و تشویق (MOTIVATION) کے لئے کچھ زیادہ اہتمام و انتظام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس کے بجائے اس بات پر ضرور نظر رکھنی ہوگی کہ اساتذہ صحیح معنی میں معلّم ہوں، محض پڑھانے والے مزدور نہ ہوں۔ اسی طرح ان اداروں کے نصاب اور ان کی تکمیل کی مدت پر بھی کنٹرول کرنا ہوگا تاکہ یہ ادارے تجارتی اور کاروباری ادارے ہو کر نہ رہ جائیں۔

شبینہ ٹیوٹوریل اسکول

حوصلہ مند نوجوانوں کے دوسرے طبقے کے لوگ جو اپنے روزگار کی پابندیوں کی وجہ سے ٹیوٹوریل اسکولوں کی باضابطہ حاضری سے معذور ہوں گے، ان کے لئے خالی اوقات (یعنی رات کے) ٹیوٹوریل کھولنے ہوں گے۔ ان شبینہ ٹیوٹوریل اسکولوں کے نصاب میں تو چاہے تبدیلی کی ضرورت نہ ہو لیکن ان کی مدّت قدرتی طور پر عام ٹیوٹوریل اسکولوں سے طویل ہوگی اس لئے کہ کام پر سے تھکے ہارے آنے کے بعد ان اسکولوں کے بالغ طلباء اتنا وقت نہ دے سکیں گے جتنا پورے وقت کے طلباء آسانی سے دیں گے۔

توسیعی پروگرام (ایکسٹنشن پروگرام)

ٹیوٹوریل اسکولوں کا کام اس منزل پر پہنچ کر ختم ہو جائے گا جب ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں بالغ طلبا، ہائی یا ہائر سکنڈری اسکولوں کے امتحانات سے فارغ ہو جائیں گے۔ ان امتحانات میں کامیاب ہونے والے طلبا کی پھر ایک تقسیم ہوگی خاص کر اس بات کے پیشِ نظر کہ ہماری یونیورسٹیوں میں داخلے پر پابندی لگ جائے گی۔ ہائی اور ہائر سکنڈری اسکولوں سے نکلنے کے بعد یونیورسٹیوں میں وہی طالب علم داخل ہو سکیں گے جو ان کے داخلے کے امتحانات میں کامیاب ہوں گے۔ اڈلٹ ایجوکیشن کے اس مجوزہ پروگرام کے مطابق ہماری یونیورسٹیوں کو عوام کی تعلیم کو اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا جزو بنانا ہوگا۔ اس باب میں انھیں دو کام کرنے ہوں گے۔

۱۔ داخلے کے امتحانات میں شرکت کی عام اجازت :۔ یونیورسٹیاں اپنے داخلے کے امتحانات میں جس طرح ہائی اور ہائر سکنڈری اسکولوں کے فارغ التحصیل طلبا کو شرکت کی اجازت دیں، اسی طرح انھیں ان طلبا کو بھی اس کی اجازت دینی چاہیئے جو ٹیوٹوریل اور شبینہ ٹیوٹوریل اسکولوں کے پڑھے ہوئے ہوں، اور محض اس لئے ان کو نظر انداز نہ کیا جائے کہ وہ عمر میں عام طلبا سے بڑے ہیں اور ٹیوٹوریل اسکولوں کے پڑھے ہوئے ہیں۔

۲۔ توسیعی لیکچروں کا انتظام :۔ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے کہ یہ طلبا عمر میں زیادہ ہونے اور عام ہائی اور ہائر سکنڈری اسکولوں کی تعلیمی فضا سے ایک حد تک محروم ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی کے عام طالب علموں میں آسانی سے کھپ نہیں سکیں گے۔ اس دشواری کو دور کرنے کی غرض سے یونیورسٹیوں کو ایسے طلبا کے لئے الگ سے توسیعی لیکچروں اور اگر ممکن ہو سکے تو توسیعی استادوں کا انتظام کرنا ہوگا؛ اور ہو سکے تو یونیورسٹی کی چہار دیواری سے باہر نکل کر یہ انتظام ایسی جگہ کرنا ہوگا جہاں طلبا آسانی سے پہنچ سکیں۔

یونیورسٹی کے امتحانات میں شرکت کے لئے اگر تجربہ اجازت دے، ایسے طلبا پر حاضری کے اوسط کی پابندی بھی نہیں لگانی چاہیئے۔ اس لئے کہ اوّل تو وہ بالغ ہوں گے اور اپنے نفع نقصان کا شعور رکھتے ہوں گے اور دوسرے اپنی مرضی اور ذوق و شوق سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے ٹیوٹوریل اسکولوں کے زمانۂ طالب علمی ہی سے عادی ہوں گے۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ اگر زندگی کی دوسری مصروفیتوں سے مجبور ہو کر وہ حاضری پوری نہیں بھی کر پائیں گے تو اس کی کمی کو محنت و مشقت اور طبیعت کی پختگی کے ذریعے پورا کر لیں گے۔ یہ بالغوں کی تعلیم کی ایک فردی شرط ہے، اگر پوری ہوگی تو ان کے اوپر اس کا نفسیاتی اثر بہت اچھا مرتب ہوگا۔

اڈلٹ ایجوکیشن کو اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا جزو قرار دینے کے بعد یونیورسٹیوں کے لئے ضروری ہو جائے گا کہ وہ اپنے یہاں دوسرے محکموں کی طرح اڈلٹ ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ قائم کریں یا مناسب سمجھیں تو اس محکمے کا نام اکسٹرا میورل ڈپارٹمنٹ قرار دیں تاکہ اس کے

ادارے میں بالغوں کی تعلیم سے متعلق اُن کے وہ کام بھی آجائیں جو ان بالغ طلبا رکی باضابطہ تعلیم کے علاوہ وہ عوام کو علوم و فنون سے متعارف کرانے کی غرض سے انجام دیں گی۔

۵۔ بالغوں کی عام تعلیم

اب تک کی بحث کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ (۱) بچوں کے لئے جو لازمی ابتدائی تعلیم کی منزل پار کریں گے ۱۸ سال کی عمر تک تسلسلی تعلیم لازمی ہوگی۔ (۲) اَن پڑھ بالغوں کے لئے جو قائمۂ ناخواندگی کی مہم کے نتیجے کے طور پر لکھنا پڑھنا سیکھ لیں گے، ایک متعینہ مدت تک مشتقی نصاب ضروری ہوگا۔ دوسرے الفاظ میں تعلیم کی یہ مقدار ملک کے ہر فرد کے لئے خواہ وہ اَن پڑھ بچہ ہو یا بالغ، لازمی ہوگی۔ (۳) اس تسلسلی اور مشتقی تعلیم کے بعد دوسری منزل وہ آئے گی جس میں تسلسلی تعلیم کی مدت پوری کرنے کے بعد ان نوجوان اور بالغ طلبار کا ایک طبقہ آگے کی اونچی تعلیم حاصل کرنے کا خواہش مند ہوگا، اور اُسے میٹرک یا ہائر سکنڈری کے فائنل امتحانات کی تیاری کرانے والے ٹیوٹوریل اور ٹیوٹوریل اسکولوں کی امداد کی ضرورت پڑے گی۔ (۴) اس منزل کو پار کر لینے کے بعد یونیورسٹی ایجوکیشن حاصل کرنے والے طلبا کو یونیورسٹیوں کے ایکسٹنشن یا اکسٹرا میورل ڈپارٹمنٹوں کی رہنمائی کی ضرورت ہوگی۔

اس تقسیم سے یہ بات ظاہر ہے کہ آخر کی تینوں منزلوں میں یعنی تسلسلی تعلیم کی مدت کے گزر جانے کے بعد جب تعلیم لازمی نہیں رہ جائے گی، کچھ لوگ آگے کی طرف بڑھیں گے اور کچھ لوگ وہیں پر پہنچ کر اپنا تعلیمی سفر ختم کر دیں گے اور زندگی کے دھندوں میں لگ جائیں گے۔ اس طبقے کی تعداد خصوصاً بالغوں میں نسبتاً زیادہ ہوگی اور انھیں ایسی تربیت کی ضرورت ہوگی جو براہ راست ان کے کام آئے۔ اور سچ پوچھیے تو اڈلٹ ایجوکیشن کے صحیح طالب علم اسی طبقے کے لوگ ہوں گے، اور ان کے ساتھ ایک حد تک وہ لوگ بھی جنھیں مہارتِ خصوصی (SPECIALIZATION) کے تقاضے سے علم کی دوسری شاخوں کی ابتدائی معلومات کی ضرورت ہوگی اور جو سوائے اڈلٹ ایجوکیشن کے تعلیم کے کسی اور ادارے کے توسط سے پوری نہ ہو سکے گی۔ اس تعلیم کی شکل و صورت مذکورہ بالا باضابطہ تعلیم کی طرح ادارے کی پابند یعنی (INSTITUTIONALIZED) نہیں ہوگی اس لئے کہ خود زندگی ادارے کی پابند نہیں ہوتی۔ اس کی شکل و صورت خالصتہً غیر رسمی ہوگی اور یہی غیر رسمیت اس کی کامیابی کی ضامن ہوگی۔

اس عام تعلیم کی شاخیں

بالغوں کی یہ عام تعلیم، بلا خوف اعتراض کہا جا سکتا ہے، اُسی قدر متنوع ہوگی جتنی زندگی کے مختلف دھارے متنوع ہوتے ہیں۔

یہاں میں ان بے شمار شاخوں میں سے صرف چند کا ذکر کروں گا تاکہ دوسری شاخوں کا تعین کرنے میں ان نمونوں سے مدد ملے۔

۱۔ مزدوروں کی تعلیم: ہندوستان جیسے ملک میں جہاں زندگی کو قائم رکھنے کے لئے روزگار کی تلاش ابتدائے عمر ہی سے شروع ہو جاتی ہے، ہر نوجوان سے جو لازمی ابتدائی تعلیم اور اس کے بعد کی مشتق اور مسلسل تعلیم کی منزل پار کرلے، یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ آگے کی اونچی تعلیم کا حوصلہ کرے گا۔ پھر صنعتیت کا آئے دن فروغ ہوتا جارہا ہے اور نئے نئے کارخانے اور صنعتی مرکز تقریباً روز کے روز قائم ہو رہے ہیں۔ اُدھر روزگار کی ضرورت اور تلاش اور اِدھر صنعتیت کا فروغ، قدرتی بات ہے کہ یہ نوجوان زیادہ سے زیادہ اسی طرف مائل ہوں گے اور اس طرح صنعتی مزدوروں کا طبقہ دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ اس صورتِ حال کا تقاضا ہو گا کہ مزدوروں کی تعلیم کا اچھے سے اچھا اور وسیع پیمانے پر بندوبست ہو۔

مزدوروں کی تعلیم اڈلٹ ایجوکیشن کی مستقل ایک شاخ ہے اور اس کے آداب و اقدار مقرر اور مرتب ہیں اس لئے اس کے مقصد و منہاج پر یہاں بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اس موقع پر یہ سوال اٹھانے کی ضرورت ہے کہ آیا یہ تعلیم حکومت کے زیرِ سایہ کامیاب اور وقت کے تقاضے کے مطابق ہو گی یا مزدوروں کا طبقہ اس کا بندوبست براہِ راست خود کرے گا۔

۲۔ پڑھے لکھوں کی تعلیم: پڑھے لکھے طبقے کی تعلیم بظاہر ایک عجوبہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا عجوبہ محسوس ہونا صرف ہندوستان ہی جیسے ملکوں میں سمجھ میں آسکتا ہے جہاں بے پڑھوں کی اتنی تعداد ہے کہ پڑھے لکھوں کی بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی، مگر اس کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ یورپ اور امریکہ میں جہاں بے پڑھوں کا مسئلہ سے وجود ہی نہیں ہے۔ اڈلٹ ایجوکیشن کا رواج کیوں عام ہے۔

تعلیم کی اس شاخ کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں مثلاً

ا۔ ماہرینِ خصوصی کے لئے: جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، یہ زمانہ مہارتِ خصوصی کا زمانہ ہے جس کے زیرِ اثر کوئی شخص علم کی تمام شاخوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ علم کی کسی ایک شاخ (اور اب تو حال یہ ہے کہ اس شاخ کی بھی ایک مخصوص شاخ) کا مطالعہ مکمل کرے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہو گا (اور ہو رہا ہے) کہ زندگی دوسرے علوم کی عدم واقفیت کی وجہ سے خالی خالی محسوس ہوتی ہے اور یہ ویرانی کبھی کبھی ذہنی عدم توازن کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اس سماجی نقصان سے بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اڈلٹ ایجوکیشن کے واسطے سے پڑھے لکھے بالغوں کو جو ماہر کسی نہ کسی ایک ہی مضمون کے ہوں گے، دوسرے علوم کی ابتدائی بنیادی معلومات بہم پہنچائی جائے۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، صرف اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ امریکہ میں اس خطرے سے بچنے کے لئے جنرل ایجوکیشن کے نام سے

یونیورسٹیوں میں تعلیم کی ایک شاخ کا رواج ہو گیا ہے لیکن امریکہ کے مقابلے میں انگلستان میں جنرل ایجوکیشن کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اس لئے کہ یہ ضرورت وہاں کے اڈلٹ ایجوکیشن کے نظام سے اچھی طرح پوری ہو رہی ہے۔

ب۔ والدین کی تعلیم: میرا خیال یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں اس کی پیدائش سے لے کر موت تک جتنے نسل اور مستقبل پر اثر انداز ہونے والے مرحلے آتے ہیں ان میں وہ مرحلہ سب سے زیادہ نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے جب دولہا دلہن پہلی بار باپ اور ماں بنتے ہیں۔ لیکن ہمارے یہاں جاہل اور اَن پڑھ والدین کی بات چھوڑئیے، اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ اس فن میں بالکل کورے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس ناواقفیت کا اثر صرف انہی کی ذات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ آنے والی پوری کی پوری نسل متاثر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے تعلیمی نظام میں "والدینیت" (PARENT HOOD) اور "بچوں کی پرورش" (CHILD REARING) کی تعلیم کا سرے سے کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اڈلٹ ایجوکیشن کا ایک بڑا منصب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ قومی نظام تعلیم کی کمیوں کو پورا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی والدین کی تعلیم و تربیت اڈلٹ ایجوکیشن کی ایک اہم ذمہ داری ہونی چاہیئے۔

اڈلٹ ایجوکیشن کا یہ پہلو بھی صرف اتنی بحث سے مکمل نہیں ہوتا، تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہاں اس تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

ج۔ زندگی کی مصروفیت کا تقاضا: سائنس اور مشین کے اس تیز رو دور میں زندگی جس قدر رواں دواں اور مصروف نظر آتی ہے، اتنی زمانۂ ماضی میں شاید کبھی نہیں تھی۔ اس مصروفیت اور دیوانہ وار دوڑ بھاگ کا نتیجہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اور معلومات کے ذرائع میسر آنے کے باوصف لوگ بالعموم حالات حاضرہ اور نئے نئے واقعات سے ناواقف ہوتے ہیں! انھیں خواہش ہوتی ہے کہ کوئی جانکار شخص ہوتا جو انھیں یہ حالات و واقعات اختصار ہی کے ساتھ ہی سُنا اور سمجھا دیتا۔ اس مقصد کے لئے حالاتِ حاضرہ، مخصوص مسائل، مخصوص واقعات و حادثات، مخصوص موضوعات سے متعلق ان کے ماہرین کے لیکچر، مقالات، صحبتیں وغیرہ منظم کی جاسکتی ہیں تاکہ یہ باتیں ان صحبتوں میں شریک ہونے والوں پر واضح اور صاف صاف ذہن نشین ہو جائیں اور اجنبیت باقی نہ رہے۔

اس صورت حال میں بھی اڈلٹ ایجوکیشن ہی کی طرف نظریں اٹھتی ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ خدمت اڈلٹ ایجوکیشن ہی انجام دے اور انجام دے سکتی ہے۔

د۔ فرصت کے اوقات کا صحت مند استعمال: پڑھا لکھا طبقہ ہو یا کم پڑھا لکھا مزدوروں اور کسانوں اور صناعوں کا طبقہ، کام سے تھکا ہارا جب واپس آتا ہے

زیادہ ضرورت ہوتی تھی اور سائنس اور مشین کے اس دور میں یہ ضرورت اتنی ہی شدید ہو گئی ہے جتنی کھانے پینے اور نیند کی ضرورت شدید ہوتی ہے، کہ کچھ عرصے کے لئے اپنے تھکا دینے والے کام کی صعوبتوں کو بھول جائے، کھیلے کودے، گائے بجائے، ہنسے اور قہقہے لگائے اور اس طرح دوسرے دن کے کام کے لئے تازہ دم ہو جائے۔

ہر ترقی یافتہ سماج میں اس ضرورت کے احساس کے تحت تفریح اور دل بہلاؤ کے وسائل موجود ہوتے ہیں جو کچھ تو کاروباری ادارے فراہم کرتے ہیں اور کچھ سماجی قسم کے ادارے۔ اس ضرورت کی تکمیل اڈلٹ ایجوکیشن کے منصبوں میں ایک اہم منصب تصور کیا گیا ہے اور ہمارے یہاں تو اس باب میں اتنا مبالغہ کیا گیا ہے کہ اسی کو سوشل ایجوکیشن کا واحد کام کہا جانے لگا ہے۔

فرصت کے اوقات کے استعمال کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں جو خالصۃً تفریحی بھی ہو سکتی ہیں اور تفریحی اور تعلیمی دونوں پہلو لئے ہوئے بھی۔ خالصۃً تفریحی سرگرمیاں تو اکثر و بیشتر تجارتی اور کاروباری ادارے منظم کرتے رہتے ہیں مثلاً سینما، تھیٹر، کارنیوال، سرکس وغیرہ۔ اڈلٹ ایجوکیشن کے اداروں کو اس شاخ میں چھوٹے پیمانے کی سرگرمیاں جیسے مختلف قسم کے فرشی کھیل، کٹھ پتلی اور معلوماتی فلموں کے شو، گپ شپ کلب، گانے بجانے کی محفلیں وغیرہ منظم کرنا۔ لیکن ان کا اس باب میں اصل اور نتیجہ خیز کام وہ ہے جو تفریح اور تعلیم دونوں پہلو لئے ہوئے ہو۔ مثلاً ہاتھ کے ایسے کام سیکھنا جن سے گھر کی آرائش میں مدد ملے ـــــ ان کاموں میں مٹی کے کھلونے اور نمونے، لکڑی پر کندہ کاری کا کام، مصوری اور پینٹنگ اور باغبانی جیسے فن آ سکتے ہیں؛ یا ایسے مشغلے جن سے فن بھی آتا ہے اور آپس میں ایک دوسرے سے مل جل کر کام کرنے اور رہنے سہنے کا موقع بھی ملتا ہے جیسے کسی ڈرامے کی تیاری اور اس کے سلسلے میں اداکاری، ڈرامہ نویسی، ڈائرکٹری، اسٹیج بنانے کا آرٹ سیکھا جا سکتا ہے۔ یا گانا بجانے کا فن سیکھنا، وغیرہ۔

۳۔ کم پڑھے لکھوں کی تعلیم:۔ پڑھے لکھے اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے درمیان فرق صرف تعلیم کے معیار اور کچھ بوجھ کے درجے کا ہوتا ہے ورنہ زندگی کے مسائل دونوں کے لئے قریب قریب یکساں ہوتے ہیں اور اس اعتبار سے ان کی تعلیم کی شکلوں کی تقسیم وہی ہو گی جو پڑھے لکھوں کی تعلیم کے باب میں بیان کی گئی ہے۔ شہر اور دیہات کے فرق کے لحاظ سے بھی دونوں جگہوں کے رہنے والوں کے درمیان کچھ فرق ہو سکتا ہے جسے ان تعلیمی سرگرمیوں کی تنظیم کے وقت دھیان میں رکھنا ضروری ہو گا ورنہ اس بات کا اندیشہ رہے گا کہ ان کے اوپر "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا" والی مثل صادق آ جائے۔

تنظیم کی شکلیں

ان تعلیمی سرگرمیوں کی تنظیم کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں اور ان کا تعین کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنی ہو گی کہ کس مقصد کے لئے کون سی شکل نتیجہ بخش اور مفید ہو گی۔ ان شکلوں کی فہرست تو بڑی طول طویل ہے مگر چند کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہو گا۔

۱۔ ایک دن کا اسکول۔ ۲۔ ہفتے کے آخری دن کے اسکول جو کسی مقررہ نصاب کو پورا کرنے کے لئے متعدد اسکولوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں اور ان کورسوں کی یونیورسٹیوں سے منظوری لی جاسکتی ہے۔ ۳۔ شبینہ اسکول جو والدین کی تربیت اور اس قسم کے دوسرے کورسوں کی غرض سے ایک مقررہ وقت کے لئے منظم کئے جاسکتے ہیں۔ ۴۔ ایک دن کے سیمینار جو درمیانی چھٹیوں کے دنوں میں منعقد کئے جاسکتے ہیں۔ اور جو کسی خاص موضوع کے ماہر کی صحبت میں پورے دن جاری رہ سکتے ہیں۔ ۵۔ پالی کلاسیں جو فرصت کے اوقات کے استعمال کی غرض سے تفریحی اور تہذیبی مشاغل کے لئے روز کے روز یا مخصوص دنوں میں منعقد کی جائیں۔ ۶۔ ایکس ٹینشن لیکچر۔ ۷۔ ڈرامے محفل موسیقی، دراما ئی پروگرام اور خوش باشی کی شام وغیرہ کے منصوبے بنانا اور چلانا وغیرہ۔

۴۔ جمہوریت کی تعلیم اور کمیونٹی سنٹر:

جمہوریت کی تعلیم اور مشق سماج کی ایسی اہم ضرورت ہے کہ جن ملکوں میں اس کا رواج ہوئے صدیاں گذر گئی ہیں، وہاں بھی اس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور بڑی آمادگی اور شد و مد سے کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے لئے تو یہ نیا تجربہ ہے اس لئے اس کی اہمیت جتنی یہاں ہے کسی اور جگہ میں نہیں آسکتی۔ مگر جمہوریت کی باضابطہ اور رسمی تعلیم سوائے اس کے کہ علم سیاست کے مطالعے کے سلسلے میں ضمنی طور پر آجائے باقاعدہ نصاب بنا کر دینا نہ ممکن ہی ہے اور نہ نتیجہ بخش ہی ہو گی۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے عملی مشق۔

ہندوستان میں خاص طور پر چاہے پڑھا لکھا طبقہ ہو یا ان پڑھ اور کم پڑھا لکھا، جمہوریت کی عملی مشق کے اعتبار سے قریب قریب ایک ہی صف میں آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے، ملک محکوم تھا، اور اس کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ جو حکم حضور کی ذہنیت کو زندگی کی قدر بنالے۔

تو اس کی عملی مشق کی کیا شکل ہو؟ یہ ہے وہ سوال جس کا جواب سوائے اڈلٹ ایجوکیشن کے اور کسی تعلیمی نظام کے پاس نہیں ہے! اور وہ یہ ہے کہ لوگ مختلف بہانوں سے ایک جگہ جمع ہوں، اپنی اپنی جماعتیں اور انجمنیں بنائیں اور ان کے کام کو جمہوری طرز پر چلائیں۔ یہ جماعتیں اور انجمنیں جتنی چھوٹی ہوں اتنا ہی اچھا ہے تاکہ اس کے اراکین ایک انبوہ کثیر میں گم ہو کر نہ رہ جائیں۔

اس سلسلے میں مختلف ترقی یافتہ ملکوں میں تجربے تو بہت ہوئے ہیں مگر جو تجربہ ہندوستان کے حالات سے زیادہ قریب ہے وہ میرے نزدیک انگلستان کا کمیونٹی سنٹروں اور پڑوس سبھاؤں NEIGHBOURHOOD ASSOCIATION کا تجربہ ہے۔ یہ کمیونٹی سنٹر ہمارے لئے ان جانے ادارے نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا بھی بہت کچھ جا چکا ہے۔ یہاں اس سلسلے میں صرف ایک بات پر زور دینا ہے اور وہ یہ کہ انگلستان کے کمیونٹی سنٹر سولہ سے سوا سولہ آنے کمیونٹی یا بستی کے قبضہ و تصرف میں ہوتے ہیں اور اسی سبب سے وہ بستی ان کے وسیلے سے آزادی کے ساتھ جمہوریت کی عملی مشق کرتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ہمارے یہاں کمیونٹی سنٹر کا تجربہ بالکل الٹے اصول پر کیا گیا یعنی یوں کہ سنٹر پر قبضہ و تصرف تو سرا سر حکومت یا حکومت جیسی کسی

سنستھا کا اور امید اس سے کی گئی کہ وہاں بستی کے لوگ آزادی سے جمہوری طرز تنظیم کی عملی مشق کریں گے تجربے کرنا کام ہونا تھا اور وہ ہوا۔ لیکن اگرچہ اس تجربے کو قریب قریب ترک کر دیا گیا ہے تاہم ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ اُسے پھر سے نئے اصول اور طریقے کے ساتھ شروع کیا جا سکتا ہے۔

یہی کمیونٹی سنٹر اڈلٹ ایجوکیشن سے متعلق اور بعض سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے، اپنی آغوش میں سمیٹ لے سکتے ہیں شرط صرف یہ ہے کہ حکومت انھیں اپنے اہتمام میں چلانے کے بجائے بستیوں اور پڑوسیوں کی اس بات کے لئے حوصلہ افزائی کرے کہ وہ اپنے لئے کمیونٹی سنٹر، پڑوس سبھا، تعلیمی مرکز، اور اسی طرح کی دوسری انجمنیں اور سنستھائیں بنائیں اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق (جس کے اوپر قوانین وضوابط کے ذریعے کسی قدر کنٹرول ہو) چلائیں۔

اترپردیش میں سہکاری سوسائیٹیاں

اُترپردیش میں اس مالی سال میں خدماتی سہکاری سوسائیٹوں کی تعداد ۲۰ ہزار تک پہنچ جائے گی۔ ایک اعلانیہ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تیسرے پلان کے آخر تک پردیش کی تمام کوآپریٹیو سوسائیٹیاں خدماتی سہکاری سوسائیٹوں میں بدل دی جائیں گی۔

عوامی تعلیم کا پنج سالہ منصوبہ

خواندگی بڑھ گئی

پچھلے مہینے آزاد ہندوستان کی دوسری مردم شماری کا کام مکمل ہو گیا۔ ابھی منی پور، ناگالینڈ اور نیفا کے علاقے شامل نہیں ہیں مگر ان کے علاوہ پورے ہندوستان کی آبادی کے اعداد و شمار کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ اعداد و شمار خواندگی کی رفتار کے بارے میں جو کیفیت پیش کرتے ہیں وہ ایک جمہوری ملک کی بقا اور ترقی کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

ان اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان کی آبادی میں گزشتہ دس سال کے اندر ساڑھے اکیس فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ یعنی ۱۹۵۱ء کے مقابلے میں آبادی ۳۶ کروڑ سے بڑھ کر اب ۴۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ہو گئی ہے۔ اس عرصے میں خواندگی کا اوسط بھی ۱۶٫۶ فی صدی سے بڑھ کر ۲۴ فی صدی ہو گیا ہے یعنی ۱۹۵۱ء میں اگر ملک میں ۵ کروڑ ۹۰ لاکھ پڑھے لکھے لوگ تھے تو ان کی تعداد اب ۱۰ کروڑ ۲۵ لاکھ ہو گئی ہے۔ گویا خواندہ لوگوں کی تعداد ۴ کروڑ ۳۵ لاکھ زیادہ ہو گئی ہے۔

ناخواندگی بھی بڑھ گئی

اس لحاظ سے دیکھئے تو یہ اعداد و شمار کم سے کم خواندگی کے معاملے میں کوئی بہت تاریک نقشہ نہیں پیش کرتے مگر اس کے باوجود انہی اعداد و شمار سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ناخواندہ لوگوں کی تعداد میں بھی اچھا خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ۳۶ کروڑ کی آبادی میں ناخواندہ لوگوں کی تعداد ۳۰ کروڑ ۲ لاکھ تھی اس وقت ۴۳½ کروڑ کی آبادی میں ۳۳ کروڑ ۲۶ لاکھ ہے۔ پچھلے دس سال میں آبادی میں ۷ کروڑ ۶۰ لاکھ کا اضافہ ہوا ہے۔ مگر خواندہ لوگوں کی تعداد میں صرف ۴ کروڑ ۳۵ لاکھ افراد کا اضافہ ہوا ہے اور ۳ کروڑ ۲۴ لاکھ افراد ان پڑھوں کے اس ٹڈی دل میں اور شامل ہو گئے ہیں۔ نیچے کے چارٹ سے اس صورت حال کا آسانی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

	۱۹۵۱ء	۱۹۶۱ء	مجموعی اضافہ
آبادی	۳۶ کروڑ	۴۳ کروڑ ۶۰ لاکھ	۷ کروڑ ۶۰ لاکھ
خواندہ لوگوں کی تعداد	۵ کروڑ ۹۰ لاکھ	۱۰ کروڑ ۲۵ لاکھ	۴ کروڑ ۳۵ لاکھ

	۱۹۵۱ء	۱۹۶۱ء	مجموعی اضافہ
ناخواندہ لوگوں کی تعداد	۳۰ کروڑ ۲ لاکھ	۳۳ کروڑ ۴۶ لاکھ	۳ کروڑ ۴۴ لاکھ

مجموعی اضافے کی کیفیت

آبادی	خواندگی	ناخواندگی
۷ کروڑ ۶۰ لاکھ	۴ کروڑ ۲۵ لاکھ	۳ کروڑ ۴۴ لاکھ

تشویشناک مسئلہ

خواندگی کی مجموعی تعداد اور اوسط فی صد میں جو اضافہ ہوا ہے وہ دراصل تعلیمی کاموں کے معاملے میں ہمارے اس خلوص اور نیک نیتی کا ثبوت ہے جو ہم اپنے ترقیاتی پروگراموں میں دکھاتے رہے ہیں۔ آبادی میں تیز رفتار اضافے کے باوجود خواندگی کے اوسط فی صد کا بھی بڑھتے رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیمی کاموں کی طرف سے ہم غافل نہیں رہے اور ان کو ترقی دینے کی کوششیں، سست روی کے ساتھ ہی سہی برابر جاری رہیں۔ مگر اسی کے ساتھ جب یہ نظر آتا ہے کہ ناخواندہ لوگوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے تو صورتِ حال کی نزاکت کا احساس بھی ہونے لگتا ہے۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ دس سال پہلے کے مقابلے میں ناخواندگی کا مسئلہ آج زیادہ تشویشناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس مسئلے کی نزاکت اور بڑھ جاتی ہے جب مختلف ریاستوں میں خواندگی کی مجموعی تعداد اور اس اعتبار سے عورتوں اور مردوں کے تناسب کا حال کھلتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

آبادی، خواندگی، اور عورتوں اور مردوں کی خواندگی کا ریاست وار نقشہ

نام صوبہ	آبادی	مرد	پڑھے لکھے مرد	عورتیں	پڑھی لکھی عورتیں
آندھرا پردیش	۳ کروڑ ۶۰ لاکھ	ایک کروڑ ۸۲ لاکھ	۵۳ لاکھ ۹۳ ہزار	ایک کروڑ ۷۸ لاکھ	۲۰ لاکھ ۹۵ ہزار
آسام	۱ کروڑ ۱۹ لاکھ	۶۳ لاکھ ۸۱ ہزار	۲۲ لاکھ ۴۴ ہزار	۵۵ لاکھ ۴۱ ہزار	۸ لاکھ ۱۱ ہزار
بہار	۴ کروڑ ۶۵ لاکھ	۲ کروڑ ۳۳ لاکھ	۶۹ لاکھ	۲ کروڑ ۳۲ لاکھ	۱۵ لاکھ ۷۵ ہزار
گجرات	۲ کروڑ ۶ لاکھ	۱ کروڑ ۶ لاکھ	۴۳ لاکھ ۳۲ ہزار	۱ کروڑ	۱۹ لاکھ ۵ ہزار
جموں و کشمیر	۳۵ لاکھ ۶۰ ہزار	۱۹ لاکھ ۳ ہزار	۳ لاکھ ۱۱ ہزار	۱۷ لاکھ ۱ ہزار	۶۰ ہزار ۷ سو

نام صوبہ	آبادی	مرد	پڑھے لکھے مرد	عورتیں	پڑھی لکھی عورتیں
کیرالہ	۱ کروڑ ۶۹ لاکھ	۸۳ لاکھ ۶۳ ہزار	۳۵ لاکھ ۲۲ ہزار	۸۵ لاکھ ۴۲ ہزار	۳۳ لاکھ ۴۹ ہزار
مدھیہ پردیش	۳ کروڑ ۲۴ لاکھ	۱ کروڑ ۶۶ لاکھ	۳۳ لاکھ ۲۵ ہزار	۱ کروڑ ۵۸ لاکھ	۱۰ لاکھ ۳۷ ہزار
مدراس	۳ کروڑ ۳۱ لاکھ	۱ کروڑ ۶۹ لاکھ	۷۲ لاکھ ۷۰ ہزار	۱ کروڑ ۶۲ لاکھ	۲۸ لاکھ ۹۲ ہزار
مہاراشٹر	۳ کروڑ ۹۵ لاکھ	۲ کروڑ ۳ لاکھ	۸۵ لاکھ ۳۴ ہزار	۱ کروڑ ۹۱ لاکھ	۳۱ لاکھ ۷۸ ہزار
میسور	۲ کروڑ ۳۵ لاکھ	۱ کروڑ ۲۰ لاکھ	۴۳ لاکھ ۴۲ ہزار	۱ کروڑ ۱۵ لاکھ	۱۴ لاکھ ۳۲ ہزار
اڑیسہ	۱ کروڑ ۷۶ لاکھ	۸۷ لاکھ ۶۲ ہزار	۳۰ لاکھ ۲۱ ہزار	۸۷ لاکھ ۳۹ ہزار	۷ لاکھ ۵۸ ہزار
پنجاب	۲ کروڑ ۳ لاکھ	۱ کروڑ ۹ لاکھ	۳۵ لاکھ ۲۴ ہزار	۹۴ لاکھ ۱۲ ہزار	۱۳ لاکھ ۹۱ ہزار
راجستھان	۲ کروڑ ۲ لاکھ	۱ کروڑ ۶ لاکھ	۲۴ لاکھ ۹ ہزار	۹۵ لاکھ ۸۸ ہزار	۵ لاکھ ۳۴ ہزار
اتر پردیش	۷ کروڑ ۳۸ لاکھ	۳ کروڑ ۸۰ لاکھ	۱ کروڑ ۳ لاکھ	۳ کروڑ ۱۵ لاکھ	۲۵ لاکھ ۵۲ ہزار
مغربی بنگال	۳ کروڑ ۵۰ لاکھ	۱ کروڑ ۸۶ لاکھ	۴۷ لاکھ ۳۵ ہزار	۱ کروڑ ۶۴ لاکھ	۲۷ لاکھ ۴۵ ہزار
جزائر انڈمان نکوبار	۶۳ ہزار ۴ سو	۳۹ ہزار ۲ سو	۱۶ ہزار ۶ سو	۲۴ ہزار ۲ سو	۴ ہزار ۷ سو
دہلی	۲۶ لاکھ ۳۴ ہزار	۱۴ لاکھ ۱۸ ہزار	۸ لاکھ ۷۲ ہزار	۱۱ لاکھ ۶۳ ہزار	۴ لاکھ ۸۷ ہزار
ہماچل پردیش	۱۳ لاکھ ۴۹ ہزار	۷ لاکھ	۱ لاکھ ۸۵ ہزار	۶ لاکھ ۳۹ ہزار	۲۹ ہزار
جزائر لکادیپ وغیرہ	۲۴ ہزار ایک سو	۱۱ ہزار ۹ سو	۴ ہزار ۳ سو	۱۲ ہزار ۲ سو	۱ ہزار ۳ سو
تری پورہ	۱۱ لاکھ ۴۲ ہزار	۵ لاکھ ۹۱ ہزار	۱ لاکھ ۹۰ ہزار	۵ لاکھ ۵۰ ہزار	۲۳ ہزار ۹ سو

سماجی اور اقتصادی ترقی کے لئے عوامی تعلیم کی ضرورت

یہ اعداد و شمار ایک جمہوری سماج کو، جس نے منصوبہ بند ترقی کے ذریعہ ملک کے سماجی اور اقتصادی معیار کو بلند کرنے کا فیصلہ کیا ہو، متنبہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کا کوئی ملک اس وقت تک کسی بھی حیثیت سے خواہ وہ اقتصادی حیثیت سے ہو یا سماجی حیثیت سے ترقی نہیں کر سکا ہے جب تک وہاں کے لوگ جاہل اور ناخواندہ رہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت ساڑھے ۴۳ کروڑ میں سے ۳۲ کروڑ آدمی ناخواندہ ہے۔ ظاہر ہے یہ تعداد اس وقت تک اسی رفتار سے بڑھتی رہے گی جب تک تعلیمی ترقی کی موجودہ کوششوں میں کوئی غیر معمولی تبدیلی واقع نہ ہوگی۔ تعلیم کو فروغ دینے کا کام آج جس نہج پہ ہو رہا ہے اس سے تو ممکن ہے کہ

خواندگی کے اوسط اور مجموعی تعداد میں تھوڑا بہت اضافہ ہوتا ہے اور تعلیم کا معیار بھی کسی قدر اونچا ہو جاتا ہے۔ مگر ان کوششوں سے ناخواندگی کا یہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو سکے گا۔ جب تک ہماری راہ میں یہ پہاڑ حائل ہے اس وقت تک ملک میں جمہوری نظام کی نشوونما، منصوبہ بند ترقی کے عیش و مسرت کی شیرینی چکھنے کے قریب، اور ذوق و شوق کے ساتھ ترقی کی جوئے شیر لانے کا خواب اور اشتراکی نمونے کا سماج قائم کرنے کا منصوبہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

ترقی یافتہ ملکوں نے اقتصادی ترقی کی جو منزلیں پار کی ہیں ان پر ایک ہی نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ جن ممالک نے کوشش کر کے تعلیم کو فروغ دیا، انہی کے یہاں تعمیر و ترقی کی بہار در بار میں لکشمی دیوی کا نزول ہوا ہے۔ ان کے یہاں تعلیمی ترقی کے بعد صنعتیں بھی پھولیں پھلیں، اور زراعت اور تجارت نے بھی بہار دکھائی۔ یہ صورتِ حال کسی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی۔ اسکینڈی نیویا کے ممالک، امریکہ، جرمنی اور روس کی مثالیں اس کا زندہ ثبوت ہیں۔ کسی ملک کی ترقی کا انحصار اس کی دولت ہی پر نہیں ہوتا، بلکہ وہ دل اور دماغ ہوتے ہیں جو ملک کو ترقی کی معراج پر لے جانے کے لئے نئے نئے وسائل تلاش کر لیتے ہیں۔

تعلیم اس حیثیت سے کہ وہ کسی ملک کو اقتصادی اور سماجی اعتبار سے ترقی کے عروج پر پہنچانے میں مددگار ہوتی ہے، اس کے لئے سب سے اہم اور ضروری شرط یہ ہے کہ اُسے جلد از جلد ملک میں عام کر دیا جائے۔ اسکول کی عمر کے تمام بچوں کے لئے اسکولوں کا انتظام کیا جائے اور ان پڑھ بالغوں کے لئے چاہے وہ جوان سال ہوں، ادھیڑ ہوں، بوڑھے ہوں، عورتیں ہوں یا مرد ہوں — سب کے لئے خواندگی اور کارآمد تعلیم کی باضابطہ اور منظم مہمیں چلائی جائیں تاکہ آبادی کا کوئی بھی حصہ تعلیم کے فیض سے محروم نہ رہ جائے۔ صرف اسی صورت میں تعلیم ملک کی سماجی اور اقتصادی ترقی میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اقتصادی اور سماجی ترقی ہر حالت میں باشعور اور ہوشمند عوام کی رہینِ منت ہوتی ہے۔

پنج سالہ منصوبے میں تعلیم

کسی جمہوری ملک میں منصوبہ بند ترقی کی کوششیں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب وہاں کے عوام میں سوچ بات کر سکنے اور صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ تعلیم اس حیثیت سے کہ وہ لوگوں کے ذہن کو روشن اور ان کی قوتِ فیصلہ میں پختگی پیدا کرتی ہے، جمہوری منصوبہ بندی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے پنج سالہ منصوبوں میں بابت تعلیم بھی کی گئی ہے اور مختلف دستاویزوں میں بار بار اس پر زور بھی دیا گیا ہے۔ پچھلے منصوبوں کے خاکوں کی روشنی میں دیکھئے تو یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ تعلیم کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ تیسرے پلان کے مجوزہ خاکے میں اس کے باوجود کہ سماجی خدمت کے کاموں کے لئے جن میں تعلیم کا کام بھی شامل ہے [illegible] رکھی گئی ہے وہ پہلے اور دوسرے پلانوں کے مقابلے میں اوسطاً [illegible] تعلیم کی مد میں اوسطاً بھی اضافہ

[illegible]

کے لئے کی بالترتیب ۲۰۰ کروڑ اور ۲۰۸ کروڑ کی رقم مختص کی گئی تھی۔ تیسرے پلان میں عام تعلیم کے مصارف کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ (اس میں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی مد شامل نہیں ہے جس کے لئے الگ سے ۱۴۲ کروڑ کی رقم رکھ دی گئی ہے)

ابتدائی تعلیم	ثانوی تعلیم	اعلیٰ تعلیم	سماجی تعلیم
۲۰۰ کروڑ	۹۰ کروڑ	۸۸ کروڑ	۲۵ کروڑ

ظاہر ہے اس تقسیم کے پیش نظر پلان کی توجہ کا مرکز زیادہ سے زیادہ یہی چند کام ہو سکیں گے جن کا منصوبے کے مجوزہ خاکے میں خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے یعنی (۱) ۶ سے ۱۱ سال کی عمر کے بچوں کے لئے ابتدائی لازمی تعلیم کا انتظام کرنا (۲) سیکنڈری اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں سائنس کی تعلیم کو بلند معیار بنانا اور (۳) ہر طرح کی تعلیم کے لئے استادوں کی ٹریننگ۔ [illegible] صورت حال میں جب کہ خواندگی کے اوسط میں اضافے کے ساتھ ساتھ ناخواندہ لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے ناخواندگی کے انسداد کا جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، منصوبے کے مجوزہ خاکے میں کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ سماجی تعلیم کے لئے پلان میں ۲۵ کروڑ کی رقم رکھی گئی ہے اس کے خرچ کے مدوں کی کوئی تفصیل بھی نہیں دی گئی ہے بس اتنا کہا گیا ہے کہ پلان کے آخری مسودے میں اس کی تفصیلات طے کر دی جائیں گی۔ اس صورت میں یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان تفصیلات میں ناخواندگی کے انسداد کی کوئی مد نہ ہوگی لیکن حالات کے مطالعے سے اندیشہ ضرور ہوتا ہے کہ سماجی تعلیم کی گاڑی اب تک جس ڈگر پر چلتی رہی ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اور اس کے لئے ابھی اگلے کئی پنج سالہ منصوبوں کی راہ دیکھنی پڑے گی۔

عوامی تعلیم کا پنج سالہ منصوبہ

عوامی تعلیم کے میدان میں اب صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ پنج سالہ منصوبے کے تحت مختلف اسکیمیں [illegible] چلائی جاتی رہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ الگ سے عوامی تعلیم کے پنج سالہ منصوبے بنائے اور چلائے جائیں۔ ان کی حیثیت عام پنج سالہ پلانوں کا جز ہوتے ہوئے بھی آزاد منصوبوں کی ہونی چاہئے۔ آزادی سے میری مراد یہ ہے کہ پلان کے دیگر امور میں ترجیح اور تقدیم (PRIORITY) کے اصول کے ماتحت اس کے مصارف میں من مانی کتر بیونت کا موقع نہ ہو۔ یہ اس لئے کہ اب تک کی روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے ترقیاتی مصارف کی صحت و سلامتی کے لئے تعلیمی مصارف کی قربانی کا [illegible] ہندوستانی منصوبہ بندی میں مسلمہ اصول کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

عوامی تعلیم کے ان پنج سالہ منصوبوں میں بنیادی مقصد کچھ عرصے تک ناخواندگی کے انسداد کو قرار دینا [illegible]

شفیق صاحب کا خط

برکت علی فراقؔ کے نام

فردوس آباد۔ عالم آخرت

مجی برکت صاحب

آپ جب کبھی مجھے یاد آتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ مجازؔ کا ایک مصرع بھی یاد آجاتا ہے

سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے۔

مجازؔ نے تو یہ مصرع ممکن ہے کسی دوسری بات کے اظہار کے لئے کہا ہو مثلاً یہ کہ میں نے سب کی خبرگیری کی مگر خود اپنی خبرگیری کی بات اپنے ذہن میں کبھی آئی ہی نہیں۔ اور اس اعتبار سے یہ مصرع آپ کے اوپر صادق نہیں آتا۔ مجازؔ نے لوگوں کے چاک گریباں کو دیکھا ضرور مگر اسے سی بھی دیا لیکن آپ نے اپنا شیوہ لوگوں کے چاک گریباں پر انگشت نمائی بنا لیا ہے، اُسے آگے بڑھ کر "سی دینے" کی کوشش کبھی نہیں کرتے، اور آپ بھی جانتے ہیں کہ برائی پر ہنسنے والوں کو کوئی دوست نہیں بناتا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایسے آدمیوں کی زبان بند کرنے کے لئے انھیں خرید لیا جاتا ہے۔ آپ مگر خریدے بھی نہ جا سکے غالباً اس لئے کہ لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس سودے میں جو سرمایہ لگایا جائے گا ، ضائع جائے گا کیونکہ زبان اگر بند بھی ہو گئی تو نظریں کس طرح بند کی جائیں گی جو برائی کے سوا اور کچھ دیکھ ہی نہیں سکتیں۔

میں یہ جانتا ہوں کہ نیت آپ کی کبھی کسی معاملے میں بد نہیں ہوتی، جو کچھ آپ کہتے ہیں اپنی دانست میں اپنے مخاطب کی بھلائی کے لئے کہتے ہیں لیکن اگر یہ ہو جائے کہ لوگ کہنے والے کی بات کے بجائے اس تحریک کا تجزیہ کرنے لگ جائیں جو اس کے دل میں وہ بات کہنے کا سبب بنی تھی تو پھر رونا ہی کس بات کا ہے! آپ کی شخصیت کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ آپ کی تخلیق شاعری کے لئے ہوئی تھی اور آپ شعر گوئی ترک کرنے کے باوجود شاعر ہیں۔ آپ ہمیشہ ایسا خواب دیکھتے ہیں جس کے مستقبل میں پورا ہونے کی امید ہو تو ہو حال میں اس کا امکان دور دور نہیں ہوتا۔ آپ کو جھنجھلاہٹ اسی لئے ہوتی ہے۔ جیسے خواب دیکھنے والے ہر شاعر کو ہوتی ہے — کہ آپ کو اپنی امیدوں کا محل تعمیر ہوتے ہوئے کبھی نظر نہیں آتا۔

آپ کو یاد ہوگا میں آپ سے کہا کرتا تھا ۔۔ خاص طور پر اُس وقت جب آپ لوگوں کی تعلیم کا کوئی منصوبہ اپنے ہاتھ میں لیتے تھے ۔۔ "کہ امید زدہ ہوکر کامیابی کی قائم نہ کیجئے گا ورنہ بڑا سخت عذاب اٹھائیے گا اور آپ کے کام کا تو نقصان ہوگا ہی، خود آپ کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔" مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپنے میرے ہر سبق کو تو یاد کیا اس سبق کو کبھی ذہن نشین نہ کرسکے۔ آپ اپنے رسالے کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، جب کبھی حکومت کی جانب سے یا کسی رضاکار تعلیمی جماعت کی طرف سے کوئی نئی اسکیم سامنے آئی، آپ نے اس کا خیر مقدم کیا۔ وقتاً فوقتاً اس کی کمزوریوں اور نقائص کی طرف، اس میں شک نہیں، اشارہ بھی کیا، لیکن پھر بھی امیدیں اس اسکیم سے اتنی باندھیں اتنی باندھیں کہ اتنی شاید خود اسکیم کے مصنفوں کے بھی ذہن و خیال میں نہ ہوں گی۔ لیکن اوراق کو الٹتے وقت ترتیب واقعات کو ذہن میں رکھیں تو دیکھیں گے کہ وہی قلم جس نے قصیدے لکھے تھے اُسی ممدوح کی ہجو پر اُتر آیا ہے۔

آپ کی اس ذہنی کیفیت اور کرب و اضطراب کی حالت اُس وقت دیدنی ہوتی ہے جب آپ نیشنل سیمیناروں میں جاتے ہیں، وہاں کی بحثوں میں حصہ لیتے ہیں اور واپس آتے ہیں۔ آپ کی مایوسی کی کیفیت اور مضامین میں اس کیفیت کا اظہار دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کچھ ہوا ہے نہ آیندہ ہو سکتا ہے اور تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ ان سیمیناروں میں جانے سے پہلے آپ اپنے مضامین کی زبان میں یہ کہہ چکے ہوتے ہیں کہ کچھ ہونا جانا نہیں ہے، مگر اس کے باوجود وہاں سے واپس آتے ہیں تو بیمار بیمار سے لگتے ہیں۔ سیمینار کے انعقاد کے دوران میں ایک زمانے میں کچھ اسی قسم کی کیفیت میرے ایک دوست کی بھی ہوئی تھی جو اب مزدوروں کو ٹریڈ یونین کی تعلیم دینے لگے ہیں۔ اُن کو تو میں نے سمجھایا تو وہ سمجھ گئے اور ان کی بے چینی کی کیفیت دور ہو گئی لیکن آپ یہ نہ سمجھے کہ یہ سیمینار اور سبھائیں سال بھر کے کام سے تھکے ہارے لوگوں کی بس پکنک ہوتی ہے اور جو جماعت اس کا اہتمام کرتی ہے اس کا یہی کارنامہ کیا کم ہے کہ اتنے عظیم الشان پیمانے پر وہ اس کا انتظام کر دیتی ہے۔

آپ اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر، مجھے معلوم ہے، مجھ سے سوال کریں گے کہ "کیوں مولانا، آپ کی یہ تشبیہ اگلے پچھلے تمام سیمیناروں اور سبھاؤں پر صادق آتی ہے؟" مگر اس بات کو چھوڑیئے آپ کا یہ قومی مسئلہ ہے۔ آپ کے ہندوستان میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کام کرنے کا اصول یہ بن گیا ہے کہ ۔۔ اور اسے عملاً مان بھی لیا گیا ہے کہ کام زمین سے شروع کرنے کے بجائے آسمان سے شروع کر دیا جائے۔ آسمان پر چڑھنے کے ذوق و شوق میں لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ زمین میں بلا کی قوت کشش ہے۔ اس میں نہ آپ کا قصور ہے نہ اور کسی کا۔ یہ آپکے قومی مزاج کی بات ہے، اسے آپ کو مان لینا چاہیے اور چونکہ قوم کے ساتھ رہنا سہنا ہے اس لئے اس کے مزاج کو اپنے لئے قانونِ حیات بنا لینا چاہیے، ورنہ اس کے یہاں آپ کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ یہ نسخہ میرا آزمایا ہوا ہے، نیشنل سیمناروں اور سبھاؤں کو آپ پکنک سمجھیں گے اور اسی اعتبار سے اس سے امید لگائیں گے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دل کے دورے کے اثر سے آپ کی صحت کو جو نقصان پہنچا ہے وہ تو پورا ہی ہو جائے گا ممکن ہے اس میں اضافہ بھی اتنا ہو جائے کہ آپ آیندہ کی زندگی کے لئے اس میں سے کچھ پس انداز کر لیں۔

لکھنؤ کے سیمینار کے موقعے پر آپ نے ایک نظم کہی تھی ۔ دل کے کرب و اضطراب کی یہ کیفیت !! قیامت ہے قیامت !! آپ نے

پہ نظم لکھتے وقت یہ نہ سوچا کہ قلندروں اور ملنگوں کی اولاد آج کے زمانے میں وہ زندگی گزارتی ہے کہ اس کی مثال یورپ اور امریکہ میں ملے تو ملے۔ آپ کے ہندوستان کے مستقبل میں تو اس کا ابھی دور تک امکان نہیں ہے!! اور اس وقت یہ کیوں بھول گئے کہ جھونپڑوں اور خانقاہوں میں پیدا ہونے والی تحریک کچھ عرصے کے بعد پخ کے محل میں اپنا گھر بسائے گی جس کی تعمیر کے لئے خود آپ نے میری تصویریں چھاپ چھاپ کر چندے کی اپیلیں شائع کی تھیں۔

اس نظم کے سلسلے میں یہ بات تو میں نے جملۂ معترضہ کے طور پر کہی۔ جو چیز اس نظم میں مجھے خاص طور پر محسوس ہوئی وہ، وہ ہے جو کسی قدر گھوم کر خود میرے اوپر آتی ہے۔ آپ نے اپنا مرثیہ بھی تو اس میں لکھ دیا ہے:

میں تری بزم میں اب بھی مگر آ جاتا ہوں ۔۔۔ یوں کہ شاید تجھے یاد آئے وہ ترا ہم سن
ہاں وہی خادمِ دیرینہ کہ ان رندوں نے ۔۔۔ تیری خدمت کے لئے جس کو کیا تھا مامور
لوگ دیں اب اس کی کبھی شگفتہ رائے درست ۔۔۔ اس نے پیمانِ وفا تجھ سے مگر باندھ لیا
لیکن اب جب کہ ترا قصرِ تہی میں ہے گذر ۔۔۔ میں کہاں اور تری محفلِ شاہانہ کہاں!

میں تری بزم میں اب بھی مگر آ جاتا ہوں
اک نظر تاکہ ترا حسنِ فسوں گر دیکھوں

یہ بات تو برکت صاحب صحیح ہے کہ آپ کو شعر و ادب کی حسین دنیا سے الگ کر کے اڈلٹ ایجوکیشن کے خارزار میں پھنسا دیا گیا مگر میں سمجھتا ہوں جتنی صحیح یہ بات ہے اسی قدر یہ بھی واقعہ ہے کہ جس طرح اڈلٹ ایجوکیشن کی حسینہ نے آپ کی طرف سے منہ پھیر لیا اسی طرح شعر و ادب کی عروس زہرہ جبیں بھی آپ کو منہ نہ لگاتی، کیونکہ جس طرح اڈلٹ ایجوکیشن کی پری زاد کے یہاں مقبولیت کی شرط ذوق البجٹ کیت ہے اسی طرح شعر و ادب کی رادھا اپنے کرشنوں سے بانسری کی تان کی متوقع رہتی ہے۔ آپ کی محرومیٔ قسمت کو کیا کہئے کہ آپ نے عشق تو دونوں سے کیا مگر شرطِ وصل کسی کی پوری نہ کر سکے اور نہ اپنی طبیعت کی افتاد کے پیشِ نظر پوری کر سکتے ہیں۔

لیکن ان سب کچھ کے باوجود اب بھی برکت صاحب کچھ نہیں گیا ہے۔ آپ کی سیرت و شخصیت کی تعمیر اور اس کے استعمال کے باب میں جس کسی نے جو کچھ کیا، وہ نیک نیتی کی بنیاد پر کیا تھا۔ آپ مجھے یقین ہے اب بھی اپنے آپ کو سنبھال سکتے ہیں۔ بس ایک بات کوشش کر کے کر ڈالئے۔ آپ کا دل جتنا حسین ہے کم سے کم اتنا ہی حسین اپنی آنکھوں کو بھی بنا لیجئے۔ کائنات پھر عرش سے فرش تک مطلع انوار بن جائے گی۔ اسی طرح خواب تو خوب دیکھئے مگر اس کی تعبیر کی امید کبھی نہ باندھا کیجئے۔ اچھا خدا حافظ

آپ کا شفیق

سوشل ایجوکیشن اور جمہوری لامرکزی تنظیم

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے اہتمام میں سوشل ایجوکیشن کا بارہواں نیشنل سیمنار جو اس سال ۲۷ تا ۳۰ ستمبر کو کوٹمبٹور میں ہونا طے پایا ہے اس کے ڈائرکٹر شری بھگونت سنگھ مہتہ، چیف سکریٹری حکومت راجستھان ہوں گے۔ سیمنار کا زیر بحث موضوع ہے "سوشل ایجوکیشن اور جمہوری لامرکزی تنظیم"۔ جمہوری لامرکزیت کے باب میں حکومت راجستھان نے پہل کی ہے۔ اس اعتبار سے شری بھگونت سنگھ کی رہنمائی سیمنار کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔

سیمنار کے سکریٹری جنرل شری۔ بی۔ آر۔ کرشنا مورتی، ڈائرکٹر پی۔ ایس۔ جی۔ اسکول آف سوشل ورک کوئمبٹور ہوں گے۔

شفیق میموریل کا افتتاح

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی عمارت شفیق میموریل کا افتتاح پنڈت جواہرلال نہرو صاحب فرمائیں گے۔ یہ افتتاحی تقریب جس کی صدارت ایسوسی ایشن کے صدر ڈاکٹر موہن سنگھ مہتہ فرمائیں گے، ۲۶ اپریل کو شام کے ½ ۵ بجے شفیق میموریل واقع ۱۷۔ بی۔ اندر پرستھ مارگ نئی دہلی میں منعقد ہوگی۔

راجستھان میں سوشل ایجوکیشن کا خود مختار بورڈ

راجستھان سوشل ایجوکیشن بورڈ بل، جسے سوشل ایجوکیشن کے میدان کے ایک رہنما شری جاردن ناگر نے اسمبلی میں دو سال پہلے پیش کیا تھا، سیلکٹ کمیٹی کی ترمیم شدہ سفارشات کے ساتھ پاس ہو چکا ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق راجستھان میں سوشل ایجوکیشن کے لئے ایک خود مختار بورڈ کی تشکیل کی جائے گی۔ یہ بورڈ راجستھان میں سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کی منصوبہ بندی کرے گا اور ان کے عمل درآمد کے لئے وسائل فراہم کرے گا۔

سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کا ٹریننگ کورس

دہلی میں

شہراتی علاقوں میں سوشل ایجوکیشن اور مزدوروں کی تعلیم کے موضوع پر ایک سہ ماہی ٹریننگ کورس ۱۵ مئی ۱۹۶۱ء سے شروع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے کا دوسرا ٹریننگ کورس ہے۔ پہلا کورس ۱۴ نومبر ۱۹۶۱ء سے شروع ہوا تھا۔

کورس میں داخلے کی درخواست بھیجنے کی آخری تاریخ ۵ مئی ۱۹۶۱ء ہے۔ اس سلسلے میں انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن ۱۷۔ بی اندر پرستھ مارگ نئی دہلی سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

ترقی پذیر ملکوں میں اڈلٹ ایجوکیشن - جرمنی میں افریشیائی سیمنار

"جرمنی کا انسٹی ٹیوٹ فار ڈیویلپنگ کنٹریز" اس سال ۵ سے ۹ مئی تک مغربی جرمنی میں افریشیائی ملکوں کے تعلیم بالغان کے ماہرین کا ایک سیمنار منعقد کر رہا ہے۔ اس سیمنار میں انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے نائب صدر شری دتشی پانڈے، میسور اسٹیٹ اڈلٹ ایجوکیشن کونسل کے صدر شری این۔ بھدریا اور لٹریسی ہاؤس لکھنؤ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ٹی۔ اے۔ کوشی ہندوستان کی نمائندگی کریں گے۔

صنعتی تعلقات اور حکومت کا منصب

انٹرنیشنل کنفیڈریشن آف فری ٹریڈ یونین کے اہتمام میں جنوب اور جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کے نمائندوں کا ایک سیمنار "صنعتی تعلقات میں حکومت کا منصب" کے موضوع پر غور کرنے کے لئے دہلی میں منعقد ہوا۔ حکومت ہند کے ریلوے منتری شری جگجیون رام نے ۸ اپریل کو اس سیمنار کا افتتاح فرمایا۔

ایشین ٹریڈ یونین کالج کلکتہ کے پرنسپل شری وی۔ ایس۔ ماتھر نے سب سے پہلے ایشین ٹریڈ یونین کالج کے اہتمام میں اس سے پہلے منعقد ہوئے پانچ سیمناروں کا مختصر تعارف پیش کیا اور موجودہ موضوع کی وضاحت فرمائی۔ دہلی کارپوریشن کے میئر شری شیام ناتھ نے باہر کے ملکوں کے نمائندوں کا دہلی کے اس تاریخی شہر میں تشریف لانے پر خیر مقدم کیا۔

کنفیڈریشن کے ریجنل ڈائرکٹر نے اپنی مختصر تقریر میں بتایا کہ انجمن کی رکنیت اس وقت ۶۰ لاکھ ۲۵ ہزار سے کچھ زیادہ ہے یعنی

ایشیا کے ۶۰ فی صدی مزدوروں کا اس انجمن سے کسی نہ کسی شکل میں الحاق ہے۔ کنفیڈریشن کے اہتمام میں چلنے والا ایشین ٹریڈ یونین کالج مزدور رہنماؤں کی تربیت کا بہت اہم اور مشکل کام انجام دے رہا ہے۔

انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے شری مینن نے آرگنائزیشن کی طرف سے مزدوروں کی فلاح و بہبود کے کاموں کا ذکر کرتے ہوئے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ فرمایا۔ آخر میں شری جگجیون رام نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھ کر سنایا جس میں موصوف نے ایک جمہوری اور فلاحی اسٹیٹ میں ٹریڈ یونینوں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی آزادی اور قومی ضرورتوں کے پیش نظر ان پر لگائی جانے والی پابندیوں کا ذکر کیا اور کہا کہ ان بدلے ہوئے حالات میں مزدوروں کو اپنی سماجی ذمہ داریوں کا خاص طور سے لحاظ رکھنا چاہیئے اور انھیں اپنے مطالبات پیش کرنے کا کوئی ایسا طریقہ ڈھونڈ نکالنا چاہیئے جس سے عوام کی بہبود کی خدمات میں کسی قسم کا خلل نہ واقع ہو اور ساتھ ہی نہیں کسی بے جا زیادتی کا شکار بھی نہ ہونا پڑے۔

آخیر میں شری ماتھر نے حاضرین اور مقررین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ ان بدلے ہوئے حالات میں صرف مزدوروں کی صحیح تعلیم ان میں وہ نظر پیدا کر سکتی ہے جو آج وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے۔

مدھیہ پردیش میں پنچایتی راج بل منظور

مدھیہ پردیش ہندوستان کی تیسری ریاست ہے جہاں پنچایت راج بل پاس ہو چکا ہے۔ راجستھان اور آندھرا میں اس سے پہلے اس طرح کا قانون پاس ہو چکا ہے۔

اس بل کے مطابق گاؤں میں ضلع پنچایتیں، ان سے اوپر علاقائی پنچایتیں یا جن پد پنچایتیں اور ضلع کی سطح پر ضلع پنچایتیں قائم ہو جائیں گی۔ اور جمہوری لامرکزی تنظیم کے اصول پر انھیں مقامی نظم و نسق اور ترقیاتی کاموں کے لئے ذمہ دار بنا دیا جائے گا۔

دہلی میں سہکاری کھیتی کا تجربہ

تیسرے پنج سالہ منصوبے کے ماتحت دہلی میں سہکاری کھیتی کے ۵ آزمائشی فارم قائم کئے جائیں گے۔ اس آزمائشی اسکیم کے علاوہ ۵۰ سہکاری فارم بھی قائم کرنے کی اسکیم ہے۔ حکومت ہند کے طے کئے ہوئے اصولوں کے ماتحت سوسائٹی کے ممبروں کی پہلے زمینیں ایک جائیں گی۔ یہ ممبر کھیتی باڑی کے انتظامات کے لئے مشترکہ طور پر ذمہ دار ہوں گے۔ دہلی ایڈمنسٹریشن ان کے لئے مالی امداد فراہم کرے گی۔

نئے پڑھنے والوں کے لئے

ہم ایک عرصے سے سوچ رہے تھے کہ تعلیم و ترقی ہمارے ان دوستوں کے بھی کام آئے جو ابھی اونچی قسم کی زبان نہیں سمجھ سکتے بلکہ ابھی نئے نئے پڑھنا لکھنا سیکھا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس ارادے میں ہم کامیاب ہو گئے اور اس پرچے سے "تعلیم و ترقی" میں کم پڑھے لوگوں کے لئے ایک حصّہ الگ کر رہے ہیں۔

ہماری کوشش ہوگی کہ ہم اس حصّے میں زیادہ سے زیادہ کام کی باتیں بتائیں۔ مگر یہ تو ہمارا سوچنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہم ضروری سمجھتے ہیں، وہ اِن نوسکھ بھائیوں کے لئے ضروری نہ ہو اس لئے زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ ہمارے کارکن اور احباب اِن لوگوں سے مل کر ان کی ضرورت کی باتیں معلوم کریں اور ہمیں لکھ بھیجیں تاکہ ہم اس حصّے کے مضمونوں کا پروگرام بناتے وقت ان باتوں کو بھی دھیان میں رکھیں۔

—— ایڈیٹر

یوجنا کیا ہے؟

فصل کٹ گئی۔ اناج گھر میں آگیا۔ اناج کیا آیا گھر مہمان خانہ بن گیا۔ اپنا اپنا حق مانگنے والے ایک ایک کرکے آرہے ہیں۔ بنیا اپنا حساب چکتا کرنا چاہتا ہے۔ بڑھئی ہل کے دام مانگتا ہے۔ نائی، دھوبی اپنا اپنا سالیانہ مانگ رہے ہیں۔ سب کو اسی اناج میں سے دینا ہے۔ اناج بیچ کر جو رقم آئے گی اُس سے بنئے کا حساب چکتا کیا جائے گا۔ بڑھئی، دھوبی اور نائی اناج کے ساتھ کچھ نقدی بھی مانگیں گے، وہ بھی اسی میں سے دی جائے گی۔ پھر گھر کی اپنی بھی ضرورتیں ہیں۔ اناج تو موجود ہے، رکھ لیا جائے گا۔ پر گھر گرہستی کی دوسری ضرورتیں ہیں! کپڑا لتا، گہنا پاتا، شادی بیاہ!!

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سارا کاروبار کیسے چلے گا! بڑا مشکل حساب کتاب ہے۔ مگر بھئی کرنا سب اسی میں سے ہے!! دوسرا اور اُپائے ہی کیا ہے؟ ایک ترکیب قرض ہے پر وہ گلے کی پھانسی بن جاتا ہے کہ ایک بار پڑ گئی تو نکالے نہیں نکلتی۔

پھر اگلے مہینے رشتہ داری میں بیاہ ہے۔ مالکن کو ابھی سے اس کی فکر ہے۔ عزت آبرو کا سوال ہے۔ اگلے سال گھر میں بہو بھی آئے گی۔ بیٹی کے گھر خوشی ہونے والی ہے۔ وہ الگ خرچ ہے۔ ننھا لڑکا تیرھویں سال میں لگا ہے۔ ماسٹر اُتر تے اُتر تے اُسے قصبے کے اسکول میں بھیجنا ہے۔ ہے اسکول میں جائے گا تو بڑا خرچ بھی ہوگا اور وہ بھی لگاتار کئی برس تک۔ پھر گھر سے باہر کا

خرچ، کہ چولھا جلانے کے لئے، مٹی بھی لو تو پیسہ لگے۔ اوپر سے مہنگائی ہے کہ ساون بھادوں کے بادل کی طرح چڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اگلے مہینے مال گذاری بھی جمع کرادینی چاہیئے اسی سال بوڑھے بیل کی جگہ نیا بیل بھی لینا ہوگا۔ خریف کی فصل کے لئے تو چلو اوپر بھگوان ہیں، پانی دے دیں گے، پر ربیع کے لئے تو نہر کا پانی لینا ہوگا۔ اس کا ٹیکس ہے، وہ بھی اسی میں دینا ہوگا۔

غرض فصل کٹ کے کیا آئی کہ منکو کا دماغ فکروں کا ڈیرہ بن گیا۔ وہ تو کہئے اس بار فصل اچھی رہی کہ ان کے دماغ میں سب باتیں آبھی گئیں، نہیں تو اس کا بھی کہاں موقع آتا ہے، سوچ بیا کرتے تھے کہ آنکھیں موند کے بیٹھ جاؤ اور جو بیتے مرپیٹ کر اوڑھ لو۔ آگے کچھ اور سوچو گے تو موت آنے سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔

یہ سوچنا تو ہر کسی کو پڑتا ہے، چاہے وہ کسان ہو یا کاری گر۔ مزدور ہو یا بابو، دیہاتی ہو یا شہری، امیر ہو یا غریب۔ من بڑا موذی ہوتا ہے، لاکھ آنکھیں موندو، اس کا چنچل پن نہیں جاتا۔ اور سچ پوچھو تو من کا یہ چنچل پن ہی زندگی کی نشانی ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اسے قابو میں رکھا جائے۔ اسی کو گیان کہتے ہیں۔ گیان کے ساتھ سوچ بچار کر کے کام کرنے سے زندگی اچھی گذرتی ہے۔ بھگوان نے عقل ہی اس لئے دی ہے کہ آدمی سوچ بچار سے کام لے۔ فکریں زندہ آدمیوں ہی کے لئے ہوتی ہیں۔ مردے کو فکروں سے کیا کام! گھر گرہستی ہے تو فکریں بھی ہوں گی اور ہونی بھی چاہئیں۔ جی دار آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ اِن فکروں سے نپٹنے کے لئے داؤں پیچ سوچتا ہے۔ آمدنی کم ہے۔ خرچ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے اور بڑھتا ہی جائے گا۔ گرہست کی مردانگی اس میں ہے کہ خرچ کو گھٹانے کی جگہ آمدنی کو بڑھانے کے اُپائے سوچے۔ اسی کا نام "یوجنا" ہے۔ اس کا مطلب ہے اچھے دن لانے کے لئے اپائے سوچنا اور اس کے مطابق بہادری

سے جم کر کام کرنا۔

منکو کا گھر ایک چھوٹا سا گھر ہے، بس یہی پانچ چھ پرانیوں کا گھرانا۔ ایسے ہی چھوٹے بڑے گھرانوں سے گاؤں بنتے ہیں، گاؤوں سے ضلعے، ضلعوں سے ریاستیں اور ریاستوں سے پورا دیس۔ اب دور تک سوچو تو ہمارا دیس بھی ایک بڑا گھرانا ہے جس میں ۴۴ کروڑ پرانی ہیں۔ اس گھرانے کی بھی ایسی ہی فکریں، گھر گرہستی کے ایسے ہی جنجال ہیں۔ پہلے جب تک پرائے بس میں تھا یہ سب جنجال اس کے پیلوتوں کے سر نہیں تھے۔ پر اب اپنا ہے اور ہمارے ہی اوپر اس کے بھلے بُرے کی ذمے داری ہے۔ اس کے کام کاج کے لئے ہم نے اپنے میں سے کچھ گیانی لوگوں کو چنا ہے۔ یہی لوگ، جیسے منکو اپنے گھر کو سُکھی بنانے کے اُپائے سوچتا ہے، پورے دیس کو سُکھی بنانے کے اُپائے سوچ رہے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ کچھ ایسا ہو کہ روزانہ کی دال روٹی بھی چلتی رہے اور اُسی کے ساتھ کچھ کام بھی ایسے ہو جائیں کہ آگے اُن سے سُکھ ملنے کی امید ہو۔ وہ بھی یوجنا بناتے ہیں۔

ہمارا دیس بہت بڑا دیس ہے۔ اس میں ۴۴ کروڑ کے لگ بھگ آدمی بستے ہیں۔ دیس کو ان سب کے لئے کھانے، کپڑے، مکان اور روزگار کا انتظام کرنا ہے۔ پر وہ جتنا بڑا ہے اتنا ہی غریب بھی ہے۔ اس کے پاس کھیتی کے لائق زمین تو ہے۔ مگر اس سے اتنی پیداوار نہیں ہوتی کہ سب لوگوں کو دونوں وقت سُکھ کی روٹی مل سکے۔ اتنا کام بھی نہیں ہے کہ سب کے لئے روزگار کا سہارا ہو جائے۔ غرض اتنے بڑے کنبے کے لئے آرام چین کی زندگی کی بات سوچنا آسان کام نہیں ہے، بڑا مشکل کام ہے۔

پھر یہ آبادی ہر سال لاکھوں کی تعداد میں بڑھ بھی جاتی ہے۔ ان کے لئے بھی کھانے، کپڑے روزگار کا انتظام پہلے سے سوچ لینا ہوتا ہے کیونکہ اگر پہلے سے اس کا دھیان نہ رکھا جائے تو بہت سے لوگوں کو یا تو کھانا مل ہی نہیں سکے گا یا ملے گا بھی تو بس آدھے پیٹ۔

اس بڑی بات کو چھوٹا کر کے سوچئے تو سمجھ میں آجائے گی۔ ایک گھر میں چھوٹے بڑے سات آدمی ہیں۔ ستر روپئے مہینے کی آمدنی ہے۔ اسی میں جوں توں کر کے سب کی گذر بسر ہوتی ہے۔ پانچ سال کے بعد دو بچے اور بڑھ جاتے ہیں پر آمدنی وہی ستر روپئے رہتی ہے۔ اب انھی ستر روپوں میں سات آدمی کے بجائے نو آدمیوں کا خرچ چلانا ہے۔ ستر روپئے پہلے ہی سات آدمیوں کے لئے پورے نہیں پڑتے تھے۔ اب سات چھوڑ نو آدمیوں کا خرچ آگیا۔ اب تو بس یہی ہوگا کہ پہلے چپٹی روٹی پہ گذر بسر ہوتی تھی تو اب سوکھی روٹی ہی پر صبر کرنا پڑے گا۔ وہ بھی پیٹ بھر نہیں یا دوسری صورت یہ ہے کہ آمدنی بڑھانے کا اُپائے کیا جائے۔ کیا اُپائے ہوگا۔ آمدنی کس طرح بڑھے گی۔ یہ سب باتیں آدمیوں کے بڑھنے سے پہلے ہی سوچنی ہوں گی۔ محنت زیادہ کر کے کچھ آمدنی بڑھانی ہوگی اس کے علاوہ روز کے روز یا مہینے کے مہینے کچھ بچانا بھی ہوگا تاکہ اس بچت کو دوسرے کمائی کے دھندوں میں لگا کر کچھ منافع کمایا جائے۔ جب اس طرح کے کچھ اپائے کئے جائیں گے تب یہ یقین ہو سکے گا کہ روکھی سوکھی کے بجائے دونوں وقت سب کو اچھا اور پیٹ بھر کھانا ملے۔

بالکل اسی طرح کی بات ہمارے دیس کے سامنے بھی ہے۔ غریبی کو دور کرنا ہے۔ کچھ ایسے اُپائے کرنا ہیں کہ ملک میں خوش حالی آجائے۔ سب لوگوں کو افراط سے کھانا، کپڑا، مکان اور روزگار ملے۔ مورکھتا اور جہالت کا اندھیرا دور ہو جائے۔ اور ہر طرف علم اور گیان کا اُجالا چھا جائے۔ اسی مطلب سے دس برس سے سرکار یوجنائیں بنا کر کام کر رہی ہے۔ ایک یوجنا پانچ برس کے لئے بنتی ہے۔ اسی لئے اسے پنج برسی یوجنا کہتے ہیں۔

اس کام کے لئے سرکار نے ملک کے بڑے بڑے گیانیوں اور رجان کاروں کی ایک سبھا بنائی ہے۔ جو دیش کی ترقی کے لئے یوجنا بناتی ہے۔ یہی سبھا یہ بھی سوچتی ہے کہ یوجنا میں جو کام سوچے گئے ہیں ان کو پورا کرنے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے اور کون سے کام پہلے کرنے کا ہے، کون سا کام بعد میں

کرنے کا ہے۔ کون سا کام سرکار کے کرنے کا ہے اور کون سے کام ایسے ہیں جن کو جنتا خود کر سکتی ہے۔

ہمارے دیش میں بڑے بڑے دریا ہیں۔ اونچے اونچے پہاڑ ہیں، لوہے، کوئلے اور دوسری دھاتوں کی کھانیں ہیں۔ غرض دھن دولت کے سادھن جتنے ہمارے یہاں ہیں، شاید ہی کہیں اتنے ہوں گے۔ مگر ان سے ہمیں ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ دریا کا پانی یہاں سے چل کر سمندر میں جا گرتا ہے۔ جو کھیت ان دریاؤں کے آس پاس ہیں، ان کو تو پانی مل جاتا ہے مگر جو علاقے اُن سے دور ہیں اُن کو اس پانی سے فائدہ نہیں پہنچ پاتا۔ اس لئے ان ندیوں سے نہریں نکال کر دور پڑے ہوئے علاقوں کو پانی پہنچانا ایک بڑا ضروری کام ہے۔

گاؤں سے شہروں کو اور ایک شہر سے دوسرے شہر کے درمیان ایک تو سڑکیں ہیں ہی نہیں اور اگر ہیں بھی تو یوں ہی اونچی نیچی اور کچی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ سامان لانے لے جانے میں مشکل پڑتی ہے جب یہ مشکل دور نہ ہو تجارت اور کاروبار کی ترقی ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ اس لئے گاؤں گاؤں اور شہروں کے بیچ میں سڑکیں بنوانا دوسرا بڑا کام ہے۔

ہماری دھرتی کے اندر لوہے، کوئلے اور تیل کے روپ میں بہت سادھن چھپا پڑا ہے۔ اس کو نکال کر کام میں لانا ہے اور جن چیزوں کے لئے دوسرے ملکوں کی ہمیں محتاجی ہے، ان کو خود اپنے یہاں تیار کرنا ہے۔ اس کے لئے کل کارخانوں کی ضرورت ہوگی۔ اور ان کلوں کارخانوں کو چلانے کے لئے بجلی کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہمیں اپنے دریاؤں سے نہریں نکالنے کے ساتھ بجلی کی طاقت بھی پیدا کرنی ہے۔

ہمارے دیش میں پڑھے لکھے لوگوں کی کمی ہے۔ سینکڑوں پیچھے بیس سے زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہیں ہیں۔ اس لئے بچوں اور ان پڑھوں کی تعلیم کا انتظام کرنا ہے۔ انھیں نئے نئے کام اور دھندے سکھانا ہے۔ یہ اور ایسے ہی اور بڑے بڑے کام ہیں جن کو پورا کرنے کے لئے ان پنج برسی یوجناؤں کے روپ میں کام ہو رہا ہے۔

آج سے دس برس پہلے ۱۹۵۱ء میں پہلی پنچ برسی یوجنا شروع کی گئی تھی۔ پہلی یوجنا ۱۹۵۶ء میں پوری ہو گئی۔ دوسری یوجنا اس سال پوری ہو جائے گی۔ اور اب اگلے سال سے تیسری پنچ برسی یوجنا شروع ہو گی۔ پچھلی دو یوجناؤں میں کتنا کچھ کام ہو گیا ہے، اور اب تیسری یوجنا میں کیا کیا کرنا ہے، یہ باتیں ہم آپ کے اس رسالے کے آگلے پرچوں میں لکھیں گے۔ اگر اس بارے میں کوئی بات ایسی ہو جو آپ نہ سمجھ پائے ہوں یا سمجھنے کے لئے کچھ اور باتیں جاننا چاہتے ہوں تو خود لکھ کر یا کسی سے لکھوا کر ہمیں بھیجئے۔ ہم آپ کا سوال اور اپنا جواب دونوں اس رسالے میں چھاپ دیا کریں گے۔

ایک کہانی

ایک فقیر تھا وہ دریا کے کنارے بیٹھا تھا۔ شاید پانی پینے یا وضو کرنے کے لئے۔ اس نے دیکھا ایک بچھو ڈبکیاں کھا رہا ہے۔ فقیر نے ہاتھ بڑھا بچھو کو نکال لیا اور زمین پر ڈال دیا۔ بچھو نے فقیر کو ڈنک مارا اور پھر رینگتا رینگتا پانی میں جا گرا اور ڈوبنے لگا۔

فقیر نے اُسے پھر نکال لیا۔ بچھو نے پھر ڈنک مارا۔ یہ تماشا فقیر کا ایک مرید دیر سے دیکھ رہا تھا۔ پاس آکر بولا "پیر جی بچھو ہے کہ آپ کو ڈنک مار رہا ہے اور آپ ہیں کہ بار بار اُسے پانی میں سے نکال دے رہے ہیں۔ اس میں کیا مصلحت ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

فقیر نے کہا "خدا نے ہر جاندار کا ایک ایک کام ٹھہرا دیا ہے۔ بچھو کا کام ڈنک مار کر تکلیف پہنچانا ہے۔ وہ اپنا کام کر رہا ہے۔ میرا کام لوگوں کو ڈوبتے سے بچانا ہے۔ میں اپنا کام کر رہا ہوں۔"

ادارۂ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر، نئی دہلی

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

مئی سنہ ۱۹۶۱ء

جلد ۱۲ ——— شمارہ ۵

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر:-

پروفیسر محمد مجیب
برکت علی فراق
رفیق محمد شاستری

دفتر:- ماہنامہ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر، نئی دہلی

قیمت سالانہ چار روپئے فی پرچہ ۳۰ نئے پیسے

ٹیلیفون:- ۴۴۴۶۷

ترتیب

پرنٹر و پبلشر برکت علی فراق نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

پنچایت اور سیاسی پارٹیاں

جب سے جمہوری لامرکزیت کے اصول پر پنچایتوں کو قانون کی رُو سے اختیارات ملنے لگے ہیں، اُس وقت سے ایک اُلجھن یہ آن پڑی ہے کہ آیا سیاسی پارٹیوں کو پنچایتوں کے کام کاج میں دخیل ہونا چاہیے یا نہیں۔ جہاں تک اس معاملے میں واقعات کا تعلق ہے سیاسی پارٹیاں پنچایتوں کی سیاست میں اپنا مستقبل بہت روشن دیکھ رہی ہیں اور پنچایتوں کے انتخابوں میں بھی وہی داؤپیچ اختیار کیے جاتے ہیں جو پارلیمنٹ، ریاستی اسمبلیوں اور کارپوریشنوں کے انتخابات میں رائج ہیں۔

ابھی ۴ ارپریل کو پنچایتوں کے رضاکار رفاق آل انڈیا پنچایت پریشد کا سالانہ اجلاس ہوا تھا جس کی صدارت جے پرکاش نرائن نے کی تھی۔ اس اجلاس میں بھی یہ موضوع زیر بحث آیا تھا، مگر اس سلسلے میں جو فیصلہ ہوا ہے، وہ قابل عمل نہیں معلوم ہوتا۔ اس پریشد نے اس باب میں دو تجویزیں منظور کی ہیں۔ ایک کی رُو سے یہ تجویز کہ سیاسی پارٹیوں کو پنچایتوں کے انتخابات پارٹی لائن پر لڑنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، مسترد کر دی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیاسی پارٹیوں کو پارٹی لائن پر انتخابات لڑنے کا حق ہونا چاہیے۔

دوسری تجویز جو منظور ہوئی یہ ہے کہ پنچایتوں کے انتخابات متفقہ ہونے چاہئیں تاکہ پنچایتیں اپنے انتظامی اور ترقیاتی کام کامیابی سے چلا سکیں۔

پہلی اور دوسری تجویزوں کو ایک ساتھ رکھ کر غور کیجیے دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آگ اور پیٹرول کو ایک ہی جگہ رکھا بھی جائے اور پھر بھی یہ امید کی جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے ملاپ سے بھڑک نہ اُٹھیں۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ سیاسی پارٹیاں موجود بھی ہوں اور انھیں پارٹی لائن پر انتخابات لڑنے کا حق بھی ہو اور پھر بھی یہ انتخابات متفقہ ہوں۔

پنچایتی انتخابات کا متفقہ ہونا، اس میں شک نہیں بہت ضروری ہے، اور اسی صورت میں سرو اسیوا سنگھ کا گرام سوراج کا اعلان، جسے پریشد نے منظور کیا ہے، اور جس کا سب سے اہم حصہ یہ ہے کہ ہر گاؤں کو یہ ذمے داری لینی چاہیے کہ گاؤں کا کوئی شخص بے روزگار نہیں رہے گا۔ اور اگر بے روزگار رہتا ہے تو گاؤں سماج کو چاہیے کہ جب تک اُسے روزگار نہ مل جائے،

اُسے سہارا دے گا، عمل جاری رہ سکتا ہے۔

پنچایتی انتخابوں کے متفقہ ہونے کی ضمانت اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک گاؤں کے لوگوں کی جمہوریت کے اصول پر تربیت نہیں کی جائے گی۔ اگر آل انڈیا پنچایت پریشد اپنے پروگرام میں گاؤں والوں کی تعلیم و تربیت کو نمایاں جگہ دے —— جس کا اُس کے ریزولیوشنوں میں کہیں ذکر نہیں ہے —— تو اُس کا یہ خواب جلد پورا ہوگا اور پنچایت راج کے اصول کی یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔

رفتارِ کارواں —————— بقیہ صفحہ ۲۴

گرام سیوکوں کو اعزاز

لدھیانہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاک کے ساہنوں سرکل کے گرام سیوک شری رگھوویر سنگھ مندھر کو ۱۹۶۰-۶۱ء میں ملک کا بہترین گرام سیوک قرار دیا گیا ہے۔

شری ساہنوں کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے وزیر شری ایس۔ کے۔ ڈے نے ۲۵۰۰ روپیہ کا انعام پیش کیا۔

ساہنوں سرکل ۱۱ گاؤں اور ۸۸۰۷ کی آبادی کا علاقہ ہے۔ اِس علاقے کی پیداوار میں ۲۵ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔

ریاستی سطح کا بہترین گرام سیوک منی پور بلاک کے ساؤمبنگ سرکل کے شری ایم۔ ایم۔ سنگھ کو قرار دیا گیا ہے۔ آپ کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا گیا ہے۔ ۶ اور گرام سیوکوں کو ڈھائی ڈھائی سو روپے انعام دیئے گئے ہیں۔

اڈلٹ ایجوکیشن کی تنظیم

سوشل ایجوکیشن کے بجائے پھر اڈلٹ ایجوکیشن کی راہ اختیار کرنے کے سلسلے میں پروگرام کا جو خاکہ ہم نے تجویز کیا تھا اس کو دیکھنے کے بعد ایک سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ اس پروگرام پر عمل کرنے کے لئے تنظیم کی کیا شکل ہونی چاہیے۔ آیا سوشل ایجوکیشن کی موجودہ تنظیم کے ذریعے اس پروگرام کی تعمیل ہو سکے گی یا اس کے لئے تنظیم کی کوئی دوسری راہ اختیار کرنی ہوگی۔

اس سلسلۂ مضامین کی زیر نظر قسط میں اسی سوال پر بحث کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں امید ہے کہ تحریک کے دوسرے ساتھی بھی ناظرین کو اپنے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع دیں گے۔ ہمیں اس سلسلے کے تمام مضامین کو، چاہے وہ مختصر ہوں، یا طویل، ان صفحات میں شائع کر کے خوشی ہوگی۔" —— ایڈیٹر

۱۔ سوشل ایجوکیشن کی موجودہ تنظیم

موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ سوشل ایجوکیشن کی تنظیم تو سولہ آنے سرکاری ہے ہی، اس کی تحریک بھی سرکاری ہے۔ سوشل ایجوکیشن کی پالیسی طے کرنے، اس میں نئے نئے تجربے کرنے اور پروگرام کی انجام دہی، غرض اول سے آخر تک سب کام حکومت کے براہِ راست انتظام میں انجام پاتا ہے۔ تنظیم کی یہ شکل ہے کہ افسروں اور ماتحتوں کا ایک سلسلہ ہے جو اوپر سے نیچے تک ہر سطح پر قائم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سب سے نچلی سطح پر جہاں کارکن کا عوام سے براہِ راست واسطہ ہوتا ہے سب سے کم حیثیت لوگ پہنچتے ہیں جو تعلیم، شخصیت، خلوص مقصد اور کام کے مبلغانہ جوش و خروش سے قریب قریب سو فی صدی عاری ہوتے ہیں اور بے روزگاری کے عذاب سے بچنے کی خاطر ہر وقت اور ہر قدم پر اپنے افسروں کی نگاہ پر نظر رکھتے ہیں حالانکہ عوامی تعلیم کے میدان میں ہی وہ مقام ہے جہاں پڑھے لکھے، سمجھدار، بلند مرتبہ اور

اپنی شخصیت کے جادو سے دلوں کو مسحور کر لینے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

تنظیم کا ایک پہلو جو اس سے زیادہ دردناک ہے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور تعلیم کی وزارتوں کی باہمی جنگ اور رقابت ہے جس کا حل اس صورت میں نکالا گیا ہے کہ کام ڈیولپمنٹ کے آدمی کریں اور اس کی نگرانی (جو صرف فنی نگرانی تک محدود رکھی گئی ہے) محکمہ تعلیمات کے آدمی کریں۔ یہ بات بھی کسی حد تک چل جاتی اگر کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا کام تعلیمی نوعیت کا ہوتا۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا بنیادی فلسفہ لاکھ تعلیمی سہی، اس کا زور اور عملی نعرہ پیداوار اور وہ بھی زرعی پیداوار بڑھانے پر ہے اور جس کی پیمائش کے لئے ٹارگیٹ یعنی نشانے مقرر ہیں۔ چنانچہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا تمام کام انہی پیمانوں سے ناپا جاتا ہے اور اسی کے مطابق پروگرام کی کامیابی اور ناکامی کے بارے میں حکم لگایا جاتا ہے۔

سوشل ایجوکیشن کا کام عوام کے اپنے کرنے کا کام ہے۔ اس اصول کو مانا تو جاتا ہے مگر صرف اصول کی حد تک۔ یوں بھی عوام کے اپنے نمائندے اور ادارے اس کام میں اب ہاتھ نہیں ڈالتے، اس لئے کہ وہ سوچتے ہیں سرکاری آب و ہوا میں رضاکاریت کا پودا پنپ ہی نہیں سکتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب سے سوشل ایجوکیشن کا کام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے اُس وقت سے رضاکارانہ اداروں اور سنستھاؤں کا خاتمہ ہونا قریب قریب بند ہو گیا ہے اور پرانے ادارے یا تو بند ہو گئے ہیں یا انھوں نے بھی زندہ رہنے کی خاطر سرکاری اداروں کا روپ دھار لیا ہے۔

اس تنظیمی نفسانفسی کا اثر یہ ہوا ہے کہ خود سوشل ایجوکیشن کا تصور ہی خطرے میں پڑ گیا ہے اور جب تصور ہی خطرے میں ہو تو اس کے وجود کا مستقبل آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہی غالباً خطرہ ہے جو سوشل ایجوکیشن کے پنڈتوں کو قریب قریب ہر سیمینار اور کانفرنس میں کسی نہ کسی بہانے سے از سر نو اس کی تعبیر و تفسیر پر مجبور کر رہا ہے لیکن خطرہ ہے کہ ان سب کوششوں کے باوجود ابھی جوں کا توں سر پر منڈلا رہا ہے۔

حکومت اور تعلیم

تعلیم اگر سچ پوچھئے تو ایک ایسا موضوع ہے جو تاریخ کے ہر دور میں، یہاں تک کہ ماضی قریب میں بھی حکومت کے اثر سے آزاد ہے۔ حکومت کی ذمے داری یہ اُس وقت سے قرار پایا ہے جب سے ملک کا انتظام اور نظم و نسق شخصی حکومت کے ہاتھ سے نکل کر جمہور کے ہاتھوں میں آیا ہے اور جمہوریت نے اشتراکیت کا رنگ اختیار کیا ہے اور اس عقیدے کا چلن ہوا ہے کہ جب سماج ملک کی ہر چیز کا امین ہے تو اُسے ملک کی تمام ضرورتوں کا کفیل بھی ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے چونکہ تعلیم بھی ملک کی ایک بڑی اور اہم ضرورت ہے اس لئے اس ضرورت کی تکمیل بھی سماج کے اوپر فرض ہے۔

اب اگر تعلیم کی تنظیم کے معاملے پر مذکورہ بالا نظریۂ ریاست کی وضاحت میں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم حکومت کی ذمہ داری قرار پاتی ہے مگر ایک مخصوص حد تک۔ یعنی اسی منزل تک کہ انسان کا نوخیز ذہن سمجھ داری اور ذمہ داری کے ساتھ سوچنے کے لئے تیار ہوجائے۔ تعلیم کے ماہر جانتے ہیں یہ منزل بلوغت کی عمر سے پہلے پہلے ختم ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ تعلیم حکومت کی براہ راست ذمے داری قرار پاتی ہے۔ اس سے آگے یعنی بلوغت کے زمانے کی تعلیم کے معاملے میں حکومت کی ذمہ داری کی نوعیت بالواسطہ ہوجاتی ہے۔ وہ براہ راست اپنے اہتمام اور نگرانی میں اس کا انتظام نہیں کرتی بلکہ عوام کے نمائندوں اور اداروں کو اس کے لئے تیار کرتی ہے، بحیثیت سے ان کی سرپرستی اور امداد کرتی ہے اور اپنا کنٹرول بس اس حد تک رکھتی ہے کہ سرمائے اور اختیار کا غلط استعمال نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ہر بالغ نظر دیکھ سکتا ہے کہ یونیورسٹیاں اور اڈلٹ ایجوکیشن کے ادارے ہر ترقی یافتہ ملک میں حکومت کی دست اندازی سے نہ صرف پاک ہوتے ہیں بلکہ اگر وہ انھیں امداد دینے میں کوتاہی یا تاخیر کرتی ہے تو اُن کی اور اُن کے ساتھ عوام کی سخت سے سخت تنقید کا نشانہ بھی بنتی ہے۔

آزاد ہندوستان کے بارہ سال

ہندوستان نے خوشی کی بات ہے آزاد ہوتے ہی اس بات کا کہ ملک کے ہر بچے کو تعلیم دینا حکومت کا فرض ہے، صرف احساس ہی نہیں کیا بلکہ ملک کے دستور میں اس کا ذکر کر کے اپنے آپ کو اس کا پابند کرلیا۔ ملک کی جہالت اور تعلیم سے محرومی کا اُسے اتنا شدید احساس تھا کہ اُس نے بالغوں کی تعلیم کو بھی براہ راست اپنے انتظام میں لے لیا اور عالمگیر پیمانے پر اس کا انتظام کیا۔ اس کے اس عمل سے اور کچھ نہ سہی تو اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ ملک میں تعلیم اور اس کی ضرورت کا زور شور سے چرچا ہوگیا اور لوگ یہ سمجھ گئے کہ اگر ترقی کر کے آگے بڑھنا ہے تو تعلیم پہلی اور بنیادی شرط ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، ممکن ہے کہ حکومت نے اس طرح کا غلط فیصلہ اسی مصلحت کی بنیاد پر کیا تھا۔

آزادی کے انھیں بارہ سال میں ملک کو ایک اور نہایت اہم سبق ملا ہے یعنی یہ کہ اتنے بڑے اور وسیع ملک میں مرکزی تو کیا ریاستی اور ضلع داری تنظیم کا اصول مان کر کبھی کم ترقیاتی اور تعلیمی پروگرام کامیابی سے نہیں چلائے جا سکتے۔ چنانچہ لامرکزی تنظیم کے نظریے کو نہ صرف اصولاً تسلیم کیا گیا ہے بلکہ چند ریاستوں میں اس نظریئے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے قانون بھی بن چکے ہیں اور دوسری ریاستوں میں عنقریب بننے والے ہیں۔

اڈلٹ ایجوکیشن کی تنظیم

عوام میں تعلیم کی اہمیت کا عالمگیر احساس اور لامرکزی اصول تنظیم کی مقبولیت، یہ دونوں باتیں اڈلٹ ایجوکیشن کی کامیابی

کے لئے نہایت سازگار ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے سوشل ایجوکیشن کا جو تصور قائم کیا گیا تھا اس میں بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر تعلیم کے علاوہ دوسرے بھی بہت سے موضوعات شامل ہو گئے تھے۔ ان موضوعات کو موجودہ حالات میں قائم رکھنا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ مضر بھی ہے اس لئے کہ ان موضوعات کی تکمیل کے لئے پنجسالہ پلانوں کے ماتحت دوسرے بہت سے پروگرام بڑے پیمانے پر چل رہے ہیں اور کامیابی سے کام کر رہے ہیں۔ اس میں کا اگر کوئی پہلو چھوٹ گیا ہے اور جس کے لئے بڑے پیمانے پر کوئی دوسرا پروگرام نافذ نہیں ہوا ہے تو وہ تعلیم ہے جو اس کا بنیادی موضوع تھا۔ ان حالات میں اگر ہم اڈلٹ ایجوکیشن خاص کو بڑے پیمانے پر نہیں اختیار کریں گے اور سوشل ایجوکیشن ہی کا نعرہ لگاتے رہیں گے تو تصور کا الجھاؤ روز بروز بڑھتا جائے گا اور اسی نسبت سے اس کا تعلیمی پہلو مدھم ہوتے ہوتے نظروں سے بالکل اوجھل ہو جائے گا۔

لامرکزی تنظیم کا اصول اڈلٹ ایجوکیشن کی کامیابی کے لئے یوں سازگار ہے کہ مقامی پنچایتوں اور بلاک کی سطح پر بنی ہوئی پنچایت سمتیوں کی موجودگی میں ریاست یا ضلعے کے صدر مقام میں بیٹھ کر کام کرنے کی ضرورت نہیں رہ جائے گی۔ ضلعے کی سطح پر صرف ایک اڈلٹ ایجوکیشن آفیسر کی ضرورت ہوگی جس کا کام ضلعے کے علاقوں میں گشت کر کر کے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس مقصد کے لئے بنے ہوئے قواعد و ضوابط (جن کا ذکر آگے آتا ہے) کی پابندی ہو رہی ہے یا نہیں۔ اصل کام کی ذمے داری بلاک سمتی میں قائم اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ پر ہوگی جو اس مقصد کے لئے بنے ہوئے قواعد و ضوابط کے مطابق خود بھی کام کرے گا اور بیشتر گاؤں اور قصباتی بستیوں کے مقامی اداروں سے کام لے گا۔

اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ ایکٹ

عوامی تعلیم کے معاملے میں ہمارے ملک کی جو حالت ہے، اس کو دیکھتے ہوئے میرے نزدیک ہر ریاست میں، اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ ایکٹ کی ضرورت ہے جو کچھ اس انداز کا ہونا چاہیے کہ اس کی رو سے پنچایت سمتیوں کو اپنے اپنے علاقوں میں اڈلٹ ایجوکیشن کی ترویج کے لئے بورڈ بنانے کا حق مل جائے تاکہ وہ اس کے ماتحت بنے ہوئے قواعد و ضوابط کے مطابق گاؤں اور قصباتی بستیوں کے مقامی اداروں سے کام لے سکیں اور حسب ضرورت براہ راست اپنی نگرانی میں بھی کام کر سکیں۔ اس ایکٹ میں اس بات کی بھی گنجائش ہو کہ یہ بورڈ اس کام کے لئے ریاست کے خزانے سے رقم بھی لے سکیں۔

پنچایت ایکٹ

لیکن یہ تجویز مجھے معلوم ہے عملی جامہ کبھی نہ پہن سکے گی۔ اس لئے کہ اگرچہ ریاستی اسمبلیوں میں ذرا ذرا سی بات کے لئے آئے دن نئے نئے ایکٹ بنتے رہتے ہیں مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ جب ایجوکیشن یا اڈلٹ ایجوکیشن ایکٹ کی بات آتی ہے تو لوگ کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتے ہیں اس لئے ادھر جب اڈلٹ ایجوکیشن ایکٹ یا بورڈ کی تجویز کی گئی ہے اس کی ضرورت اس طرح پوری کی جا سکتی ہے کہ جمہوری لامرکزیت کے اصول کے مطابق جو پنچایت ایکٹ بنیں ان میں ایک باب اڈلٹ ایجوکیشن پر

کو بھی موجودہ پنچایت ایکٹ کے اِس باب یا حصّے کی رو سے اڈلٹ ایجوکیشن کا کام بلاک سمیتی کے اندر اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ کے نام سے ایک بورڈ بنا کر اِس کے سپرد کر دیا جائے اور ڈیولپ منٹ بلاکوں کے بجٹ میں جو رقم سوشل ایجوکیشن کے نام سے منظور ہو وہ اس کی طرف منتقل کر دی جائے۔

اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ کی تشکیل

جب تک ملک پورے طور پر تعلیم یافتہ نہیں ہو جاتا اُس وقت تک ــــ اور یہ مدت خاصی طویل ہو گی ــــ بلاک سمیتیوں کے اس اڈلٹ ایجوکیشن کی رکنیت خالصۃً سمیتیوں کے اراکین تک محدود کرنا فائدہ مند نہ ہوگا۔ اس لئے کم سے کم ایک یا دو ممبر ایسے ہونے چاہئیں جو اگر آس پاس کے نہیں تو ضلعے کے صدر مقام کے رہنے والے ہوں، پڑھے لکھے ہوں، خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں اور اسی کے ساتھ عوامی تعلیم کے سلسلے میں معلومات بھی رکھتے ہوں۔ یہ اراکین خود اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ کی تربیت کا ایک وسیلہ ثابت ہوں گے اور ان کی معلومات اور شخصیت کے اثر سے علاقے کے اندر اڈلٹ ایجوکیشن کا پروگرام مرتب کرنے میں مدد ملے گی۔ لیکن ایسے اراکین کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ سرکاری افسر کم سے کم تعلیم اور کمیونٹی ڈیولپ منٹ کے محکموں کے افسر نہ ہوں اِس لئے کہ اِس صورت میں بورڈ ان کی خدمات سے کلی بجائے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔

اسی طرح بورڈ کا سکریٹری جو اگرچہ پنچایت سمتی کا تنخواہ دار ملازم اور اس کا اعلیٰ انتظامی افسر ہوگا۔ محکمۂ تعلیم یا ڈیولپ منٹ بلاک کا ملازم نہیں ہونا چاہئیے۔ ورنہ پھر وہی مصیبت آ جائے گی جس سے نجات حاصل کرنا مقصود ہے۔ یعنی یہ کہ وہ بورڈ کے فیصلوں سے زیادہ اپنے محکمے کے افسروں کی خوشنودی کو مقدم رکھے گا اور اس صورت میں بورڈ کے کام کو نقصان پہنچے گا۔

ڈسٹرکٹ اڈلٹ ایجوکیشن آفیسر

ڈسٹرکٹ اڈلٹ ایجوکیشن آفیسر کا کام صرف معائنے اور نگرانی تک محدود ہوگا۔ وہ بس یہ دیکھے گا کہ اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ کے قانون کے ماتحت جو قاعدے اور ضابطے بنائے گئے ہیں، بورڈ ان کی پابندی کر رہا ہے یا نہیں اور بجٹ کے مطابق کام جس مقدار میں ہونا چاہئیے وہ ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے۔ اُسے یہ اختیار بہرحال ہونا چاہئیے کہ اگر وہ ان معاملات میں مطمئن نہ ہو تو ضلعے کی سرکار کے توسط سے ریاستی سرکار کو اپنی بے اطمینانی کے درجے کے لحاظ سے بورڈ کے خلاف رپورٹ کرے اور اپنی رائے دے۔ جو اگر ضرورت ہو تو اس حد تک ہو سکتی ہے کہ موجودہ بورڈ کو توڑ کر دوسرا بورڈ منتخب کیا جائے۔ میرے خیال میں اس حد تک جانے کی ضرورت بہت کم پڑے گی لیکن عوام کے سوچنے اور عمل کرنے کی موجودہ سطح کے پیش نظر ڈسٹرکٹ اڈلٹ ایجوکیشن آفیسر کے اختیارات میں اتنی وسعت کچھ عرصے کے لئے ضرور ہونی چاہئیے۔

یونیورسٹیوں اور ثانوی تعلیم کے اداروں کا تعاون

پنچایت سمیتیوں اور دوسری مقامی حکومتوں کے یہ اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ اپنے اہتمام میں اڈلٹ ایجوکیشن کی دوسری سرگرمیوں کے ساتھ نوسکھ بالغوں کے جواں سال طبقے کے لئے باقاعدہ تعلیم کے ادارے مثلاً ٹیوٹوریل اور شبینہ ٹیوٹوریل اسکول اور اونچی تعلیم کے کورس بھی منظم کریں گے۔ یہ ٹیوٹوریل اسکول اور اونچی تعلیم کے کورس اُس وقت تک بے معنی ہوں گے جب تک ہائی اسکول اینڈ انٹرمیجیٹ ایجوکیشن کے ریاستی بورڈ اور یونیورسٹیاں اُن کے طالب علموں کو اپنے امتحانوں میں شرکت کی اجازت نہ دیں اور اپنے تمام ضابطوں سے انھیں اُن کے مخصوص حالات کے پیش نظر مستثنیٰ نہ کردیں۔

ابتدا میں تو ان اداروں کو اس سے بھی کچھ زیادہ تعاون کرنا پڑے گا۔ پنچایت سمیتیوں اور دوسری مقامی حکومتوں کے اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ جس وقت قائم ہوں گے اُس وقت فوری طور پر اُن کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے عوام کے یہ ادارے موجود نہیں ہوں گے اور ہو سکتا ہے ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے یہ بورڈ ہمت چھوڑ بیٹھیں۔ اس لئے ہائی اسکول اینڈ انٹرمیجیٹ ایجوکیشن کے بورڈوں اور مقامی کالجوں کو یہ چاہیے کہ وہ مقامی ہائی اسکولوں اور انٹر کالجوں کو ہدایت دیں کہ وہ اپنے اہتمام میں ان اڈلٹ ایجوکیشن بورڈوں سے امداد لے کر ٹیوٹوریل اور شبینہ ٹیوٹوریل اسکول کے نصاب بھی چلائیں۔ اسی طرح مقامی کالج اپنے استادوں سے فرمائش کریں کہ وہ اپنی انجمنیں بنا کر اڈلٹ ایجوکیشن بورڈوں سے امداد لیں اور اونچی تعلیم کے نصاب چلائیں۔

اگر یونیورسٹیوں اور ہائی اسکول اینڈ انٹرمیجیٹ ایجوکیشن کے ریاستی بورڈ اس طرح تعاون کریں تو اُن کی دیکھا دیکھی علاقے کے لوگ بھی اس مقصد کے لئے انجمنیں بنائیں گے اور یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ یاد رہے کہ اب تعلیم کا چرچا اتنا عام ہو گیا ہے کہ قریب قریب ہر پنچایت سمتی اور قصباتی بستی میں ہائی اسکول یا ہائر سیکنڈری اسکول اور کہیں کہیں ڈگری کالج بھی قائم ہو گئے ہیں اور اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ ان تعلیمی اداروں کے تعاون سے اپنے کام کی بسم اللہ کر سکتے ہیں۔

نوٹ: اگر موقع ملا تو اگلے پرچے میں ہم ان قواعد و ضوابط کا ایک خاکہ بھی پیش کریں گے جو مجوزہ اڈلٹ ایجوکیشن بورڈ ایکٹ کے ماتحت بنائے جا سکتے ہیں۔ اڈلٹ ایجوکیشن کی اس اسکیم میں رضاکار اداروں کا بڑا اہم کردار ہوگا جس کا ابھی تک ذکر نہیں ہوا ہے اس سلسلہ مضامین کی اس آخری قسط میں ہم اس موضوع پر بھی مضمون نگاروں کے خیالات پیش کریں گے۔

— ایڈیٹر

خواندگی ضروری نہیں

زیل کا مضمون ایک بات چیت کا خلاصہ ہے جو ہمارے خاص نمائندے شری رفیق شاستری اور شری شانگ ام تھک کے درمیان چند دن پہلے ہوئی تھی۔ اس بات چیت کا خاص پہلو اُس نظریے کی وضاحت سے ہے جس کے خواندگی کے معاملے میں تھک جی حامل ہیں۔ ——— ایڈیٹر

شاستری: " تھک جی آپ تو خواندگی کے بہت بڑے حامی رہے ہیں اور بالغوں کی تعلیم کے میدان میں آپ کا اپنا ایک ڈھنگ بھی رہا ہے جو تھک میتھڈ کے نام سے جانا بھی جاتا ہے، مگر بہت دنوں سے میں نے آپ کو خواندگی کے میدان میں کچھ نئے کام کرتے نہیں سُنا۔ نئے کام کا میں نے اس لئے کہا کہ نئے نئے طریقے ڈھونڈ نکالنا آپ کی عادت میں داخل ہو چکا ہے"۔

تھک جی: " ہاں بھئی یہ اڈلٹ ایجوکیشن والے مجھ سے اکثر شکایت کرتے رہتے ہیں کہ تھک اب گائے، گوبر، امر حیرفہ، گوبر گیس کھاد سب کی بات تو کرتے ہیں مگر لٹریسی کا اب نام بھی نہیں لیتے۔ میرے ایک دوست جو سوشل ایجوکیشن کے بڑے ماہروں میں شمار کئے جاتے ہیں، اکثر مذاق ہی مذاق میں یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ "تھک اب تو تم گوبر میں پھنس کر رہ گئے ہو"

اصل میں خواندگی کو میں زندگی کے لئے اتنی ضروری چیز نہیں سمجھتا کہ اُسے کھانے پینے اور زندگی کی دوسری بنیادی ضرورتوں میں شمار کروں میں سمجھتا ہوں کہ زندگی میں راحت کے لئے جیسے اور چیزیں ضروری ہیں اسی طرح خواندگی بھی ہے اس طرح خواندگی کو میں

زندگی میں کچھ چیزوں کی ضرورت بہت شدید ہوتی ہے جن کے بغیر زندگی گذارنا محال ہوتا ہے۔ کچھ چیزیں عیاشی کی ہوتی ہیں جو زندگی کو راحت دینے والی چیزوں کے علاوہ ہوتی ہیں خواندگی کو نہ تو میں زندگی کے لئے اُن معنوں میں ضروری سمجھتا ہوں اور نہ اُسے زندگی کو راحت دینے والی چیز کے بجائے اُسے عیاشی کا نام دے کر اُس کی اہمیت اور ضرورت سے انکار کرنے کے حق میں ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں کو زندگی، اس کی ضرورتوں اور تقاضوں سے روشناس کرانے اور انہیں زندگی سے لطف اندوز ہونے کے قابل بنانا آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور آج عوامی تعلیم کے کسی بھی پروگرام کا مقصد بھی یہی ہونا چاہئے۔ ضرورت

آج تعلیم کی ہے اور تعلیم بھی وہ جو لوگوں کو زندگی سے لطف اندوز ہونے کے قابل بنا سکے۔ خواندگی تعلیم کا ایک ذریعہ ہے، وہ خود تعلیم کا بدل نہیں ہے۔ ہمارا مقصد لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانا ہے چاہئے نہ کہ انھیں خواندہ بنانا!"

شاستری:- کیا آپ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ خواندہ بن جانے کے بعد جو باتیں آپ اُن کے دل و دماغ میں بٹھانا چاہتے ہیں وہ کم وقت اور آسانی کے ساتھ ان کے ذہن نشین ہو سکتے ہے۔ آپ نے خواندگی کو محض ایک ذریعہ اور ایک راستہ بتایا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے اگر میں کہوں کہ تعلیم کا یہی سب سے صحیح اور سیدھا راستہ ہے، اِس لئے اس راستے کو چھوڑنے میں ہر وقت اس بات کا اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں ہماری بھی وہی حالت نہ ہو جائے جو ٹھیک راستے سے بھٹکے ہوئے کسی راہ گیر کی ہوتی ہے؟"

تھلب جی:- "میں اِس بات پر ایک دوسری طرح غور کرتا ہوں اور میں اپنی بات کو صاف کرنے کے لئے ایک اور سوال اٹھانا چاہوں گا یہ سچ ہے کہ آج تعلیم خواندگی کا مسئلہ بہت نازک شکل اختیار کر چکا ہے اور یہ شکایت عام ہے کہ لوگ پڑھنے لکھنے میں دلچسپی نہیں لیتے جب کہ یہ بات بالکل صاف ہے کہ اگر کوئی شخص لکھنا پڑھنا سیکھ جائے تو اس میں اس کا بہرحال فائدہ ہے، نقصان کسی طرح بھی نہیں ہے۔ اپنے فائدے کے پیچھے تو آدمی دیوانہ وار گھومتا ہے پھر اسی پڑھنا لکھنا سیکھنے میں وہ دلچسپی کیوں نہیں لیتا؟ آپ کہیں گے لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے، میں کہوں گا اتنا فاضل وقت لوگوں کے پاس ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اس میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ کہیں گے وسائل کم ہیں، میں اس سے انکار تو نہیں کروں گا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ جہاں وسائل کو یکجا کر کے لوگ کام شروع کرتے ہیں وہاں بھی یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ لوگ کلاسوں میں آتے ہیں، آتے ہیں تو دل لگا کر پڑھتے نہیں وغیرہ وغیرہ میں سمجھتا ہوں کہ اسی بنیادی بات کو پہلے سمجھ لیا جائے تو پھر میری بات کہ میں خواندگی کو تعلیم کا واحد ذریعہ ماننے سے پوری طرح متفق نہیں ہوں آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو خواندگی سے خود کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر وہ زندگی سے دلچسپی لیں اور اس سے مسرت حاصل کرنے کا دل ہو تو پھر وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اُسے زندگی میں امید کی کوئی کرن پھوٹتی نظر نہیں آتی۔ اُسے اپنی شخصیت میں کوئی کشش نظر نہیں آتی، اور چونکہ اسے زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہتی اسی لئے وہ زندگی کو سنوارنے میں دلچسپی نہیں لیتا یہی وجہ ہے کہ گندے رہتے ہیں تو نہانے دھونے کی فکر نہیں کرتے بیشو بڑھا ہوتا ہے تو بڑھا رہنے دیتے ہیں۔ گھر گندہ ہے، چیزیں بکھری پڑی ہیں، کپڑے پھٹے اور گندے ہیں، مگر انھیں درست حالت میں رکھنے کا احساس ان کے اندر گویا مر چکا ہوتا ہے۔ اس کا صحیح علاج یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے صاف ستھرا رہنے، گلی کوچے اور محلے کو گندگی سے بچانے کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا جائے۔ ضرورت اُس بنیادی چیز کو پکڑنے کی ہے جو انھیں زندگی سے اس قدر بیزار بنائے ہوئے ہے۔ یہ کام دلیلوں سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سارے کام تو بس صرف اُسی وقت ہو سکتے ہیں جب وہ زندگی

سے دلچسپی لینے لگیں، اُس سے لطف اندوز ہونا سیکھ جائیں اور اُن میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اِس دنیا میں ان کی اپنی بھی کوئی اہمیت ہے صرف اُسی صورت میں وہ گندہ نہیں رہے گا شیو بھی بنائے گا، گھر کو سجانے کی فکر بھی کرے گا، محلے اور گلی کوچے کی صفائی ستھرائی کا بھی خیال رکھے گا۔ کپڑے اگر پھٹے ہوں تو انھیں سی کر اور اگر میلے ہوں تو انھیں دھو کر پہننے کی کوشش کرے گا۔ اور تب ہی وہ لکھنا پڑھنا سیکھنے کی طرف بھی مائل ہوگا۔

خواندگی کو میں اسی طرح کی چیز سمجھتا ہوں۔ جب انسان کا دل بجھا ہوا ہو تو وہ پڑھنا لکھنا سیکھنے کی طرف رجوع نہیں ہو سکتا۔ اس کے دل میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش پیدا کر دیجئے پھر آپ کو اُسے راستہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وہ خود اپنے لئے راستہ ڈھونڈ نکالیں گے۔ آپ اگر سمجھتے ہیں کہ تعلیم کا صحیح راستہ خواندگی ہی ہے، تو وہ اُس راستے پر چلنے کی کوشش بھی اُسی وقت کر سکتے ہیں جب ان میں چلنے ڈولنے اور قدم اُٹھانے کی طاقت ہو۔ بے حس انسان صحیح راستے پر کھڑا ہو کر بھی کیا کرے گا جب اس کے قدم ہی آگے کی طرف نہیں بڑھیں گے۔

شاستری: "آپ نے لوگوں میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ اور شرافتِ نفس کا احساس پیدا کرنے کی بات کہی ہے۔ اس کے لئے کیا آپ نے کوئی ٹھوس پروگرام بھی بنایا ہے؟"

بھک جی: "میں نے جب زندگی سے لطف اندوز ہونے اور لوگوں میں اپنی حیثیت اور مقام کو پہچاننے اور شرافتِ نفس کا احساس بیدار کرنے کی بات کہی اس میں خاص بات عوام کے ذہنوں کی تربیت ہے، جسے میں "جن مانس منتھن" کہا کرتا ہوں یعنی عوام کے دل و دماغ کو متھنا۔ ان کے دل و دماغ کو متھ کر اُس میں جو مکھن ہے اُس کو اوپر لے آنا۔ یہ پروگرام یک طرفہ نہ ہو کر ہمہ گیر ہوگا۔ آج کے ایٹمی دور میں سائنس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے ذرے میں بھی لامحدود قوت موجود ہوتی ہے یہی بات سماجی زندگی پر بھی صادق آتی ہے۔ آج سماج میں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ سمجھے جاتے ہیں اُن میں لامحدود صلاحیتیں موجود ہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اُنھیں ابھارا جائے۔ یہ کام جس طرح بھی ممکن ہو ہونا چاہئے اور میرے خیال میں اڈلٹ ایجوکیشن بھی اسی عمل کا نام ہے۔"

شاستری: "میں آپ کے خیال سے متفق ہوں، مگر صلاحیتوں کے پوشیدہ ہونے کا کیا فائدہ جب تک وہ اُبھر کر سامنے نہ آجائیں۔ ایٹم میں آج سے ہزاروں اور لاکھوں سال پہلے بھی اسی طرح کی قوت موجود تھی مگر جب تک ان قوتوں کو باہر جھانکنے کا موقع نہیں ملا یہ لامحدود قوت اپنے حدود کے اندر ہی قید تھی۔ سماجی زندگی کے حالات کے بارے بھی یہی بات ہے۔ ہر اُس آدمی میں جو چھوٹا اور حقیر شمار کیا جاتا ہے، لامحدود صلاحیتیں موجود ہیں، مگر جب تک انھیں جھانکنے کا موقع نہیں ملتا وہ بے کار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر لوگوں کو تعلیم ملے تو اُن کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع رہے گا۔

ٹھک جی: "تعلیم سے آپ کی کیا مراد ہے۔؟ تعلیم کو میں خواندگی تک محدود نہیں سمجھتا۔ سوامی وویکانند کہا کرتے تھے "تعلیم دی نہیں جاتی انسان اُسے خود ہی محسوس کرتا ہے۔" اگر آپ کی مراد ایسی ہی تعلیم سے ہے، جو انھیں زندگی سے لطف اندوز ہونے کے قابل بنائے اُن میں شرافت نفس کا جذبہ بیدار کرے، تو میں اس کے حق میں ہوں۔"

شاستری: "ابھی ایٹم کی بات ہو رہی تھی، وہی بات میرے ذہن میں ہے۔ ایٹم سے قوت حاصل کرنے کے لئے ایک خاص طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اصل تعلیم انسان زندگی کے تجربوں سے ہی حاصل کرتا ہے، اور اس لحاظ سے وہ اپنی پیدائش سے موت تک روزانہ کی زندگی میں کچھ نہ کچھ سیکھتا اور تجربے کرتا رہتا ہے۔ مگر خواندگی کے ذریعہ عمل ذرا تیز ہو جاتا ہے۔ جو باتیں وہ زندگی کے تجربوں سے بہت دنوں میں حاصل کرے گا، خواندہ بن جانے کے بعد وہ اُسے شاید اس سے بہت کم مدّت میں حاصل کر سکے۔

اگر آپ تعلیم کا کام خواندگی سے شروع نہیں کریں گے، تو پھر اس کے لئے اور کوئی باقاعدہ پروگرام آپ کے ذہن میں ہوگا؟"

ٹھک جی: "خواندگی سے شروع تو نہیں کریں گے، مگر جو کام کریں گے اس کے نتیجے کے طور پر خواندگی بڑھے گی۔ خواندگی ہمارے کام کی بنیاد نہ ہو کر اس کا نتیجہ ہو گی۔ ابھی میں اس پر پہلے بتا آیا ہوں۔

اب رہا پروگرام تو بھئی میں نے ابھی پہلے بتایا کہ یہ پروگرام بہت ہمہ گیر ہوگا۔ اس میں زندگی کے سبھی شعبے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہوں گے یعنی یہ ایک ایسا پروگرام ہوگا جو ان میں شرافت نفس کے احساس کو جگا دے۔ ان کی زندگی سے افسردگی اور مایوسی کو دور کر دے، ان کی سماجی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنا دے۔

اس کے لئے میرے سامنے ایک اسکیم ہے جس میں بھارت سیوک سماج لوک کا دیہ کھیڑا ور کھادی گرام ادیوگ کمیشن کی گرام اکائیوں کے ساتھ مل کر ایک خاص آبادی کے علاقوں کو لے کر گاؤں کی ہمہ گیر بیداری اور ترقی کا پروگرام چلانا چاہتا ہوں۔

میں نے گوبر گیس کے تجربے کو اپنے علاقے میں آزمایا ہے، یہ بہت کامیاب رہا اور اب ارادہ ہے کہ اس گیس سے فائدہ اٹھا کر ایک خاص آبادی کے علاقوں کے بیچ میں رورل براڈ کاسٹنگ سسٹم کا تجربہ کروں۔ یعنی ہر علاقے کا اپنا ایک ریڈیو اسٹیشن ہو جس پر صبح شام گاؤں کے لوگوں کی دلچسپی اور اُن کے ذہنوں کی تربیت کے پروگرام چلائے جائیں۔ لوگوں کی اقتصادی زندگی سدھارنے کا پروگرام تو بہت وسیع ہے مگر میں یہاں اپنے آپ کو صرف تعلیم تک ہی محدود رکھوں گا۔

ہمارے یہاں عوامی تعلیم کی ایک شاندار روایت رہی ہے۔ رشیوں اور منیوں نے عوام کو جگایا ہے انھیں زندگی میں دلچسپی دلائی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب ساری کی ساری قوم افسردگی اور بے حسی میں غرق ہو رہی تھی تو انھیں رشیوں

اور منیوں نے لوگوں کو زندگی کا پیغام سنایا ہے۔ بھگتی تحریک اس کا ثبوت ہے جو قرونِ وسطیٰ میں سارے ہندوستان میں پھیل گئی تھی۔ اس نے ساری قوم کو جگایا، مایوس اور افسردہ قوم کو زندگی سے لطف اندوز ہونے کا پیغام سنایا۔ اور یہی ملک جہاں سنیاس لینا ایک معمولی سی بات بنتی جا رہی تھی یہ سندیش سُن کر گھر گرہستوں کے لئے مسرت و شادمانی کا گہوارہ بن گیا۔

آج بھی ان رشیوں اور منیوں کو لوگ تعظیم کرتے ہیں۔ گاؤں گاؤں نمائش کی شکل میں رتھ یاترا کی جائے۔ رتھ پر سب سے آگے ایک سادھو ہو، جو لوگوں کو زندگی سے لطف اندوز ہونے کا پیغام انھیں کی زبان میں اور ہو سکے تو گا گا کر سنائے۔ بھگوان پھولوں سے خوش ہوتا ہے۔ ہر گاؤں میں پھول تو ہونا ہی چاہئیے، پھل پھلار و ہونا چاہئیے سنگیت کی دُھن ہو، فضا میں نغمگی ہو، زندگی میں مسرت اور دل خوشی سے لبریز ہو۔ زندگی میں آنند ہو کی بات پہلے آتی ہے، گیان، اس کے بعد میں۔ وہ پڑھیں لکھیں، گیان حاصل کریں، زندگی میں دلچسپی لیں اور اس کے مسائل کو سمجھیں اور خود اپنی زندگی کے راہبر بنیں۔ یہ رتھ یاترا کی نمائش لوگوں کے سامنے مختلف طریقوں سے یہی باتیں پیش کرنے کی یہ بھی تعلیم ہے، مگر یہاں کتاب کے مردہ الفاظ نہیں آتے بلکہ کسی جیا پرش کی شخصیت سے وابستہ ہونے پر اُن میں جان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

گاؤں کا ریڈیو بھی لوگوں کی اپنی چیز ہوگی، اُس پر جو پروگرام ہوں گے لوگ اُسے سننے میں دلچسپی لیں گے۔ اس طرح انھیں زندگی کے تقاضوں اور اُس کی ذمہ داریوں سے انھیں بہت آسانی سے روشناس کر لیا جا سکے گا اور یہ کام اس ڈھنگ پر ہوگا کہ لوگ غیر محسوس طریقے پر وہ ساری باتیں سیکھ جائیں گے۔ جن کا جاننا آج اُن کے لئے بہت ضروری ہے میں کہتا ہوں کہ آج جب کہ پنچایتی راج قائم کرنے کی بات کی جا رہی ہے اور مقامی نظم و نسق اور ترقیاتی پروگرام مقامی لوگوں کو سونپ دیئے جانے کا اصول مسلّمہ حیثیت اختیار کر چکا ہے لوگوں کے ذہنوں کی تربیت اور وہ بھی کم سے کم وقت میں بہت ضروری ہے۔ یہ گاؤں کا یہ ریڈیو جو ریڈیو نہ ہو کر ایک طرح کا مقامی براڈکاسٹنگ سسٹم ہی ہوگا سب سے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ اس کا یہ پروگرام جتنی ہوشیاری اور سلیقے سے بنایا جائے گا عوامی تعلیم کا پروگرام اتنا ہی کامیاب ہوگا۔

شاستری: گویا آپ انھیں صرف اپنی باتیں یعنی وہ باتیں جو آپ اُس گاؤں کے ریڈیو کے ذریعہ براڈکاسٹ کریں گے انھیں سننے اور سمجھنے کا ہی موقع دیں گے بلکہ ایک طرح سے مجبور بھی کریں گے۔ اس طرح آپ ہر وقت اپنا محتاج رکھنا چاہیں گے۔ آپ انھیں کوشش کر کے پڑھنا لکھنا سکھا کر اُن کی اس محتاجی کو دور کیوں نہیں کر دیتے جس سے کہ وہ آزادی کے ساتھ جہاں سے چاہیں کتابیں اور اخبارات وغیرہ پڑھ کر اپنی ایک رائے قائم کرنے کے قابل بھی بن جائیں؟

آپ کے مجوزہ پروگرام سے یہ تو ضرور ہوگا کہ آپ جو باتیں انھیں بتانا چاہتے ہیں وہ انھیں سن لیں گے، مگر ان کی آج کی محتاجی بدستور قائم رہے گی کہ کوئی کچھ باتیں انھیں ہر وقت بتلائے، ان کی انگلی پکڑ کر راستہ دکھائے۔ اگر آپ یہی پروگرام ایک ایسے علاقے میں شروع کریں جہاں لوگوں کو پہلے لکھنا پڑھنا سکھایا جا چکا ہو تو میں سمجھتا ہوں اس پروگرام کی افادیت کئی گنا بڑھ جائے گی۔

ٹیکھک جی :۔ میں نے بتایا نہ کہ خواندگی تو اس پروگرام کا نتیجہ ہوگی۔ اگر لوگوں کے ذہنوں کی صحیح تربیت ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود خواندگی کی طرف مائل ہوں گے۔ اس کے لئے بہت شعوری کوشش کی ضرورت نہیں ہے یہ کام غیر شعوری طور پر ہوگا اور انھیں اس کی طرف غیر شعوری طور پر لایا جائے گا۔

انسان کو زندہ رہنے کے لئے پروٹین کی ضرورت ہے، پروٹین دال سے حاصل ہوتی ہے۔ دال کا ذائقہ نمک کے بغیر نہیں کھلتا۔ دال کو حلق سے نیچے اتارنے کے لئے نمک کا ہونا ضروری ہے، مگر خود نمک دال کی ضرورت کو پورا نہیں کرتا۔ زندہ رہنے کے لئے دال کی ضرورت ہے۔ میں خواندگی کو دال میں نمک کی طرح ضروری سمجھتا ہوں۔ میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ بغیر نمک کی دال کھائی جائے مگر یہ نہیں کہ دال کو چھوڑ کر صرف نمک کھایا جائے۔

تحصیل علم کے معاملے میں میں کتاب کے مردہ الفاظ کے بجائے کسی کی شخصیت سے وابستہ زندہ الفاظ کو زیادہ موثر مانتا ہوں۔ یہی بات ڈنمارک کا مشہور معلم گرونڈ وگ بھی کہا کرتا تھا۔

گاؤں کا یہ ریڈیو براڈ کاسٹنگ سسٹم انھیں زندہ الفاظ میں تعلیم دے گا۔ ان کے سامنے شرافتِ نفس اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا پیغام پیش کرے گا، اور گیس پلانٹ ان کی اقتصادی زندگی میں خوشحالی لائے گا، جب ایک بار ان میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کا احساس بیدار ہو گیا، پھر انھیں راستہ بتانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں نے یہ بات پہلے نہیں کہی مگر اب دبے لفظوں میں کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس طرح اگر ایک خاص آبادی کے علاقے میں ڈٹ کر کام کیا جائے تو اس علاقے سے ایک خاص مدت تک ناخواندگی کا خاتمہ بھی ہو جائے گا اور لطف کی بات یہ ہوگی کہ اس کے لئے باہر کے لوگوں کو کوئی کوشش نہیں کرنی پڑے گی لوگ خود بخود اس کے لئے آمادہ ہوں گے اور اس کا انتظام کرنے میں سرگرمی دکھائیں گے۔

میں کسی علاقے میں اس طرح کا تجربہ بھی کر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شاستری :۔ ٹیکھک جی آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے جو بات دبے لفظوں میں کہی ہے یعنی اس ڈھنگ سے کام کر کے کسی علاقے سے ناخواندگی کا خاتمہ کر دینے کی بات، میرے نزدیک آپ کے پروگرام کی کامیابی کا یہی معیار ہوگی۔
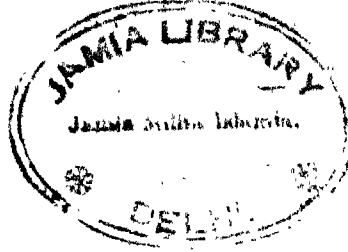
تعارف

دست کاری کو ذریعہ بنا کر بالغوں کو تعلیم دینے کا ادارہ

سری نکیتن

شانتی نکیتن سے جو شاعرِ مشرق رابندر ناتھ ٹیگور کے خوابوں کے مادّی روپ میں قائم ہوا تقریباً ہر شخص واقف ہے۔ اس ادارے میں جس کے ذرّے ذرّے سے شعریت، حُسن اور کلا کے چشمے پھوٹتے ہیں، مذہب، تاریخ، تہذیب، سائنس اور آرٹ کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس معاملے میں کسی قوم کی تفریق کرنے کے بجائے ہندو، مسلم، بدھ، جین، عیسائی اور سکھ اور دوسرے تمام تمدنوں سے روشناس کرکے مکمل انسانیت کی تخلیق کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں مشرق اور مغرب کی بھی تمیز نہیں ہے۔ بلکہ مغربی تہذیب و تمدّن سے بھی اُسی کشادہ دلی کے ساتھ طلبا کو روشناس کرایا جاتا ہے جو مشرقی علوم اور تہذیب و تمدّن کے معاملے میں برتی جاتی ہے۔

مگر شاعر ٹیگور صرف شاعر اور انسانیت کے پرستار ہی نہیں تھے، اُن کے دل میں غربت و افلاس کے مارے ہوؤں کے لئے بھی جگہ تھی، اور اُن کی اصلاح و ترقی کے لئے وہ بے چین رہتے تھے۔ یہی بے چینی تھی جس نے اُن کے ہاتھوں سری نکیتن کی بنیاد ڈلوائی جس کا مقصد و منشا انھی کے الفاظ میں یہ تھا۔

> "بے جان گاؤں میں زندگی ازسرِنو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہو یہاں تک کہ گاؤں کے لوگ کسی کے محتاج نہ رہیں، کسی معاملے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں، اپنے ملک کی تمدنی روایات سے پوری طرح واقف ہوں، اور اسی طرح نئے دور کے لائے ہوئے وسائل سے خوب اچھی طرح فائدہ اٹھا سکیں تاکہ اُن کی جسمانی ذہنی اور معاشی حیثیت میں بلندی پیدا ہو جائے۔"

گاؤں کی اصلاح و ترقی کے اس ادارے "سری نکیتن" سے لوگ اتنے واقف نہیں ہیں جتنے شانتی نکیتن سے واقف ہیں۔ سری نکیتن ٹیگور کا یہ پیغام لے کر ۱۹۲۲ء میں شانتی نکیتن سے کچھ فاصلے پر دیہی علاقے میں قائم ہوا تھا اور اب تک قائم ہے۔ ٹیگور کلا اور فن کے

عاشق تھے چنانچہ شانتی نکیتن میں بھی تمام علوم پر شعر اور آرٹ کو فوقیت حاصل تھی۔ یہی خصوصیت سری نکیتن میں بھی آئی اور اس شان سے آئی کہ اس علاقے کے لوگوں کے لئے رحمت کا پیغام بن گئی اور آگے چل کر دیہات میں بالغوں کی تعلیم کا کام کرنے والوں کے لئے ایک مستقل اصولِ تعلیم چنانچہ اب یہاں تک کہا جانے لگا ہے کہ

"ہندوستان کے اڈلٹ ایجوکیشن کے سنٹروں میں طالب علموں کی تعداد جو کم رہتی ہے اور اُن کے پروگراموں میں لوگ دل لگا کر شرکت نہیں کرتے تو اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان سنٹروں کے نصابِ تعلیم میں حرفے اور دست کاری کی ٹریننگ کا عنصر نہیں ہوتا۔ ہم نے یہ بات تجربے سے سیکھی ہے کہ حرفہ اور دست کاری بالغوں تک پہنچنے کا ایک نہایت زبردست ذریعہ ہے۔[1]"

جس وقت یہ ادارہ قائم ہوا، اُس وقت اس کے کام کا علاقہ سری نکیتن کے پاس تین گاؤں تھے۔ اِن گاؤوں کی حالت بہت خراب و خستہ تھی۔ زمین بنجر، بارش کم، باشندے غریب اور ان پڑھ، صحت و صفائی کا بھی معقول انتظام نہیں۔ ملیریا کی وبا اتنے زور پر تھی کہ آبادی کا ۸۰ فی صدی حصّہ اس کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔

کام غرض بہت مشکل تھا مگر کچھ خدمت کا جوش اور کچھ شاعر کے معصوم دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کا اثر کہ کارکن جمے رہے اور یہاں تک کامیابی ہوئی کہ جہاں پہلے تین گاؤں سے کام شروع کیا گیا تھا، وہاں ۱۹۵۳ء میں وہ ۸۵ گاؤں تک پھیل گیا، جس کا رقبہ ۱۵۰ مربع میل ہے۔

اس ادارے کے کام کے خاص خاص میدان، جو آپس میں ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں، زراعت، حرفہ و دست کاری تعلیم، صحت و صفائی اور عام خوش حالی کے میدان ہیں۔ سب سے زیادہ توجہ طلب بات اِس پروگرام کی یہ تھی کہ یہ سب کام "احاطہ بند علاقے" میں شروع کئے گئے تھے۔

کسی پروگرام کو شروع کرنے سے پہلے حسب ذیل ابتدائی کام پورے کر لئے جاتے ہیں۔

الف ۔ اس کا تعین کہ مسائل کیا ہیں۔

ب ۔ تحقیق اور ریسرچ کے ذریعے ان مسائل کا حل متعین کرنا۔

ج ۔ گاؤں کے لوگوں کو اس حل سے واقف اور روشناس کرانا۔ اور آخر میں

د ۔ ان کی مدد اس طرح کرنا کہ وہ ان مسائل کو اپنے آپ حل کر لیں۔

[1] سنتوش کمن بھنج چودھری، سپرنٹنڈنٹ کاٹیج انڈسٹری ٹریننگ سنٹر، شانتی نکیتن۔ سہ ماہی "فنڈامنٹل اینڈ اڈلٹ ایجوکیشن" اکتوبر ۱۹۴۹ء۔ اوپر کا مضمون چودھری صاحب کے ایک مضمون سے لیا گیا ہے۔ جو سہ ماہی مذکور میں چھپا ہے۔ م ۔ ن

ہر قسم کی معلومات کو لوگوں تک پہنچانے کی غرض سے لیکچروں، بات چیت کی مجلسوں، نمائشوں، تہذیبی تقریبوں، لوک سنگیت کی محفلوں، پوسٹروں، چارٹوں اور فلم وغیرہ، دستی اشتہاروں اور کتابچوں اور گشتی کتب خانوں وغیرہ کے وسیلے اختیار کئے جاتے ہیں۔

دست کاریوں کا اسکول (شلپ بھون)

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، اس ادارے کا مقصد اگرچہ گاؤں والوں کی چو طرفہ نشو و نما تھا مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے حرفہ اور دست کاری کو ذریعہ بنایا تھا چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سری نکیتن کا دور سے نظر آنے والا پہلو اس کا یہی دست کاریوں کا اسکول ہے۔ اس اسکول کے قیام کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ جس وقت کام شروع کیا گیا، اس وقت لوگوں کی معاشی حالت اس قدر خراب تھی کہ بغیر اُن کی پہلی ضرورت کو "بھوگ" پورا کئے اُن سے ذہنی تعمیر و ترقی کے پروگرام میں شرکت کی امید رکھنا بے معنی سی بات ہوگی۔ یہ ضرورت کارکنوں کے نزدیک زراعت کو ترقی دینے سے پوری نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے کہ زمین کی عام حالت کے پیشِ نظر اس کا موقع نہیں تھا۔ یوں بھی پہلے ہی سے لوگ اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے کوئی نہ کوئی اور پیشہ کیا کرتے تھے اور اس اعتبار سے دست کاری سیکھنے کے لئے اُن کے دماغ تیار تھے۔

اس تجزیے کی بنیاد پر دست کاریوں کا اسکول قائم کیا گیا اور ابتدا میں پانچ اُستادوں کے ساتھ بڑھئی کا کام، بُنائی کا کام، ٹوکری سازی اور لاکھ کے کھلونے بنانے کا کام شروع کیا گیا۔

پہلے پہلے گاؤں کے لوگ اس اسکول میں آکر دست کاری کا کام سیکھنے پر راضی نہیں تھے۔ اس لئے یہ طے کیا گیا کہ طالب علموں کے رہنے اور کھانے کا بھی مفت انتظام کیا جائے۔ اس انتظام کو دیکھ کر کچھ لوگ آئے اور کام سیکھا، لیکن کچھ عرصے کے بعد محسوس ہوا کہ یہ انتظام بہت مہنگا پڑے گا اور اس مہنگے پن کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ اسکول ہی بند کرنا پڑے، اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ بجائے طالب علم کو اپنے یہاں بلانے کے کیوں نہ خود اسکول طالب علم کے پاس چلا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق اُستاد گاؤں میں جا جا کر کلاسیں لینے لگے کچھ عرصے کے بعد جب طالب علموں کا پہلا گروہ کام سیکھ کر اپنے اپنے گاؤں کو واپس گیا اور اس کے ذریعے کمائی بھی کرنے لگا تو دوسروں کو بھی شوق ہوا اور پھر تو یہ سلسلہ بندھ گیا۔

تیار مال کی کھپت : مسئلہ اور اُس کا حل

جب تک کاریگروں کی تعداد کم اور تیار مال کی مقدار تھوڑی رہی، اُس وقت تک تو مال کی نکاسی کا مسئلہ سامنے نہیں آیا، اس لئے کہ وہ آسانی سے بک جاتا تھا۔ مگر ۱۹۳۲ء کے آتے آتے اسکول میں طلباء اور گاؤں میں پُرانے طلباء دونوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی

اور اُن کے ہاتھ کے بنے ہوئے سامان کی مقدار اس حد تک بڑھ گئی کہ اسکول کو اِس مال کی نکاسی کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مسئلے کے حل کے لیے کلکتہ شہر میں ان مصنوعات کی ایک نمائش کی گئی جس میں اب تک کا سارا مال بک گیا۔ اس نمائش سے متاثر ہو کر اسکول نے کلکتہ میں مستقل طور پر اپنی مصنوعات کی ایک دکان کھول دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسکول اور اُس کے پرانے طالب علموں کی بنائی ہوئی چیزوں کی مانگ برابر بڑھنے لگی اور جو مال تیار ہوتا ہے وہ سب کا سب نکل جاتا ہے۔

ادارے کی موجودہ تنظیم

اس وقت سری نکیتن میں دو قسم کے نصابوں کے متعلق دست کاری کی تعلیم ہوتی ہے۔ ۱۴ کورس پورے وقت کے بالغ طلبا کے لیے ہیں اور ۸ کورس جز وقتی طلبا کے لئے جن میں ۷ بالغوں کے لئے ہیں اور ایک بچوں کے لئے۔ پورے وقت کے کورس اُن بالغوں کے لیے چلائے جاتے ہیں جو اس کام کو پیشہ بنا کر اپنی روزی کمانا چاہتے ہیں۔ ایسے طلبا فارغ ہونے کے بعد مختلف طریقے پر مثلاً پیشہ ور کاری گر دست کاری کے اُستاد اور صنعت خانوں کے مزدور وغیرہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ دوسرا جز وقتی کورس وشوا بھارتی (شانتی نکیتن) کے دیہاتی اسکولوں اور ان اداروں کے بالغ طلبا کے لئے ہوتا ہے جہاں صنعت و حرفت لازمی مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل ہے۔

ان کورسوں کے علاوہ تین اسکول گاؤں کے اندر گاؤں کی عورتوں کو دست کاری سکھانے کے لئے قائم ہیں جہاں عورتوں کو بُنائی اور نرم چیزوں سے کھلونے بنانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔

ادارے کے نصاب تعلیم سے معلوم ہوتا ہے کہ دست کاری کی ٹریننگ میں نظری اور عملی تعلیم جتنی کم سے کم ضروری ہوتی ہے وہی دی جاتی ہے اس کام کے علاوہ وہ دوسری بہت سی ایسی سرگرمیوں میں شریک ہوتے ہیں جو شخصیت اور شہریت کی نشو و نما کے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں۔

نیچے چند نقشے دیئے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ اگرچہ ادارے میں بنیادی تعلیم دست کاری کی ہوتی ہے مگر اس کے اثر سے علاقے میں دیہی تعمیر و ترقی کا کتنا کام ہوا ہے۔ ان اعداد سے ۱۹۳۸ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیانی بیس سال کی رفتار معلوم ہوتی ہے۔

نقشہ نمبر ۱

سال	خاندانوں کی تعداد	آبادی	خواندگی کا اوسط فی صد	اونچی تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی تعداد
۱۹۳۸ء	۹۰	۱۹۴	۲۸٫۵	صفر
۱۹۵۸ء	۸۱	۳۸۳	۴۰٫۵	۷

نقشہ نمبر ۲

سال	تعلیمی ادارے	کوآپریٹیوز	لوک سنگیت کے طبے	کھیلوں کے کلب
۱۹۳۶ء	۱	۰	۱	۱
۱۹۵۸ء	۴	۱۲	۳	۲

نقشہ نمبر ۳

سال	ملیریا کے مریض	زیر زراعت زمین	زراعت سے آمدنی	مویشیوں کی تعداد	آمدنی فی کس
۱۹۳۸ء	۱۴۸	۱۹۴ (ایکڑ)	۱۱٫۵۵۵ روپئے	۲۲۳	۵۱ روپئے
۱۹۵۸ء	۰	۳۲۱ "	۹۲٫۳۵۰ "	۲۹۲	۳۰۰ "

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ

تعلیم بالغان کے اُستادوں اور تعلیمی مواد تیار کرنے والوں کی ٹریننگ

سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں بالغوں کی تعلیم کی غیر معمولی اہمیت ہے اور بالغوں کو لکھانا پڑھانا سوشل ایجوکیشن ورکر کے ایک اہم فرائض میں سے ہے

بالغوں کی پڑھائی کا کام ایک عرصہ سے جاری ہے لیکن ۱۹۶۱ء کی مردم شماری سے ظاہر ہوا کہ پچھلے دس برسوں میں تعلیم بالغان کی تحریک نے حوصلہ افزا ترقی نہیں کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک بار پڑھنا لکھنا سیکھ جانے کے بعد بھی بہت سے لوگ اسے بھلا بیٹھتے ہیں اور پھر ان پڑھ ہو جاتے ہیں۔

اس صورتِ حالات کے بہت سے اسباب ہیں ان میں سے چند خاص خاص نیچے لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ لکھائی پڑھائی کے سائنٹفک اور آزمودہ طریقوں سے تعلیم بالغان کے کارکنوں کی ناواقفیت۔

۲۔ ایسے تعلیمی اور پڑھائی کے سامان کی نایابی جو سائنٹفک طریقے سے تیار کیا گیا ہو۔

۳۔ تعلیمی سامان کے استعمال میں مشق اور تجربے کی کمی۔

اس ٹریننگ کا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس کام سے دلچسپی ہے یا جو تعلیم بالغان کے میدان میں کام کر رہے ہیں یا جو کرنا چاہتے ہیں انھیں اس بات کے مواقع فراہم کئے جائیں کہ

۱۔ بالغوں کی لکھائی پڑھائی کے طریقوں سے واقفیت حاصل کریں۔

۲۔ مختلف قسم کے تعلیمی مواد کی تیاری کے طریقوں یا ٹکنیک سے واقفیت حاصل کریں۔

۳۔ مختلف قسم کے تعلیم کے امدادی ذرائع اور اُن کے استعمال سے جہاں تک ممکن ہو واقفیت حاصل کریں۔

ٹریننگ کی مدّت چار مہینے ہوگی۔ پہلا کورس یکم ستمبر ۱۹۶۱ء سے شروع ہوگا داخلے کے لئے کم سے کم میٹرک یا

ہائر سیکنڈری ہونا چاہیئے۔

ٹریننگ کی کوئی فیس نہیں ہوگی۔ ٹریننگ لینے والوں کے لئے محدود پیمانے پر رہائش کا بھی بندوبست ہوگا اور اس کی ماہوار فیس پندرہ روپئے لی جائے گی۔ طالب علم اپنے کھانے کا انتظام جامعہ کے مطبخ میں کرا سکتے ہیں یا اگر مناسب سمجھیں تو کسی مقامی ریسٹوران میں بندوبست کر سکتے ہیں۔ دو وقت کے کھانے کا ماہوار خرچ تقریباً ۲۵ روپئے سے ۳۰ روپئے ہوگا۔

ٹریننگ کے زمانے میں جو تعلیمی مواد تیار ہوگا وہ ادارہ تعلیم و ترقی کی ملکیت ہوگا۔

ٹریننگ کا پروگرام :-

ٹریننگ کورس کے دو حصے ہوں گے۔

الف - تھیوری (یا نظری)

ب - عملی۔

حصہ الف (نظری یا تھیوری) لکچروں اور لکچروں کے ساتھ بحث پر مشتمل ہوگا۔ عنوانات یہ ہوں گے۔

۱- جامعہ ملیہ کی مختصر تاریخ
۲- تعلیم بالغان کی تحریک کی مختصر تاریخ
۳- سوشل ایجوکیشن کی تحریک کی مختصر تاریخ
۴- بالغوں کی تعلیم کے مختلف طریقے
۵- بالغوں کی تعلیم کے سلسلے میں مختلف مسائل
۶- بالغوں کی نفسیات　　عام اور وسیع شکل میں
۷- بچوں کی　〃　〃　〃　〃
۸- بالغوں کے ذہن و دماغ - ان کی ضرورتوں اور دلچسپیوں سے واقف ہونے کی اہمیت
۹- چند بنیادی تصورات
۱۰- تعلیمی مواد کی خاص خاص شکلیں
۱۱- سائنٹفک طریقے پر تیار کئے ہوئے تعلیمی مواد کی اہمیت
۱۲- اچھے تعلیمی مواد کی خوبیاں۔

۱۳۔ خواندگی کے بعد کے تعلیمی مواد کا دہرا مقصد

۱۴۔ مواد کی موزونیت سے کیا مراد ہے۔

۱۵۔ اس کا اندازہ کس طرح کیا جائے کہ کوئی تعلیمی مواد اپنی باتوں کو پڑھنے والوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے کس حد تک موزوں ہے

۱۶۔ لکھنا شروع کرنے سے پہلے کی تیاریاں

۱۷۔ مواد کی درجہ بندی اس کی اہمیت اور اس کے اصول

۱۸۔ ایک اچھے اڈیٹر کی لازمی اوصاف

۱۹۔ تعلیمی مواد کے ٹسٹ یا جانچ کی اہمیت

۲۰۔ تعلیمی مواد کو آنکنا (EVALOATION) اور اس کی اہمیت

۲۱۔ چھپائی اور پروف ریڈنگ کی ابتدائی معلومات

۲۲۔ پڑھائی میں اور سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں امدادی ذرائع (AUDIO-VISUALAIDS) کی اہمیت

پروگرام کے حصّہ ب کا مقصد یہ ہے کہ تعلیمی مواد کی تیاری اس کے استعمال بالغوں کی پڑھائی کے طریقوں اور آسان ذرائع تعلیم کی تیاری اور اس کے استعمال کی عملی مشق بہم پہنچائی جائے۔

ا۔ تعلیمی مواد :۔

تعلیمی مواد کی تیاری کی عملی مشق کے سلسلے میں ٹریننگ پانے والوں کو مختلف گروہوں پر تقسیم کردیا جائے گا۔ ہر گروپ کے کام کی رہنمائی ایک نگران کے سپرد ہوگی۔ تعلیمی مواد کی تیاری کا کام چار حصّوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ۱۔ لکھنا ۲۔ ایڈٹ کرنا ۳۔ جانچنا اور (۴) چھاپنا۔ ہر گروپ یا گروہ کو ان چاروں منزلوں سے گذرنے کا موقع دیا جائے گا۔

ہر قسم کے تعلیمی مواد کی تیاری کی عملی ٹریننگ دی جائے گی یعنی:۔ درجہ وار ریڈریں، مشقی کتابیں، دیواری اخبار۔ رسالہ اور اخبار وغیرہ۔ بالغوں کی پڑھائی اور تعلیمی ذرائع کو موثر طور پر استعمال کرنے کی مشق کے سلسلے میں ہر طالب علم کو ایک نگراں کی رہنمائی میں بالغوں کی ایک کلاس کو پڑھانا ہوگا۔ جامعہ ملیہ اور دہلی ایڈمنسٹریشن کے سوشل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کی تعلیم بالغان کی کلاسیں اس عملی مشق کے لئے میدان فراہم کریں گی۔

آسان تعلیمی مواد مثلاً سلک اسکرین پوسٹر اور چارٹ وغیرہ کی تیاری کی عملی مشق کا بھی انتظام کیا جائے گا۔

اس تمام عملی پروگرام کا مقصد یہ ہوگا کہ کام کے ذریعے سیکھنے کے ذرائع فراہم کئے جائیں تاکہ تربیت پانے والوں میں تعلیمی مواد کی تیاری کی اور تعلیمی ذرائع کو موثر طریقے سے استعمال کرنے کی بہتر صلاحیت پیدا ہو جائے اور وہ تعلیم بالغان کا ایک خود کفیل اور مستعد استاد بن جائے۔

پنچایتی راج

۱۹۵۶ء میں پلان کے کاموں کا جائزہ لینے والی پلان پراجیکٹ کمیٹی نے شری بلونت رائے مہتہ ایم۔ پی۔ کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی نے کل صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد یہ خیال پیش کیا کہ پلان کے کاموں میں عوام کا تعاون اُسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے، جب اُن کے ہاتھ میں زیادہ سے زیادہ اختیارات ہوں اور نظم و نسق کی لا مرکزی تنظیم کے ذریعہ مقامی اداروں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اِسی نظریئے کو بنیاد بنا کر اِس کمیٹی نے گاؤں میں پنچایتیں، بلاکوں میں پنچایت سمتیاں اور ضلعوں میں ضلع پریشد قائم کرکے انھیں ترقیاتی کاموں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ داری سونپنے کی سفارش کی تھی۔ اس کمیٹی کی سفارشات حالانکہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے تسلیم کرلی تھیں مگر انھیں عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں اب تک کافی سستی دکھائی جاتی رہی ہے۔

راجستھان اور آندھرا ریاستوں نے اِس سلسلے میں بہت جلد قانون بنا لیا تھا۔ گذشتہ مہینے سے مختلف ریاستی حکومتیں اس طرف کافی مستعدی دکھا رہی ہیں۔

ابھی گذشتہ ماہ مدھیہ پردیش میں پنچایت راج ایکٹ پاس ہوا ہے۔ ابھی چند دن ہوئے اتر پردیش اسمبلی میں بھی پنچایت راج بل پیش ہوا ہے۔ اِس سلسلے میں مختلف ریاستوں سے جو خبریں موصول ہورہی ہیں وہ کافی امید افزا ہیں۔

دہلی دہلی کی رورل ڈیولپمنٹ کونسل نے دہلی کے ڈیولپمنٹ کمشنر شری کے۔ پی بسنگھ کی اس تجویز کو مان لیا ہے جس کے مطابق دیہی تعمیر کے پروگراموں کے لئے پنچایتیں نظم و نسق کی اکائیاں تصور کی جائیں گی۔ اس کونسل نے ۱۹ آدمیوں پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی ہے جو پنچایتوں کو مالی وسائل اور انتظامی اختیارات سونپنے کی تفصیلات پر غور کرے گی۔

پنجاب کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے افسروں کو مخاطب کرتے ہوئے زراعت کے جوائنٹ ڈائرکٹر نے حکومت پنجاب کے اس فیصلے کا اعلان کیا ہے کہ محکمۂ زراعت کے ترقیاتی اور توسیعی پروگرام جلد سے جلد پنچایت سمتیوں کو سونپ دیئے جائیں گے۔ انھوں نے بتایا کہ پنجاب میں پنچایت سمتیوں اور ضلع پریشدوں کی جلد ہی تشکیل ہوجائے گی۔

بہار بہار کی حکومت نے ضلع مجسٹریٹوں کے نام یہ ہدایت جاری کی ہے کہ ۱۳ر مئی ۱۹۷۱ء سے مال گذاری وصول کرنے کا کام پنچایتوں کو سونپ دیا جائے۔ پنچایتوں کو مال گذاری وصول کرنے کے لئے کچھ کمیشن دیا جائے گا۔

کانگریس پارٹی کی اسٹڈی ٹیم پارلیمنٹ کی کانگریس پارٹی نے پنچایت راج کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک اسٹڈی ٹیم کی تشکیل کی تھی۔ یہ ٹیم مختلف ریاستوں میں پنچایت راج کی تنظیم میں زیادہ سے زیادہ یکسانیت لانے کی تجویز مرتب کی جا سکے۔

یہ ٹیم جس کے صدر شری رگھو ریر سہائے ہیں، مختلف ریاستوں کے وزیر اعلیٰ سے اس سلسلے میں بات چیت کر چکی ہے۔ جن امور پر یہ ٹیم خاص طور سے ریاستی حکومتوں سے وضاحت چاہتی ہے ان میں سے کچھ خاص یہ ہیں۔

ضلع کلکٹر اور ضلع پریشد کے باہم اختیارات

ضلع پریشد کے صدر اور پنچایت سمیتیوں کے صدر کے باہم اختیارات

ان منتخب شدہ اداروں کا لائحہ عمل اور آمدنی کے وسائل

جمہوری لامرکزی تنظیم میں یہ امور بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

آل انڈیا پنچایت پریشد۔ سالانہ اجلاس

آل انڈیا پنچایت پریشد کا سالانہ اجلاس ۱۳ – ۱۴ ر مئی کو جے پور میں ہوا۔ کانفرنس کا افتتاح بھودانی رہنما شری جے پرکاش نرائن نے کیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں موصوف نے گاؤں پنچایتوں کو اپنا خود منصوبہ بنانے کا مشورہ دیا۔ آپ نے کہا کہ حکومت پنچایتوں کو آج ترقیاتی منصوبوں کو عمل در آمد کرنے کا ایک ذریعہ مانتی ہے اور نظم و نسق میں ہی لامرکزیت کے اصول کو تسلیم کرتی ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ ملک کی تعمیر و ترقی کی منصوبہ بندی کے لئے بھی لامرکزیت کا اصول تسلیم کیا جائے اور پنچایتوں، پنچایت سمیتیوں اور ضلع پریشدوں کو اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے ترقیاتی منصوبے خود بنائیں اور ان کے لئے وسائل فراہم کریں۔

آپ نے فرمایا کہ آج پنچایت راج کا بہت ذکر ہو رہا ہے اور مختلف ریاستیں اس سمت میں قانون بھی بنا رہی ہیں، ایسی صورت میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہمارا دستور بھی پنچایتی راج کے اس سہ منزلہ نظام پنچایت، پنچایت سمتی اور ضلع پریشد کی حیثیت کو تسلیم کرے۔ اس کے لئے دستور میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔

شری بونت رائے مہتہ کی صدارت میں پنچایت پریشد نے ایک کمیٹی کی تشکیل کی ہے۔ یہ کمیٹی پنچایت راج کی حیثیت دستور ہند میں تسلیم کرانے کے لئے دستور کی دفعات میں ضروری تبدیلیاں پیش کرنے پر غور کرے گی۔ (باقی صہ۳ پر ملاحظہ کیجئے)

اپنا کام اپنے ہی کئے اچھا ہوتا ہے

آپ نے مثل سُنی ہوگی "جس کی بندریا وہی نچاوے"۔ بڑی مشہور مثل ہے۔ مطلب اِس کا آپ جانتے ہوں گے۔ آپ کو سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا کام جو ہمارے اپنے کرنے کا ہو، دوسرا چاہے کتنی ہی محنت اور سمجھ داری سے کرے، اس میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ضرور رہ جائے گی۔ یا یہ ہوگا کہ وہ ہماری آنکھوں میں بچے گا نہیں۔ پھر اپنا کوئی کام ہو تو اس کے پیچھے دس طرح کی مصلحتیں ہوتی ہیں جن کو ہم ہی سمجھ سکتے ہیں، دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ وہ تو بس اس کام کے کچھ بندھے ٹکے قاعدوں ضابطوں کو دیکھے گا اور بُرا بھلا جیسا ہوگا، اُسے پورا کر دے گا۔

یہی وجہ ہے کہ دوسرے مُلکوں میں جو ترقی کرکے آج اتنے آگے نکل گئے کہ چاند تاروں تک دوڑ لگاتے ہیں، وہاں لوگ اپنا سارا کام اپنے آپ کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں نوکر چاکر نہیں ہوتے، نہ وہ لوگ اپنے کسی کام کے معاملے میں کسی دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ کام چاہے اپنے گھر کا ہو، یا اپنی بستی کا یا اپنے دیش کا، وہ اس میں کسی دوسرے کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔

اپنا کام اپنے آپ کرنے میں سچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اِس بات کی سچائی دیکھنی ہو تو ننھے بچوں کی زندگی میں دیکھئے۔ بچہ ہر کام اپنے آپ کرنا چاہتا ہے، یہاں تک کہ اُسے کسی کام سے روکئے تو وہ رونے اور ٹھنکنے لگتا ہے۔ ایسے ہی بچے تندرست بھی رہتے ہیں اور آگے چل کر تیز ہوتے ہیں۔ جن بچوں کو اُن کے من بھاتے کام سے روکا جاتا ہے وہ یا تو ضدی ہو کر شیطان بن جاتے ہیں یا پھر دبّو اور ڈرپوک ہو جاتے

اور آگے چل کر کسی کام کے نہیں رہ جاتے۔

آج کل ہمارے دیس میں بس دو ہی طرح کے آدمی ملتے ہیں : یا شیطان یا دبّو اور ڈرپوک۔ ایسا کیوں ہے؟ ایسا اِس لئے ہے کہ غُلامی کے زمانے میں انگریز سرکار نے ہم ہندوستانیوں کو اپنا کام آپ نہیں کرنے دیا۔ اُس نے ہمارے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ ہم کوئی کام کرنے کے لائق ہی نہیں ہیں۔ راج کاج کے چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے ولایت سے آدمی بُلائے جاتے تھے۔ ہندوستانی اگر رکھے بھی جاتے تھے تو اِن ولایتی حاکموں کے نیچے۔ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتے تھے بلکہ جس کام کا حُکم ملتا تھا کہ یہ کام اس طرح کر دو، اُس سے وہ بال برابر بھی اِدھر سے اُدھر ہل نہیں سکتے تھے۔

اس طریقے کا اثر ہماری نجی زندگی پر بھی پڑا یہاں تک کہ بات کرنے کا طریقہ ہی یہ بن گیا کہ ”نہیں سرکار، میں کس لائق ہوں۔ یہ سب تو آپ ہی کی دین ہے۔ آپ ہی مائی باپ ہیں۔ میں تو کچھ کر ہی نہیں سکتا۔“

غرض زندگی گذارنے کا یہ طریقہ غلامی کا طریقہ ہے۔ اس طریقے پر چل کر آدمی کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مگر خدا کا شکر ہے، اب ہمیں آزادی ہے۔ اِس لئے وہ غلامی کا پُرانا طریقہ بدل دینا چاہیئے۔ اب ہمیں کسی کو حضور، سرکار یا مائی باپ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب ہم خود حضور ہیں، سرکار ہیں، مائی باپ ہیں۔ ہمیں اب یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ ہم کسی کام کے لائق نہیں ہیں۔ اس کے بدلے اب یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اور ایسا کر سکتے ہیں کہ ایسا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

لیکن ایسی بہادری کی بات وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنھیں اپنی عقل اور بازوؤں کی طاقت پر بھروسہ ہو۔ بیمار اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والے لوگ اس طرح کی بات سوچ بھی نہیں سکتے۔

اس لئے آپ اللہ کا نام لے کر کھڑے ہو جائیں۔ رہی یہ بات کہ آگے بڑھنے کے لئے کیا کیا کام کرنے

ہیں تو اس معاملے میں ہم آپ کو صلاح دیں گے؛ مگر ہم صرف صلاح ہی دیں گے، کام آپ ہی کو کرنا ہے کیونکہ کام آپ کا ہوگا اور آپ ہی اُسے اچھی طرح کر سکیں گے۔　　　(اب اگلے پرچے میں)

آپ کا بچّہ

بچّے کو ہم خدا کی دین کہتے ہیں۔ اُسے آنکھ کی روشنی، گھر کا اُجالا، کلیجے کی ٹھنڈک اور نہ جانے اسی طرح کتنے پیار کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ مگر اُسے جس حال میں رکھتے ہیں، اُسے سوچئے تو یہ سب بناوٹی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

بھلا سوچئے تو سہی کہ ہے تو وہ خدا کی دین مگر اُس کی حالت یہ ہے کہ کیچڑ اور مٹی میں سنا پڑا ہے۔ منھ پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں، ناک سیں سے بھری ہوئی ہے۔ آنکھ میں کاجل تو کیا لگا۔ صبح سے شام ہوگئی ابھی تک دھلی بھی نہیں، کُرتا سُفید کپڑے کا سلا تھا، پر معلوم ہوتا ہے بازار سے کالا خرید کر آیا تھا۔ خدا کی دین کا یہ شکر ہے یا ناشکری!

آپ کہیں گے "غریبی یہ سب کچھ کراتی ہے۔" ہم کہتے ہیں "یہ ٹال مٹول کی بات ہے۔ روپیہ پیسہ نہیں ہے نہ سہی، ہاتھ پاؤں تو چلتے ہیں۔ بچّے کے نہلانے دھلانے اور اس کے کپڑے لتّے صاف کرنے میں کون سا روپیہ پیسہ لگتا ہے۔ یہ کھلانے پلانے، اچھے اچھے اور درجنوں کی تعداد میں کپڑے بنوانے کی بات تو نہیں ہے کہ امیری اور غریبی کا فرق ہے۔ کھانا جیسا موٹا جھوٹا آپ کھاتے ہیں، کپڑا بُرا بھلا جیسا آپ پہنتے ہیں، وہی بچّے کے لئے بھی کافی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ ملتا ہے اُسے سمجھ داری سے استعمال کیا جائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ بچے کو دھول مٹی میں کھیلنے نہ دیجئے۔ دھول مٹی میں کھیلنا بچے کی باڑھ کے لئے ضروری ہے۔ لیکن دھول مٹی میں کھیلنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی بدن پر اس کا لگا رہنا بچے کی تندرستی کے لئے زہر ہے اِس لئے ہونا یہ چاہئے کہ روزانہ شام کو اُسے نہلا دیا جائے اور اگر نہلانے کا موقع نہ ہو تو مُنھ ہاتھ پاؤں اور سر خوب دھویا جائے اور کپڑا بدل دیا جائے اور جو جوڑا اُترے اُسے اُسی وقت صاف کر دیا جائے تاکہ جب دوسرے دن پہلا جوڑا اُترے تو اُس کی جگہ دوسرا تیار رہے۔

آپ کا بچہ آپ کی آنکھ کی روشنی، گھر کا اُجالا اور کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔ مگر حالت یہ ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر اُسے گھُڑکی دی جاتی ہے، بات بات پر ڈانٹا پھٹکارا جاتا ہے، وہ اپنی پسند کی کوئی چیز مانگے، کوئی بات کہے، تو اُسے "چپ رہ" کا حکم ملتا ہے۔ اُس کے رونے اور مچلنے پر اُسے کتے، بندر، ہَوّا اور طرح طرح کی ڈراؤنی چیزوں کا ڈر دکھا کر چُپ کرایا جاتا ہے۔ بہت پیار دکھایا تو لالچ دے دیا کہ چُپ ہو جاؤ گے تو یہ دے دیں گے، وہ دے دیں گے۔ یہ سب باتیں بچے کی زندگی کو گھُن لگا دیتی ہیں اور پھر اِن سب باتوں سے حاصل کیا ہوتا ہے! اپنے دل کو چین، اور وہ بھی ایک چھن کے لئے۔ واہ کیا سودا ہوا! اپنے چھن بھر کے آرام کی خاطر بچے کی پوری زندگی تباہ ہو گئی۔ جی ہاں تباہ! ایسے بچے آگے چل کر دبّو، ڈرپوک، لالچی اور کام چور ہو جاتے ہیں اُن کو اپنے اوپر بھروسہ نہیں رہتا، اپنے شوق سے کام کرنے کی اُمنگ نہیں پیدا ہوتی۔ لالچ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ سیانے اور چالاک لوگوں کے جال میں آسانی سے پھنس جاتے ہیں۔

عقل مند اور دانا لوگوں کا کہنا ہے کہ بچے کی سب سے بڑی ضرورت پیار اور محبت ہے، اُسے ایک وقت دودھ یا کھانا نہ ملے تو پروا نہیں ہوتی لیکن اگر یہ شبہ ہو جائے کہ ماں باپ کا پیار کم ہو گیا ہے تو اُس کی دنیا اندھیر ہو جاتی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ بچے سے ذرا سی دیر کے لئے

ناراض ہو جانا مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ غصّے میں بھر کر مارنا پیٹنا بچّے کے لئے جہنم سے بڑھ کر ہے۔ اس کے سدھار کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے پیار کم کر دیجئے۔ وہ اُسے پھر سے حاصل کرنے کے لئے آپ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا اور پھر جو چاہے اُس سے کرا لیجئے۔

بچّہ جب بولنے اور باتیں کرنے کے قابل ہو جاتا ہے، تو ماں باپ کے لئے وہ بڑا نازک وقت ہوتا ہے۔ بچّہ اپنا یہ نیا نیا تجربہ بڑے جوش کے ساتھ ماں باپ کو دکھانا چاہتا ہے اور سوال کر کر کے ناک میں دم کر دیتا ہے۔ ایسے وقت میں بڑے صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُس کی ہر بات کو پوری توجہ سے سننا اور اُس کے سوالوں کا جواب دینا چاہئے۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ ناسمجھ لوگ اُسے جھڑک کر خاموش کر دیتے ہیں۔ یہ بڑی زبردست غلطی ہے۔ اس سے بچّے کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اس کی بات کسی کام کی نہیں ہے۔ اس کا اثر آگے چل کر یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے کھل کر بات نہیں کرتا۔

بچّہ جب چھوٹے موٹے کام کے قابل ہوتا ہے تو اُسے بات بات پر ٹوکنے سے پرہیز کرنا چاہئے، اور اُسے ایسا ہی کام دینا چاہئے جو اُس کے بس کا ہو۔ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بچّوں کے اوپر ہر وقت جھنجھلاتے اور انھیں طعنہ دیتے رہتے ہیں۔ اس سے کام کے معاملے میں بچّے کو اپنے اوپر بھروسہ نہیں پیدا ہوتا۔ کام کی طرف سے اُن کی طبیعت ہٹ جاتی ہے۔ کہنے سُننے ڈانٹنے ڈپٹنے سے وہ کچھ کرتے بھی ہیں تو بے دلی سے اور کام کو ٹالنے کی خاطر۔

بچّہ آپ کی دولت ہے مگر ایسی دولت کہ ذرا سی چوک ہونے سے مٹّی میں مل جاتی ہے۔ اِس لئے اسے سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے۔

پیسہ، پیسے کو کھینچتا ہے (پہلی پنچ سالہ یوجنا)

ایک مثل آپ نے سُنی ہو گی۔ "ایک لگاؤ، چار پاؤ"۔ یہ بات تو خیر بہت بڑھا چڑھا کر کہی گئی ہے۔ ایسا شاید ہوتا بھی نہیں ہے۔ مگر اس میں ایک سچائی ضرور ہے۔ وہ یہ کہ کچھ ملے گا اُسی وقت جب پاس میں لگانے کے لئے پہلے سے کچھ موجود ہو۔ یہ تو صحیح ہے کہ ایک کے تین اور دو نہ ملیں، ڈیوڑھا یا سوایا تو مل ہی جائے گا۔ سچ ہی کہا ہے "لگاؤ گے تو پاؤ گے نہیں تو کھڑے کھڑے پچھتاؤ گے"۔

اب اگر کسی کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے تو کیا وہ خاک اپنی قسمت آزمائے گا؟ قسمت آزمانے کے لئے بھی تو پیسہ ہونا چاہیئے۔

زندگی میں جتنے بھی دھندے ہیں، سب کے لئے پونجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھیتی کسانی میں بھی کیا ہے۔ پہلے پاس سے لگانا ہوتا ہے۔ کسان بیج خرید کر بوتا ہے۔ بیل اور ہل خریدتا ہے، ہنسیا اور کدال لیتا ہے، گڑائی اور بوائی کے لئے مزدور رکھتا ہے، جب ان سب چیزوں پر پیسے اور محنت لگا لیتا ہے تب کہیں جا کر فصل تیار ہوتی ہے۔ اسی طرح اور بھی جتنے دھندے ہیں سب میں پاس سے کچھ نہ کچھ لگانا پڑتا ہے۔

اگر کسان کے پاس اچھے بیج خریدنے کے لئے پیسے نہ ہوں تو فصل بھی اچھی نہ ہو گی۔ کم پیسوں میں اچھی کھاد نہیں ملے گی، اچھے اوزار نہیں ملیں گے۔ پیسے نہ ہوں گے تو مزدور نہیں مل سکیں گے۔ اکیلے ہاتھ پاؤں مار کر وہ جو کچھ کرے گا، بُری بھلی فصل کاٹ لے گا۔ یہ فصل دونوں وقت روٹی کے لئے کسی طرح پوری نہ پڑے گی۔ اگلی فصل کے کٹتے کٹتے بنئے کا قرض دار ہو جائے گا۔ اتنے پیسے وہ بچا ہی نہیں پائے گا کہ اگلی

فصل اچھی طرح بو سکے۔ یہ غریبی کا جنجال اُسے کسی طرح اپنے چکر سے نکلنے نہیں دے گا۔ اگر کسی طرح اُس کی پیداوار بڑھ جائے تو وہ چار پیسے بھی بچائے، کھیتی میں لگائے اور اگلے سال اور اچھی فصل کاٹے۔ مگر غریبی کی مار بُری ہوتی ہے۔ یہ چاروں طرف سے مارتی ہے۔

جس کے پاس چار پیسے ہوں وہ چار دھندے بھی کر سکتا ہے، اپنے دھندے کو بڑھا سکتا ہے۔ زیادہ نفع کما سکتا ہے۔ اپنی کمائی سے کچھ اور بچت کر سکتا ہے اور اس بچت سے وہ اپنے دھندے کو اور بڑھا سکتا ہے۔ مگر جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ بے چارا کیا کرے۔ جہاں پیٹ بھرنے ہی سے پورا نہ پڑتا ہو وہاں بچت بھلا کیا ہو گی؟ پہلے سے کوئی پونجی پاس نہیں اور کمائی پیٹ بھر کھانے سے بھی کم۔ روز کنواں کھودنا روز پانی پینا۔ جب حالت یہ ہو تو بچنے بچانے کا کیا سوال۔ جب کچھ بچے گا نہیں تو پونجی نہیں بنے گی۔ جب پونجی نہیں بنے گی تو اور کمائی بھی نہیں بڑھے گی۔ اور یہ چکر ساری زندگی اور ایک نسل سے دوسری نسل تک ایسے ہی چلتا رہے گا۔

ہندوستان کی غریبی کس سے چھپی ہے۔ جب دیس آزاد ہوا تو اس وقت اس کی حالت بہت خراب تھی۔ غریبی اور بے روزگاری پھیلی ہوئی تھی جس طرح ایک غریب آدمی کے لئے ترقی کے دروازے بند ہوتے ہیں، اُسی طرح ایک غریب ملک کے لئے بھی ترقی کے تمام راستے بند ہوتے ہیں۔ ملک کا بھلا چاہنے والوں نے سوچا کہ ملک کو غریبی کے اس چکر سے نکالنا ضروری ہے۔ اُسے غریبی کے اس چکر سے نہ نکالا گیا تو دِن بہ دِن اس کی حالت بگڑتی جائے گی۔ اس سے پہلے "یوجنا کیا ہے؟" والے مضمون میں ہم نے بتایا تھا کہ اس کا بس ایک ہی اُپائے ہے۔ دیس کی اُپج بڑھائی جائے۔ دیس کی اُپج بڑھانے کے لئے بہت سے کام سوچے گئے۔ مگر ہر کام کو کرنے کے لئے پونجی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہمارے دیس کے رہنے والے غریب ہیں۔ اسی لئے ہمارا ملک بھی غریب ہے۔ آدمی جو کچھ کمائی کرتا ہے، اس میں سے خرچ کرتا ہے۔ جو بچ رہتا ہے، وہی اُس کی پونجی ہوتی ہے۔ دیس میں رہنے والے سب لوگوں کی پونجی مل کر دیس کی پونجی کہلاتی ہے۔ جس دیس میں غریب آدمی بستے ہوں وہاں پونجی اکٹھا ہونا کتنا مشکل کام ہے! جب کام میں لگانے کے لئے پونجی کم ہو گی تو پیداوار بھی تیزی سے آگے نہیں بڑھے گی۔ جب پیداوار

تیزی سے نہیں بڑھے گی تو دیس بھی آگے نہیں بڑھے گا۔ غریبی کے چکر سے نہیں نکل سکے گا۔

یوجنا بنانے والوں نے دیس کی آمدنی اور خرچ کا حساب لگایا تو یہ دیکھا کہ کہاں کہاں سے بچت ہو سکتی ہے۔ باہر کے لوگوں سے مدد اور قرض مانگا۔ قرض اس لئے لیا کہ اُسے اُپج بڑھانے کے کاموں میں لگایا جائے۔ اس سے دیس کی اُپج بڑھے گی تو قرض واپس کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ ہر طرح کی آمدنی کا حساب لگایا گیا۔ معلوم ہوا کہ دو ہزار تین سو پینسٹھ کروڑ روپے پانچ سال کے لئے مل سکیں گے۔

اس رقم کو سامنے رکھ کر دیس کی اُپج بڑھانے کے کام سوچے گئے۔ یہ کام پہلی پنج برسی یوجنا میں شروع کئے گئے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کچھ ایسے کام کئے جائیں جس سے ملک میں اور زیادہ پونجی اکٹھا کی جا سکے اور اُس پونجی کو بعد میں نئے نئے دھندوں میں لگایا جائے اور اس طرح دیس اپنی اُپج بڑھاتا جائے اور اپنے آپ کو غریبی کے اِس چکر سے باہر نکال لے۔

جتنی زیادہ پونجی ہوگی اتنے ہی نئے نئے دھندے کھلیں گے۔ جتنے نئے نئے دھندے کھلیں گے اتنی ہی اپج بڑھے گی جتنی اُپج بڑھے گی اتنی ہی پونجی بنے گی۔ یہ پونجی پھر نئے نئے دھندوں میں لگائی جائے گی۔ کسی نے سچ کہا ہے پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے۔

پہلی یوجنا ۱۹۵۱ء میں شروع ہوئی تھی۔ یہ آج سے پانچ سال پہلے ۱۹۵۶ء میں پوری ہو گئی۔ اس کے بارے میں اور باتیں ہم آپ کو بعد میں بتائیں گے۔

تعلیم و ترقی
(سوشل ایجوکیشن کا رسالہ)
ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

جون ۱۹۶۱ء

جلد ۱۲ —— شمارہ ۶

بانی:۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر:۔

پروفیسر محمد مجیب

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر:۔

ماہنامہ تعلیم و ترقی۔ جامعہ نگر

نئی دہلی

قیمت

سالانہ چار روپے — فی پرچہ ۳۷ نئے پیسے

ٹیلیفون: [illegible]

ترتیب

پرنٹر پبلشر برکت علی فراق نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ نگر۔ نئی دہلی سے شائع کیا

اشارات

وزارتِ تعلیم کا نیک قدم

مرکزی وزارت تعلیم نے ابھی حال میں اپنے یہاں سوشل ایجوکیشن کے لئے بھی محکمۂ مشاورت قائم کیا ہے اور اس تحریک کے مسلم الثبوت رہنما شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے کو مشیر سوشل ایجوکیشن (ایڈوائزر، سوشل ایجوکیشن) مقرر کیا ہے۔ سوشل ایجوکیشن کی تحریک کے آگے بڑھنے کے لئے یہ ایک بڑا نیک شگون ہے اور امید بندھتی ہے کہ سوشل ایجوکیشن، چاہے اس کی شکل کچھ بھی قرار پائے، کے باب میں مایوسی اور بددلی کی جو فضا پیدا ہوتی جا رہی تھی، وہ امید اور جوش و ولولے کی شکل میں تبدیل ہو جائے گی۔

شری دیش پانڈے کی خدمات کی تشریح و توضیح کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس تحریک کے رہنما ہی نہیں، بہادر سپاہی بھی رہے ہیں اور سوشل ایجوکیشن کی تعریف و تعبیر کے سلسلے میں ملک نے اُن کے فکر و عمل سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اس اعتبار سے مرکزی وزارت تعلیم مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس عہدے کے لئے اس نے شری دیش پانڈے کا انتخاب کیا۔

اس موقعے پر نامناسب نہ ہوگا اگر ہم وقت کی ایک اہم ترین ضرورت کی طرف اشارہ کر دیں اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس ضرورت کی تکمیل جس حسن و خوبی کے ساتھ مرکزی وزارتِ تعلیم کر سکتی ہے، کوئی اور ایجنسی نہیں کر سکتی۔

سوشل ایجوکیشن کا چرچا تو ملک کی آزادی کے بعد سے ملک میں بہت عام ہو گیا اور اسی نسبت سے اس کے کام کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہمارا خیال ہے کہ اس میدان میں اصل محاذ پر کام کرنے والے کارکنوں کے ذہن و فکر کی اِس سمت میں تربیت کا انتظام اُتنا نہیں ہوا جتنا ہونا چاہئے تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی وزارت کے اہتمام میں متعدد مقامات پر سوشل ایجوکیشن آرگنائزرز ٹریننگ سنٹر یہ کام کر رہے ہیں لیکن اول تو اِس ٹریننگ کی مدت بہت مختصر ہے جس کے اندر ٹریننگ کا پورا پورا حق ادا نہیں ہو پاتا اور دوسرے سب سے بڑی کمی اس فیلڈ سے متعلق مستقل اور مسلسل ادب کی غیر موجودگی ہے۔ ٹریننگ کے دوران میں جو کچھ پڑھنے اور سُننے کا موقع ملتا ہے، اگر اس کا سلسلہ تازہ ترین کتابوں اور رسائل کے مطالعے کی شکل میں جاری نہ رہے تو عام طور سے ذہن سے مٹ جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کارکن رُٹین کا غلام ہو جاتا ہے اور اپنی اپج اور تحریک پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

اس میں شک نہیں کہ ملک میں اور ملک سے زیادہ بدیسی ممالک میں اس موضوع سے متعلق انگریزی زبان میں ادب تیار ہوتا رہتا ہے لیکن اس ادب سے زیادہ تر افسروں اور ڈائرکٹروں کا طبقہ تو شاید مستفید ہو سکتا ہو اور ہوتا ہو لیکن اصل کارکن مثلاً ایس ای۔ او اور دی۔ ایل۔ ڈبلیو، اور انھیں کی صف میں آنے والے دوسرے کارکن جیسے پنچایت انسپکٹر، پنچایت سکریٹری وغیرہ اوّل تو انگریزی زبان سے بس یونہی سے واقف ہوتے ہیں، دوسرے زبان کی یہ واقفیت اتنی گہری نہیں ہوتی کہ وہ اس فیلڈ کی اصطلاحی زبان کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

اِن حالات میں ضرورت ہے کہ سوشل ایجوکیشن، اڈلٹ ایجوکیشن، کمیونٹی آرگنائزیشن، ورکرز ایجوکیشن سے متعلق ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں کتابوں اور رسالوں کی تالیف و اشاعت عام کی جائے اس کے لئے کچھ ایسی فضا پیدا کی جائے کہ ملک کے پبلشرز اور بک سیلرز اس کی طرف متوجہ ہوں۔ خود حکومت بھی اس سلسلے میں براہِ راست اپنے اہتمام و انتظام میں یہ کام کر سکتی ہے، لیکن وہ کتنا کام بھی کرے، جب تک غیر سرکاری اداروں اور افراد کی حوصلہ افزائی نہ ہوگی، اِس ادب کا چرچا عام نہیں ہوگا۔

اس کام کو انجام دینے کی کیا شکل کیا ہوگی، اس کا فیصلہ تو سوشل ایجوکیشن کا محکمہ مشاورت ہی کر سکتا ہے، ہم صرف ضرورت کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں۔ ایک زمانے میں حکومت نے نوسکھ بالغوں کے ادب کی حوصلہ افزائی کی تھی، اس کا اتنا اثر ہوا کہ ملک میں اس ادب کا چرچا اب عام ہونے لگا ہے۔ اب ضرورت فیلڈ کے کارکنوں کا ادب مہیا کرنے اور اس کے لئے فضا تیار کرنے کی ہے ہمیں پوری امید ہے کہ اِس نئے انتظام کے ماتحت اس ضرورت کو بھی اُسی اہتمام اور شان و شوکت کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

افکار و مسائل

کیا سوشلسٹ سماج کی تعمیر میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم مدد دے رہی ہے؟

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے موجودہ پروگرام میں تبدیلی کی ضرورت

ہمارے ملک میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم کو شروع ہوئے اب نو سال پورے ہو رہے ہیں۔ اس مختصر سی مدت میں یہ پروگرام جس تیزی سے پھیلا ہے اس کے لئے ہماری حکومت مبارکباد کی مستحق ہے۔ گاؤں کی بیل گاڑی کی چال والی سست رفتار اور خاموش زندگی میں یہی کیا کم ہے کہ اِس پروگرام نے وہاں جیپ کی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر دیا ہے۔ دیہی تعمیر و ترقی کے میدان میں ہندوستان کا یہ تجربہ آج دوسرے ملکوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو رہا ہے اور وہ اس تجربے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔

ایک دوسری حیثیت سے بھی یہ اسکیم کافی اہم ہے۔ اسکیم پر بے لاگ تنقید و تبصرہ اس اسکیم کا ایک جزو لازم بن چکا ہے اور اسکیم پر آزادانہ رائے اور تنقید و تبصرہ کا ایک سلسلہ اسکیم ساتھ ساتھ شروع ہو گیا ہے۔ اس سے حکومت کی اس دلچسپی، نیک نیتی اور خلوص کار کا پتہ چلتا ہے جو حکومت کو اس پروگرام کی طرف سے شروع دن سے رہی ہے۔ حکومت کے اور کسی پروگرام پر اس سے پہلے شاید کبھی اتنی آزادانہ رائے زنی، حکومت کے حلقوں میں اور اس سے باہر کبھی نہیں کی گئی۔ بیرونی ممالک کے ماہرین اور خود ہمارے ملک کے اربابِ فکر نے اس پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر اپنی رائیں پیش کی ہیں اور اس سلسلے میں اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازا بھی ہے۔ پلاننگ کمیشن نے پلان کے کاموں کے جائزے کے سلسلے میں اس اسکیم پر مختلف رپورٹیں پیش کی ہیں۔ اور ان تمام جانچ رپورٹوں، جائزوں اور تاثرات میں ایک بات لازمی طور پر ملتی ہے کہ اس پروگرام کا فائدہ سماج کے سب سے نچلے طبقے کو نہیں مل پا رہا ہے اور اس سے اچھے کھاتے پیتے لوگ ہی زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

یہ صورتِ حال، ایک ایسے ملک کے لئے جس نے سوشلسٹ نما سماج بنانے کا فیصلہ کر رکھا ہو، کافی تشویشناک ہے۔ ایک

سوشلسٹ یا سوشلسٹ نما سماج کے لئے ضروری ہے کہ سماج کا جو سب سے نچلا طبقہ ہے وہ اوپر اٹھے اور لوگوں کی آمدنی کے درمیان جو فرق ہے اس میں بتدریج کمی واقع ہو یعنی بڑھی ہوئی پیداوار میں سب سے زیادہ حصہ ان لوگوں کو ملے جو سماج میں آج سب سے نچلی سطح پر ہیں۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ اسکیم کا بنیادی مقصد ملک کے کروڑوں کسانوں کو اپنی زندگی میں بہتری اور خوش حالی لانے میں مدد دینا ہے۔ اسی غرض سے یہ اسکیم ملک گیر پیمانے پر شروع کی گئی ہے جس سے کہ گاؤں کے لوگ اپنی مدد آپ کے اصول کے ماتحت اپنی پیداوار اور گھریلو آمدنی کو بڑھا سکیں اور اس طرح گاؤں کی بستیاں آزاد ہندوستان کی اقتصادی اور سماجی زندگی کی تعمیر و ترقی میں مستعدی سے حصہ لے سکیں میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ اسکیم اپنے مقصد میں بالکل ہی ناکام رہی ہے مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ملک کی قومی پالیسی جس کے ماتحت ہماری قومی حکومت نے ملک میں سوشلسٹ نما سماج بنانے کا فیصلہ کیا ہے، یہ پروگرام پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے یہ پروگرام گاؤں کی زندگی میں کسی حد تک خوش حالی بھی لایا ہے اور ایسی بہت سی سہولتیں مہیا کر دی ہیں جو اس سے پہلے گاؤں والوں کو نصیب نہیں تھیں۔ اس پروگرام کے ماتحت کچھ ایسے کام بھی ہوئے ہیں جو گاؤں کے ایک ایک آدمی کی فلاح اور بہبود سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اکثر گاؤں میں سڑکیں بن گئی ہیں، اسکول کھل گئے ہیں، گلیاں اور کنویں پختہ ہو گئے ہیں، شہروں کے پاس کے بلاکوں میں بھی اسکیم سے لوگ خاطر خواہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تفریح اور دل بہلاؤ کے پروگرام بھی خاص طور پر نوجوانوں میں کافی مقبول ہیں۔ ان سب چیزوں نے گاؤں کی زندگی میں بہت سی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ پیداوار کے کچھ نئے طریقے لوگوں نے اختیار کئے ہیں اور ان سے ان کی آمدنی بھی بڑھی ہے، قرض، بیج اور بہتر کھاد کی سپلائی سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے اور ان سب کا اثر گاؤں کی سماجی اور تہذیبی زندگی پر مرتب ہوا ہے۔ لوگوں میں نئے نئے طریقے اور نئی نئی باتیں اختیار کرتے ہوئے جھجکنے کی عادت اب پہلے سے کم ہو گئی ہے۔ بلاک کی ٹیم کے توسط سے شہروں سے ان کا ربط ضبط بڑھا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گاؤں کی میلی کچیلی زندگی میں چند سفید پوش لوگوں کے اس طرح گھل مل کر کام کرنے سے ان کے دل و دماغ کے گوشوں میں کچھ خوشگوار تبدیلیوں کی امید اب آہستہ آہستہ کروٹیں لینے لگی ہے۔

گاؤں کے لوگوں کو اپنے پیداواری کاموں کو بڑھانے میں مدد دینے کے لئے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے اپنے کچھ قواعد و ضوابط ہیں، جن میں اس میں شک نہیں کہ پرانے سرکاری قاعدوں کے مقابلے میں کافی لچک اور وسعت ہے۔ اس کے ماتحت حکومت نے اپنی موجودہ انتظامی مشنری اور کنٹرول اور نگرانی کے موجودہ طریقوں کے اندر رہتے ہوئے، جہاں تک ممکن ہوا ہے کافی سہولتیں فراہم کی ہیں۔ مگر اس کے باوجود حکومت کی جانب سے تقاوی قرض اور دوسری سہولتیں حاصل کرنے کی شرائط ایسی ہیں کہ ان سے بس وہی کسان فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کے پاس ضمانت کے لئے جائداد یا اور دوسری چیزیں ہوں۔ جن کے پاس جتنی زیادہ جائداد ہو گی، حکومت اپنی رقم ان کے پاس اتنی ہی زیادہ محفوظ سمجھے گی اور انہیں قرض بھی زیادہ اور لمبی مدت کے لئے ملے گا۔ جو صاحب جائداد

نہیں ہیں، حکومت اپنی رقم اُن کے پاس محفوظ نہیں سمجھے گی، اور چونکہ وہ قرض کے لئے کوئی معقول ضمانت نہیں پیش کر سکتے اس لئے اوّل تو انہیں کسی طرح کا قرض یا دوسری امداد حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں رہتا ہے یا اگر انہیں قرض اور تقاوی وغیرہ کی شکل میں کچھ رقم ملے گی بھی تو وہ اتنی معمولی ہوگی کہ اس سے وہ کام جنہیں کرنے کے لئے وہ قرض حاصل کرنے کا خواہشمند تھا نہیں پائے گا۔ اس طرح وہ کبھی اس حیثیت کو نہیں پہنچ سکیں گے جب کہ وہ اپنے آپ کو حکومت کے اِن پروگراموں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے قابل بنا سکیں۔
اس کے برعکس کھاتے پیتے اور صاحب جائداد کسانوں کے لئے ان سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے امکانات موجود ہیں۔ ایک دوسری بات جو اِس پروگرام کے تحت لوگوں کو امداد اور دوسری سہولتیں دینے کے لئے میعار بنائی جاتی ہیں، وہ لگان کی رقم ہے۔ حکومت کے خزانے میں جو جتنی لگان جمع کرے گا ضرورت پڑنے پر اُسے اسی نسبت سے امداد اور قرض کی سہولتیں ملیں گی۔
یہ عمل بھی ایسا ہے کہ اُس سے یہ سارا پروگرام محض ان لوگوں کے لئے جو کھاتے پیتے اور صاحب جائداد طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے اور وہ لوگ جو ہر طرف سے بے سہارا ہیں ان کو سہارا دے کر اِس قابل بنانے کا کوئی موقع نہیں ہے کہ وہ اپنی مدد آپ کے اصول کے ماتحت پیداواری کاموں کو بڑھانے کے لئے جو سہولتیں حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ایک سوشلسٹ یا سوشلسٹ نما سماج (SOCIALISTIC PATTERN OF SOCIETY) کی تعمیر جس کی یقین دہانی بار بار کرائی جاتی رہی ہے اور جس کی حیثیت آج ہماری قومی پالیسی کی سی بن گئی ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی آمدنی کے درمیان جو فرق ہے وہ بتدریج کم ہو اور سماج کے سب سے نچلے طبقے کو ملک کی بڑھتی ہوئی پیداوار میں سب سے زیادہ حصّہ ملے۔ اس کی صرف ایک صورت ہے کہ آج جو دبے ہوئے اور نچلے طبقے کے لوگ ہیں انھیں آگے بڑھنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہوں۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا پروگرام آج گاؤں کی ہمہ گیر ترقی کے لئے چلایا جارہا ہے۔ مگر گاؤں کی ہمہ گیر ترقی کم سے کم اس معنی میں کہ اس کے ذریعہ گاؤں کے ہر طبقے کے لوگوں میں خوشحالی آئے۔ اُسی وقت ممکن ہے جب یہ پروگرام اُن لوگوں کو سب سے زیادہ اوپر اٹھنے کا موقع دے جو آج ہر طرح سے دبے ہوئے ہیں، یعنی چھوٹے چھوٹے کسان، اسامی، کھیت مزدور اور دیہی صنعت کے نام پر ٹوکریاں اور چھلیاں بنانے والے ایسے خاندان اور ایسی برادریاں جو آج بیشتر بے کار رہتی ہیں، اُن کی زندگی میں خوش حالی آئے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا پروگرام اپنے موجودہ ڈھیچر کے اندر رہتے ہوئے، اِس سمت کچھ بہت مفید کام انجام نہیں دے سکتا ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کا خود حکومت کے حلقوں میں احساس ہے اور وہ اس سلسلے میں سوچ بچار بھی کر رہے ہیں۔ جے پرکاش نارائن کی صدارت میں ایک کمیٹی کا قیام اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ یہ کمیٹی کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگراموں سے سماج کے سب سے نچلے طبقے کے لوگوں کو مستفید کرنے کے امکانات پر غور کر رہی ہے اور عنقریب اپنی رپورٹ پیش کرنے والی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جب تک کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے اصول اور طریق کار میں بہت زیادہ اور انقلابی قسم کی تبدیلیاں نہیں کی گئیں، یہ پروگرام ہندوستان میں ایک سوشلسٹ نما سماج کی تشکیل میں مددگار نہیں ہو سکے گا۔

ایکس ٹنشن کی اسکیم میں سوشل ایجوکیشن کا مقام: ایک جائزہ

(ایک طالب علم کے تاثرات)

تمہید: ڈپلوما (رورل سروسز) کورس کی تکمیل کے سلسلے میں سال دوم کے امتحان کے بعد ہر طالب علم کو اپنی مرضی کی ایک ایجنسی کا مطالعہ کرنا تھا۔ میں نے اس مقصد کے لئے ایک ڈیولپمنٹ بلاک کے مطالعے کا فیصلہ کیا۔ مطالعہ شروع کرنے سے پہلے میں نے کچھ سوالات مرتب کئے اور پوری گرمیوں کی چھٹیاں اسی کام پر وقف کردیں۔ اس مطالعہ کا خاص مقصد اس بات کا یقین کرنا تھا کہ بلاک کے کاموں پر جو عام طور پر اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کی کیا حیثیت ہے۔ ایکس ٹنشن کے پروگرام نے کس حد تک کامیابی حاصل کی ہے اور کس حد تک ناکام رہا ہے اور کیوں؟

اس مقصد کے لئے میں نے بلاک کے افسروں سے تعلقات پیدا کئے اور ان کو اپنے مطالعے کی نوعیت بھی بتادی۔ میں نے طے کیا تھا کہ مستند دستاویزات کا بھی مطالعہ کروں گا اور اصلیت کا بھی پتہ لگاؤں گا اور دونوں کا موازنہ کرکے نتیجہ نکالوں گا چنانچہ بلاک کی لائبریری میں بھی روزانہ جانے لگا اور بلاک کے پروگریس اسسٹنٹ سے مل کر بلاک کے کاموں کا قریب سے مطالعہ بھی شروع کیا۔ وقت نکال کر اپنے اس دوست کے ساتھ گاؤں کے دورے پر بھی جانے لگا اور بلاک کے کاموں کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی۔ غرض اس خوبصورت تصویر کو ہر رُخ سے دیکھا۔ مگر جتنی گہرائی میں گیا اتنی ہی ذہنی الجھنیں بڑھتی گئیں اور میں آخر وقت تک اس نتیجے پر نہیں پہنچ پایا کہ اپنی رپورٹ میں اس مواد کی بنیاد پر لکھوں جو بلاک کے دفتر سے فراہم کیا گیا تھا یا جو کچھ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی اس کی روشنی میں لکھوں۔

ایک مشکل یہ بھی تھی کہ میرے نزدیک بلاک کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہیں آرہا تھا۔ جب افسر لوگ رسمی طور سے گفتگو کرتے تو سارا الزام گاؤں والوں کی بے ذوقی پر رکھتے۔ اور جب دفتر کے باہر غیر رسمی گفتگو ہوتی تو فرماتے کہ گورنمنٹ پیسہ کا ر دیہہ برباد کررہی ہے۔ کام دام کچھ نہیں ہورہا ہے سب کاغذی کارروائی ہے۔ دوسری طرف جب گاؤں والوں سے بات چیت ہوتی تو وہ بلاک والوں کو گالیاں دیتے نظر آتے عجیب مخمصے میں پڑ گیا تھا کہ کیا لکھوں کیا نہ لکھوں۔

ناکامی کی اصل وجہ

اس اسکیم کی ناکامی کے بہت سے اسباب سننے میں آئے تھے اور اُن کا اس عرصے میں کسی قدر تجربہ بھی ہوا۔ لیکن سب سے بڑی وجہ جو ان تمام ناکامیوں کی جڑ ہے وہ ہے سوشل ایجوکیشن کے ساتھ بدسلوکی۔ سوشل ایجوکیشن میرے نزدیک اس پوری اسکیم کی جان ہے۔ میں نے اپنے مطالعے کے دوران میں ایس۔ ای۔ او کو بلاک میں ایک کھلونے کی حیثیت میں پایا جس کو بی۔ ڈی۔ او سے لے کر وی۔ ایل۔ ڈبلیو تک سب اپنے ہاتھوں میں نچاتے تھے۔ ایک افسر سے میں نے درخواست کی کہ وہ ایس۔ ای۔ او سے میرا تعارف کرا دیں۔ انھوں نے مکدر ہو کر جواب دیا "میاں وہ بے وقوف کیا جانے سوشل ایجوکیشن کس چڑیا کا نام ہے۔ ہماری ٹیم میں سب سے بے کار شخص اگر کوئی ہے تو وہ ایس۔ ای۔ او ہے"! لیکن میں نے تو یہ دیکھا کہ سوشل ایجوکیشن کے مفہوم کو سمجھنے اور اس کام کو آسان سمجھ کر اُسے انجام دینے والے افسروں میں سے کسی نے کبھی اس کام کو عمل میدان میں پورا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ چنانچہ وہاں کسی گاؤں میں کلب یا کمیونٹی سینٹر جیسی کوئی چیز نہیں ملے گی۔ پورے بلاک میں خواندگی کی ایک آدھ کلاسیں تو دیکھنے کو ضرور مل جائیں گی لیکن لائبریری یا سوشل ایجوکیشن کے دوسرے کاموں کا تو دور دور پتہ نشان نہیں ملے گا۔

سچی بات یہ ہے کہ یہ مضمون دیکھنے میں اور بحث کرنے کی حد تک تو بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اس کو عمل میدان میں جا کر کرنا ہر شخص کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک خاص مہارت اور پیشہ ورانہ معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو صرف ایک مدت کی ٹریننگ ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ جب واقعہ یہ ہو تو یہ بات کس طرح مان لی جائے کہ ٹریننگ پایا ہوا ایس۔ ای۔ او تو بے کار شخص ہے اور ٹیم کے دوسرے ماہر جنھیں اس مضمون کی سرے سے ٹریننگ نہیں ملی ہوتی۔ اس کام کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے لیں گے۔ ان باتوں کو نظر میں رکھتے ہوئے میرا خیال تو یہ ہے کہ بلاک والوں نے سوشل ایجوکیشن کے باب میں اپنی ناواقفیت کی پردہ پوشی کرنے کے لئے ایس۔ ای۔ او کے متعلق اس قسم کا جال بن رکھا ہے۔

اور یہ صورتِ حال اُس وقت تک اسی طرح جاری رہے گی جب تک سوشل ایجوکیشن کا منصب اور مقصد اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے گا اور اس کو اس کا اصلی مقام نہ دیا جائے گا۔

سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا منصب کیا ہے؟ اس موضوع پر بہت سے ماہرین گفتگو کر چکے ہیں اور اس الجھاؤ کو دور کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک مضمون میں نے شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے کا پڑھا تھا جو میرے خیال میں نہایت سلجھا ہوا اور نہایت واضح ہے۔ شری دیش پانڈے نے اس الجھاؤ کی ابتدا (ORIGINE) اور ارتقا (DEVELOPMENT) پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ الجھاؤ ۱۹۵۱ء کے بعد سے جب کہ سوشل ایجوکیشن کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام سے وابستہ کیا گیا

شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کا ذمہ دار بی۔ ڈی۔ او اور ایس۔ ای او کے درمیان افسری اور ماتحتی کے رشتے کو ٹھہرایا ہے۔ ان کے مطابق بی۔ ڈی۔ او اور دوسرے افسروں کا خیال یہ رہا ہے کہ ایس۔ ای۔ او کا کام تو ایسا ہے جیسے ڈاک کے ہر ایکسپرٹ کو اپنے کام کے ساتھ کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے ایس۔ ای۔ او ایک بے کار سا شخص ہے۔ مگر جب گورنمنٹ نے اس کو کام پر لگا ہی دیا ہے تو اس سے کچھ نہ کچھ کام تو یا ہی جائے گا۔ چنانچہ اسی خیال کی بنیاد پر بی۔ ڈی۔ او اپنے ایس۔ ای۔ او کو معمولی معمولی کام جیسے سڑک ناپنا۔ فیلڈ بنوانا کھیلوں کا ریفری مقرر کرنا وغیرہ دیتا رہا اور اس کے اصلی کام سے اسے دور رکھا۔ ان حالات میں قدرتاً ایس۔ ای۔ او اپنے منصب کو بھول گیا یا یوں کہئے کہ اُسے اپنا اصلی رول بھولنے پر مجبور کر گیا۔

میری اپنی رائے

دفتری پانڈے جی کی رائے اپنی جگہ بالکل صحیح ہو سکتی ہے۔ لیکن میری رائے اس سے ذرا مختلف ہے تاریخ تو اس الجھاؤ کی واقعی صحیح ہے لیکن میں بی۔ ڈی۔ او کو یا افسری ماتحتی کے رشتے کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتا۔ کیونکہ اگر یہی بات ہے تو یہ الجھاؤ بی۔ ڈی۔ او اور اس کے دوسرے ماتحتوں میں کیوں نہیں ہوا؟ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسرے ماتحتوں کا شروع ہی سے ایک رول (منصب) متعین تھا۔ لیکن جب سوشل ایجوکیشن کا سوال اسکیم بنانے والے ماہرین کے سامنے آیا تو انھوں نے اس کی اہمیت کو تو تسلیم کر لیا لیکن اُس کی روح کو نہ سمجھ سکے چنانچہ اس کے ماہر کے منصب کا معاملہ گول مول رہ گیا۔

ایکس ٹنشن اور سوشل ایجوکیشن

میرے خیال میں اس سارے جھگڑے کی بنیاد یہ ہے کہ ایکس ٹنشن اور سوشل ایجوکیشن کے مفہوموں کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں الگ الگ کام ہیں اور ان کے مقاصد مختلف ہیں۔ سب سے پہلے اس فرق کو ایک سوال قائم کر کے سمجھنا چاہیے اور وہ یہ کہ اگر سوشل ایجوکیشن اور ایکس ٹنشن ایک ہی چیز ہے تو ان کے لئے الگ الگ اصطلاحیں کیوں وضع کی گئی ہیں؟ ہم ایکس ٹنشن کی جگہ سوشل ایجوکیشن کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے اور اسی طرح سوشل ایجوکیشن کی جگہ ایکس ٹنشن کا لفظ نہیں بول سکتے۔

سوشل ایجوکیشن

سوشل ایجوکیشن کا مقصد ذہنوں کو بدلنا اور ان میں لوچ پیدا کرنا ہے لوگوں کو اس بات کے لئے تیار کرنا ہے کہ

وہ بدلے ہوئے حالات اور طریقوں کو جن سے ان کی ترقی وابستہ ہے اپنی خوشی سے تسلیم کریں

ایکس ٹنشن

دوسری طرف ایکس ٹنشن ہے جو ایک خاص قسم کے طریقۂ کار کے لئے بولا جاتا ہے جس کا منشا یہ ہوتا ہے آزمائی اور پرکھی ہوئی معلومات کو تجربہ گاہ کے کام اور استعمال کے مراکز تک پہنچانا۔ وسائل سے اس کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ایکس ٹنشن کا عمل ہر ملک میں ہوتا ہے لیکن طریقے ہر ملک کے اپنے ہوتے ہیں جو سوشل ایجوکیشن کی فیلڈ کہلاتے ہیں

ایکس ٹنشن اور سوشل ایجوکیشن کا باہمی رشتہ

ان دونوں تصورات میں اگرچہ فرق ہے مگر ان میں باہم ایک رشتہ بھی ہے جسے یوں واضح کیا جا سکتا ہے کہ ایکس ٹنشن ایک پُل ہے جس کے ذریعے لوگ اِس پار سے اُس پار جا سکتے ہیں۔ اور سوشل ایجوکیشن وہ ستون ہیں جن کے اوپر پُل قائم ہے۔ اگر ان ستونوں کو پُل کے نیچے سے ہٹا دیا جائے تو پُل گر جائے گا اور لوگ پار نہیں اتر پائیں گے۔ اس فرق اور باہمی رشتے کو یوں بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ ایکس ٹنشن ایک گاڑی ہے جس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو ترقی کی گنگا نہلانے لے جایا جا رہا ہے۔ اس گاڑی میں جتے ہوئے بیلوں کو اگر ہم ایکس ٹنشن کا اصول مان لیں تو سوشل ایجوکیشن کے طریقے اس کے پہیے ہوئے۔ اگر گاڑی میں سے پہیوں کو نکال دیا جائے تو مسافر گنگا تو نہا لیں گے لیکن انھیں پیدل جانا پڑے گا اور وقت زیادہ لگے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایکس ٹنشن کا کام براہ راست بھی ہو سکتا ہے۔ سائنس نے اب تک جو چیزیں ایجاد کی ہیں، وہ لوگوں کے سامنے لا کر ڈال دی جائیں اور یہ امید رکھی جائے کہ جب ان کو ضرورت ہوگی یا وہ اس قابل ہوں گے اُس وقت انھیں استعمال کریں گے یا بلاک میں وہ چیزیں رکھی ہیں اُن کی جب خواہش ہوگی آکر خود مانگ لے جائیں گے۔ یہ بھی ایکس ٹنشن کا ایک طریقہ ہے جو آج کل چل رہا ہے۔ اسے آپ چاہیں تو بغیر سوشل ایجوکیشن کا ایکس ٹنشن کہہ لیں۔

دراصل سوشل ایجوکیشن ایک ایسی مشنری ہے جس سے ایکس ٹنشن کی گاڑی چلتی ہے۔ ایکس ٹنشن کی مثال مال گاڑی کے بھرے ہوئے ڈبوں کی ہے جو اپنی جگہ نہایت گراں قیمت شے ہے۔ لیکن اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے ایک طاقت ور انجن کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ہے سوشل ایجوکیشن۔

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایس۔ای۔او کا کام ایک ٹریکٹر کی طرح کا ہے جو زمین کی طرح ذہنوں کو ملائم اور ہموار کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ٹیم کے دوسرے ایکسپرٹوں کا کام کسان کی طرح کا ہے جو بڑی خوبی کے ساتھ زمین میں بیج بو دیتا ہے

۔ اس طرح سوشل ایجوکیشن اگر دماغوں کو بدلنے کا آلہ ہے تو ایکسٹنشن نئی نئی معلومات کو ان دماغوں میں اُتارنے کا آلہ۔ سوشل ایجوکیشن کا کام کلب کھولنا۔ لٹریسی کی کلاسیں منظم کرنا۔ کمیونٹی سینٹر قائم کرنا اور سرداری کی تربیت دینا ہے۔ دوسرے ایکسپرٹوں کا کام ایک مخصوص فیلڈ کی معلومات کو تجربہ گاہ سے منتقل کرکے گاؤں والوں تک لے جانا یا انھیں ان ذرائع تک پہنچانا ہے۔ منزل دونوں کی ایک ہی ہے، لیکن ان کے راستے مختلف ہیں۔ اگر ان دونوں کاموں کو جو نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ایک شخص کے سپرد کیا جائے گا تو کسی نہ کسی طرح کام میں کہیں نہ کہیں یقیناً کمی رہ جائے گی۔ مگر اسی طرح دونوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا تو بھی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ دونوں کے سپرد اگر ایک ہی کام نہ کیا گیا تو کاموں میں ٹکراؤ اور دوہراؤ (over lapping) واقع ہوگا۔ اور محنت اور سرمائے کی بہت بڑی مقدار ضائع ہوگی۔ ان دونوں (ایس۔ ای۔ او اور بلاک ٹیم کے دوسرے ایکسپرٹوں) کے الگ الگ کام ہونے کے باوجود ان کے درمیان باہمی رشتے کی سب سے اچھی مثال ہائیڈروجن اور آکسیجن سے دی جاسکتی ہے۔ یہ دونوں گیسیں اگرچہ ایک دوسرے سے مقصد اور نوعیت کے اعتبار سے بالکل الگ الگ ہیں لیکن جب تک ایک خاص تناسب سے ان دونوں کا میل نہیں ہوگا، اُس وقت تک پانی وجود میں نہیں آسکتا۔ یہی کیفیت ایکسٹنشن اور سوشل ایجوکیشن کے باہمی رشتے کی ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرکے گاؤں والوں کا سدھار نہیں کیا جا سکتا۔

صحیح راستہ

ہمیں اپنے دیس کو ترقی دینے کے لئے (MAX WEBER) کے تصوری نظریۂ تغیر (IDEOLOGICAL THEORY OF CHANGE) کو اختیار کرنا ہوگا چنانچہ گاندھی جی کا بھی یہی اندازِ فکر تھا۔ وہ کارل مارکس اور دوسرے نظریوں کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مادی ترقی کو بروئے کار لانا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک سماجی ڈھانچے میں تبدیلی نہ آجائے یعنی جب تک لوگ تبدیلی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہو جائیں۔ اُس وقت تک اُس تبدیلی کے وجود پذیر ہونے کی امید کرنا شیخ چلی کے منصوبے مرادف ہے۔ وہ اس سلسلے میں بڑی جامع اور ناقابلِ انکار مثال دیتا ہے۔ کہتا ہے "یورپ کے کچھ ملکوں مثلاً انگلینڈ اور فرانس میں صنعتی انقلاب بڑی تیزی سے آیا۔ لیکن دوسرے ممالک جیسے اسپین ہے۔ اس کی رفتار بہت سست رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگلینڈ اور فرانس میں پروٹسٹنٹ مذہب رواج پاچکا تھا اور اسپین وغیرہ میں اُس وقت تک کیتھولک مذہب کا غلبہ تھا۔ پروٹسٹنٹ بہت ترقی پسند مذہب تھا اور اُسے مادی دنیا سے نسبتاً زیادہ دلچسپی تھی۔ اس کے برخلاف کیتھولک مذہب کی دلچسپی کا مرکز اُخروی دنیا تھی۔ اور اِس عالمِ فانی میں جنم لینا اُن کے نزدیک پچھلے گناہوں کی سزا تھی لہٰذا یہاں انھیں عبادت و ریاضت کے علاوہ بہت کم کام رہتا تھا۔

بلکہ ملک اگرچہ کمیونسٹوں سے کئی گنا مذہبی ہے تا ہم لوگ اپنے حالات کو بدلنا چاہتے ہیں پیچ بس اتنا ہے کہ اس عمل میں وہ اپنے مخصوص طریقے باقی رکھنا چاہتے ہیں. سوچنے کا یہ طریقہ بے بنیاد بھی نہیں ہے چنانچہ اس بات کو سماجیات کا ایک دوسرا عالم کلارک بھی تسلیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ دنیا بھر کے لوگ وہی چیزاسی شکل میں چاہتے ہوں جس شکل میں ہم انھیں دینا چاہتے ہیں۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ کھانا کھانے کے بہت سے طریقے ہیں۔ لہٰذا یہ محض بے وقوفی ہوگی کہ ہم کسی خاص طبقے کو اپنے آداب اور طریقوں کے مطابق کھانا کھانے پر مجبور کریں۔

حاصل کلام

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم کی ناکامی کے بارے میں یہ جھگڑا اب تک جاری ہے کہ اس کی ذمہ داری بلاک والوں کے اوپر ہے یا گاؤں والوں کے اوپر. میں بہرحال اپنے مطالعے کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خطا نہ بلاک والوں کی ہے اور نہ گاؤں کی خطا ہماری سمجھ کی ہے کہ ہم نے اِس اسکیم کو بغیر سوشل ایجوکیشن کی مدد کے چلانا چاہا ہے۔

بہرحال خوشی کی بات ہے کہ اب مختلف کانفرنسوں میں (خاص طور سے میسور کانفرنس میں) یہ طے پایا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کو اِس اسکیم میں ترجیح دینی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ضرورت ہم نے اب محسوس کرلی ہے کہ معاشی ترقی کے لئے ذہنی تبدیلی کو بروئے کار لانا ضروری ہے. لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم معاشی ترقی کا کام اُس وقت تک کے لئے اٹھا رکھیں جب تک گاؤں والوں کے ذہن بالکل نہ بدل جائیں. ایسا کرنے سے مریض کی حالت تشخیص ہی تشخیص میں خراب سے خراب تر ہو جائے گی۔ اس لئے اس کی جگہ ہمیں (OGBURN) کا بتایا ہوا نسخہ استعمال کرنا چاہیئے. جو یہ ہے کہ پہلے وہ باتیں اور چیزیں گاؤں والوں تک پہنچانی چاہئیں جس کا ان کے عقائد سے براہِ راست تعلق نہ ہو۔ رہیں دوسری باتیں جو انقلابی نوعیت کی ہیں ان کو ان تک پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کا ذہن بدلا جائے اس طرح کام جلد ہوگا اور اچھا ہوگا مگر یہ کام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک سوشل ایجوکیشن کے صحیح منصب پر ایمان نہ پیدا ہو جائے اور اُسے اُس کا اصلی مقام حاصل نہ ہو جائے۔

نمونے

بستی کی اپنی کوششوں کا پھل

دیسنہ (بہار) کا کتب خانہ

شوق سچا اور دھن پکی ہو تو نہ کوئی فرد یا جماعت حقیر ہے نہ کوئی بڑے سے بڑا کارنامہ ناممکن۔ نیچے کا مضمون جو ایک معمولی سے قصبہ دیسنہ کے کتب خانے کا تعارف ہے، اس حقیقت کی سچی مثال پیش کرتا ہے۔

یہ مضمون ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" علی گڑھ سے ماخوذ ہے جس کے لئے ہم معاصر مذکور کے شکر گذار ہیں۔

——— ایڈیٹر

دیسنہ بہار کی ریاست میں ہزار بارہ سو کی آبادی کا ایک معمولی سا قصبہ ہے جہاں سے قریب ترین ریلوے اسٹیشن بھی سات میل کی دوری پر پڑتا ہے۔ بیسویں صدی کے علوم مشرقی کے مایۂ ناز محقق اور ریسرچ اسکالر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم یہیں کے رہنے والے تھے۔ مولانا مرحوم ہی کی طرح اِس قصبے کے اور بھی بہت سے عالم اور اسکالر پیدا کئے ہیں جن میں سید عبدالحکیم مرحوم بھی تھے۔ جو مولانا شبلی نعمانی کے ساتھیوں میں تھے اور مولانا شبلی نعمانی وہ بزرگ تھے جنھوں نے اپنی تحقیقوں کے ذریعے اپنے زمانے کے علوم مشرقی کے طالب علموں کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ یہی سید عبدالحکیم صاحب دیسنہ لائبریری کے بانی تھے جو ۱۸۹۲ء میں قائم ہوئی تھی۔

دیسنہ لائبریری کا ارتقا کس طرح ہوا، یہ ایک دلچسپ اور سبق آموز کہانی ہے۔ اس کہانی سے پہلے آپ یہ دیکھیں کہ اس کی حیثیت کیا تھی۔ [1]

[1] "حیثیت کیا تھی" اس لئے لکھا گیا کہ اب یہ کتب خانہ دیسنہ سے منتقل ہو کر پٹنے کی "خدا بخش لائبریری" میں "دیسنہ لائبریری سکشن" کے نام سے منتقل ہو گیا ہے۔ م

۱۔ اس کتب خانے میں کتابوں کی تعداد دس ہزار سے اوپر ہے جس میں رسائل کے مجلد فائل شامل نہیں ہیں
۲۔ کتب خانے کی اپنی ایک پختہ اور خوبصورت عمارت تھی۔
۳۔ کتب خانے کے بارے میں ملک کے بڑے بڑے اہل رائے نے نہایت اچھی رائے ظاہر کی ہے۔ مثلاً مولوی عبدالحق نے اُس کا معائنہ کرنے کے بعد فرمایا تھا

"مجھے یہ کتب خانہ دیکھ کر حقیقی مسرت ہوئی۔ اُردو کتب اور رسالوں کا ایسا اچھا اور جامع مجموعہ شاید کہیں اور ہو۔"

اچاریہ کرپلانی نے اُسے دیکھ کر کہا "مجھے حیرت اِس بات پر ہے کہ دیہات میں اتنی بڑی ورنیکولر لائبریری کیسے اکٹھا ہو گئی۔"

ڈاکٹر سید محمود نے اُسے دیکھ کر اعتراف کیا کہ "غالباً اُردو کا یہ بہترین کتب خانہ ہے۔ میں نے اردو کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ کہیں اور نہیں دیکھا۔"

مولانا حفظ الرحمٰن کا بیان ہے کہ "یہ ہندوستان کی مایۂ ناز لائبریری ہے۔"

اتنی بڑی اور ان خصوصیتوں کی حامل لائبریری اور لطف یہ کہ اس کی ابتدا اور ارتقا میں کبھی کسی شکل میں بھی اُسے کسی نواب، کسی رئیس، کسی جاگیردار یا کسی تاجر کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قصبہ دلیسنہ کے لوگ عام طور پر تعلیم یافتہ اور کسی نہ کسی عہدے پر مامور ضرور رہتے اور انھیں علم و ادب کی پیاس تھی۔ سید عبدالحکیم صاحب جو اُس کے بانی تھے، خود بہت بڑے عالم اور ادیب تھے اور چونکہ قصبے کے بزرگوں میں تھے اس لئے اُن کے ہم عمر یا ان کے بعد کی نسل کے لوگ اُن کی عزت کرتے تھے اور اُن کی بات کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ اُن کی ذات کے علاوہ لائبریری کا نہ کبھی کوئی فنڈ رہا نہ بجٹ بنا، نہ کوئی سالانہ گرانٹ تھی اور نہ مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ۔ سید عبدالحکیم صاحب ہی اس کے سکریٹری بھی تھے اور لائبریرین بھی، منیجر بھی تھے اور نگران بھی، کلرک بھی تھے اور چپراسی بھی۔

کتابوں کی فراہمی

جب صورتِ حال یہ ہو کہ لائبریری کو کسی مال دار رئیس یا تاجر کی سرپرستی حاصل نہ ہو، نہ کوئی مستقل ذریعہ آمدنی، تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بڑا ذخیرہ جمع کیسے ہوا۔ یہ بڑی دلچسپ داستان ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ قیمتی سے قیمتی کتاب لائبریری کو کبھی ایک آنے سے زیادہ میں نہیں پڑی۔

سید عبدالحکیم صاحب بڑے جوہر شناس آدمی تھے۔ وہ رسالوں اور اخباروں میں نئی کتابوں کے اشتہار اور ریویو بڑے غور سے پڑھتے تھے اور اس کے علاوہ پبلشروں کی فہرستیں ہمیشہ منگواتے رہتے تھے۔ ان فہرستوں کے علاوہ ان کے پاس ایک تازہ ترین فہرست دلینہ کے ان لوگوں کی بھی رہتی تھی جو ملازمت کے سلسلے میں ملک کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوتے تھے۔

سید صاحب کو جب کبھی کوئی نئی یا نادر کتاب لائبریری کے لئے منگوانی ہوتی تو اس کتاب کے پبلشر یا تاجر کو دو پیسے کا ایک کارڈ لکھ دیا کہ فلاں کتاب فلاں صاحب کے نام وی۔ پی کر دی جائے۔ اسی کارڈ کے ساتھ دوسرا کارڈ جن صاحب کے نام وی۔ پی بھیجا جاتا ہو تو ان کے نام لکھ دیتے کہ "فلاں کتاب کا وی، پی آپ کے نام پہنچے گا۔ وی۔ پی وصول کر لیں اور جب گھر آئیں تو کتاب اپنے ساتھ لیتے آئیں"۔

چھٹیوں کے زمانے میں کتب خانے میں بڑا دلچسپ سماں نظر آتا تھا۔ کوئی بیش کار صاحب فلسفہ کی کتاب بغل میں دبائے چلے آرہے ہیں۔ پولیس کے حولدار صاحب تاریخ اسپین لئے چلے آرہے ہیں، وکیل صاحب تاریخ الاطبا لئے داخل ہو رہے ہیں، ڈاکٹر صاحب "عربوں کا تمدن" پیش کر رہے ہیں۔ ان حضرات سے کتابیں لے کر کتب خانے کی فہرست میں داخل کر لی جاتی تھیں اور کیفیت کے خانے میں یہ الفاظ "عطیہ منجانب . . . . . . فلاں صاحب" لکھ دیئے جاتے تھے۔ یہی تین الفاظ وہ قیمت تھی جو کتب خانے کی طرف سے کتاب کے خریدنے اور کتب خانے تک لانے والے کو ادا کی جاتی تھی۔ مگر یہ بہت بڑی قیمت تھی جسے پا کر لوگ فخر سے پھول جاتے تھے۔

یہی ترکیب جو کتابوں کے معاملے میں اختیار کی جاتی تھی، رسالوں کے معاملے میں بھی برتی جاتی تھی۔ اس کے ایک ہی وقت میں دو فائدے تھے۔ ایک یہ کہ اس کے ذریعے اہلِ دلینہ اردو کی اعلیٰ درجے کی معیاری کتابوں سے متعارف ہو جاتے تھے۔ جو کتب خانے کے قیام کا اولین مقصد تھا اور دوسرے انھیں کتابوں اور رسائل کو ترتیب اور سلیقے کے ساتھ رکھنے کا ذوق بھی پیدا ہو جاتا تھا۔ کتب خانے اور اس کے ذخیرے کی توسیع گویا الجھاؤ میں پڑتی تھی۔

کتابوں کی حفاظت اور جلد بندی

کسی کتب خانے میں محض کتابوں کا جمع ہو جانا کافی نہیں ہوتا، اصل چیز ان کی حفاظت صفائی اور ترتیب ہوتی ہے ورنہ ان کی کاغذ کے ڈھیر سے زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ کام قصبے کے نوجوان طالب علموں نے اپنے ذمے لیا تھا، اور خاص اسی مقصد کے لئے اپنی ایک تنظیم "جمعیۃ الطلباء" کے نام سے بنائی تھی۔

طالب علموں کی اس جوشیلی خدمت کو دیکھ کر "جمعیۃ الطلباء" کے سکریٹری کو کتب خانے کا نائب ناظم تو بنا دیا گیا تھا لیکن چونکہ

بیچارے طالب علموں کے پاس کوئی فنڈ نہیں تھا اس لئے ان کے سامنے یہ مسئلہ ایک سوچتک رکاوٹ بنا رہا کہ وہ اپنے کام کو کس طرح انجام دیں۔ اپنے ہاتھ پیر کی محنت سے جھاڑ پونچھ کا جو کام ہو سکتا تھا، وہ تو یہ کرتے تھے مگر اصل کام یعنی کتابوں کی جلد بندی ایک مدت تک نہ ہو سکی۔

سوچتے سوچتے آخر اُن کی سمجھ میں بھی ایک ترکیب آ گئی۔ دلیسنہ میں شادی کے موقعوں پر دولہا کے بازو پر امام ضامن باندھے جاتے ہیں مگر یہ رسم ضروری اُس وقت سمجھی جاتی ہے جب دولہا کو شادی کے لئے سفر درپیش ہو۔ دلیسنہ میں شادیاں زیادہ تر آپس ہی میں ہوتی ہیں اس لئے "جمعیتہ الطلبا" نے یہ تحریک شروع کی کہ امام ضامن کے تمام روپئے جو رسماً غیر ضروری ہیں اُن کے حوالے کر دیئے جائیں جن سے وہ کتب خانے کی کتابوں کی جلدیں بنوائیں گے۔

اس تحریک میں بڑا زور اور جوش تھا، چنانچہ قصبے کی عورتوں نے جب دیکھا کہ اُن کے بچے ایک نیک کام میں جوش دکھا رہے ہیں تو انھوں نے نہ صرف امام ضامن کے روپئے کھول کھول کر دے دیئے بلکہ اپنے گوٹے کناری والے پرانے کپڑے بھی ان کے حوالے کر دیئے جن کے سونے اور چاندی کے اجزاء کو بیچ کر بھی کچھ رقم اکٹھا ہو گئی اور اس طرح ہزاروں کتابوں کی جلد بندی کا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔

اسی طرح کتب خانے کی دوسری ضرورتیں مثلاً قلم دوات، الماریاں، میز اور کرسیاں، ان کے لئے بھی فنڈ اکٹھا کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ دلیسنہ کے لوگ خود اپنے گھروں سے یہ چیزیں نکال نکال کر کتب خانے کی ضرورتیں پوری کیا کرتے تھے۔

سید عبدالحکیم صاحب کی خدمات کے علاوہ دلیسنہ کے اور بہت سے اہلِ کمال تھے جن کی فیاضی اور علم دوستی کی بدولت کتب خانہ مالامال ہوا۔ ان حضرات میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور مولوی بشیر الحق دلیسنوی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی جو ایک بڑے ریسرچ اسکالر ہیں، جب طالب علم تھے اُس زمانے میں کتب خانے کی خاطر کلکتے کے فٹ پاتھوں پر کباڑیوں کی دکانیں چھانا کرتے تھے۔ اسی چھان بین کے دوران میں انھیں عمر خیام کی رباعیوں کا وہ نادر مجموعہ ہاتھ آ گیا جو مشہور خوشنویس سلطان مشہدی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ نسخہ اور اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی بیسیوں کتابیں پروفیسر صاحب نے حاصل کر کے کتب خانے کی نذر کیں۔

مولوی بشیر الحق دلیسنوی صاحب ہونے کو تو پولیس کے داروغہ تھے اور صرف میٹرک پاس تھے لیکن اردو ادب پر اُن کی نظر اتنی گہری اور محققانہ تھی کہ اردو ادب کے بڑے بڑے عالم اُن کے آگے کتابوں پر تنقید و تبصرہ کرتے ہوئے

گھرانے تھے، اُن کے پاس جتنی کتابیں تھیں، وہ سب کی سب انھوں نے کتب خانے کے حوالے کر دی تھیں چنانچہ لائبریری کے تنقیدی اور تحقیقی سیکشنوں کا بڑا حصہ انہی کی علم دوستی کا رہین منت ہے۔

اُردو شعر و ادب اور تحقیق و ریسرچ کا یہ مایۂ ناز ذخیرہ — جو خالصۃً دیسنہ کی بستی کے لوگوں کے ذوق و شوق اور عزم و ارادے کی لاجواب مثال پیش کرتا ہے — پچھلے سال جولائی میں گورنر بہار (ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب) کے ایما سے دیسنہ سے پٹنے کی خدا بخش لائبریری (اورینٹل پبلک لائبریری) میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جہاں اس کا نام "دیسنہ لائبریری سیکشن" ہوگا۔
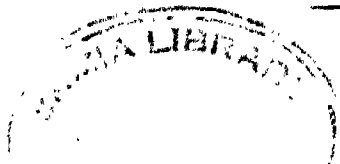
ہر قسم کی تعلیم، سچ پوچھئے تو نام ہے ایک عمل کا جس سے فرد اپنے آپ کو گردوپیش کی دنیا سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلے میں گذرتا ہے۔ مگر چونکہ اس کے گردوپیش کی دنیا مستقل بدلتی رہتی ہے۔ اور چونکہ وہ خود اس تبدیلی کو بروئے کار لانے میں غیر شعوری طور پر دخیل ہوتا ہے، اس لئے اپنی دنیا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے اس عمل میں تسلسل ضروری ہے۔ یہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے جو، بچپن یا زمانۂ ماقبل بلوغت میں ہمیشہ کے لئے پورا ہو جائے۔ یہ راز سمجھ لینے کے بعد یہ بات کہ تعلیم کی ضرورت فرد کو عمر بھر جب تک وہ کام کے لائق رہے، رہتی ہے، پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور اسی کے ساتھ یہ جھگڑا بھی ختم ہو جاتا ہے کہ آیا صحیح تعلیم وہ ہے جس کا منشا فرد کی نشوونما ہوتا ہے یا وہ جس کا منتہائے نظر چند سماجی مقاصد کا حصول ہوتا ہے۔

رابرٹ پی ادس

دہلی میں اڈلٹ اسکول

مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شری مالی نے لوک سبھا میں ایک بیان دیتے ہوئے بتایا کہ دہلی میں ۶۲-۱۹۶۱ء کے دوران پانچ بالغوں کے اسکول کھولے جائیں گے۔

یہ اسکول شام کو چلا کریں گے جن میں پرائمری سے ہائر سیکنڈری کے معیار تک کی باقاعدہ کلاسیں چلائی جائیں گی۔ ہائی اسکول اور ہائر سیکنڈری اسکول کے امتحانوں کی تیاری کے لئے بالغوں کی کوچنگ کلاسیں بھی اس اسکیم کے ماتحت چلائی جائیں گی۔

جولائی کے مہینے سے انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن اپنی نئی عمارت میں ایک عورتوں کا ہائی اسکول کھول رہی ہے یہ اسکول دن میں چلے گا۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ اسکول عورتوں کو سوشل ایجوکیشن اور سوشل ویلفیئر کے کاموں کی طرف متوجہ کرنے میں بھی کامیاب ہو سکے گا۔

شری اے۔آر دیش پانڈے
حکومت ہند کے سوشل ایجوکیشن کے مشیر

مرکزی وزارت تعلیمات نے سوشل ایجوکیشن کے مشیر کی حیثیت سے اس تحریک کے نامور رہنما شری اے۔ آر دیش پانڈے کا تقرر کیا ہے۔ اڈلٹ ایجوکیشن کے حلقوں میں قومی تعمیر کے اس اہم پروگرام کو مرکزی سطح پر نمائندگی دیئے جانے کی ضرورت بہت دنوں سے محسوس کی جا رہی تھی۔ حکومت کے اس فیصلے کا ان حلقوں میں بہت گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا ہے۔

شری اے۔ آر دیش پانڈے نے مختلف حیثیتوں سے ملک میں اڈلٹ اور سوشل ایجوکیشن کے تصور کو واضح کرنے اور اُسے مقبول بنانے میں بہت نمایاں کام انجام دیا ہے۔ موصوف اسی دسمبر تک سوشل ایجوکیشن کے قومی مرکز نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن

سنٹر سے اس کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے وابستہ تھے۔

نوخواندہ بالغوں کی کتابوں کی گشتی نمائش

یونیسکو کے نیشنل کمیشن اور اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے تعاون سے نوخواندہ بالغوں اور نئے پڑھنے والوں کے تعلیمی مواد کی ایک گشتی نمائش ترتیب دی جارہی ہے۔ نمائش میں بین الاقوامی مفاہمت کے موضوع پر مختلف زبانوں کی منتخب کتابیں رکھی جائیں گی، جس میں دوسرے ملکوں کے بارے میں اچھی کتابیں اور چند باہر کے ملکوں کی کتابیں بھی شامل ہوں گی۔

یہ نمائش سب سے پہلے جولائی میں ہونے والی اڈلٹ ایجوکیشن کی بین الاقوامی کانفرنس کے موقع پر نئی دہلی میں ترتیب دی جائے گی۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں یہ نمائش گشت کرے گی ایسوسی ایشن کے ممبر ادارے ملک کے مختلف گوشوں میں نمائش کی ترتیب میں ایسوسی ایشن کو پوری مدد دے رہے ہیں۔

اڈلٹ ایجوکیشن کی بین الاقوامی کانفرنس

دہلی میں

تعلیم پیشہ انجمنوں کے بین الاقوامی وفاق　　　　　　　　کے زیر اہتمام دہلی میں ۲۸ - ۳۰ جولائی اڈلٹ ایجوکیشن کی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔ کانفرنس کا افتتاح مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر کے۔ ایل شریمالی فرمائیں گے۔

کانفرنس میں مختلف ملکوں کے اڈلٹ ایجوکیشن کے جن ماہرین کی شرکت متوقع ہے ان میں　　　(W.C.O.T.P.) اڈلٹ ایجوکیشن کے چیرمین ڈاکٹر روبی کیڈ، جرمن اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے سکریٹری جنرل ہر ڈولفس اور ملیشیا کے اڈلٹ ایجوکیشن بیورو کے صدر مسٹر ایم بی محمد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کے اساتذہ کے بچوں کو اسکالرشپ

حکومت ہند نے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں کے اساتذہ کے بچوں کو ہائی اسکول کے بعد اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے

۔۔ اسکالرشپ دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ اسکیم اس سال سے لاگو ہو رہی ہے۔
اسکالرشپ ہائی اسکول کے امتحان کے نتائج کی بنیاد پر محض ان لڑکوں کو دی جائے گی جنھوں نے ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا ہو یا ۶۰ فی صدی سے زیادہ نمبر حاصل کئے ہوں۔
یہ اسکالرشپ مرکزی اسکیم کے ماتحت دیئے جا رہے ہیں جو تیسرے پنج سالہ پلان میں شامل ہے۔

ٹیلی ویژن کے ذریعہ تعلیم: ایک تجربہ

ٹیلی ویژن عوامی تعلیم کے لئے کس حد تک مددگار ہو سکتا ہے، اس کی جانچ کے لئے آل انڈیا ریڈیو، نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر اور انڈین اڈلٹ ایجوکیشن نے باہم تعاون سے ایک تجرباتی منصوبہ یونیسکو کی امداد سے شروع کیا تھا۔ یہ اسکیم جو ٹیلی ویژن کے ذریعہ سوشل ایجوکیشن کا باقاعدہ پروگرام چلانے اور اس کے ذریعہ عوام کو تعلیم دینے کے امکانات پر غور کرنے سے متعلق ہے، اب فیلڈ کے کاموں کی حد تک مکمل ہو چکی ہے، اور اب اس سلسلے میں جو نتائج اور اعداد و شمار ملے ہیں، ان کی سائنٹیفک طریقے پر جانچ اور تشریح کی جا رہی ہے۔

اس مطالعے میں شہریت کی تعلیم کے پانچ پہلو منتخب کئے گئے اور ہر موضوع پر چار مختلف پروگرام پیش کئے گئے۔ پروگرام کے شروع ہونے سے پہلے اور پروگرام دیکھ لینے کے بعد لوگوں سے ایک تیار شدہ سوال نامے کی بنیاد پر معلومات حاصل کی گئی۔ اس مطالعے کا مقصد یہ پتہ لگانا تھا کہ لوگ متعلقہ موضوع کی معلومات ٹیلی ویژن پروگرام کے ذریعہ کس حد تک حاصل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تقریباً چار سو آدمیوں سے سوالات کئے گئے۔ یہ چار سو آدمی وہ تھے جو ٹیلی ویژن کے پروگراموں پر باقاعدہ مباحثہ کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ چار سو ایسے آدمیوں سے بھی سوالات کئے گئے جنھوں نے یہ پروگرام نہیں دیکھا تھا۔
اس مطالعے کی رپورٹ عن قریب تیار ہو جائے گی۔

تعلیمی کتب رسائل کے ایڈیٹروں کا ورکشاپ

دہلی میں

تعلیمی کتب و رسائل کے ایڈیٹروں کا ایک ورکشاپ ۲۰ تا ۳۱ جولائی ۱۹۶۱ء دہلی کے وگیان بھون میں منعقد ہو رہا ہے۔ یہ ورکشاپ تعلیم پیشہ انجمنوں کے بین الاقوامی وفاق کی کانفرنس کے موقع پر دہلی میں ہو رہی ہے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ سے متعلق تصویروں کا مقابلہ

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی وزارت نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام سے متعلق فوٹوگرافوں کے ایک کل ہند مقابلے کا اعلان کیا ہے۔ اس مقابلے میں شرکت کی کوئی فیس نہیں ہے۔ مقابلے میں شامل ہونے والی تصویریں مندرجہ ذیل پہلوؤں پر یا ان میں سے کسی ایک پر کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے اثرات سے متعلق ہونی چاہئیے۔

زراعت، آب پاشی، سوشل ایجوکیشن، صحت و صفائی، عورتوں اور بچوں کے پروگرام، پنچایت، کوآپریٹو، اسکول اور دیہاتی صنعتیں۔

حکومت نے اس ضمن میں چودہ انعاموں کا اعلان کیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

پہلا انعام	۳۰۰ روپئے
دوسرا انعام	۲۰۰ روپئے
تیسرا انعام	۱۵۰ روپئے
چوتھا انعام	۱۰۰ روپئے
دس انعامات	۵۰ روپئے فی انعام

اس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے سیکشن آفیسر (پبلسٹی) منسٹری آف کمیونٹی ڈیولپمنٹ اینڈ کوآپریشن۔ کرشی بھون نئی دہلی کے پتے پر خط و کتابت کریں۔

(بقیہ تنقید و تبصرہ صفحہ ۱۳) اور دیہی سماجیات کے ایک سروے کی رپورٹ ہے جو دہلی کے دو منتخب گاؤں میں ۵۴-۱۹۵۳ء میں کیا گیا تھا۔ سروے آراضی کے رقبے اور تقسیم کے متعلق ہے۔ جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ کھیتوں کا رقبہ اب بھی چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ سروے میں بتایا گیا ہے کہ دلی شہر کے قریب ہونے کا اثر یہ تو ضرور ہوا ہے کہ سبزی کی کاشت اور دودھ کی پیداوار کا کام کرنے والوں کی آمدنی بہت بڑی حد تک بڑھ گئی ہے مگر آراضی کے رقبے اور تقسیم پر اس کا مفید اثر نہیں پڑا ہے۔ اس جائزے سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ اُسی وقت زیادہ مفید ہوں گے جب کچھ ایسے گاؤں کا بھی سروے کیا جائے جو دلی یا کسی دوسرے بڑے شہر سے دور ہوں۔ دونوں جائزوں کے مقابلے سے ہی ہم گاؤں کی زندگی پر شہری زندگی کے مضر اور مفید اثرات کا صحیح صحیح اندازہ کر سکیں گے۔

تنقید و تبصرہ

رورل کریڈٹ اینڈ کوآپریشن ان دی جامعہ ڈیولپمنٹ سرکل۔ (دسمبر ۱۹۶۹ء)

مصنف:۔ کے۔ یو۔ خان ایم۔ اے، بی۔ کام، ایل۔ ایل۔ بی۔ ناشر: دی جامعہ انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچرل اکنامکس اینڈ رورل سوشیالوجی۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ قیمت ۲ روپئے ۵۰ نئے پیسے

کتاب میں دلی متھرا روڈ اور جنگلی کے درمیان واقع ۱۵ گاؤں میں کوآپریٹو تحریک اور قرضے کی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی بنیاد پر کچھ ایسے نتائج اخذ کئے گئے ہیں جو کوآپریٹو تحریک کو اپنا اصل منصب پورا کرنے میں ۔۔ یعنی اقتصادی ترقی میں مددگار بننے کے کام میں ۔۔ مددگار ہو سکتے ہیں۔

یہ جائزہ دلی شہر کے قریب ترین گاؤں میں کیا گیا ہے، ظاہر ہے ان گاؤں پر دلی کے بڑھتے ہوئے شہری اور صنعتی ترقی کے اثرات بہت تیزی سے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ گاؤں کے اقتصادی ڈھانچہ میں ادھر چند سال میں بہت اہم تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ زمین کی قیمتیں ایک دم چڑھ گئی ہیں، اور شہر کو چیزیں سپلائی کرنے کے سلسلے میں بہت سے کام کوآپریٹو طریقے پر شروع کرنے کے مواقع پیدا ہوئے ہیں، مگر اس کے باوجود لوگ اس طرف متوجہ نہیں ہیں۔ کوآپریٹو سوسائٹیوں کے ماتحت قرض وغیرہ دینے کی شرائط ایسی ہیں کہ لوگ ان سہولتوں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھاپاتے ہیں اور بنیوں اور مہاجنوں سے زیادہ سود پر قرض لینے کا آج بھی اس علاقے میں رواج ہے۔

رپورٹ میں قرض دینے کے قاعدوں اور طریقوں میں تبدیلی کرنے کے سلسلے میں کچھ مفید مشورے بھی شامل ہیں اور اعداد و شمار کی بنیاد پر یہ بات ثابت کر دی گئی ہے کہ اگر اقتصادی ترقی کے پروگرام ٹھیک ڈھنگ سے چلائے جائیں تو خود گاؤں کے اندر سے ان کے لئے کافی وسائل فراہم ہو سکتے ہیں۔

کوآپریٹو تحریک اس علاقے میں (اور سارے ملک میں بھی) کیوں نہیں مقبول ہے، اس سلسلے میں کوآپریٹو سوسائٹی کے ممبروں اور غیر ممبروں اور محکمے کے کارکنوں سے ایک سوالنامے کی بنیاد پر معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ ۱۷۰ خاندانوں میں سے ۴۴ خاندان نے کوآپریٹو سوسائٹی کا ممبر نہ بننے کی وجہ اپنی اقتصادی خود کفالت بتائی اور ایک چوتھائی لوگوں نے اپنی غریبی کا شکوہ کیا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ ذاتوں کی تفریق کی وجہ سے وہ سوسائٹی کے ممبر نہیں بن سکے۔ ان اعداد و شمار کی بنیاد پر کوآپریٹو تحریک کو مقبول اور کامیاب بنانے کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کوآپریٹو تحریک کی بدنامی کی ایک وجہ گاؤں کی موجودہ لیڈرشپ کو بھی بتایا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں پروفیسر محمد عاقل صاحب کا پیش لفظ کوآپریٹو تحریک اور دیہی قرضے سے متعلق ملک کی موجودہ صورت حال پر ایک بہت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ سائز اینڈ ڈسٹری بیوشن آف ہولڈنگ ان ٹو ولیجز

مصنف: ایم۔ سلطان ایم۔ اے ۔۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ کے ادارہ زرعی معاشیات (باقی صفحہ ۲۱ پر)

دو طرح کے کام

(پچھلے پرچے سے ملا کر پڑھئے)

آدمی کے کام دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ کام جو خود اپنی محنت اور سوجھ بوجھ سے کیا جاتا ہے۔ اِس کام میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا بلکہ اگر کوئی شریک ہونا بھی چاہے تو ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ ہم کہہ دیتے ہیں "بھائی صاحب! آپ کو کسی کے نجی معاملے میں بولنے کا کیا حق ہے؟" یہ کام اپنے گھر کے نجی کام کہلاتے ہیں؛ جیسے اپنی کھیتی باڑی، بنج بیوپار، گھر کا رکھ رکھاؤ، بال بچوں کی پرورش اور اسی طرح کے دوسرے کام۔ یہ کام ایسے ہیں جنھیں آدمی اپنے خاندان والوں کی مدد سے اکیلا کر سکتا ہے۔

دوسرے وہ کام ہیں جنھیں آدمی اکیلا نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے بہت سے لوگوں کو مل کر زور لگانا پڑتا ہے۔ جیسے کھیتی باڑی کا کام ہے۔ جہاں تک اناج یا دوسری چیزیں پیدا کرنے کی بات ہے، یا گائیں بھینسیں پال کر دودھ پیدا کرنے کا معاملہ ہے، یہ کام آپ اپنی محنت سے کر سکتے ہیں۔ لیکن جب اناج کو بیچنے کا معاملہ آئے گا یا دودھ سے مکھن، گھی، پنیر بنانے کی بات آئے گی تب آپ دیکھیں گے کہ آپ یہ کام اکیلے نہیں کر سکتے۔ اناج آپ خود بیچنا چاہیں گے تو اس میں دس بکھیڑے آئیں گے۔ بازار کا بھاؤ نہیں معلوم ہے۔ ہو سکتا ہے مال سستا بک جائے اور گھاٹا پڑے۔ پھر یہاں تو

منڈی لے جانے میں وقت لگے گا۔ نہ جانے منڈی میں کتنی دیر رہنا پڑے گھر پر کام کا حرج الگ، مال گودام کا کرایہ الگ اور اپنے رہنے اور کھانے پینے کا خرچ الگ۔ اب اگر مال کو اپنے گھر ہی پر رکھ کر بیچنے کی بات سوچیں تو وہی ہو گا جو اب تک ہوتا آیا ہے۔ مہاجن اور ساہوکار جھوٹ سچ بازار بھاؤ بتا کر مال سستے داموں خریدیں گے اور تول میں کاریگری کی الگ کریں گے اور اوپر سے یہ بھی کریں گے کہ پورے دام نہیں دیں گے کچھ اُدھار کر والیں گے۔ بات وہی ہوئی کہ مال بیچنے کا معاملہ اکیلے ایک آدمی کے بس کا کام نہیں ہوتا۔ اس کے لئے گاؤں یا بستی کے سب لوگوں کو مل کر کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کام کے کرنے کا طریقہ بھی نکل آیا ہے جس کو سہکار سوسائٹی کہتے ہیں۔

اسی طرح دودھ پیدا کرنے کی بات ہے۔ دودھ تو آپ جتنا چاہیں پیدا کر لیں۔ لیکن چاہے دودھ کو بیچنا ہو تب، یا اس کا گھی مکھن بنانا ہو تب دونوں حالت میں بہت سے لوگوں کو مل کر کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھی مکھن اور پنیر بنانے کے لئے ہزاروں روپے کی مشین لگا کر ڈیری قائم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے؛ اکیلا آدمی تو اتنے روپئے لگا کر ڈیری کھڑی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے بھی سب لوگوں یا پندرہ بیس آدمیوں کو مل کر سہکار سوسائٹی بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

گھر کے رکھ رکھاؤ اور صفائی ستھرائی کا معاملہ ہے۔ اپنے گھر سے گندے پانی نکالنے کے لئے تو خود محنت کر کے یا پیسے لگا کر نالیاں بنا دیں یہ کام آپ اکیلے کر سکتے ہیں اور کر بھی لیا۔ لیکن کیا اتنے ہی کام سے صفائی کا انعام، جسے اچھی صحت اور اصلی خوشی کہتے ہیں آپ کو مل سکتا ہے؟ جب تک پورے گاؤں کے گھروں کی نالیوں کو ایک میں ملا کر گاؤں بھر کے گندے پانی کو کہیں باہر نہ گرایا جائے گا یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ کام کوئی ایک آدمی اکیلا نہیں کر سکتا۔ سارے گاؤں کو مل کر محنت اور کچھ رقم اکٹھی کرنی پڑے گی تب جا کر یہ کام ہو پائے گا۔

کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جو مل جُل کر ہی کرنے کے ہوتے ہیں۔ اکیلے کرنے کے ہوتے ہی نہیں۔ آپ

کام سے تھک کر گھر آئے ہیں۔ جی چاہتا ہے ہنس بول کر، گا بجا کر، گپ شپ کر کے دل ہلکا کریں۔ لیکن آپ اکیلے نہ ہنس بول سکتے ہیں، نہ گا بجا سکتے ہیں نہ گپ شپ کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے اپنے میل کے لوگوں کے جمع ہونے کی۔

یہی حال لکھنے پڑھنے کے شوق کا ہے۔ آپ کو ضرورت ہوئی یا دل میں شوق پیدا ہوا کہ کچھ لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہیئے یا دیس بدیس کا حال معلوم کرنا چاہیئے۔ یہ ضرورت آپ اکیلے پوری نہیں کر سکتے۔ اگر ان پڑھ ہیں تو پڑھنا لکھنا سیکھنے کے لئے اکیلے اُستاد نہیں رکھ سکتے۔ اگر کچھ پڑھے لکھے ہیں تو ابھی اتنا پیسہ کہاں کہ اکیلے اخبار منگوائیں یا کتابیں خریدیں۔ گاؤں یا بستی کے یا بستی کے ایک محلے کے لوگ آپس میں ملیں کچھ رقم اکھٹی کریں اور شوق بھی پورا ہو تو لکھنا پڑھنا سیکھنے کا شوق بھی پورا ہو سکتا ہے اور اخبار اور کتابیں بھی اکٹھی ہو سکتی ہیں۔

بچوں کے پالنے پوسنے کا معاملہ ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے بچے تو ایک چھوڑ کئی کئی ہیں۔ لیکن وہ انھیں اچھے ڈھنگ سے پالنے پوسنے کا طریقہ نہیں جانتے جس سے کہ بچے بڑے ہو کر تندرست اور اچھے انسان بن سکیں۔ کتابوں میں یہ طریقے لکھے ہیں لیکن پہلے تو پڑھنا ہی نہیں آتا، اور اگر تھوڑا بہت پڑھنا آتا بھی ہے تو اوّل تو پڑھنے کی فرصت نہیں ہوتی دوسرے اس فن پر سہل زبان میں لکھی ہوئی کتابیں نہیں ہیں۔ ایسی حالت میں ایک ہی ترکیب سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ کوئی اس فن کا جان کار سطے جو لیکچر کے ذریعے یہ فن سمجھا دے۔ پر ایک اکیلے آدمی کے لئے تو کوئی جان کار لیکچر دینے نہیں آئے گا! اور پھر ایک لیکچر میں پوری بات آ بھی نہیں سکتی۔ کئی لیکچر ہوں اور پوچھ گچھ کے ذریعے بات کو سمجھنے کے لئے جم کر بیٹھک ہو تو کام چلے۔

ایسے کام جو مل جُل کر ہی کرنے کے ہوتے ہیں، اکیلے کرنے کے ہوتے ہی نہیں، آدمی کی زندگی کو سنوارنے کے لئے بہت ضروری ہوتے ہیں لیکن ایسے کاموں کو مِل جُل کر کرنے کا ڈھنگ کیا ہے؟

مال کو بیچنے اور دودھ سے گھی، مکھن، پنیر بنانے کی غرض سے ڈیری قائم کرنے کا طریقہ تو معلوم ہے کہ سہکار سوسائٹی بنائی جائے۔ ایسے کاموں کے لئے جن میں خرچ ہی خرچ ہوتا ہے، کیا کرنا چاہئے؟ یہ کام ایسے بھی نہیں ہیں کہ ایک بار مل جل لئے پھر ملنے جلنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سدا قائم رہنے والے کام ہیں۔ اس لئے انھیں پورا کرنے کا ڈھنگ بھی ایسا ہونا چاہئے کہ ہمیشہ بلکہ روز روز کے روز آپس میں ملنے جلنے کا موقع رہے۔ اس کے لئے گاؤں یا بستی یا محلے کے لوگوں کو مل کر گاؤں سمیتی یا بستی مرکز یا محلہ ایسوسی ایشن بنانا چاہئے۔

آپ سوچیں گے گاؤں گاؤں پنچایتیں تو ہیں ہی، پھر گاؤں سمیتی بنانے کی کیا ضرورت! لیکن گرام پنچایت سرکاری سمیتی ہے۔ آپ کی گرام سمیتی اور گرام پنچایت میں ایسا ہی فرق ہے جیسا کانگریس کمیٹی اور پارلیمنٹ (یا لوک سبھا) میں فرق ہے۔ گرام پنچایت آپ کی گاؤں سمیتی کی مدد کر سکتی ہے اور اگر گاؤں سمیتی زندہ اور طاقت ور سنستھا ہے تو گرام پنچایت اگر غلط کام کرے تو اس کے کان بھی اینٹھ سکتی ہے۔

(اب اگلے پرچے میں دیکھئے)

آپ کا بچہ

بچوں کی پرورش میں معلومات کی ضرورت

ہمارے یہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچوں کی اچھی پرورش کے لئے جس طرح کی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے وہ ماں باپ کو قدرتی طور پر یا رسم و رواج کے ذریعے ملتی ہے اور الگ سے

اس معاملے میں کسی علم کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی ناسمجھی کی وجہ سے ہمارے یہاں بچوں کی موتیں بالغوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہیں۔ ہیضہ، خسرہ اور اسی طرح کی دوسری بیماریوں میں ہمارے بچے آئے دن گھرے رہتے ہیں اور ان بیماریوں سے انھیں بچانے کے لئے ہم زیادہ تر جھاڑ پھونک اور جادو ٹونے کا سہارا لیتے ہیں۔

لیکن اگر خدا کے فضل و کرم سے بچہ کسی طرح دودھ پینے کا زمانہ مر پیٹ کر گذار بھی لے گیا اور گھٹنیوں یا پاؤں پاؤں چلنے کی عمر کو پہنچ گیا تو اس وقت ہم ناسمجھی سے کچھ ایسا سمجھ لیتے ہیں کہ وہ سمجھ دار ہو گیا اور اب اس کی طرف کسی قسم کی توجہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہی زمانہ زیادہ نازک ہوتا ہے اور بچے کی زندگی کے اچھے یا برے راستے پر پڑنے کا دارومدار اسی زمانے میں ماں باپ کی سمجھ داری یا بھول چوک کے اوپر ہوتا ہے۔

ادھر کچھ عرصے سے بچوں کی پیدائش کے معاملے میں کچھ بہتری ہوئی ہے۔ جیسے پیدائش کے وقت کی صفائی، جگہ جگہ جان کار دائیوں کا مل جانا، ماں اور بچہ پانچ چھ دن تک جس جگہ رہتے ہیں یعنی زچہ خانہ، اس جگہ کا صاف، روشن اور ہوا دار رہنا، ماں اور بچے کے بستر اور کپڑے کی صفائی، ان باتوں میں اب وہ پرانے اور گندے سندے طریقے نہیں برتے جاتے جن کی بدولت ماں اور بچہ دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی تھی۔ یہاں تک تو بہتری ہوئی ہے لیکن پیدائش کے بعد اگلے چار چھ سال کی مدت میں بچے کی پرورش کے بارے میں کیا ہونا چاہئے، یہ بات، ان پڑھ تو ان پڑھ ہیں، پڑھے لکھے لوگ بھی اچھی طرح نہیں جانتے۔ سمجھنے کے لئے دو تین مثالیں لے لیجئے۔

بچوں کا جھوٹ بولنا

ایک بچہ ایک بات کو کہتا ہے "میں نے نہیں کیا" حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اس نے کیا ہے۔ اس حالت میں ہمیں اس کے ساتھ کیسے پیش آنا چاہیے؟ کیا اُسے سخت سزا دینا چاہئے یا کہنا چاہئے "میاں جھوٹ بولنا بری بات ہے"!

اور اگر ہم یہ نہ کریں تو کیا وہ سدا جھوٹ ہی بولتا رہے گا؟ وہ جھوٹ کیوں بولتا ہے؟

بچّوں کے سوال جب بابر اور منّی اس طرح کے سوال پوچھیں کہ "ابّا بچے کہاں سے آتے ہیں" تو ہمیں کیا جواب دینا چاہیئے؟ اس طرح کے سوالوں کو ٹال جانا چاہیے یا جھوٹ موٹ کے قصے گھڑ کر اُن کو خاموش کر دینا چاہیئے؟ یا اپنے ڈھنگ کے مطابق صاف اور صحیح جواب دے دینا چاہیئے؟ اور کیا یہ جواب پا کر اُن کی تسلّی ہو جائے گی اور وہ پھر کچھ اور نہ سوچیں یا پوچھیں گے؟

دانت کاٹنا تین چار سال کا ایک بچہ کسی نہ کسی وقت اپنے ساتھ کے کھیلنے والے بچے یا اپنی ماں کو غصے یا پیار میں کاٹ کھاتا ہے۔ مائیں اس بات پر بہت چونکتی اور پریشان ہوتی ہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ بچہ کاٹتا کیوں ہے؟ ہمیں اِس معاملے میں کیا کرنا چاہیئے؟

چمچے یا کھلونے کا بار بار گرا دینا سال بھر کا ایک بچہ اپنے چمچے یا کھلونے کو بار بار نیچے گرا دیتا ہے تاکہ ماں یا دائی اٹھا اٹھا کر اُسے دیتی جائے۔ عام طور پر اس کی اس حرکت سے ہم بہت جلد تھک جاتے ہیں اور اُسے ڈانٹ دیتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ بچہ یہ حرکت کیوں کرتا ہے؟ کیا یہ نری شرارت ہے جسے بند کرنے کی ضرورت ہے یا اُس کی باڑھ کے لئے اس حرکت کا کچھ مطلب ہوتا ہے؟

ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟

یہ چند باتیں سمجھنے کے لئے نمونے کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح کی سینکڑوں باتیں روزانہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ بات صاف ہے کہ جب ہم سمجھ لیں کہ بچوں کی حرکت کے پیچھے اس کے دل میں کیا مقصد ہوتا ہے اور جان لیں کہ اس حرکت پر ہم جو کچھ کریں گے اس کا ان کے اوپر کیا اثر ہوگا اُسی وقت ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا اور کیا کہنا چاہیئے۔

لیکن ہم اپنی روزانہ کی زندگی میں یہ سب سوچ بچار نہیں کر سکتے۔ موقع آن پڑنے پر ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے کتابیں پڑھتے پھریں یا سوچ بچار میں ڈوب جائیں۔ اس لئے اچھا یہ ہے کہ اگر بچے کی کسی حرکت پر سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کرنا چاہئے تو بس چپ ہو رہیں۔ کیونکہ کسی بات پر چپ ہو رہنا ہر وقت کی دانا کل کل کرتے رہنے سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ مگر اپنے طور پر پڑھتے اور سوچ بچار برابر کرتے رہنا چاہئے تاکہ بچوں کی حرکتوں پر فوراً ٹھیک کارروائی کرنا ہماری عادت بن جائے۔

بچوں کی پرورش ایک باقاعدہ فن ہے اور ماں یا باپ بننے کی ایک ضروری شرط یہ ہے کہ لکیر کا فقیر نہ بنا جائے بلکہ بچے کے پلنے بڑھنے کے طریقوں کی جانکاری حاصل کر لی جائے اور یہ فیصلہ کرنا سیکھ لیا جائے کہ کیسا بچہ ہے، کس طرح کا موقع ہے اور اس حالت میں کیا کارروائی کرنا چاہئے کہ اس سے بچے کی باڑھ میں فرق نہ آئے۔　　　　　　　　(اب اگلے پرچے میں)

پنج سالہ یوجنا

سب کا بھلا

اب آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ پیسہ پیسے کو کس طرح کھینچتا ہے۔ یہاں مجھے ایک بے وقوف کی کہانی یاد آرہی ہے۔ آپ بھی سنئے۔ ایک بے وقوف آدمی تھا۔ اس نے بڑے بوڑھوں سے یہ مثل سُن رکھی تھی کہ پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے۔ اس کی جیب میں ایک روپیہ پڑا تھا۔ ایک دن وہ کسی کام سے

مہاجن کے یہاں گیا۔ اُس نے دیکھا اُس کی گدّی کے پاس بہت سے روپئے بکھرے پڑے ہیں۔
اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اُس نے سوچا اِن روپیوں کو کسی طرح اپنے پاس کھینچنا چاہیئے۔ اُس نے
جیب سے روپیہ نکالا اور اُسے چپکے سے مہاجن کے روپیوں کی ڈھیری کے پاس پھینک دیا۔ اُسے یقین
تھا کہ اُس کا روپیہ مہاجن کے روپیوں کو ضرور کھینچ لائے گا۔ وہ چُپ کر بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ پر
اُس کا روپیہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ اب تو وہ گھبرایا۔ اُسے اُلٹا اپنے روپئے کی فکر ہونے
لگی۔ مہاجن کے سامنے آکر بہت گڑگڑایا کہ جو روپیہ اُس نے مہاجن کے روپیوں کے پاس پھینکا اُسے
واپس دیدے۔ مہاجن کو اس طرح چپکے سے روپیہ پھینکنے کی بات کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔ بے وقوف
نے اپنی کہانی اور روپئے کو روپئے سے کھینچنے والی بات بتائی۔ مہاجن اس پر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا
تمھاری یہ مثل بالکل صحیح ہے۔ اِسی لئے تو میرے روپیوں نے تمھاری جیب کے روپئے کو کھینچ لیا۔ اب تو
بے وقوف بہت سٹپٹایا۔ وہ اپنی نادانی پر بہت دیر تک پچھتاتا رہا۔

خیر یہ تو ایک بے وقوف کی کہانی تھی۔ پیسہ کوئی اس طرح پھینکتا نہیں ہے۔ مگر اس کہانی میں ایک
سچائی بھی ہے۔ بے وقوف کی جیب میں صرف ایک روپیہ تھا اور مہاجن کی ڈھیری میں سینکڑوں روپئے
تھے۔ اگر بے وقوف کی جیب میں بہت سارے روپئے ہوتے تو وہ ادھر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ اصلیت
یہ ہے کہ کم پیسوں والوں کو چھوٹی چھوٹی رقم زیادہ پیسے والوں کے پاس کسی نہ کسی بہانے کھنچ کھنچ کر جاتی رہتی
ہے۔ اسی سے امیر زیادہ امیر ہو جاتے ہیں اور غریب پہلے سے زیادہ غریب۔ جس طرح پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے
اسی طرح غریبی اور زیادہ غریبی کو جنم دیتی ہے۔ یہ ایک موٹی سی بات ہے۔ آپ اسے پہلے بھی سمجھ چکے ہیں۔
جس کی آمدنی زیادہ ہوگی وہ بچت بھی زیادہ کرے گا۔ جو بچت زیادہ کرے گا اس کے پاس پونجی بھی زیادہ
ہوگی۔ جس کے پاس پونجی زیادہ ہوگی وہ اُپج بھی زیادہ کرے گا۔ زیادہ اُپج سے اور زیادہ آمدنی بڑھے گی۔
اس طرح آمدنی کے بڑھتے رہنے کا یہ چکّر سیدھے منہ کو چلے گا۔ غریبوں کے جیون میں یہ چکّر اُلٹا چلتا ہے۔

جتنا کمایا اس سے زیادہ کھا لیا۔ قرض دار ہو گئے۔ فاقوں کی نوبت کو پہنچ گئے۔ حالت بگڑی تو بس بگڑتی چلی گئی۔ ایک ایک خاندان اور ایک ایک آدمی کے جیون میں یہ باتیں دکھائی دیتی ہیں یہی بات سارے دیش کے جیون میں بھی گھٹتی ہے۔

کنبے میں ہم سارے پرانیوں کا دھیان رکھتے ہیں۔ ایک دو آدمی کماتے ہیں، سب کھاتے ہیں۔ سب لوگ کم بڑھ ایک ہی طرح کا جیون بتاتے ہیں۔ کہنے کو تو ہمارا دیش بھی ایک بڑا [illegible] ہے جس میں ۴۴ کروڑ آدمی رہتے ہیں۔ مگر یہ عجیب و غریب کنبہ ہے۔ اس میں کتنے ہی پرانی [illegible] ہیں کتنوں کو ایک وقت روٹی کا بھی مشکل سے سہارا ہے۔ بہت سے روکھی سوکھی پر کسی طرح گذارہ کر رہے ہیں بہتوں کو دونوں وقت کی روٹی مل جاتی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو اچھا کھانا کھاتے ہیں، اچھے کپڑے پہنتے ہیں اور اچھے مکانوں میں رہتے ہیں۔ کچھ [illegible] گھومنے کے لئے موٹریں ہیں۔ باقی [illegible] ہیں جو تیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، کتنے ایسے ہیں جو [illegible] میدانوں میں بھی ننگے پاؤں گھومتے ہیں کسی کے پاس بڑی بڑی ملیں اور کل کارخانے ہیں۔ کوئی اتنا غریب کہ کام کرنے کے لئے معمولی معمولی اوزاروں کا بھی محتاج۔ کچھ ہیں جن کے پاس زمین اور کھیت ہیں۔ کچھ دوسرے ہیں جو دوسروں کے کھیتوں پر مزدوری کرتے ہیں۔ ان کے پاس دھرتی کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہیں ہے۔

آپ یوجنا کے بارے میں پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ہمارے یہاں دیش کو غریبی کے چکر سے نکالنے کے لئے پچھلے دس سال سے یوجنا چل رہی ہے۔ ان یوجناؤں کا مقصد دیش کو ہر حیثیت سے اونچا اٹھانا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہمارے دیش کے رہنے والے غریب ہیں۔ اسی لئے ہمارا دیش بھی غریب ہے۔ یوجنا دیش کو غریبی کے چکر سے اسی وقت نکال سکتی ہے جب دیش میں اپج بڑھے۔ دیش کے رہنے والوں کی آمدنی بڑھے۔ انہیں سکھ اور چین ملے۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے اور غریبی اور زیادہ غریبی کو جنم دیتی ہے۔ یوجنا ہی

اس بات پر بہت دھیان دیا گیا ہے۔ اس میں ایسے اپائے سوچے گئے ہیں کہ دیس میں دھن کے بڑھنے سے ساتھ ساتھ امیر اور غریب کا فرق بھی کم ہوتا جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو امیر اور زیادہ امیر ہوتے جائیں گے اور غریب اور زیادہ غریب۔ آپ جانتے ہیں غریب ہی اس ملک میں زیادہ رہتے ہیں۔ دیس اسی وقت اونچا اٹھ سکتا ہے جب ان غریبوں کا جیون اونچا اٹھے۔ یوجنا کا دوسرا خاص مقصد غریبوں کے جیون کو اونچا اٹھانا بھی ہے۔ ہمارے ملک کی ضرورت بس یہی نہیں ہے کہ دیس میں دھن دولت بڑھے۔ دھن کا بڑھنا تو ہر طرح سے ضروری ہے۔ پر اس بڑھتے ہوئے دھن دولت سے سب کو فائدہ پہنچانا بھی ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ جس دیس کو ہم ایک بڑا کنبہ کہتے ہیں، اس کے کچھ پرانی سکھ چین کا جیون گذاریں اور کچھ دانے دانے کو محتاج رہیں۔

ہماری یوجنا کی یہی دو خاص باتیں ہیں۔ ایک تو دیش کی ترقی ہو۔ دوسرے اس ترقی سے سب کا بھلا ہو۔

اس کے لئے یوجنا میں اس طرح کے کام سوچے گئے ہیں جن سے عام آدمیوں کی آمدنی بڑھے۔ سرکار لوگوں سے آمدنی کا کچھ حصہ ٹیکس کے روپ میں لے رہی ہے۔ جن کی آمدنی جتنی زیادہ ہے ان سے ٹیکس بھی زیادہ لئے جا رہے ہیں۔ سرکار ان پیسوں کو سب کے بھلے کے کاموں پر لگا رہی ہے۔ نہریں بنا رہی ہے۔ جس سے کسان کے کھیتوں کو پانی ملے۔ اس کی پیداوار بڑھے۔ نئے نئے کارخانے کھول رہی ہے، جس سے لوگوں کو کام ملے اسکول کھول رہی ہے جس سے بچوں کو شکشا ملے۔ وہ نئے نئے کاموں کو کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس طرح سماج کا جو نچلا طبقہ ہے وہ اوپر اٹھے اور وہ دیش کی تعمیر میں اور زیادہ لگن سے حصہ لے۔

ہماری یوجنا کا مقصد ہے سب کا بھلا۔ سب کے بھلے میں ہی دیس کا بھلا ہے

ادارۂ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر، نئی دہلی

July 1961

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

جولائی ۱۹۶۱ء

جلد ۱۲ — شمارہ ۷

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر:-

پروفیسر محمد مجیب

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر:

ماہنامہ تعلیم و ترقی - جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵

قیمت:-

سالانہ چار روپے　　فی پرچہ، ۳ نئے [illegible]

ٹیلیفون:- ۷۴۴۶۴

ترتیب

اشارات

تجربے اور منصوبے

نمونے

ایک مسئلہ حل کیجئے

نئے پڑھنے والوں کے لئے

پرنٹر پبلشر برکت علی فراق نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

پنچایتیں اور سوشل ایجوکیشن

ہندوستان میں پنچایتوں کی شکل میں مقامی خود مختاری (لوکل سیلف گورنمنٹ) کا چلن بہت قدیم اور کامیاب تھا، اور ہونا یہ چاہئے تھا کہ جب ملک آزاد ہوا اُسی وقت سے اس قدیم سنستھا کو نئے حالات سے ہم آہنگ کر کے فروغ دیا جاتا۔ اُس وقت یہ کام نہیں ہوا اور اس کے برخلاف انگریزوں کے زمانے میں ضلعوں کی سطح پر لوکل سیلف گورنمنٹ کا جو رواج تھا اُسے بھی یا تو ختم کر دیا گیا یا بالکل بے اثر بنا دیا گیا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ کچھ عرصے کے بعد بلونت رائے مہتہ کمیٹی کے سُجھاؤ پر اِس اصول کو مان لیا گیا اور آہستہ آہستہ اس کے اوپر عمل درآمد بھی کیا جا رہا ہے۔ یہ ملک کی ترقی کے لئے بڑا نیک شگون ہے۔

جمہوری لامرکزیت (ڈیماکریٹک ڈی سنٹرلائیزیشن) کے اس اصول کو عملی جامہ سب سے پہلے راجستھان کی حکومت نے پہنایا، اُس کے ساتھ ہی ساتھ آندھرا میں اس پر جزوی طور پر عمل کیا گیا اور اب دوسری ریاستیں بھی بتدریج اس پر عمل شروع کر رہی ہیں۔ ابھی حال میں یوپی میں بھی اس طرف توجہ کی گئی ہے۔ گرام پنچایتوں کے اختیارات میں توسیع کی گئی ہے اور بلاک کی سطح پر تمام گرام پنچایتوں کے سبھاپتیوں کی ایک بلاک دکاس سمیتی کی تشکیل کر کے بڑی حد تک اُسے ڈیولپمنٹ کے کاموں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر کو اس دکاس سمیتی کا سکریٹری بنایا گیا ہے اور سمیتی کے فیصلوں کا بڑی حد تک اُسے پابند قرار دیا گیا ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو اگرچہ اس دکاس سمیتی کو وہ کے اختیارات تو حاصل نہیں ہوئے ہیں جو راجستھان کی پنچایت سمیتیوں کو حاصل ہیں لیکن پھر بھی قافلہ اُسی منزل کی طرف جا رہا ہے اور دیر یا بدیر وہاں تک پہنچ جائے گا۔

پنچایتوں کی تربیت کی ضرورت

مقامی اداروں کو مقامی حکومت کا کام کاج سونپنا اگرچہ صحیح جمہوریت کا تقاضا ہے لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں کے لوگ ایک طویل مدت تک محکوم رہنے کی وجہ سے ذمے داری اور سماجی فرائض کے احساس سے عاری ہو گئے ہوں اور اسی کے ساتھ تعلیم سے بھی یکسر محروم ہوں یہ قدم خطرناک اور مہلک بھی ہو سکتا ہے۔ مغرب کے ملکوں میں جمہوری لامرکزیت کا چلن جو کامیاب ہے تو وہ اس وجہ سے کامیاب ہے کہ وہاں خود جمہوری طرزِ حکومت ارتقا کے پورے عمل سے گذر چکا ہے، تعلیم عالمگیر ہے اور وہ شخص بھی جو کم سے کم تعلیم یافتہ ہے چودہ سال کی عمر تک ضرور تعلیم پا چکا ہے اور جو کچھ کمی رہ گئی تھی اُسے بھی اڈلٹ ایجوکیشن کے توسط سے پورا کر چکا ہے۔ اِس لحاظ سے ہندوستان جیسے ملک

ہیں اس سمت میں قدم اٹھانا بہت بڑی جرأت اور دلیری کا کام ہے۔

لیکن اگر اس کے ساتھ ساتھ عقل مندی سے کام نہ لیا گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ جرأت اور دلیری شیر کے اُس نوجوان بچے کی جرأت اور دلیری ثابت ہوگی جو ایک آرہ کش بڑھئی سے کشتی لڑنے گیا تھا جس نے اُس سے کہا تھا کہ پہلے اس لکڑی کے کُندے کو جہاں تک میں پھاڑ چکا ہوں اس سے آگے پھاڑ کر دو دو پھال کر دو۔ پھر مجھ سے بھی کشتی لڑ لینا۔ شیر کا بچہ اپنے زعم میں لکڑی کے کُندے سے لپٹ گیا تھا اور اُسے پھاڑنے کی کوشش میں چِرے ہوئے حصے کے اندر پھنس کر رہ گیا تھا اور کچھ عرصے میں خود ہی دم دے دیا تھا۔

اب جب کہ پنچایتوں کو وسیع اختیارات دے دیئے گئے ہیں اور ان پنچایتوں کے سبھا پتیوں پر مشتمل ہر بلاک میں وکاس سمیتیاں اور پنچایت سمیتیاں بن گئی ہیں اس بات کی بہت سخت ضرورت ہے کہ کم سے کم سبھا پتیوں کی تعلیم و تربیت کا نہایت معقول انتظام کیا جائے اس باب میں ہمیں مزدوروں کی تعلیم کے اُس پہلو سے سبق لینا چاہئے جو مزدور سبھائیت کی تربیت (EDUCATION IN TRADE UNIONISM) کہلاتا ہے۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں ہے کہ مزدور سبھائیت کی تعلیم کے لئے ہر ملک میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر تنظیمیں قائم ہیں اور زور و شور سے اپنا یہ کام کرتی رہتی ہیں۔ لیکن سبھا پتیوں کی تعلیم سے یہ مطلب نہ سمجھنا چاہئے کہ تعلیم کوئی طلسمی لفظ ہے جس کا نام لے کر سبھا پتیوں پر دم کر دیا اور اُن کی تعلیم مکمل ہوگئی۔ تعلیم بڑا سست رد عمل ہے اور اسے بہت زیادہ تیز کیا گیا تب بھی پانچ چھ مہینے کی مدت لگ جانا معمولی بات ہے۔ سبھا پتیوں کی تعلیم کا بہترین طریقہ ہمارے خیال میں وہ ہوگا جو ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ ڈیولپمنٹ والوں کو چاہئے کہ وہ اپنے کاموں میں ایک نہایت اہم کام یہ سمجھیں کہ پہلے سبھا پتیوں اور ان کے بعد پنچایتوں کے ممبروں کا ایک ایک گروہ لے کر ان کی مکمل تعلیم کا بندوبست کریں اور اس مقصد کے لئے کم سے کم چھ مہینے تک اُن کے قیام و طعام اور تعلیم کا اپنے اپنے ہیڈ کوارٹرز میں انتظام کریں۔ اس طرح کم سے کم ہر گاؤں میں ایک ایک آدمی ایسا پہنچ جائے گا جو اپنے عمل اور خیال سے لوگوں کے اندر زندگی کی لہر پیدا کر سکے گا اور یہی وہ ضرورت ہے جسے اب تک نہ سوشل ایجوکیشن کی تحریک پوری کر سکی ہے اور نہ خود کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم پوری کر سکی ہے۔

مگر تعلیم کی ایک مدت چاہے وہ چھ مہینے کی ہی کیوں نہ ہو، مسلسل تعلیم کی ضرورت پوری نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ رسمی تعلیم کے میدان میں بھی اس زمانے میں اعادی نصابوں اور مختلف قسم کے پیشہ ورانہ لٹریچر کی فراہمی کے ذریعے استادوں کو زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے باخبر رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح سبھا پتیوں اور پنچایت ممبروں کے لئے بھی ضرورت ہوگی کہ آسان زبان میں طرح طرح کا معلوماتی لٹریچر اُن کو فراہم کیا جاتا رہے تاکہ انھیں نئی نئی معلومات مسلسل حاصل ہوتی رہے۔

یہ جمہوری لامرکزیت کی موجودہ تحریک کی سب سے اہم ضرورت ہے اور اگر اسے سوجھ بوجھ کے ساتھ پورا نہ کیا گیا تو دو صورتوں میں سے ایک صورت کا واقع ہونا یقینی ہے۔ یا تو یہ ہوگا کہ سبھا پتی لوگ اپنی کم علمی کی وجہ سے بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کو انٹ شنٹ مشورے دیں گے اور وہ چونکہ ان مشوروں پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہوں گے اس لئے ترقی کی اسکیمیں غلط راہوں پر پڑ جائیں گی یا پھر یہ ہوگا کہ بلاک ڈیولپمنٹ افسر اور بلاک سمیتی کے درمیان ہمیشہ کے لئے چپقلش پیدا ہو جائے گی اور عوامی تعاون (پبلک کوآپریشن) کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

جن شکشا سنستھا گونڈہ کے اہتمام میں
نگوا گرام اکائی کی اسکیم
گوبر گیس پلانٹ کے ساتھ بسم اللہ

آخر وہ وقت آ ہی گیا جس کا ایک عرصے سے اشتیاق تھا۔ جن شکشا سنستھا اور تھک جی (شری شالگ رام تھک) کی رہنمائی میں اس نت نئے تجربے طلب ذہن پر ایک عرصے سے مسلط تھے اور ایک عرصے سے انھیں دیکھنے کا انتظار تھا۔ دوستانہ طنز کے پیرائے میں تھک جی کے شکوے شکایات نے اس اشتیاق میں اور زیادہ شدت پیدا کر دی تھی۔ طلب صادق تھی، مطلوب ہاتھ آ گیا۔ سنستھا میں قیام رہا اور مسرتوں کی باد بہار سے اشتیاق کی کلی کھل کر حصول مقصود کے عطر بیز پھول میں تبدیل ہو گئی۔

تھک جی کے من کی نئی موج گوبر گیس پلانٹ کے افسانے دماغ پر طاری تھے اس لئے جب سنستھا کی چہار دیواری میں قدم رکھا اور اسے بجلی کے قمقموں سے جگمگاتے دیکھا تو یقین ہو گیا کہ یہ روشنی اسی گوبر کا فیض ہے جسے ہم ہندوستانی اپنی ناسمجھی سے جلا جلا کر خاک کر ڈالتے ہیں۔ تھک جی چونکہ تھوڑی دیر تک موقع واردات سے غائب تھے اس لئے سب سے پہلے گوبر گیس پلانٹ کی چھان بین شروع کی۔ معلوم ہوا کہ ابھی ابھی ہم نے جو چائے پی ہے وہ تو اسی گیس کے چولہے پر تیار ہوئی تھی اور رات کا جو کھانا کھائیں گے وہ بھی اسی سے تیار ہوگا لیکن یہ روشنی ابھی اس پلانٹ کی نہیں ہے اور شاید ابھی ایک عرصے تک اس کی نوبت بھی یہاں نہ آئے، لیکن "نگوا گرام اکائی" کے ایک گاؤں بانیشور گنج میں جو پلانٹ لگا ہے اس میں گیس کو بجلی کی طاقت میں منتقل کر کے روشنی کی فراہمی کا تجربہ مکمل ہو چکا ہے اور وہاں یہ انتظام عنقریب مستقل ہو جائے گا۔

نگوا گرام اکائی

تھک جی اوّل اور آخر گاندھی وادی ہیں اور گاندھی واد کی تبلیغ کرنے والے جتنے ادارے ہیں، انھیں وہ زیارت گاہ ہی نہیں بلکہ صحت مند افکار و خیالات کا سرچشمہ مانتے ہیں۔ یہ گرام اکائی" کی اسکیم بھی اسی قسم کے ایک ادارے کھادی اُدیوگ کمیشن کا ایک منصوبہ

ہے جس کے ماتحت دس دس گاؤوں کا ایک ایک احاطہ بند (کمپیکٹ) علاقہ لے کر اُسے ہر اعتبار سے خود کفیل بنانے کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔
تھپک جی نے اپنی سنستھا کے زیر اہتمام اس طرح کا تجربہ کرنے کی غرض سے گونڈہ سے بارہ میل کے فاصلے پر موضع نگوا کے آس پاس کے دس گاؤوں کا ایک علاقہ منتخب کیا ہے اور کھادی اڈیوگ کمیشن نے انھیں اس کے لئے مالی امداد بہم پہنچانے کا وعدہ کیا ہے۔

بالیشور گنج کا گوبر گیس پلانٹ

آدمی دُھن کا پکا ہو تو اس کے کام کے سلسلے کی ضرورتیں بھی خود بخود پوری ہو جاتی ہیں۔ یہ نظریہ تھپک جی کے تجربات کے اوپر پورا پورا صادق آتا ہے۔ سوشل ایجوکیشن کے کام میں خاص طور پر کسی تجربے کے کامیاب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی شخص آگے بڑھ کر تجربے کے میدان میں پہل کرے۔ اسی کو لوکل لیڈر شپ کہتے ہیں۔ نگوا گرام اکائی میں گوبر گیس پلانٹ کو بنیادی چیز قرار دے کر تجربہ کرنے کے کام میں بالیشور گنج کے ایک نیک سیرت رئیس ٹھاکر سوم دت سنگھ جی آگے بڑھے ہیں۔ انھوں نے ایک نیا مکان بنوایا ہے اور کوشش کی ہے کہ شہر کی جتنی سہولتیں اور آسائشیں ہو سکتی ہیں، وہ سب مکان میں موجود ہوں۔ اور تو اور انھوں نے پاخانوں میں فلش سسٹم رکھا ہے اور پانی پہنچانے کے لئے انجن لگوایا ہے۔ بجلی کی روشنی کا انتظام باقی تھا کہ انھیں تھپک جی کے پروگرام اور گوبر گیس پلانٹ کے امکانات کا علم ہوا۔ وہ ان امکانات کی تصدیق کرنے کی غرض سے دلی آئے اور ادکھلا سیویج گیس پلانٹ کا مطالعہ کیا۔ واپس جا کر پہلا کام انھوں نے یہ کیا کہ گوبر گیس پلانٹ اور بجلی کی فٹنگ کا ایک ساتھ بندوبست کیا۔ پلانٹ تیار ہونے کے بعد گیس کو بجلی کی طاقت میں منتقل کرنے کے لئے انجن منگوایا اور ایک دن مستریوں نے اسی انجن کو جس میں جنریٹر چلانے کے لئے پٹرول خرچ ہوتا ہے، ذرا سا ہیر پھیر کر کے گوبر گیس پلانٹ ہی کی گیس سے چلا دیا اور ٹھاکر صاحب کا محل نما مکان جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ اُس دن تھپک جی نے اُسی بجلی سے اپنے رورل براڈ کاسٹ کا مائکرو فون بھی چلایا اور فوراً پانی کھینچنے والا ٹیوب ویل بھی چلا۔

بالیشور گنج کے ٹھاکر صاحب کی اس پہل سے "اکائی" کے تمام گاؤوں میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور دوسرے رئیسوں اور خوشحال کسانوں نے اپنے اپنے یہاں گوبر گیس پلانٹ لگوانے کا اصرار شروع کر دیا ہے۔ ایک صاحب تو ہمارے سامنے ہی تھپک جی سے باتیں کر رہے تھے کہ "میں کسی قابل تو نہیں ہوں پر آپ کے پروگرام میں دل و جان سے شریک ہونا چاہتا ہوں۔ میرے پاس جو کچھ زمین ہے اس میں سے میری اور میرے بچوں کی دال روٹی کے بقدر چھوڑ دیجئے اور باقی سب لے لیجئے اور اس کا جو جی چاہے کیجئے۔ پر گوبر گیس پلانٹ ضرور لگوا دیجئے۔"

دیہاتی ریڈیو پروگرام

گرام اکائی کے تمام گاؤوں تک آسانی سے اور بیک وقت اپنی بات پہنچانے کی غرض سے تھپک جی نے ایک تربیت راستہ

نکلا ہے جسے وہ "رورل براڈ کاسٹ" کہتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے ـــــ اور بالیشور گنج کے گوبر گیس پلانٹ کے کامیاب تجربے سے ان کے بیان کا جواز بھی ثابت ہوتا ہے ـــــ کہ گوبر گیس پلانٹ سے جو بجلی کی طاقت پیدا ہوگی، اس سے گاؤں گاؤں میں تفریح اور دل بہلاؤ کی وہ سہولتیں بھی حاصل ہوں گی جن سے شہر تو بجلی کی طاقت کی وجہ سے فیضیاب اور گاؤں محروم ہیں۔ سر دست اس کی سیم اللہ کرنے اور اپنے کام کی تبلیغ کرنے کی غرض سے انھوں نے بیٹری سے مائکروفون کے اوپر صبح اور شام دونوں وقت روزانہ (سوائے جمعہ کے دن کے) ایک ایک گھنٹے کا پروگرام شروع کیا ہے۔ اس پروگرام میں پہلے بھجن ہوتا ہے، پھر دن کی تاریخ، مہینہ اور سال بتایا جاتا ہے، اس کے بعد لوک گیتوں کے رکارڈ بجائے جاتے ہیں اور آخر میں اگر تیھک جی موجود ہوئے تو وہ ورنہ اُن کے کوئی ساتھی "حالات و مسائل" کے عنوان کے ماتحت دس سے پندرہ بیس منٹ تک تقریر کرتے ہیں۔

اس پروگرام کا بھی بہت اچھا اثر دیکھنے میں آیا۔ اول تو جس طرف کی ہوا ہوتی ہے اُس سمت میں اس پروگرام کی گونج دو ڈھائی میل تک پہنچتی ہے۔ دوسرے اس کے ذریعے لوگوں کی اچھی خاصی تفریح ہو جاتی ہے اور اسی بہانے لوگ گرام اکائی کی اسکیم سے رفتہ رفتہ واقف ہو جاتے ہیں۔ ایک آدھ آدمی یہ کہتے سنے گئے کہ "بابو جی، یہ جمعے کے دن آپ کا پروگرام کیوں بند رہتا ہے؟ بڑا سُونا سُونا لگتا ہے اُس دن، جمعے کو بھی جاری رکھئے نا اپنا پروگرام!"

تیھک جی کا خواب

تیھک جی گوبر گیس پلانٹ کو نئی دنیا کی تحقیق سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ گذشتہ دس بارہ سال سے جس چیز کی تلاش میں خانہ بدوشوں کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا، وہ اب مجھے مل گئی ہے اور اگر زندگی رہی تو کم سے کم ایک علاقے کو اقتصادی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور اخلاقی غرض ہر حیثیت سے خوشحال اور خود کفیل بنا کر دکھا دوں گا اور گاندھی جی کا وہ خواب جو انھوں نے "گاؤوں کی آزادی" کے نام سے دیکھا تھا پورا ہو جائے گا۔"

اُن کا نظریہ ہے کہ "موجودہ دور تہذیب میں ترقی اور فلاح و بہبود کی کنجی بجلی سے حاصل ہونے والی قوت ہے۔ ہندوستان میں جبکہ شہروں اور گاؤوں کی حالت میں جو بیّن فرق نظر آتا ہے، اُس کا راز بھی یہی قوت کا وجود اور عدم ہے۔ اگر گاؤوں میں بھی بجلی کی قوت بہم پہنچا دی جائے ـــــ اور بہم پہنچائی جائے اس طرح کہ گاؤں کا باشندہ اُسے خود اپنے وسائل اور محنت کے بل بوتے پر حاصل کر لے ـــــ تو تہذیب و ترقی کے چشمے گاؤوں میں بھی پھوٹ پڑیں گے۔

ترقی اور خوشحالی کے باب میں اس نظریے کا جہاں تک تعلق ہے، یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے اور نہ میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں نے یہ نظریہ ایجاد کیا ہے۔ بالکل یہی نظریہ حکومتِ وقت کا بھی ہے۔ چنانچہ گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچانا ہمارے پنج سالہ منصوبے [illegible]

منصب ہے۔ فرق صرف اس منزل تک پہنچنے کے راستے کا ہے۔ حکومت وقت نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جو مغربی ملکوں کی خصوصیت ہے۔ اور جس کے نتائج بد سے پوری دنیا واقف ہے۔ ہمارا راستہ گاندھی جی کا سودیشی اور کھادی کا راستہ ہے۔ ہم بجلی کی جو قوت گوبر گیس پلانٹ کے ذریعے گاؤں کو پہنچائیں گے اُسے گاؤں والے صرف اپنے گھر کے استعمال کے لئے اسی طرح حاصل کریں گے جس طرح وہ اپنے کھانے پینے کی چیزیں حاصل کرتے ہیں۔ انھیں بجلی کی قوت سپلائی کرنے والی کوئی باہر کی ایجنسی نہیں ہو گی۔ گاندھی جی خود بھی مشین یا بجلی کی قوت کے مخالف نہیں تھے۔ بشرطیکہ وہ منافع کے بہانے سے انسانوں کی لوٹ کھسوٹ (ایکسپلائٹیشن) کا ذریعہ نہ بنے۔"

ٹھک جی کا منصوبہ ہے کہ وہ نگرو اگرام اکائی کے دس گاؤوں کے ہر ہر گھر میں نہ سہی تو ایک دوسرے سے ملے ہوئے دو دو چار چار گھروں کے ہر ہر مجموعے میں گوبر گیس پلانٹ لگوائیں گے اور اسی کے ساتھ اگر بالیشور گنج کے تجربے کے مطابق کام کرنے والے معمولی پٹرول کے انجن کافی تعداد میں دستیاب ہوسکے تو وہ، نہیں تو گیس سے چلنے والے انجن بھی فٹ کرادیں گے۔ اس طرح ابتدا تو اس بات سے ہو گی کہ ہر گھر میں دھواں دھکڑ سے پاک گیس کے چولھے جلنے لگیں گے اور اسی طرح مٹی کے تیل کے دھوئیں اور کالکھ سے پاک بجلی کے بلبوں سے روشنی ہونے لگے گی۔ گھر کی عورتیں گوبر تھاپنے، اُسے کھیت میں لے جانے اور اُپلوں کے دھوئیں اور چولھے کی پھونک پھانک سے نجات پا جائیں گی، تو ان کا حوصلہ بڑھے گا اور وہ دوسرے تخلیقی اور نفع بخش کاموں کے لئے تیار ہو جائیں گی۔ بجلی کی قوت سے گھر میں روشنی تو ہو گی ہی، امبر چرخے بھی چلیں گے اور بجلی کے اس امبر چرخے سے جو سوت تیار ہو گا اُس سے بنا ہوا کپڑا مل کے عام بنے ہوئے کپڑوں کے مقابلے کا مگر اس سے سستا ہو گا۔ اس طرح کھدر کے سر سے یہ الزام بھی ہٹ جائے گا کہ موٹا اور بدنما ہوتا ہے، جلد میلا ہو جاتا ہے، جلد پھٹ جاتا ہے، اور اس پر طرہ یہ کہ مہنگا بھی پڑتا ہے اور اس مہنگے پن کو کم کرنے کے لئے حکومت سے امداد لینی پڑتی ہے۔

گوبر گیس پلانٹ سے جو کھاد ملتی ہے وہ گوبر کی معمولی کھاد سے کئی گنا تیز ہوتی ہے اس لئے کھیت کی اُپج بھی اس کے ذریعے بڑھے گی۔ کسان کا سب سے بڑا مسئلہ پانی کی قلت ہوتی ہے۔ گوبر گیس پلانٹ سے جو بجلی حاصل ہو گی اُس سے ضرورت کے مطابق چھوٹے یا بڑے پیمانے کا ٹیوب ویل چلایا جاسکتا ہے اور اس طرح یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ کھاد اور پانی کا مسئلہ حل ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ کسان اپنی کھیتی سے اچھی اور صاف ستھری زندگی نہ گذار سکے۔

اسی گوبر گیس کی بجلی سے گاؤں کے تیلی بجلی سے چلنے والے کولہو، جُلاہے بجلی سے چلنے والے کرگھے، لوہار بجلی سے چلنے والے لوہار خانے بڑھئی بجلی سے چلنے والے بڑھئی خانے، اور کمہار بجلی سے چلنے والے چاک چلا کر اچھا اور صاف تیل، بڑھیا اور فینسی کپڑے، نئے قسم کے ہل اور کُھرپے، صاف اور سانچے میں ڈھلے ہوئے فرنیچر، دروازے، چوکیاں اور تخت اور بڑھیا قسم کے برتن فراہم کرسکتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ (اگر سماج کا مزاج اجازت دے) تو دیہی سماج کے یہ پیشے مع اپنی قدیم اور خوشگوار روایات و اقدار کے ساتھ جوں کے توں قائم بھی رہ سکتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے یہ سب کام بہ یک وقت نہیں ہوں گے۔ گوبر گیس پلانٹ کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہے کہ رات کی رات ایک دنیا کو

تباہ کر کے اس کی جگہ دوسری دنیا آباد کر دے گا۔ ہندوستانی اور خصوصاً ہندوستان کے دیہی عوام کا مزاج کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ ہر نئی چیز کو خواہ وہ اس کے کتنے ہی بھلے کی کیوں نہ ہو، دیکھ کر بدکتا ہے اور جب تک بس چلے، اس سے دور ہی دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ گوبر گیس پلانٹ بھی اس کے لئے نئی چیز ہے۔ ہمارا سب سے پہلا کام اس گھریلو مشین سے اُس کے مزاج کو آشنا کرنا ہوگا اور یہی اتنا دیر طلب کام ہے کہ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کب تک کامیاب ہوں گے لیکن یہ بہرحال اب ہمارا ایمان ہو گیا ہے کہ اس گوبر گیس پلانٹ سے ہندوستان کے گاؤں کا نقشہ بدلا جا سکتا ہے اور اس وقت کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے جب کروڑوں روپے کی لاگت سے ندیوں پر بند باندھ کر ان سے بجلی کی قوت حاصل ہوگی اور اُسے پھر لاکھوں روپئے کی لاگت لگا کر گاؤں گاؤں پہنچایا جائے گا۔

گوبر گیس پلانٹ کیا ہے؟

گوبر گیس پلانٹ مویشیوں کے گوبر اور بے کار پڑے ہوئے گھاس پھوس سے گیس تیار کرنے کی ایک دیسی مشین ہے جو چھوٹے سے چھوٹے پیمانے پر بنے تو چار سو روپئے میں تیار ہوتی ہے۔ اس کے ٹکنیکل اعداد و شمار کا تو ہمیں پورا پورا علم نہیں ہے لیکن تیھک صاحب کا بیان یہ ہے کہ چار سو روپئے میں بننے والے پلانٹ سے جس میں روزانہ بیس سیر گوبر اور اسی قدر گھاس پھوس ڈالا جائے تو چھ سو کیوبک فیٹ گیس حاصل ہوتی ہے۔ اس مقدار میں سے چار سو کیوبک فیٹ گیس سے اتنا کھانا تیار ہو سکتا ہے جو پچیس تیس آدمیوں کے لئے کافی ہو۔ باقی دو سو کیوبک فیٹ گیس جو بچ رہے گی ——— اور روزانہ بچتی رہے گی۔ اُس سے آدھے ہارس پاور کا ایک انجن دو تین گھنٹے تک چل سکتا ہے اور اتنی بجلی پیدا کر سکتا ہے کہ پچیس واٹ کے چار پانچ بلب روشن ہو جائیں یہ قوت صرف ۲۰۰ کیوبک فیٹ گیس سے حاصل ہوگی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مہینے میں ۱۴۰۰ سو کیوبک فیٹ گیس صرف بجلی کی قوت حاصل کرنے کے لئے بچ رہے گی پھر یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ ایک خاندان میں اوسطاً سات آٹھ آدمی سے زیادہ تعداد نہیں ہوتی اس لئے دونوں وقت کا کھانا تیار کرنے پر پندرہ سولہ آدمیوں کے کھانے کا اوسط پڑے گا جو اس حساب سے صرف ۲۰۰ کیوبک فیٹ گیس سے تیار ہو جائے گا اور بجلی کی قوت حاصل کرنے کے لئے بجائے ۲۰۰ کے ۴۰۰ کیوبک فیٹ گیس بچ رہے گی۔

پلانٹ کی تیاری میں کوئی خاص پیچیدگی نہیں ہے صرف بارہ پندرہ فیٹ گہرا ایک پکا کنواں بنانا پڑتا ہے۔ جس میں ایک خاص راستے سے سیال شکل میں یعنی پانی میں گھلا ہوا گوبر اور چھوڑا کی ہوئی گھاس ڈال دی جاتی ہے۔ اس کنویں کے اوپر لوہے کی چادر کا بنا ہوا ایک ٹوپا سا اوندھا کر چاروں طرف سے کس دیا جاتا ہے اور اتنی لچک رہنے دی جاتی ہے کہ گیس کے بھرنے سے اوپر کو اٹھ جائے۔ اور اس کے خالی ہونے سے نیچے کو دب جائے۔ ایک طرف کنویں ہی میں ایک اور راستہ اس لئے بنایا جاتا ہے کہ گیس بننے کے بعد ہضم شدہ گوبر اور گھاس کھاد کی شکل میں باہر نکل جائے۔ کنویں کے بنانے اور لوہے کا ٹوپا اوندھانے میں یہ حکمت رکھی جاتی ہے کہ نیچے جو گوبر موجود ہے اسے روشنی اور ہوا نہ پہنچے؛

ورنہ جو کھاد حاصل ہوگی وہ اتنی اچھی اور تیز نہیں ہوگی۔

ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے، پلانٹ کی ٹکنیک کا اور گیس کی مقدار کے اعداد و شمار کا پورا پورا علم نہیں ہے۔ اگر ناظرین نے اس سودیشی گیس مشین سے دلچسپی لی اور ہمیں اس سے مطلع کیا تو ہم کوشش کریں گے کہ انھیں اس کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل ہو جائے۔

تھمک جی، جیسا کہ ہم اوپر کی سطروں میں کہیں ذکر کر آئے ہیں، نئی تعلیم کے آدمی ہیں جس میں تعلیم کا وسیلہ ایک نہ ایک بنیادی حرفے کو بنایا جاتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر تعلیم کا یہی فلسفہ بالغوں کی تعلیم کے باب میں بھی اُن کے ذہن میں کارفرما ہے اور جب سے وہ اِس میدان میں اُترے ہیں، غالباً اُسی زمانے سے کارفرما ہے۔ گوبر گیس پلانٹ سے پہلے تھمک جی نے امبر چرخے کو بنیادی حرفے کے طور پر بالغوں کی تعلیم میں آزمایا تھا، لیکن یقین سے تو ہم نہیں کہہ سکتے مگر اندازہ یہی بتاتے ہیں کہ اُسے وہ چھوڑ بیٹھے اور اب اس انتظار میں ہیں کہ گوبر گیس پلانٹ سے بجلی کی قوت حاصل کرنے کا یقین ہو جائے تو امبر چرخے کو آمدنی کے مزید وسیلے کے طور پر استعمال کریں اور اس سے وہ چیز حاصل کرلیں جو ہاتھ کا چرخا اور ہاتھ کا کرگھا ابھی تک کھادی کے شوقینوں کو نہیں دے سکا ہے۔

گوبر گیس پلانٹ یقینی تجربوں کی بنیاد پر ابھی اسی قابل ہو پایا ہے کہ اُس سے گھر کی عورتیں ایندھن کے چولھوں کی مصیبتوں سے نجات پا جائیں اور گھر کے گوبر سے جتنی مقدار میں کسان کو کھاد حاصل ہوتی تھی، اس سے کئی گنا زیادہ کھاد مل جائے یہ بھی اتنے کم خرچ سے (یعنی صرف چار سو روپیہ لگنے کے بعد) کچھ کم کامیابی نہیں ہے۔ اُسی گوبر سے جسے اگر کھاد کے لئے استعمال کیا جاتا تو ایندھن کا مسئلہ باقی رہ جاتا، اور ایندھن کے طور پر استعمال کیا جاتا تو کھاد کا مسئلہ باقی رہ جاتا، اس پلانٹ کی شکل میں بیک وقت دونوں مسائل حل ہو جاتے ہیں اور رسوئی گھر کے موجودہ عذاب سے گھر کی عورت کو چھٹکارا الگ مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ گھر کے گوبر اور گھاس پھوس اور گاؤں کے راج اور لوہار کے ہاتھوں بنی ہوئی یہ مشین اتنی عجوبہ اور نئی چیز بھی نہیں ہے جس سے گاؤں کا باشندہ بھڑک جائے۔ اس اعتبار سے گاؤں والوں کو ترقی کی راہ پر چل پڑنے کی عملی ترغیب دینے کے لئے یہ آلہ نہایت کارآمد اور ہندوستانی گاؤں کے مزاج کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے اور یہی وہ گم شدہ کڑی ہے جس کی ہندوستانی گاؤں کے ارتقا کے عمل میں تلاش تھی۔ بیدار آدمی گو ہندوستانی گاؤں کا آدمی جب تک اپنی تعلیم و ترقی کے میدان میں کوئی ایسی چیز نہ دیکھ لے جو اس کی گوبر مٹی کی زندگی سے قریب بھی ہو اور اسے نفع پہنچانے والی بھی ہو، اُسے ترقی کے راستے پر ڈالنا بڑا مشکل کام ہے۔ گوبر گیس پلانٹ میں اس لحاظ سے تعلیمی امکانات بہت ہیں۔

لیکن اس پلانٹ کے ذریعے جہاں تک بجلی کی قوت حاصل کرنے کا تعلق ہے، وہ ابھی تجربے ہی کی منزل میں سمجھنا چاہیے۔ یہ اس لئے بھی کہ اگر گیس سے چلنے والا انجن لگا کر بجلی پیدا کرنے والی مشین چل بھی گئی تو یہ مسئلہ باقی رہ جائے گا کہ اس سے گاؤں کا ہر گھر مستفید

نمونے

ڈیولپمنٹ پروگرام میں تبدیلی کی ضرورت

انڈین کوآپریٹیو یونین کا ایک تجربہ

دیہی تعمیر و ترقی کے میدان میں آج حکومت بہت وسیع پیمانے پر کام کر رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں اب رضاکار اداروں کا منصب صرف حکومت کے منصوبوں کو تکمیل دینے میں مدد پہنچانا ہی رہ گیا ہے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام جو دو تین سال کے اندر ملک کے تمام گاؤں کو اپنے زیر اثر لے لے گا، اس کے طریق کار کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مختلف سرگرمیوں کی انجام دہی میں رضاکار اداروں کی حیثیت اب اتنی رہ گئی ہے کہ وہ اس میں عوام کا تعاون دلانے میں حکومت کی کچھ مدد کر دیں۔ مگر رضاکار اداروں کا منصب صرف یہیں تک محدود نہیں ہے۔ انڈین کوآپریٹیو یونین نے جو ایک خالصتاً رضاکار ادارہ ہے۔ اپنے تجرباتی پروگراموں کے ذریعہ اس سلسلے میں ایک اچھی مثال پیش کی ہے۔ جس سے رضاکار اداروں کا اصل منصب آج حکومت کے براہ راست انتظام میں اور وسیع پیمانے پر کام کے پھیلاؤ کے بعد بھی بہت نمایاں طریقے سے ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کی یہ حیثیت مسلّم ہو جاتی ہے کہ رضاکار اداروں کا کام محض حکومت کے کاموں میں مدد دینا ہی نہیں ہے بلکہ چھوٹے پیمانے پر تجربے کر کے حکومت کے وسیع پیمانے پر رائج پروگراموں میں بہتری پیدا کرنے کی تدبیریں ڈھونڈنا اور اس طرح حکومت کی رہنمائی کرنا بھی ہے۔

تجربے کی ضرورت

دیہی تعمیر کے میدان میں جب کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا ہمہ گیر پروگرام شروع ہوا اس وقت شعوری اور غیر شعوری طور پر اس سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی گئی تھیں مگر جلد ہی یہ بات محسوس کر لی گئی کہ اس پروگرام سے گاؤں کے غریب اور چھوٹے کسان کچھ بہت فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں۔ اس کمزوری کا ذکر پروگرام کی اکثر جانچ رپورٹوں میں کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں کچھ مفید تجویزیں بھی رکھی گئی ہیں مگر ان کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ انہیں عمل اور تجربے کی کسوٹی پر کس کر دیکھ بھی لیا گیا ہے اور یہ اطمینان کر لیا گیا ہے کہ یہ تجویزیں

ہندوستان کے گاؤں کے مخصوص حالات میں مفید اور کارگر ثابت ہوں گی۔

انڈین کواپریٹیو یونین نے بھی دہلی کے چند گاؤوں میں دیہی تعمیر و ترقی سے متعلق کچھ تجرباتی اور آزمائشی کام گزشتہ چند سال سے کر رہی ہے۔ ان باتوں پر زیادہ عملی نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کیا اور اس غور و فکر میں اس نے نہ صرف دوسرے اداروں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ایک سیمینار منعقد کیا بلکہ اس کی اس سفارش پر کہ رضاکار اداروں کا کام محض نکتہ چینی کرنے تک محدود نہیں ہے دہلی کے پاس ۵ گاؤں کا ایک علاقہ چن کر کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا ایک نمونے کا تجرباتی پروجیکٹ بھی شروع کیا۔

پروجیکٹ کی شروعات

تجرباتی منصوبہ شروع کرنے سے پہلے کواپریٹیو یونین نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی سرکاری جائزہ رپورٹوں کی چھان بین کی اور دیکھا کہ اس پروگرام میں کون سی ایسی خامیاں ہیں جن سے کہ یہ پروگرام سماج کے سب سے نچلے طبقے کی حالت بہتر بنانے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں حاصل کر پا رہا ہے۔ انڈین کواپریٹیو یونین ایک ایسی جماعت ہے جس کا تعلق زیادہ تر امداد باہمی اور دیہی قرضوں سے رہا ہے ظاہر ہے کہ اس کی توجہ سب سے زیادہ پروگرام کے انھی پہلوؤں پر گئی ہوگی۔ اس چھان بین سے اندازہ ہوا کہ

(الف) ڈیولپمنٹ پروگرام کے تحت جو قرض دیئے جاتے ہیں ان کی شرائط ایسی ہیں کہ چھوٹے کسان ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

(ب) لوگوں کو قرض یا امداد دینے کا طریقہ بہت دیر اور وقت طلب ہے۔ جس سے کہ اکثر قرض یا امداد ملنے سے پہلے اس کام کے کرنے کا وقت گذر جاتا ہے۔

(ج) رقم مطلوبہ کام کو پورا کرنے کے لئے ناکافی ہوتی ہے۔

(د) پیداوار بڑھانے کے لئے جو قرض دیا جاتا ہے وہ قرض خواہ کی قرض کی رقم سے پیداوار بڑھانے کی صلاحیت اور بڑھی ہوئی پیداوار سے قرض کی واپسی کے امکانات کی بنیاد پر نہ ہو کر قرض خواہ کی موجودہ حیثیت اور آمدنی پر دیا جاتا ہے۔

(ہ) قرض کے لئے زمین اور جائداد کی ضمانت کی شرط سے چھوٹے کسان اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

پروجیکٹ نے قرض اور امداد کے اس رائج طریقے میں اس طرح اصلاح کرنے کی کوشش کی جس سے اس پروگرام سے چھوٹے کسان خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کے لئے اس نے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا۔

۱۔ قرض خواہ کی جائداد یا آمدنی یا اس کے کسی دوست اور ہونیک جائداد کی ضمانت کی بنیاد پر قرض نہ دے کر خود قرض خواہ کی ایمانداری اور پیداواری صلاحیتوں پر قرض دینا۔

(۲) قرض کا فیصلہ اسی پیداواری منصوبے کے اصل اخراجات اور متوقع آمدنی کی بنیاد پر کرنا چاہیے جس کو پورا کرنے کی صلاحیت اس میں موجود ہو۔

(۳) قرض کی درخواست موصول ہونے کے پندرہ دن کے اندر اندر کوئی نہ کوئی فیصلہ اور اس پر عمل درآمد ہو جانا چاہیے۔

(۴) قرض کی ہر درخواست پر گاؤں میں کام کرنے والا کارکن اور زراعتی ماہر مل کر غور کریں اور دیکھیں کہ مطلوبہ رقم جس کام پر صرف کرنا چاہتے ہیں وہ کام کہاں تک مفید اور پیداواری ثابت ہوگا۔ اس سے قرض کی رقم کے صحیح استعمال میں قرض خواہ کو مدد ملے گی۔

کواپریٹیو سوسائٹی کی تنظیم

کواپریٹیو سوسائٹیوں کی تشکیل میں عام طور پر جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ امداد باہمی کے اصول کے منافی ہوتا ہے، یعنی سوسائٹی کے قیام کا مقصد ہوتا ہے خاص طرح کا مالی فائدہ اٹھانا اور اس کے لئے کافی جلد بازی سے کام لیا جاتا ہے۔ ممبروں کے سامنے امداد باہمی کے اصول اور فوائد نہیں ہوتے بلکہ محض ان کی غرض ہوتی ہے۔

اس پروجیکٹ نے کواپریٹیو سوسائٹی کی تنظیم کا کام مختلف مرحلوں میں تقسیم کر کے کیا اور امداد باہمی کے اصول اور طریق کار کی تربیت کرنے کے بعد ہی اس کی تنظیم کے سلسلے میں عملی قدم اٹھائے۔ اس طرح سوسائٹی کی تشکیل کرنے سے گاؤں کی مجموعی زندگی پر کافی اچھا اثر مرتب ہوا ہے۔

چھوٹے کسان

یہ تجرباتی پروجیکٹ چونکہ خاص طور سے چھوٹے کسانوں کو فائدہ پہنچانے کے مقصد سے ہاتھ میں لیا گیا تھا اس لئے اس سوال کا سامنے آنا لازمی تھا کہ چھوٹے کسان کا معیار کیا ہو! بہرحال اس سلسلے میں یہ بات طے کی گئی کہ سینچائی والے علاقے میں ۰ بیگھے اور بغیر سینچائی والے علاقے میں ۱۵ بیگھے زمین رکھنے والے کسان چھوٹے کسانوں کی فہرست میں آئیں گے مگر اس کے ساتھ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا کہ اس تقسیم سے گاؤں دو دھڑوں میں تقسیم نہ ہو جائے اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ قرض اور امداد کا پروگرام تو صرف چھوٹے کسانوں تک محدود رکھا جائے مگر زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں سے متعلق تعلیمی مشوروں اور مظاہروں وغیرہ کی سہولتوں سے سب ہی کسانوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے۔

پروجیکٹ جو ۲۱۳۰ خاندانوں کے ۱۵ گاؤں پر پھیلا ہوا ہے اب تک ۸۱ فی صدی خاندانوں نے اس کے خدماتی پروگراموں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس میں نقد قیمت ادا کرنے پر بیج کھاد وغیرہ کی سپلائی کی صورت میں جو سہولتیں فراہم کی گئی ہیں وہ شامل نہیں ہیں۔

کسانوں کی ضرورت کا اندازہ لگانے کا ایک طریقہ

ڈیولپمنٹ پروگرام کے ماتحت اب تک جو قرض یا امداد وغیرہ کی سہولتیں فراہم کی جاتی رہی ہیں، اس کے لیے کبھی کسان کی ضرورت کا اندازہ کسی سائنٹفک ڈھنگ سے نہیں لگایا جاتا رہا ہے بس کسی علاقے میں قرض وغیرہ تقسیم کرنے کے لئے کچھ رقم منظور ہے تو اُسے کسی نہ کسی طرح تقسیم کردینا چاہیے۔ اس سے کوئی سروکار نہیں کہ یہ رقم کس طرح زیادہ سے زیادہ کارآمد کاموں پر خرچ ہوسکے گی۔

پروجیکٹ نے یہ انتظام کیا کہ ہر کسان اپنے کاموں کا منصوبہ خود بنائے۔ اِس سلسلے میں گرام سیوک اور زراعتی ماہر کسان کے پاس جاکر پوچھتے ہیں کہ اُس نے اپنی پیداوار اور آمدنی بڑھانے کے لئے کیا سوچا ہے۔ کسان انھیں بتاتا ہے کہ اس کے کام کی موجودہ حالت کیا ہے، وہ اُسے کس طرح بہتر بناسکتا ہے، اس کے راستے میں کیا دشواریاں ہیں اور وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے۔ کسان اور پروجیکٹ کے کارکنوں کے درمیان اس بات چیت سے خود بخود ایک منصوبہ تیار ہوجاتا ہے۔ جو کسان کا اپنا منصوبہ ہوتا ہے۔

پروجیکٹ کے کارکن ان باتوں پر غور کرتے ہیں۔ وہ یہ اندازہ کرتے ہیں کہ اِس منصوبے کو پورا کرنے میں کسان اپنے طور پر کیا کرسکتا ہے اور پروجیکٹ کی طرف سے کس قسم کی مدد دی جاسکتی ہے۔ اس کی ٹھیک ٹھیک ضرورتوں کا اندازہ لگالینے اور ہر بات کا اطمینان کرلینے کے بعد گرام سیوک اور زراعتی ماہر کی یہ ذمہ داری ہوجاتی ہے کہ وہ کسان کے اِس منصوبے کے لئے ضروری وسائل فراہم کرے۔

ہر کسان کی علاحدہ علاحدہ ریکارڈ شیٹ ہوتی ہے جس پر یہ ساری باتیں درج کرلی جاتی ہیں۔ بعد میں جو نتائج سامنے آتے ہیں اور آئندہ جو منصوبے بنائے جاتے ہیں وہ ساری باتیں اور اس سلسلے میں کارکن کے اپنے تاثرات اِس ریکارڈ شیٹ پر درج ہوتے رہتے ہیں۔ ریکارڈ شیٹ ایک ایک فرد اور سارے گاؤں کی زراعتی منصوبہ بندی کے ابتدائی خاکے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر قرض اور دوسری سہولتوں کی فراہمی کا انتظام کیا جاتا ہے۔

قرض اور سہولتوں کی فراہمی

عام طور پر ایک کسان اپنی پیداواری ضروریات کا سارا سامان کسی ایک ذریعے سے حاصل نہیں کرپاتا ہے آب پاشی اور زراعت

کے لئے خصوصی کاموں کے لئے تقاوی دیتے ہیں۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اپنے بجٹ سے قرض وغیرہ کی سہولتیں فراہم کرتا ہے اور کوآپریٹیو کی قرضہ سوسائٹیاں مختلف کاموں کے لئے قرض کا انتظام کرتی ہیں۔ عام طور پر یہ رقم مطلوبہ کام کی ضرورت کے لئے بہت ناکافی ہوتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسان کو اور دوسری جگہوں سے بھی قرض لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال کے لئے کسان کو ایک بیل خریدنے کے لئے دو سو روپیوں کی ضرورت ہے مگر اُسے صرف ۱۰۰ روپئے قرض میں منظور ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں بے چارہ کسان کیا کرے۔ آدھا بیل تو خریدنے سے رہا۔ ایسی صورت میں یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ اس روپئے کو دوسرے غیر ضروری اور کم پیداواری کاموں پر خرچ کر دیتا ہے، یا کسی مہاجن سے زائد سود پر مزید قرض لیتا ہے۔ ایک بار سود خوار مہاجن جہاں درمیان میں آیا تو بس سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ گلے کی پھانسی زندگی بھر اتر نہیں سکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مہاجن کا قرض اتارنے میں سوسائٹی کا بقایا چڑھتا جاتا ہے۔ ناکافی قرض دینے کے نتیجے میں کوآپریٹیو سوسائٹی کمزور پڑ جاتی ہے۔ اس کے لئے صرف مہاجنوں کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

پروجیکٹ نے یہ انتظام کیا کہ ایک بار کسان کی ضرورت کا اندازہ ہو جانے پر اُسے ضرورت کی ساری رقم بروقت فراہم کی جائے۔

امداد اور قرض کی کوئی آخری حد پہلے سے مقرر نہیں کی گئی، بلکہ کسان کے زراعتی منصوبے اور اس کے وسائل میں جو فرق ہوتا ہے اور جس کا اطمینان پروجیکٹ کے کارکن کر لیتے ہیں، وہ ساری رقم کسان کو مہیا کی جاتی ہے اور اس شان سے مہیا کی جاتی ہے کہ کسان کو اُس بات کا احساس تک نہیں ہوتا جو اسے کسی سود خوار مہاجن سے روپیہ وغیرہ قرض لینے میں ہوتا ہے۔ سارے سامان اسے گھر بیٹھے مل جاتے ہیں۔ ہر کسان کے پاس ڈاک خانے کی کتاب کی طرح کی پاس بک ہوتی ہے جس میں قرض کے لینے اور واپس کرنے کے اندراجات کسان کے سامنے کئے جاتے ہیں۔ یہ پاس بک کسان کے پاس رہتی ہے جس پر پروجیکٹ کے مقاصد اور قرض اور امداد حاصل کرنے کے قواعد وضوابط بھی چھپے ہوتے ہیں۔

مختلف قرض اور اُن کی واپسی کی مدت

پروجیکٹ نے چھوٹے کسانوں کے لئے تین طرح کے قرض کی سہولتیں فراہم کی ہیں:۔

(۱) کم مدت کے قرض جو بیج، کھاد اور کیڑا مار دواؤں وغیرہ کی خریداری کے لئے پندرہ ماہ کے لئے دیئے جاتے ہیں۔

(۲) درمیانی مدت کے قرض جو بیل، گائے، بھینس اور زراعتی سامانوں اور کنوؤں وغیرہ کے لئے ۳ سے ۵ سال کی مدت کے لئے دیئے جاتے ہیں۔

(۲) لمبی مدت کے قرض جو سینچائی کے تالابوں، یا زمین کو ہموار اور زرخیز بنانے کے کاموں کے لئے ۱۰ سے ۲۰ سال کی مدت کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ اگر سینچائی کا تالاب کسی وجہ سے کام نہ دے سکے تو قرض کی ساری رقم امداد میں بدل دی جاتی ہے۔

پروجیکٹ افسر قرض کی واپسی کی مدت بڑھا سکتا ہے اگر اسے یہ اطمینان ہو جائے کہ فصل کسی آفات ارضی و سماوی کی وجہ سے ماری گئی ہے یا کسان کے بیمار پڑ جانے کی وجہ سے اپنے منصوبے کے مطابق کام نہیں کر سکا ہے۔ غرض یہ کہ قرض کی واپسی کی مدت مطلوبہ کام کے تکمیل ہو جانے پر ہوتی ہے اور اس سلسلے کے سارے قواعد و ضوابط اس بات کو تسلیم کر کے وضع کئے گئے ہیں کہ قرض پیداوار اور آمدنی بڑھانے کے مقصد سے دیئے جائیں گے۔

قرض اور فنی مشوروں کا تال میل

گاؤں کی قرضہ سوسائٹی عام طور پر کسان کے زراعتی منصوبے اور اس کے زراعت کے طریقوں کو دیکھے بغیر، قرض کی واپسی کی معقول ضمانت ملنے پر قرض کی فراہمی کا انتظام کرتی ہے۔ اسے اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ کسان کو زراعت کے اچھے اور ترقی یافتہ طریقوں کو اختیار کرنے کا مشورہ دے اور اس طرح اس بات کا اطمینان کرلے کہ رقم زیادہ سے زیادہ مفید کاموں پر خرچ ہوگی۔ قرض دینے والی ایجنسیاں سمجھتی ہیں کہ اس طرح کے فنی مشورے دینا محکمہ زراعت اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ والوں کا کام ہے۔ دوسری طرف فنی مشورے دینے والے محکموں اور اداروں کو اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ جن ترقی یافتہ طریقوں، اچھی بیج اور کھاد وغیرہ کو استعمال کرنے کا وہ مشورہ دے رہے ہیں اس کے لئے ضروری وسائل وہ کہاں سے فراہم کرے گا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وسائل فراہم کرنا کسان کا کام ہے۔ اس طرح دونوں میں تال میل نہ ہونے کی صورت میں وہ نہ تو قرض کی رقم سے اور نہ ان فنی مشوروں سے پورا پورا فائدہ اٹھا پاتا ہے۔

پروجیکٹ نے اس بات کو شروع سے محسوس کر لیا کہ چھوٹے کسانوں کو صرف قرض ہی درکار نہیں ہوتا بلکہ اسے زراعت کے طریقوں میں فوری طور پر سدھار کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ قرض کے ساتھ ساتھ پیداوار کو بڑھانے کے فنی مشورے بھی دیئے جائیں۔ جس سے کہ زیادہ سے زیادہ آمدنی بڑھے اور اسے قرض کی واپسی میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے قرض کے لئے کسان کو کسی طرح کی ضمانت نہیں پیش کرنی پڑتی بلکہ کسان کے پیداواری منصوبوں اور پیداواری صلاحیتوں کی بنیاد پر انھیں قرض کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ مگر قرض کے ساتھ پیداوار بڑھانے کے فنی مشورے اور رہنمائی حاصل ہونے سے رقم کی بر وقت واپسی بہت حد تک یقینی ہو جاتی ہے یہ ایک اچھی ضمانت ہے جس کی وجہ سے پروجیکٹ اپنے مقصد میں یعنی چھوٹے کسانوں کو ڈیولپمنٹ پروگراموں سے فائدہ پہنچانے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوا ہے۔

پروجیکٹ نے اس کے علاوہ کچھ خاص طرح کے خدماتی کام بھی شروع کئے ہیں جو عام طور پر ایک ملٹی پرپز کوآپریٹیو سوسائٹی کرتی ہے۔ نقد قیمت پر اچھے بیج، اچھی کھاد اور فرٹیلائیزر، کیڑے مار دوائیں اور زرعی اوزاروں کی فراہمی، مویشیوں کی دیکھ بھال، کنوؤں کی مرمت، پمپنگ سیٹ، زمین کو ہموار کرنا، بند باندھنا، اور بیل گاڑیوں وغیرہ کا انتظام کرنا۔ کسانوں کو اپنی مختلف ضرورتوں کے لئے کئی کئی محکموں کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ اس طرح اسے بہت پریشانی اور فضول خرچی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پروجیکٹ کے علاقے کے کسانوں کو اب یہ چکر نہیں لگانا پڑتا اس طرح اسے بہت سی مصیبتوں اور فضول اخراجات سے نجات مل جاتی ہے۔

یہ تجربہ جو آج سے چار سال پہلے اکتوبر ۱۹۵۶ء میں شروع کیا گیا تھا گاؤں کے چھوٹے کسانوں کی زندگی کے معیار کو بلند کرنے میں اُسے جو کامیابی ملی ہے، گاؤں کی مجموعی زندگی پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں اور قرض دینے کے نئے طریقے اختیار کرنے سے رقم کی واپسی میں جو امید افزا کامیابی ہوئی ہے۔ سے دیکھ کر یہ یقین سا ہو جاتا ہے کہ اگر اس تجرباتی پروگرام کو وسیع پیمانے پر اختیار کیا گیا تو اس سے کمیونٹی ڈیویلپمنٹ پروگرام کے سر سے یہ الزام بہت حد تک دور ہو سکتا ہے کہ وہ سماج کے سب سے نچلے طبقے اور چھوٹے کسانوں کو خاطر خواہ فائدہ پہنچانے میں ناکام ہے۔ تجربے کے اس پہلو پر اگلے شمارے میں روشنی ڈالی جائے گی۔

بقیہ صفحہ ۹

ہو جائے گا۔ دوسرا ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ جہاں یہ تجربہ کامیاب ہوا، فوراً اسے کوئی کروڑپتی کارخانے دار یا خود حکومت ہتھیا لے گی اور اُسے تجارتی اصولوں پر رائج کر دے گی۔ ایسی صورت میں اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس کی وہ حیثیت باقی رہ جائے گی جسے دیکھ کر گاندھی جی ہوتے تو وہ خوش ہوتے یا ان کے بعد ان کے پیغام کے جو مبلغ باقی رہ گئے ہیں وہ خوش ہوں گے؟

گاؤں کی پارٹی بندی

"شرما جی، آج چار روز کم پورے بیس سال ہوئے جب میں اس گاؤں میں پہلی بار آیا تھا۔ اس بیس سال میں چودہ سال کی وہ مدت بھی شامل ہے جو ہندوستان کو آزاد ہوئے اور ترقی اور خوشحالی کی راہ پر چلتے ہوئے گذری ہے۔ اس عرصے میں، دنیا کو تو چھوڑیئے آپ کا ہندوستان ہی نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا لیکن نہ بدلا تو یہ گاؤں! وہی مٹی کیچڑ میں سنی ہوئی کھوریں اور گلیاں، وہی ٹوٹے پھوٹے مکان، وہی مرے ٹوٹے گائے بیل، چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے وہی سوکھے سڑے بچے، وہی ہل، وہی کھرپی کدال! حالانکہ یہ گاؤں ڈیولپمنٹ بلاک میں شامل ہے جسے قائم ہوئے بھی تین چار سال کا زمانہ ہو گیا۔ کیا بلاک والے کچھ نہیں کرتے؟"

میں ہر دوسرے تیسرے سال جب بھی اس گاؤں میں جانے کا پروگرام بناتا، تو اس کا ایک نقشہ بھی اپنے دماغ میں بنا لیتا۔ وہ نالا جسے گاؤں تک پہنچنے کے لئے پار کرنے میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتے ہیں، اب اس کے اوپر پل بن گیا ہوگا۔ بھائی صاحب نے اب اپنے مکان کی بیٹھک نئی بنوالی ہوگی، پہلے والی بیٹھک میں بڑی تکلیف اور گھٹن ہوتی تھی، وہ کھور جو بیچ میں سے گزرتی ہے اور گرمی کے زمانے میں بھی گندے پانی اور کیچڑ سے بھری رہتی ہے، اب پکی ہو گئی ہو گی، غرض اور نہ جانے کیا کیا کچھ، لیکن جب پانچ چھ میل پیدل سفر کر کے کھیتوں کی مینڈیں ناپتے ہوئے کسی طرح بھائی صاحب کے گاؤں پہنچ جاتا تو دیکھتا کہ وہی ڈھاک کے تین پات!! جی جل کر رہ جاتا، سوچا ہوا تھا کہ اب کی مرتبہ بھائی صاحب اور دس پانچ اور بڑے کسانوں سے بات کروں گا، مگر رشتے داری کا معاملہ، سوچ ہی سمجھ کر رہ جاتا تھا۔ اس مرتبہ کمبخت دل نہیں مانا: گاؤں کے سبھاپتی اور دس پندرہ آدمی اور کسی معاملے پر بات چیت کرنے کے لئے بھائی صاحب کے گھر پر جمع ہوئے تھے۔ میں بھی بن بلائے ہی پہنچ گیا تھا اور لوگوں سے باتیں شروع کر دی تھیں۔

"میاں، یہاں پارٹی بندی کے جوڑ توڑ سے کسے فرصت ہے جو گاؤں کی ترقی اور بھلائی کی بات سوچے گا" بھائی صاحب بولے۔

میں نے کہا "آپ تو بولتے نہیں بھائی صاحب، پارٹی بندی سے گاؤں چاہے ترقی نہ کرے، مگر اپنے ذاتی کاموں میں پارٹی بندی سے کیا فرق پڑ جائے گا! اپنے کھیتی باڑی کے طریقوں میں آپ نے کون سی ترقی کر لی ہے! حالانکہ آپ اتنے بڑے کسان ہیں، چاہتے تو نئے طریقے کی کھیتی سے میل کھڑا کر لیتے۔ لیکن اپنی قید خانے جیسی بیٹھک میں تو تبدیلی کر نہ سکے آپ"

"نہیں" سبھاپتی نے بات کاٹی۔ "وہ ٹھیک کہتے ہیں۔ پارٹی بندی یہاں کے لوگوں کے نجی اور ذاتی کاموں میں بھی رکاوٹ ڈالتی ہے۔ آپ دوسرے تیسرے سال چند دن کے لئے تو مہمان ہوتے ہیں، آپ کو تہہ کا حال معلوم نہیں ہو سکتا ــــ اور ابھی جو آپ نے پوچھا کہ کیا بکاس کھنڈ والے کچھ نہیں کرتے، تو سنئے، وہ لوگ تو بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں، گاؤں والے ہی کچھ نہیں کرتے۔ وہ تو کنوؤں کی منڈیریں بنوانے کو تیار ہیں، کھوروں اور گلیوں کو پکا کرانے کے لئے کہتے ہیں، لیکن یہاں کوئی شرم دان (محنت کا دان) دینے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ ایک پارٹی تیار ہوتی ہے تو دوسری پارٹی کے لوگ پیچھا کھینچ جاتے ہیں"

"مگر آپ تو سبھاپتی ہیں، گاؤں کی اکثریت نے آپ کو سردار چنا ہے۔ آپ لوگوں کو سمجھائیے، آپ کو کسی پارٹی کا طرف دار نہ ہونا چاہئے!" میں نے کہا۔

"بھئی میں تو کسی پارٹی میں نہیں ہوں لیکن اس کو کیا کروں کہ جن لوگوں نے مجھے ووٹ دیا ہے وہ اگر میرے کہنے سے کسی کام کے لئے تیار ہوتے ہیں، تو انھی کے ساتھ لوگ مجھے بھی شبہے کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں اور میرا اعتبار بھی نہیں کرتے۔ سارا معاملہ اسی طرح کھٹائی میں پڑا ہے"

"بکاس کھنڈ کے سماج شکشا آرگنائزر صاحب کبھی آکر نہیں سمجھاتے بجھاتے؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا تو نام ہی ہم آج سن رہے ہیں اور وہ بھی آپ سے! ہاں گرام سیوک صاحب کبھی کبھی ادھر آنکلتے ہیں، مگر جب گاؤں ہی کسی بات کے لئے تیار نہیں، تو وہ بھی کیا کریں گے؟" ایک دوسرے صاحب بولے جو شاید دوسری پارٹی کے تھے۔

میں واقعی صرف چند دن کے لئے گیا تھا۔ اتنا موقع نہیں ملا کہ حالات کا گہرائی سے مطالعہ کرتا اور کوئی نتیجہ نکالتا۔ چند باتیں جو گاؤں میں اوپر اوپر سے دیکھنے میں آئیں، یہ ہیں:

۱۔ گاؤں کی آبادی ملی جلی ہے۔ ہندو مسلمان تقریباً برابر تعداد میں رہتے ہیں۔ مگر پارٹی بندی، ہندو مسلم پارٹی بندی بالکل نہیں ہے۔ دونوں پارٹیوں میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ اور برابر برابر تعداد میں شامل ہیں۔

۲۔ آبادی زیادہ تر ان پڑھ لوگوں کی ہے اور چونکہ خود گاؤں میں کوئی اسکول نہیں ہے اس لئے بچے اور نوجوان بھی ساٹھ ستر فی صدی سے زیادہ ان پڑھ ہی ہیں۔

۳- گاؤں میں پنچایت گھر اور چوپال کی قسم کی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ کسان ہیں۔ مگر چھوٹے چھوٹے۔ بڑے کسان صرف تین چار ہیں جن میں ایک سبھاپتی بھی ہیں۔ یہ سبھاپتی صاحب بھی کل چوتھی جماعت تک پڑھے ہوئے ہیں البتہ پہلے گاؤں کے زمیندار اور بڑے آدمی تھے اور اب بھی غالباً سب سے بڑے کسان ہیں اس لئے ان کے بزرگ ہمیشہ گاؤں کے مکھیا رہے تھے اور یہ بھی سبھاپتی ہونے سے پہلے مکھیا ہی تھے۔ عمر زیادہ نہیں ہے، یہی تیس پینتیس سال کے ہوں گے۔

۴- ہریجنوں کی بستی گاؤں سے الگ ہے مگر اُن کے کنوئیں کی منڈیر پکّی بن گئی ہے اور شاید اس سے ملا ہوا ایک چھت دار غسل خانہ بھی ہے۔ یہ اندازہ میں نہیں کرسکا کہ آیا وہ لوگ بھی گاؤں کی پارٹی بندی میں شامل ہیں یا نہیں۔

۵- ڈیویلپ منٹ بلاک کے کچھ افسروں سے بھی ایک موقعے پر ملاقات ہوئی تھی۔ اُن کا کہنا بھی یہی تھا کہ وہاں کے لوگ کچھ کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہاں سے کچھ لوگ کھاد اور بیج وغیرہ لے جاتے ہیں لیکن وہ بھی بس کبھی ہی کبھی۔

۶- غالباً بلاک کی سطح پر ایک قرضہ سوسائٹی قائم ہے لیکن جو لوگ قرضہ لیتے ہیں وہ براہِ راست سوسائٹی سے نہیں لیتے بلکہ ایک تیز قسم کا آدمی شاید ایجنٹ کی حیثیت سے قرضہ بانٹنے کے لئے روپیہ لاتا ہے اور سُنا ہے ضرورت مند کسانوں کو اپنا حصّہ رکھ کر قرضہ بانٹتا ہے۔

۷- یہ قرضے کی رقم بھی عام طور پر روزانہ کی ضروریات پر صرف ہوتی ہے اور جس مقصد کے لئے قرضہ لیا جاتا ہے وہ جوں کی توں پڑی رہ جاتی ہے۔

گاؤں کی پسماندگی کا یہ مسئلہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر آپ اس کا کوئی حل نکالیں تو ہم خوشی سے اُسے ان صفحات میں جگہ دیں گے۔

بچوں کی باڑھ میں کھیل کی حیثیت

آدمی اور جانور کے بچوں کا فرق

آپ جانوروں کے بچوں کو بھی دیکھتے ہوں گے۔ اور آدمی کے بچوں کو تو خیر دیکھتے ہی ہیں۔ جانور دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن کے بچے اُن کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں اور ماں کا دودھ پیتے ہیں اور ایک وہ جن کے بچے اُن کے انڈوں میں سے نکلتے ہیں اور دودھ نہیں پیتے۔ آپ دیکھتے ہوں گے کہ اِن دونوں طرح کے جانوروں کے بچے بہت جلد بڑے ہوجاتے ہیں اور اُن کے بچپن کا زمانہ بہت کم ہوتا ہے۔ اسی طرح اِن جانوروں کے بچے ایک ہی طرح کی طبیعت اور عادت کے ہوتے ہیں، بچے بچے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

ایک بات آپ اور دیکھتے ہوں گے کہ اِن باتوں میں پیٹ سے پیدا ہونے والے اور انڈے سے نکلنے والے بچوں کے درمیان بھی فرق ہوتا ہے۔ انڈے سے نکلنے والے بچوں کے مقابلے میں دودھ پلانے والے جانوروں کے بچوں کا بچپن کا زمانہ زیادہ لمبا ہوتا ہے اور وہ انڈے سے نکلنے والے بچوں کے مقابلے میں ماں کی دیکھ بھال اور پرورش کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں۔ وہ کھیلتے کودتے بھی زیادہ ہیں اور انڈے سے نکلنے والے

بچوں کے مقابلے میں سمجھ دار بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

کھیل کی حیثیت

اِن دونوں باتوں سے یعنی بچپن کی مدت کا لمبا ہونا اور کھیلنا کودنا، یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بچپن کا زمانہ اور پالنے پوسنے کی مدت جتنی زیادہ لمبی ہوگی اور کھیل کود کا موقع جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی بچہ زیادہ ہوشیار اور سمجھ دار ہوگا۔

آدمی اور جانور کا فرق آپ جانتے ہی ہیں۔ یہ فرق اسی وجہ سے ہے کہ جانور کے بچے کے بچپن اور بے بسی کی مدت کم ہوتی ہے اور کھیلنے کودنے کا موقع کم ملتا ہے اُس کے مقابلے میں آدمی کا بچہ ایک لمبے عرصے تک بے بس اور ماں باپ کی پرورش کا محتاج ہوتا ہے اور کھیلنا اور کودنا ہی اس کا ایک کام ہوتا ہے۔ کھیلنے اور بھی بہت سے جانوروں کے بچے ہیں، اور خاصی لمبی مدت تک کھیلتے ہیں جیسے بلی اور بندر کے بچے۔ لیکن آدمی کے بچوں کی طرح کسی جانور کا بچہ اِس طرح بے دھڑک ہوکر، اس طرح نئے نئے کھیل نکال کر، اتنا لگاتار اور اتنے عرصے تک نہیں کھیلتا جس طرح آدمی کا بچہ۔

اِن سب باتوں سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ کھیل بچے کے جسم اور دماغ کی باڑھ کے لئے بہت ضروری چیز ہے۔ کھیل اصل میں بچے کا کام ہے اور ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے وہ بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے۔ اگر کوئی بچہ پھرتیلے پن سے کھیلتا کودتا نہیں ہے تو یہ اِس بات کی علامت ہے کہ یا تو اس میں کوئی پیدائشی خرابی ہے یا اُسے کوئی دماغی بیماری ہوگئی ہے۔

کھیل کا مطلب

آپ کو اپنے گھر سے الگ کسی ایسی جگہ رہنا ہو جہاں پہلے آپ کبھی گئے نہیں اور پہلے کبھی دیکھا نہیں تو آپ کیا کریں گے؟ یہ تو آپ نہیں کریں گے کہ ایک کوٹھری میں اپنے آپ کو بند کر لیں اور کبھی باہر نہ نکلیں!! آپ اپنے آس پاس کا پتہ لگائیں گے۔ وہاں کے لوگوں سے ملیں جُلیں گے اور ایک عرصے تک اُن سے سوال پر سوال کرتے رہیں گے۔ وہاں کے لوگ جو کچھ کریں گے، کچھ عرصے تک وہی آپ بھی کریں گے۔ تب کہیں ایک مدت کے بعد آپ اس قابل ہوں گے کہ اپنی سوجھ بوجھ اور فیصلے سے کچھ کر سکیں۔

بالکل یہی حال آدمی کے بچّے کا بھی ہے۔ وہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد جس دنیا میں آتا ہے، وہ اُس کے لئے بالکل نئی جگہ ہوتی ہے۔ اُس کو اِسی دنیا میں رہنا ہوتا ہے اس لئے وہ اس کی کھوج لگاتا ہے، سب سے پہلے اپنے مُنھ کے ذریعے پھر آگے چل کر چیزوں کو بے دھڑک چھُو کر؛ وہ چیزوں کو تتر بتر کر دیتا ہے۔ اُنھیں توڑ پھوڑ دیتا ہے، گُڑیا کو آگ میں پھینک دیتا ہے کہ دیکھے جلتی ہے یا نہیں۔ دیا سلائی کی ڈبیہ کو کھول کر تیلیوں کو بکھیر دیتا ہے۔ اِدھر اُدھر جھانکتا پھرتا ہے۔ "کیا"، "کیوں" اور "کیسے" کے سوال کر کر کے ناک میں دم کر دیتا ہے۔ ہر وقت کھود کھاد لگائے رہتا ہے۔ کتاب کے پنّے پھاڑ دیتا ہے کہ دیکھے اس میں سے کیسی آواز نکلتی ہے۔

ان معلوماتی کھیلوں کے علاوہ بہت سے کھیل بچہ ایسے بھی کھیلتا ہے جن کا تعلق اس کے آس پاس کے سماج سے ہوتا ہے۔ جیسے ننھی بہن کے ساتھ ماں باپ کا ناٹک کرتا ہے، پولیس اور سپاہی کا روپ بھرتا ہے۔ ڈنڈے کی سواری بنا کر سفر پر جاتا ہے۔ سونے اور سو کر اٹھنے کی

نقل کرتا ہے۔ ننھی بچی پتوں کی پلیٹ اور تھالی بنا کر مٹی اور گھاس رکھ کر ننھے بھیا کو کھانا دیتی ہے اور وہ اپنے خیال میں اُس کو کھاتا ہے۔ غرض وہ سب کچھ کرتا ہے جو اپنے بڑوں کو کرتے دیکھتا ہے۔

اِن کھیلوں سے وہ جس دنیا میں ہے اُس کے اندر اپنی جگہ بنانے کی مشق کرتا ہے۔ وہ جو کچھ اپنی بے بسی کی وجہ سے اصلی دنیا میں نہیں کر سکتا اور نہ بن سکتا ہے وہ اُسے اِس کھیل کی دنیا میں حاصل ہو جاتا ہے اور اِس طرح اس کے دل اور دماغ پر اصلی باتوں کا جو بوجھ پڑتا ہے، وہ ہلکا ہو جاتا ہے اور وہ تازہ دم اور مگن رہتا ہے۔

اس بات چیت کا نتیجہ

کھیل بچے کی باڑھ کے لئے کتنی ضروری چیز ہے، یہ بات اب صاف طور سے سمجھ میں آسکتی ہے ہم ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ سمجھ دار ماں باپ کے لئے بچے کی پرورش میں کھیل سے کتنی زیادہ مدد مل سکتی ہے اور اگر اس سے اُسے روکا جائے تو اس سے کتنا زبردست نقصان ہو سکتا ہے۔ بچوں کا چونچال پن اور نچلا نہ بیٹھ سکنے کی عادت، اُن کی شوخی اور شرارت، تاک جھانک، ہر وقت کے سوال، چڑھنا اُترنا، دوڑ بھاگ، کھود کھاد، دھول مٹی میں سنے ہوئے ہاتھ پیر اور پھٹے ہوئے کپڑوں کی طرف سے بے پروائی — یہ باتیں ایسی نہیں ہیں جن پر افسوس اور گھبراہٹ ظاہر کی جائے اور کوشش کی جائے کہ بچہ یہ عادتیں جلد سے جلد چھوڑ دے۔ یہ آدمی کے بچے کی شان ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ اُس کے اندر وہ اتھاہ قوت موجود ہے جس سے کام لے کر انسان نے بڑے بڑے کارنامے کئے ہیں اور اب چاند تاروں پر بھی اپنا سکہ جمانے کی ترکیبیں کر رہا ہے۔

دو لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہمیں اپنے بچوں کے چونچال پن، اچھل کود اور کھیل تماشے پر غصہ نہیں کرنا چاہیئے اور نہ اس سے اُن کو روکنا اور ڈانٹنا پھٹکارنا چاہیئے۔ اُن کی باڑھ میں اُن کے چونچال پن، اُچھل کود اور کھیل تماشے سے بڑی مدد ملتی ہے اور اس کے ذریعے وہ زندگی کی بہت سی باتیں اپنے آپ سیکھ جاتے ہیں۔

(اب اگلے پرچے میں)

اپنا کام اپنے ہاتھ

سہکاری سوسائٹیاں اور گرام بھون بنائیے

(پچھلے پرچے سے ملا کر پڑھئے)

پچھلے مہینے کے پرچے میں ہم نے کہا تھا کہ آدمی کے کام دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک اکیلے اور اپنے خاندان والوں کی مدد سے کرنے کے کام اور دوسرے ایسے کام جن کے لئے بہت سے لوگوں کو مل کر زور لگانا پڑتا ہے۔ دوسری طرح کے کام بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بہت سے لوگ مل کر کریں تو اچھا ہوتا ہے لیکن انہیں اکیلا آدمی بھی کر سکتا ہے مگر وہ اچھا نہیں ہو گا، بس رو پیٹ کر ختم ہو جائے گا، پھر بھی ادھورا ہی رہے گا۔ دوسرے کچھ ایسے کام ہیں جو اکیلے کسی طرح ہو ہی نہیں سکتے۔ انہیں کرنے کے لئے دس بیس پچاس آدمیوں کو اکٹھا

ہونا ہی پڑتا ہے۔

آپس میں ایک دوسرے سے مل جُل کر کام کرنے کی کیا قدر و قیمت ہے اور اس میں کیا فائدہ ہے اُس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ آگ آدمی کی زندگی کے لئے کتنی ضروری چیز ہے۔ وہ پیدا ہوتی ہے دو چیزوں کے آپس میں رگڑ کھانے سے۔ دیا سلائی کی ڈبیہ میں سالہ لگی ہوئی تیلی الگ رکھی رہتی ہے اور ڈبیہ کے دو طرف سالہ لگا ہوا کاغذ الگ ہوتا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں آگ پیدا کرنے کی قوت ہے لیکن جب تک اُن کو ایک دوسرے سے ملا کر رگڑا نہ جائے، آگ روشن نہیں ہو سکتی۔

انسان معمولی سے معمولی کیوں نہ ہو، اس میں بڑی طاقت ہے لیکن یہ طاقت ظاہر اُسی وقت ہوتی ہے جب انسان انسان ایک دوسرے سے ٹکرا کر رگڑ کھاتے ہیں۔ یورپ کے لوگوں اور ہمارے جیسے پچھڑے ہوئے ملکوں کے لوگوں میں سب سے بڑا فرق یہی ہے۔ وہ لوگ ایک دوسرے سے رگڑ کھا کر زندگی کی گرمی پیدا کرنے کا گُر جانتے ہیں اور قریب قریب ہر کام آپس میں مل جُل کر کرتے ہیں۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں اور قریب قریب ہر کام اکیلے بلکہ دوسروں سے چھپا کر کرنے کے عادی ہیں۔ جب تک ہمارے اندر یہ عادت قائم رہے گی، ہمارے اندر زندگی کی گرمی نہیں پیدا ہوگی اور ہم ترقی نہیں کر پائیں گے۔

سہکاری سوسائٹی

مل جُل کر کام کرنے کا ایک طریقہ سہکاری سوسائٹی بنا کر کام کرنا ہے۔ سہکاری سوسائٹی زیادہ تر ایسے کاموں کے لئے بنائی جاتی ہے جو آمدنی والے کام ہوتے ہیں۔ جیسے

پیداوار کو بیچنے کا انتظام کرنے والی سوسائٹی، گھریلو جٹائی کے لئے ٹریکٹر سوسائٹی، دودھ سے مکھن، گھی، پنیر بنانے کے لئے ڈیری سوسائٹی، بہت سے کھیتوں کو ایک میں ملا کر بڑے پیمانے پر کھیتی کرنے والی سہکاری کھیتی سوسائٹی اور کھیتی کے کاموں میں ضرورت کے وقت روپیہ دینے والی قرضہ سوسائٹی۔

یہ تو سہکاری سوسائٹیوں کے دو چار جانے بوجھے نام ہیں۔ ایسے ہی مل جل کر کئے جانے والے بیسیوں کاموں کے لئے بیسیوں سہکاری سوسائٹیاں بن سکتی ہیں۔ یورپ کا ایک ملک ہے ڈنمارک۔ وہاں تو گاؤں کے لوگوں کو سہکاری سوسائٹی کا ایسا چسکا پڑ گیا ہے کہ مل جل کر کرنے والا کوئی کام لوگ سہکاری سوسائٹی بنائے بغیر کرتے ہی نہیں۔

سہکاری سوسائٹی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے اوپر بھروسہ کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ ہمارے دیس کا ایک بڑا ابھاگ یہ بھی ہے کہ ہم ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کو شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی دیکھ لے یا جان جائے تو کام کو اس کی نظر لگ جائے گی۔ سہکاری سوسائٹی بنا کر کام کرنے سے ہر معاملے میں سوسائٹی کے ممبر آپس میں صلاح مشورہ کرتے ہیں۔ ہر ممبر کو ہر بات کی خبر رہتی ہے۔ ہر معاملے پر خوب کھل کر بات چیت ہوتی ہے۔ ہر ممبر دوسرے ممبر کی بات سنتا اور اپنی بات کہتا ہے۔ اِس طرح ایک کام کو کرنے کے لئے دس دماغ سوچتے ہیں۔ مثل مشہور ہے "ایک سے دو اچھے"۔ سہکاری سوسائٹی میں اسی مثل کے مطابق کام ہوتا ہے اِس لئے اچھا ہوتا ہے۔

پھر سرکار کی بھی خوشی اسی میں ہے کہ لوگ سہکاری سوسائٹی بنا کر کام کریں۔ نجی پونجی لگا کر کام کرنے والوں کے مقابلے میں سہکاری سوسائٹی بنا کر کام کرنے والوں

سرکار بھی مدد دیتی ہے۔ حکومت سہکاری سوسائٹی کو قرضہ بھی معمولی سود پر دیتی ہے اور قرضہ چکانے کے لئے کوئی سختی نہیں کرتی بلکہ آسانی سے ادا ہو جانے والی قسطیں مقرر کر دیتی ہے۔

بکاس کھنڈ والے سہکاری سوسائٹی بنوانے میں لوگوں کی ہر طرح مدد کرتے ہیں۔ بس سوسائٹی بنانے والوں کے کہنے کی دیر ہوتی ہے، باقی وہ لوگ سب کام کرا دیتے ہیں اور اُسے کامیابی سے چلانے میں مدد بھی کرتے ہیں۔ بس دس بارہ آدمی اپنے میل جول کے اکٹھا کر لیجئے اور بکاس کھنڈ والوں سے مل کر اپنے مطلب کے کام کی سہکاری سوسائٹی بنا لیجئے۔

گرام بھون

آدمی کے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جنھیں وہ اکیلا کر سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو جو کام آدمی کے اکیلے کرنے کے ہوتے ہیں، اُن میں بھی آپس میں ملنے جُلنے کا پہلو نکل آتا ہے۔ جیسے گھر کی ترتیب اور رکھ رکھاؤ ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اپنے گھر کو جس حالت میں آپ خود رکھنا چاہتے ہیں، اُسی حالت میں رکھیں گے لیکن یہ بات تو آپ کو معلوم ہی کرنی پڑے گی کہ گھر کو کس حالت میں رکھیں کہ وہ اچھا اور خوبصورت معلوم ہو۔ یہ معلومات آپ کو کیسے ہوگی؟ ظاہر بات ہے آپ کسی جاننے والے سے صلاح و مشورہ کریں گے۔ دوسرے لوگوں کے گھروں کو دیکھیں گے۔ اور سو بات کی ایک بات یہ کہ گھر کو سجانے بجانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب کی سب آپ اپنے ہاتھ سے تو نہیں بنائیں گے۔ کسی سے بنوائیں گے یا کسی کی بنائی ہوئی خریدیں گے۔ بچوں کی پرورش ٹھیک ہے، آپ ہی جیسے چاہیں کریں گے۔ اس بیچ میں کسی کو بولنے کا حق نہیں ہے۔ لیکن یہ تو آپ بھی چاہیں گے کہ بچے کی پرورش اس طرح ہو کہ اُس کی بڑھوتری رُکنے نہ پائے۔ یہ بات معلوم کرنے کے لئے کسی نہ کسی کا سہارا اپنا ہی پڑے گا۔

اِس بات کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایک دوسرے سے ملے جُلے بغیر زندگی گذار ہی نہیں سکتا۔ پورا گاؤں ہو یا ایک شخص، آپس میں ملنے جُلنے کی عادت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی وہ ترقی پر ہوگا، اور جتنی کم ہوگی، اُتنا ہی وہ پیچھے رہے گا۔

یہی ضرورت ہے جس کو پورا کرنے کے لئے لوگ اپنی بستیوں، ٹولوں محلوں اور گاؤوں میں ایک نہ ایک جگہ ایسی بنا لیتے ہیں جہاں بستی، ٹولے محلے یا گاؤں کے سب لوگ بے روک ٹوک آجا سکتے ہوں اس جگہ کے الگ الگ مقامات پر الگ الگ نام ہوتے ہیں جیسے بستی گھر، کمیونٹی سنٹر، محلہ مرکز۔ آپ اپنے گاؤں میں ایسی کوئی جگہ بنائیں تو اُس کا نام "گرام بھون" رکھ سکتے ہیں۔

گرام بھون کے ایک چھوڑ کئی فائدے ہیں۔ آپ کام پر سے تھکے ہارے آئے ہیں۔ روٹی ٹکڑا کھانے پینے کے بعد جی چاہتا ہے گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر دوست احباب سے ہنسیں بولیں، گپ شپ کریں گائیں بجائیں تاکہ تھکن دور ہو کر جی ہلکا ہو جائے۔ اسی طرح کی ضرورت آپ کے گھر کی عورتوں، بن بیاہے نوجوان لڑکے لڑکیوں یہاں تک کہ بچوّں کو بھی ہوتی ہے۔ یہ جو آپ اپنے لڑکے لڑکیوں اور ذرا ہوشیار بچوّں کو پاس پڑوس میں کہیں جا کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ غائب رہنے پر چیختے چلاتے اور ڈانٹتے پھٹکارتے ہیں، اِس میں اُن کی اتنی خطا نہیں ہے جتنی آپ اور آپ جیسے گاؤں کے دوسرے سمجھ دار لوگوں کی خطا ہے۔ آپ لوگوں نے اپنی بستی یا گاؤں میں ایسی کوئی جگہ ہی نہیں بنائی، جہاں آپ خود آپ کی عورتیں، آپ کے لڑکے لڑکیاں اور چھوٹے بڑے بچے جا کر اکٹھے ہوں، ہنسیں بولیں، گائیں بجائیں، اور خوش ہوں۔

مثل مشہور ہے دیئے سے دیا جلتا ہے۔ ایک آدمی، چاہے وہ بڑے سے بڑا پنڈت ہی ہو سب باتیں نہیں جانتا۔ دس آدمی اکٹھے ہوتے ہیں تو دس طرح کی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ان میں بہت سی

باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت سے لوگ پہلے سے نہیں جانتے ہوتے۔ اسی طرح کی مجلسوں میں دوسروں سے سُن کر حاصل کر لیتے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں معلوم کرنے کے لئے کسی جانکار کی باتیں اور لیکچر سُننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر کوئی جانکار گھر گھر جا کر تو لیکچر نہیں دے گا! اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے کسی بیٹھک کی جہاں دس بیس پچاس آدمی اکٹھے ہو سکتے ہوں۔

آپ اگر اپنے گاؤں میں گرام بھون بنالیں تو آسانی سے اِس طرح کی باتیں سُننے کے لئے ہر دسویں پندرھویں دن کسی نہ کسی جانکار آدمی کو بُلوا سکتے ہیں۔

گاؤں میں آئے دن مہمان آتے رہتے ہیں۔ اپنا گھر ہو سکتا ہے اچھی حالت میں نہ ہو، یا مہمان کے دو چار دن ٹھہرنے کی وجہ سے گھر کی عورتوں اور لڑکیوں کی آزادی میں فرق پڑے، اگر گرام بھون موجود ہو، تو گاؤں کے سب مہمانوں کو اس میں ٹھہرا دیا جائے۔ مہمان بھی آرام سے ٹھہریں اور گھر کی آزادی بھی قائم رہے۔ اسی طرح گاؤں میں کوئی بارات آئی ہو، تو اُسے بھی گرام بھون میں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

غرض گاؤں میں گرام بھون بن جائے تو اس کی بیسیوں مشکلیں آسان ہو جائیں۔ آپ سوچیں گے کہ جب تک پورا گاؤں اس کے لئے تیار نہ ہو جائے، یہ کام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سوچئے کہ مل جُل کر گائے جانے والے گیتوں میں گیت شروع کرنے والا یا گیت کڑھانے والا ایک ہی ہوتا ہے۔ جب وہ گانا شروع کر دیتا ہے تو دوسرے لوگ بھی سُر میں سُر ملا کر گانے لگتے ہیں۔ گرام بھون بنانے میں آپ پہلے قدم اٹھائیے آپ دیکھیں گے کہ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی بہت جلد آپ کے ساتھ آ جائیں گے۔

اگلے پرچے میں ہم گرام بھون کا نقشہ اور اس کے سلسلے کی دوسری ضروری باتیں بتائیں گے۔

جنت کے لئے پہلے مرنا پڑتا ہے

جب ہم بہت زیادہ موج میں ہوتے ہیں تو اُسی ترنگ میں کہہ اُٹھتے ہیں "واہ! جنّت کا مزہ آگیا" جنت کے ذکر سے مجھے ایک اُدگھڑ کی بڑ یاد آجاتی ہے جو کہتا پھرتا تھا "اپنے مرے بغیر جنت نہیں ملے گی" اِس بات میں بڑی سچّائی ہے۔ کسی بھی طرح کی خوشی ہو وہ آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بڑا پتّہ مارنا پڑتا ہے۔ جنّت کے مزے کے لئے پہلے مرنا پڑتا ہے اور مرنا ہی نہیں مرنے سے بھی پہلے نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، تب کہیں جاکر اس کی صرف اُمید بندھتی ہے یقین پھر بھی نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح سکھ بھوگنے کے لئے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اچھے دن کی امید میں بُرا بھلا ہر طرح کا وقت کاٹنا ہوتا ہے۔ محنت مشقّت کرنی ہوتی ہے۔

زندگی کا آرام اُٹھانے کے لئے ہم کام کرتے ہیں۔ کام کو آسان بنانے کے لئے طرح طرح کے اوزاروں اور سامانوں کی مدد لیتے ہیں۔ گھاس کھودنے میں کُرپی اور کُدال، زمین کی جُتائی میں ہل بیل اور ٹریکٹر، سینچائی کے کاموں میں کنوئیں تالاب اور ٹیوب ویل یہ سب ہمارے

کام کو آسان بناتے ہیں۔ ہمارے پاس اس طرح کے جتنے سامان ہوں گے کام اتنا ہی اچھا اور آسان ہوگا۔ کام میں جتنی آسانی ہوگی زندگی میں اتنا ہی آرام ملے گا۔ اُپج بڑھے گی اور زندگی میں اطمینان اور خوشی پیدا ہوگی۔

دور کیوں جایئے خود اپنے گاؤں کو دیکھئے۔ گاؤں میں پانی کی قلت ہے۔ آپ ایک کنواں کھودنا چاہتے ہیں جس سے آپ کے کھیتوں کو پانی مل جائے۔ اس کے لئے آپ تھوڑا تھوڑا کر کے پیسے بچاتے ہیں۔ پیسہ بچانے کے لئے روز کے خرچ کو کاٹتے ہیں۔ یعنی اپنی زندگی کے آرام قربان کرتے ہیں۔ جب تھوڑی سی پونجی اکٹھی کی جاتی ہے تو خود محنت کر کے اور ایک دو آدمیوں کو ساتھ لگا کر آپ کنواں کھدوا لیتے ہیں۔ اس سے آپ کے کھیتوں کی سینچائی کے لئے پانی مل جاتا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ پانی آپ کے کھیتوں کی سینچائی کے لئے کافی نہیں ہے تو پھر آپ کو ٹیوب ویل لگوانے کی ضرورت ہوگی۔ اب یہ کام آپ کے لئے زیادہ مشکل ہوگا۔ یہ کام ایسا نہیں ہے جسے آپ تھوڑی سی پونجی اور اکیلے اپنی محنت سے پورا کر سکیں۔ اس کے لئے آپ کو زیادہ روپے پیسے لگانے پڑیں گے۔ زیادہ محنت اور دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی۔ انجینئر اور بڑے بڑے مستری بھی لگانے پڑیں گے۔ اس کی تیاری میں آپ کو بہت انتظار کرنا پڑے گا۔ کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ آپ کو بھی اس انتظار کا میٹھا پھل ملے گا۔ آپ کے کھیت لہلہا اٹھیں گے اور سارے گاؤں کی زندگی میں چہل پہل آ جائے گی۔ مگر اس کے لئے آپ کو بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اگر آپ کی آمدنی کم ہے تو آپ شاید کنواں کھدوانے کی بات ہی سوچیں گے۔ ٹیوب ویل لگوانے کے لئے آپ کو کئی کئی سال کیا پوری زندگی جبر کرنا پڑے گا۔ اچھے دن کے لئے صبر کرنا پڑے گا۔ جب ٹیوب ویل لگ رہا ہوگا، اس وقت تو خرچ ہر طرف سے آپ کو گھیرے ہوگا۔ مگر جب یہ ٹیوب ویل لگ جائے گا تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا، جیسے جنت مل گئی ہو۔ ٹیوب ویل کے ساتھ آپ کی نئی زندگی شروع ہوگی۔ آپ کو اپنے اچھے کرموں کا اچھا پھل ملے گا۔

ہمارے دیش میں پچھلے دس سال سے یوجنا چل رہی ہے۔ یوجنا کا مقصد آپ جانتے ہیں دیش کے جیون کو اونچا اٹھانا ہے۔ اس کے سامنے کسی ایک آدمی یا کسی ایک گاؤں کا جیون نہیں ہے۔ اس کے سامنے آپ کے گاؤں جیسے ۵ لاکھ گاؤں اور ہزاروں شہروں کا جیون ہے۔ آپ جانتے ہیں کام جتنا بڑا ہوتا ہے اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جس طرح کنوئیں کے مقابلے میں ٹیوب ویل بنانے کا کام۔ اس میں وقت بھی بہت لگتا ہے اور روپیہ پیسہ بھی۔ اس میں بڑے بڑے آدمیوں کے دماغ اور ہوشیار آدمیوں کے ہاتھ لگتے ہیں، تب کہیں جا کر وہ کام پورا ہوتا ہے۔ یوجنا ہمارے اس بڑے دیس کے لئے بہت بڑے بڑے ٹیوب ویل بنانے سے بھی بڑے کام کر رہی ہے۔ وہ دریاؤں پر بڑے بڑے بند باندھ کر نہریں نکال رہی ہے جس سے ہزاروں اور لاکھوں ایکڑ کھیتوں کو پانی مل سکے۔ کھاد اور فصل بچانے کی دواؤں کے بڑے بڑے کارخانے بنا رہی ہے تاکہ زیادہ اور اچھی فصل پیدا ہو سکے۔ فولاد کے بڑے بڑے کارخانے بنا رہی ہے تاکہ ان سے ہمیں کام کرنے کے لئے اچھے اوزار اور مشینیں مل سکیں۔ بجلی پیدا کر رہی ہے تاکہ ہمارے کل کارخانے چل سکیں اور ملک کی اندھیری زندگی میں اُجالا ہو سکے۔ یہ سب چیزیں ہمارے کام میں مدد دیں گی جس سے ہم زندگی میں زیادہ آرام اُٹھا سکیں گے۔

سوچئے تو سہی ہمارے جیسے غریب ملک کے لئے یہ کتنا مشکل کام ہے۔ مگر یہ کام اب سے دس سال پہلے شروع ہو چکے ہیں۔ اِس بھروسے پر کہ ہم ان کاموں میں مدد دیں گے اور اپنے ملک کو جنّت کا نمونہ بنائیں گے اپنے آرام کو قربان کریں گے اور آنے والے اچھے دن کے لئے محنت کریں گے۔ بغیر محنت اور قربانی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ نہ ہم خود آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ ملک اُونچا اُٹھ سکتا ہے۔ ہماری یوجنا کا یہی سندیش ہے۔

اوگھڑ نے سچ ہی کہا ہے "بغیر مرے جنّت بھی نہیں ملے گی"!!

28 AUG 1961

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ایڈیٹر:- برکت علی فراق

جلد ۱۲ | اگست ۱۹۶۱ء | شمارہ ۸

اشارات

ستمبر کا پرچہ ۱۹۶۱ء کا اسپشل نمبر ہوگا جس میں "پنچایتی راج کی اسکیم اور سوشل ایجوکیشن کا منصب" کے زیر عنوان مختلف نقطۂ خیال کی نمایندگی کرنے والے مضامین جمع کئے جائیں گے۔ یہ اسپشل نمبر حسب دستور معمولی پرچوں سے زیادہ ضخیم ہوگا اور اس کی تالیف و ترتیب میں وقت بھی زیادہ صرف ہوگا اس لئے اگست کا یہ پرچہ عام معمول سے ہٹ کر صرف آٹھ صفحات کا شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ صرف اس غرض کے لئے ہے کہ اسپشل نمبر کی اشاعت کی آپ کو اطلاع ہو جائے اور آپ اس کی ترتیب و تالیف کے لئے ہمیں اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کی اجازت دیں۔

ملک کے لئے یہ دور اسکیموں اور تجربات کا دور ہے لیکن اگر ملک کسی اسکیم یا تجربے سے اچھی طرح واقف نہ ہو جائے، اس کی اونچ نیچ کا [illegible] اور ان باتوں کو سوچ سمجھ کر اس میں جی جان سے شریک نہ ہو، تو اچھی سے اچھی اسکیم دھری کی رہ جاتی ہے۔

[illegible] لامرکزیت کے عنوان سے پنچایتی راج کا اصول اب سے تین چار سال پہلے منظور کیا گیا تھا اور اس کے سال ڈیڑھ سال کے بعد [illegible] کے اوپر عمل بھی شروع ہو گیا، لیکن اب بھی یہ کیفیت ہے کہ عوام تو دور رہے "خود ڈیولپمنٹ کا کام کرنے والے [illegible] سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔

[illegible] اس ناواقفیت کو دور کرنے کی ایک کوشش ہے؛ اگر اس میں "تعلیم و ترقی" کے ناظرین اور ہمدرد [illegible] کوشش کامیاب ہوئی۔

سوشل ایجوکیشن کیوں؟

سوشل ایجوکیشن کی شروعات

ہندوستان جب انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اُس وقت ملک جن مسائل سے گھرا ہوا تھا اور اس نے اپنے مستقبل کے لیے جمہوریت کا راستہ اختیار کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کے پیش نظر اِس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ملک کے سامنے عوامی تعلیم کا ایک ایسا ہمہ گیر اور جامع تصور پیش کیا جائے جو نہ صرف اِن مسائل کو حل کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہو بلکہ وہ جمہوریت کے تقاضوں کے مطابق بھی ہو۔

ذرا ان حالات کا تصور کیجیے جن میں ہندوستان کو آزادی ملی جس ملک میں ۱۰۰ میں ۸۸ آدمی ناخواندہ ہوں، غربت و افلاس کا دور دورہ ہو۔ بیماری اور گندگی زندگی میں رچ بس گئی ہو اور ذات پات اور چھوت چھات کی لعنتوں سے سماج ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہو، اِس ملک میں جمہوریت کی نشوونما میں جو دشواریاں تھیں وہ ظاہر ہیں۔ عوامی تعلیم کے کاموں میں دلچسپی رکھنے والے ان باتوں سے بے خبر نہیں تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ان حالات میں عوام کی تعلیم کا ایک ایسا جامع اور ہمہ گیر پروگرام بننا چاہیے جس کا رشتہ ملک کی سماجی زندگی کے اِن سارے پہلوؤں سے ہو۔ یہ تعلیم ایسی ہو جو زندگی کی محرومیوں سے نجات حاصل کرنے اور سماجی اور شہری ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے میں لوگوں کی مدد کر سکے۔

سوشل ایجوکیشن کا تصور ہماری انھیں ضرورتوں اور ہمارے انھیں مخصوص حالات کے پیش نظر وجود میں آیا ہے جس میں شہریت، صحت و صفائی، اقتصادی زندگی میں بہتری اور سماجی یک جہتی پیدا کرنے کے پروگرام ایک ساتھ شامل ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے ایک فقرے میں سوشل ایجوکیشن کی تعریف کرنے کو کہے تو میں کہوں گا "سوشل ایجوکیشن اچھی زندگی کی تعلیم کا دوسرا نام ہے۔"

سوشل ایجوکیشن: اڈلٹ ایجوکیشن

سوشل ایجوکیشن کی اصطلاح اگرچہ آزادی کے بعد ہی اختیار کی گئی ہے مگر دراصل یہ اڈلٹ ایجوکیشن کا ہی ایک ہندوستانی

نام ہے۔ اڈلٹ ایجوکیشن کے لئے ایک نیا نام اختیار کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔ اس کا جواب ہمیں اپنے یہاں کی اڈلٹ ایجوکیشن تحریک کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی مل جائے گا۔

ہندوستان میں بالغوں کی تعلیم کا کام انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوا۔ یورپ کے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں اس کام کی تاریخ نئی ضرور ہے۔ مگر خود یہاں کے حالات میں کام ایسا نہیں کہہ سکتے بلکہ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا یہاں ۱۲ فی صدی خواندگی تھی۔ آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ انیسویں صدی کے اخیر میں یہ تعداد ۵ فی صدی سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ ظاہر ہے جس وقت اڈلٹ ایجوکیشن کے کام کی طرف دھیان دینا شروع کیا گیا اُس وقت اڈلٹ ایجوکیشن کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ خواندگی کا تھا۔ اس طرح ہمارے یہاں اڈلٹ ایجوکیشن کی تاریخ خواندگی کے کاموں سے شروع ہوتی ہے۔ اور بہت زمانے تک اڈلٹ ایجوکیشن سے مراد خواندگی لی جاتی رہی ہے اور حالت یہ ہے کہ آج بھی اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ حالانکہ اڈلٹ ایجوکیشن کبھی خواندگی تک محدود نہیں ہے۔

اُس زمانے میں خواندگی کو پھیلانے کی یہ کوششیں کچھ بکھرے طریقے سے جاری تھیں۔ نہ حکومت کی طرف سے ان کاموں کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی اور نہ اس کے لئے باقاعدہ انجمنیں اور رضاکار ادارے قائم تھے۔ یہ کام اُس زمانے میں بیشتر اُن لوگوں کی کوششوں کا رہین منت تھا جو خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت لوگوں کو کچھ لکھنا پڑھنا سکھانا چاہتے تھے۔ یہ تحریک اسی طرح لشتم پشتم چلتی رہی۔ ملک میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ اِس طرف لوگوں کا دھیان جانے لگا تھا۔

ایک نیا موڑ ۱۹۳۷ء

ہندوستان کی اڈلٹ ایجوکیشن کی تاریخ میں ایک نیا موڑ ۱۹۳۵ء کے بعد دکھائی دیتا ہے جب کہ صوبوں میں عوام کی نمائندہ حکومتیں قائم ہوئیں۔ اب حکومتوں نے بھی اس کام میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اُس وقت تک عوامی تعلیم کے باقاعدہ رضاکار ادارے قائم ہونا شروع ہو گئے تھے اور خواندگی کا شمار ملک کے تعمیری کاموں میں ہونے لگا تھا مگر اتنا ہوتے ہوئے بھی سوائے اس کے کہ خواندگی کے کاموں میں دلچسپی لینے والوں کا حلقہ پہلے سے کچھ وسیع ہو گیا ہے اس کے مفہوم میں کوئی وسعت نہیں دکھائی دیتی ہے۔ اڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک اب بھی خواندگی تک محدود رکھی۔ مگر اب سوچنے کے طریقے میں فرق آنا شروع ہوا تھا اور اس تحریک کی ناکامی کے اسباب پر بھی غور ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بمبئی میں ۱۹۳۷ء میں اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی کا قیام بھی ہوا تھا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ ہندوستان میں اڈلٹ ایجوکیشن کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کمیٹی اپنی رپورٹ میں جس خاص نتیجے پر پہنچی اس میں سے کچھ یہ ہیں۔

(۱) ناخواندہ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سیکھنے کے عمل میں کوئی کشش نظر نہیں آتی ہے۔ اس لئے وہ اس میں دلچسپی نہیں لیتے۔

(۲) اڈلٹ ایجوکیشن کے پروگرام بالغوں کی زندگی کے حالات سے بے تعلق ہیں۔

(۳) پڑھنا لکھنا سیکھنے کے بعد لوگ اُسے جلد ہی بھلا بیٹھتے ہیں۔

غرض اس کمیٹی نے بالغوں کی تعلیم کو اُن کی زندگی کی ضروریات اور اُن کی دلچسپی سے مربوط بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس طرح اِس کمیٹی نے پہلی بار اڈلٹ ایجوکیشن پروگرام کو خواندگی کے گھسے پٹے ڈھرے سے باہر نکلنے کی طرف اشارہ کر کے اڈلٹ ایجوکیشن کو اس کے وسیع مفہوم میں سمجھنے میں مدد دی مگر عملی پروگراموں پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا اور خواندگی کی چھوٹی بڑی مہمیں اسی حال میں بدستور چلتی رہیں۔ اڈلٹ ایجوکیشن کا دم بھرنے والے خواندگی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے رہے۔ اِس سلسلے میں سب سے اچھی مثال بہار کے وزیر تعلیم کی ہمارے سامنے موجود ہے جو اسمبلی سے باہر نکلتے ہی کوچہ و بازار میں تختۂ سیاہ لٹکائے لوگوں کو پڑھنا لکھنا سیکھنے کے عمل مصروف نظر آتے تھے۔

ان سب کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا! ناخواندگی کا دیو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ یہ کچھ اِس لئے کہ اِن مہموں میں لوگوں کی دلچسپی اور ضرورتوں کا قطعی خیال نہیں رکھا گیا تھا جس کی طرف بمبئی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں خاص طور سے اشارہ کیا تھا۔ یہ خواندگی کی مہمیں کیا تھیں کچھ بے ربط سی کوششیں اور فرصت کے وقت کا مشغلہ تھیں۔ یہ کام آزادی کی تحریک کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لوگوں کی پوری توجہ ملک سے غیر ملکی اقتدار کے خاتمے پر تھی اور جب کبھی اِس مورچے پر کوئی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہوتی تو لوگ جی جان سے اُسی طرف لگ جاتے اور خواندگی کی مہموں کی طرح کے تعمیری کاموں کی طرف سے دھیان ہٹ جاتا تھا۔ سنہ ۱۹۴۲ء کی تحریک اور "ہندوستان چھوڑدو" کے نعرے نے جنگِ آزادی کی آگ کو خوب بھڑکایا اور اس میں اتنی شدت آگئی کہ اس کے سامنے خواندگی کی مہموں کی وہ بے ربط اور ادھوری کوششیں بھی دب کر رہ گئیں۔

اِس طرح آزادی سے پہلے اڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اِس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس وقت تک اڈلٹ ایجوکیشن سے خواندگی ہی مراد لی جاتی تھی۔ اس کی ایک اچھی مثال یہ ہے کہ ہندی میں ہم اڈلٹ ایجوکیشن کو "پرودڑھ ساکھرتا" (بالغوں کی خواندگی) کہتے تھے۔ یہ مثال اُس وقت کی صورتِ حال کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے اس طرح ہم ہندوستان میں اڈلٹ ایجوکیشن کو اس کے وسیع مفہوم میں سمجھا ہی نہیں گیا۔ یہ بات اُن حالات کو دیکھ کر آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے جن حالات میں رہ کر ہمارے ملک میں بالغوں کی تعلیم کی تحریک پروان چڑھی ہے۔ جس ملک میں ناخواندہ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد موجود ہو ظاہر ہے وہاں اڈلٹ ایجوکیشن پروگرام کو اپنا سارا زور اُسی مورچے پر لگانا چاہئے۔ یہ اور بات تھی کہ اِس مورچے پر بھی اُسے ڈٹ کر کام کرنے کا کچھ زیادہ موقع نہیں ملا۔

نئے حالات نئے تقاضے

آزادی ملنے کے بعد عوام کے اوپر نئی ذمہ داریاں آئیں اور لوگوں نے اڈلٹ ایجوکیشن کے بارے میں نئے سرے سے سوچنا شروع کیا جس سے کہ عوام کی تعلیم کا پروگرام اُس وقت کی ضرورت کے مطابق بنایا جا سکے۔ حکومت نے بھی اِس پر کافی سنجیدگی سے غور کیا اس لئے کہ اس پر ان کروڑوں انسانوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری تھی جن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور دیئے جانے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ اس وقت یہ بات دیکھی گئی کہ یہاں صرف ناخواندگی ہی ایک اکیلا مسئلہ نہیں ہے بلکہ کچھ اور باتیں بھی ہیں جن پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ ملک میں جمہوریت قائم کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا، اِس لئے ضروری تھا کہ لوگوں کو شہریت کی تعلیم دی جائے جس سے ان کے اندر اپنی اِس نئی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جائے۔ پھر ملک میں صحت کا معیار بہت ناقابلِ تشفی تھا اور اِس بات کی ضرورت تھی کہ لوگوں کو صحت وصفائی سے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ غربت وافلاس کا مسئلہ اُن سب سے زیادہ نازک صورت اختیار کر چکا تھا۔ اور اس بات کی ضرورت تھی کہ لوگوں کو آمدنی بڑھانے کے طریقوں کی معلومات کرائی جائے۔ اِن باتوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج کا شیرازہ بھی بکھرا پڑا تھا۔ ملک سینکڑوں طرح کے توہمات کا شکار تھا۔ ذات پات اور مذہب کے ہزاروں گھروندے بنے ہوئے تھے۔ اِس بات کی شدید ضرورت تھی کہ لوگوں میں سماجی یک جہتی پیدا کی جائے اور ایسی تعلیم دی جائے جو اُن کے ذہنوں میں وسعت اور رواداری کا احساس پیدا کرے۔ اِن ساری باتوں کو سامنے رکھ کر جو پروگرام بنا وہ اس سے پہلے والی اڈلٹ ایجوکیشن سے اس معنی میں مختلف تھا کہ اس میں تعلیم کی ساری توجہ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانے پر نہیں تھی بلکہ انھیں ایک بہتر شہری اور ایک بہتر اور باخبر انسان بنانے پر تھی۔ تعلیم کے اِس نئے تصور کی بنیاد اس بات پر تھی کہ زندگی ناقابلِ تقسیم ہوتی ہے اور اسے اُونچا اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں کو ترقی دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے اس تصور کو "سوشل ایجوکیشن" نام دیا گیا ہے۔

شری اے۔ آر۔ دیش پانڈے کی ایک تقریر کی بنیاد پر جو موصوف نے بین الاقوامی اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے نمائندوں کے سامنے ۲ راگست ۱۹۶۷ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں کی تھی۔

ہماری سمجھ کی بھول

بچّے کی بارٓھ میں کھیل کی جو حیثیت ہے اُسے سمجھ لینے کے بعد یہ بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ بچّوں کی جن حرکتوں کو ہم شرارت یا ضد کہا کرتے ہیں اُن کے پیچھے کیا بھید چھپا رہتا ہے۔ دودھ پیتا بچہ جو باربار اپنے کھلونے کو نیچے گرا دیتا ہے، یا ذرا بڑے بچّے جو اوپر نیچے کودتے پھاندتے رہتے ہیں، دیا سلائی کی تیلیوں سے کھیلتے رہتے ہیں یا دیواروں پر لکیریں بناتے پھرتے ہیں تو یہ اُن کی شرارت نہیں ہوتی بلکہ ان حرکتوں کا کچھ مطلب ہوتا ہے۔ بچّے کے ماں باپ بس اسی مطلب کو نہیں سمجھ پاتے اور بچّوں کی اِن حرکتوں سے جو تھوڑی بہت تکلیف ہوتی ہے یا گھر کی سجاوٹ اور ترتیب میں جو تھوڑا بہت فرق آجاتا ہے اُس کی وجہ سے ایسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں کہ بچّے کو عمر بھر ان غلطیوں کا بھگتان بھگتنا پڑتا ہے۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ بچّے کو چُپ چاپ اور دم سادھے بیٹھا رہنا چاہیئے یا یہ چاہیں کہ اُس کے کپڑے ہر وقت اُجلے اور صاف رہیں، اُس کے ہاتھ پیر میں مٹّی نہ لگے، تو یہ اِس بات کی علامت ہے کہ بچّہ نہیں ہم خود نا سمجھ ہیں۔ ہونا یہ چاہیئے کہ ہم کوئی ایسی ترکیب نکالیں کہ بچّوں کو اِن حرکتوں سے جو فائدہ پہنچتا ہے وہ فائدہ بھی پہنچے اور اُن سے ہم کو یا گھر کی سجاوٹ کو جو نقصان پہنچتا ہے اُس کی بھی نوبت نہ آئے۔

اب یہی بات ہے کہ دو سے تین چار سال کے بچّے کے ہاتھ میں چُل اُٹھتی رہتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ

کوئلے، کھریا، پنسل یا جو چیز بھی ہاتھ لگ جائے اُس سے لکیریں بنائے، کچھ کھینچے کھانچے۔ ابھی تک اُسے یہ تمیز تو ہے نہیں کہ کہاں لکیر بنانی چاہئے کہاں نہیں، جو ہی چیز سامنے آتی ہے، دیوار، کپڑا، کاغذ، اسی کے اوپر کھینچ کھانچ کرنے لگتا ہے۔ اب اگر ہم اُسے کوئی تختی، یا بے کار پڑا ہوا کاغذ نہیں دیتے ہیں کہ وہ اس کے اُوپر بے روک ٹوک بڑے بھیا کی طرح لکھنے کی مشق کرے، اور اس کے بجائے الٹے سیدھے ڈانٹنے پھٹکارنے لگیں تو یہ ہماری بہت بڑی بھول ہوگی۔ ایسا کرنے سے بچے کی باڑھ میں رُکاوٹ پڑ جائے گی۔ اسی طرح کی بہت سی ترکیبیں ہیں جو اگر ہم سمجھ داری سے کریں تو بچہ بھی خوش اور مگن رہے اور اُس کی حرکتوں سے جو نقصان ہو سکتا ہے، وہ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن یہ سب کچھ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب ہمارے دماغ میں یہ بات پوری طرح بیٹھ جائے کہ جن باتوں کو ہم بچے کی ضد، شرارت اور بدتمیزی کہتے ہیں وہ اس کی شرارت اور بدتمیزی نہیں ہے بلکہ اُس کی باڑھ کے وسیلے ہیں۔

دو بڑی غلطیاں

بچوں کے معاملے میں ہم سے دو غلطیاں عام طور پر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم دودھ پیتے ننھے بچے کے بارے میں ایسا کچھ سمجھ لیتے ہیں کہ اس کے دماغ نہیں ہوتا نہ اس کے اوپر کسی بات کا اثر ہوتا ہے۔ صرف کچھ جسمانی ضرورتیں ہوتی ہیں جن کو پورا کرنا ماں باپ کا فرض ہے۔ دوسرے جب بچہ تین سے پانچ سال کی عمر کا ہو جاتا ہے اُس وقت ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس اب وہ سمجھ دار ہو گیا ہے اور اچھی اور بُری باتیں اسی طرح تمیز کر سکتا ہے جیسے ہم بالغ لوگ کر سکتے ہیں۔

یہ دونوں باتیں سرے سے غلط ہیں۔ سمجھ کی یہ بھول ہم سے شاید اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ایک طرف دودھ پیتا ننھا بچہ قریب قریب گونگا ہوتا ہے اور بول نہیں سکتا اور دوسری طرف تین سے پانچ سال کا بچہ چلنے پھرنے اور بولنے لگتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ چونکہ دودھ پیتا بچہ بول نہیں سکتا

اس لئے اُس کے دماغ ہوتا ہے اور نہ اُس کے اوپر ہماری باتوں کا کوئی اثر ہوتا ہے۔ اُس کے دماغ بھی ہوتا ہے اور ہماری باتوں کا اُس کے اوپر بہت تیز اور گہرا اثر ہوتا ہے جیسا کہ آنے والی باتوں سے معلوم ہوگا۔ اسی طرح جو بچے چل پھر اور بول سکتے ہیں اُن کے بارے میں ہمیں یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اب اُن کی سمجھ پکی ہوگئی ہے اور اگر وہ ہم بالغوں کی طرح کے کام نہیں کرتے ہیں یا ہماری طرح "تمیز اور سلیقے" سے نہیں رہتے تو "بدمعاشی" کرتے ہیں۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بچوں کے خیال میں بولنے اور بات کرنے کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو مطلب ہم بالغ لوگ سمجھتے ہیں۔ تین چار سال کی عمر میں بچے کے بولنے چالنے کی لیاقت اسی طرح کی ہوتی ہے جیسے پیدا ہونے کے وقت ماں کی چھاتی سے دودھ چوسنے کی لیاقت۔ اُس وقت بچہ روٹی یا گوشت ہضم نہیں کرسکتا تو کیا ہم سمجھتے ہیں کہ وہ بیمار ہے؟ نہیں سمجھتے۔ اسی طرح تین سے چار یا پانچ سال کے بچے کے بولنے چالنے کی لیاقت کو بس اتنا ہی سمجھنا چاہئے کہ وہ ہماری بول چال کا دودھ پی رہا ہے، بول چال کی روٹی اور گوشت ہضم کرنے کے قابل نہیں ہے۔

اِن سب باتوں کا مطلب دو لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ بچے پالنے کے معاملے میں ہم کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہم سے بھول نہیں ہو سکتی۔ ہم سے بھول ہوتی ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی باڑھ میں رکاوٹ نہ پڑے تو ہمیں اُن کی پرورش کے بارے میں بہت سوچ سمجھ کر اور احتیاط سے کام کرنا چاہئے۔

(اب اگلے پرچے میں)

جس طرح ایک نوخیز پودے کو ہرا بھرا اور پھل پھول والا درخت بننے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ہر طرح اُس کی دیکھ بھال اور حفاظت کی جائے اسی طرح بچہ کو ایک صحت مند اور خوش و خرم لڑکا یا لڑکی بنانے کے لئے بھی ضروری ہے کہ اُس سے محبت کی جائے اور ہر طرح اُس کی دیکھ بھال کی جائے۔

ادارۂ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر، نئی دہلی

ادارۂ تعلیم و ترقی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

جلد ۱۲ ستمبر ۱۹۶۱ء نمبر ۹

خاص نمبر

بہ عنوان

پنچایتی راج اور سوشل ایجوکیشن

بانی :- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر :- پروفیسر محمد مجیب
برکت علی فراق
رفیق شاستری

دفتر ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی

قیمت :- سالانہ ۳ روپے - فی پرچہ ۳۰ نئے پیسے ٹیلیفون :- ۷۳۴۶۴ اس خاص نمبر کی قیمت ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

ترتیب

کلماتِ خیر

اشارات

افکار و مسائل

نظریات اور رائیں

باہر کے چند نمونے

کلماتِ خیر

ڈاکٹر سید عابد حسین

(قائم مقام) شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی کہ رسالہ تعلیم و ترقی، سماجی تعلیم کے موضوع پر ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔ میں انجمن تعلیم بالغان کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اپنی کانفرنس میں وقت کی اہم ترین ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس موضوع کا انتخاب کیا، جس پر اس خاص نمبر میں بحث کی جائے گی۔

پنچایتی راج کا جو خاکہ ہماری حکومت رفتہ رفتہ بنا رہی ہے، وہ جب پورا ہو جائے گا تو ہمارے دیہات کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آجائے گا۔ سب سماجی کارکنوں کو چنانچہ سماجی تعلیم کے ہراولوں کو بھی اپنے کام کا نقشہ نئے سرے سے اسی انقلاب کو سامنے رکھ کر بنانا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تعلیم و ترقی کا یہ خاص نمبر نئے نقشے کے بنانے میں قابل قدر مدد دے گا۔

سید عابد حسین

ڈاکٹر موہن سنگھ مہتا
صدر انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن

مکرمی ایڈیٹر صاحب تعلیم و ترقی

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ اپنے رسالہ تعلیم و ترقی کا اسپیشل نمبر شائع کر رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ بڑی نیک کوشش ہے اور اس کے لئے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

اڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک کو ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ جماعت بہت بری طرح نظر انداز کر رہی ہے۔ ہمارے یہاں اس کی قدر و قیمت اور ضرورت کی شدت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا جا رہا ہے۔ دوسرے ملکوں میں اڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک بہت زوروں پر ہے اور عوام کی بہت بڑی تعداد کو جو حالات کی ناموافقت کی وجہ سے ترقی پسند تعلیم کے معیار تک پہنچنے سے قاصر رہ گئی تھی، اس کے انعامات سے مالا مال کر رہی ہے۔ برطانیہ اور ویلز کی مزدوروں کی تعلیمی انجمن ورکرز ایجوکیشنل ایسوسی ایشن، ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں اور اسی طرح کی دوسری تحریکوں کی بدولت سماجی، سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے ان ملکوں کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ امریکہ میں یونیورسٹیاں سماجی تعلیم کو فروغ دینے میں نہایت ٹھوس اور قابلِ قدر خدمات انجام دے رہی ہیں، اور ان کی بدولت وہاں کی آبادی کے ایک بڑے طبقے کو فائدہ پہنچا ہے۔ اور ایسی بات نہیں ہے کہ یہ خدمات کسی ایک نقطے پر پہنچ کر رک گئی ہوں، نہیں، ان کا دائرۂ عمل برابر پھیل رہا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی تعلیم کا معیار بھی روز بروز بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔

جو کوئی بھی اس معاملے میں ہمارے سماج کے جمود کو توڑنے میں پیش قدمی کرتا ہے وہ ہماری داد و تحسین اور حمایت کا مستحق ہے۔ ان احساسات کے ساتھ مجھے امید ہے کہ آپ کے رسالے کا اسپیشل نمبر جو آپ "پنچایتی راج کی تعمیر میں سوشل ایجوکیشن کے منصب" کے زیر عنوان شائع کر رہے ہیں مقبول ہوگا اور اڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوگا۔

دستخط / موہن سنگھ مہتا

اشارات

پنچایتی راج کی تعلیمی بنیادیں

ایک صاحب علم نجوم کے بڑے ماہر تھے۔ اُن کے یہاں ایک بچے کی ولادت ہوئی جس کا زائچہ انھوں نے خود مرتب کیا جب زائچہ مرتب ہوگیا تو اُن کے چہرے پر امید و بیم کی ایک عجیب کیفیت تھی۔ وہ اپنے ایک عزیز سے بولے "یہاں یہ بچہ ایسی ساعت میں پیدا ہوا ہے جب سورج برج عقرب میں ہے۔ مجھے اس کے مستقبل کے بارے میں امیدیں بھی ہیں اور اندیشے بھی!" ان عزیز کو اپنے نجومی بزرگ کی ان باتوں میں شعریت کا رنگ نظر آیا۔ کہنے لگے "حضرت اِس ابہام کی تفسیر بیان فرما دیجئے۔ یہ فلسفہ کچھ میری سمجھ میں آ نہیں سکا۔" نجومی صاحب بولے "بھئی اِس ساعت کی خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ معمول سے بہت زیادہ ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی اگر اِس بچے کی تعلیم و تربیت ٹھکانے سے ہوئی تو یہ اپنے زمانے کا جیّد ترین عالم ہوگا جس کے فیضِ علم سے دُنیا چمک اُٹھے گی۔ لیکن واقعہ اگر اس کے برخلاف ہوا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تو یہ بدترین انسان ہوگا جس کے وجود سے لوگ پناہ مانگیں گے اور اس کے سائے سے بھی گھبرائیں گے۔"

اِس قصّے کی مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ نجومی بزرگ لڑکے کے بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے جس کی وجہ سے اس کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام نہ ہو سکا۔ وہ بچہ بھی ابتدائے شباب ہی میں چل بسا لیکن اِس قلیل عمر میں بھی اس نے اپنے ہم جنسوں کو خون کے آنسو رُلائے۔ کہنا صرف اِس قدر ہے کہ ہمارے ملک میں پنچایتی راج کا جنم بھی کچھ اسی طرح کی ساعت میں ہوا ہے۔ اگر اِس بچے کو تعلیم و تربیت کے گہوارے میں پالا گیا تو وہ دن دور نہیں ہے جب اس کی بدولت ہندوستان کے شاندار عہدِ ماضی کی یادیں تازہ ہو جائیں گی اور دُنیا ہم سے اکتسابِ فیض کرے گی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تو جو کچھ ہوگا، اُس سے زبان کو آلودہ نہ کرنا ہی اچھا ہے۔

پنچایتی راج کی تحریک خواہ وہ کسی شکل میں ہے، اس کی کامیابی عوام کی مکمل اور مؤثر تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اِس باب میں غالباً دو رائیں نہیں ہیں۔ یہ اتنی بیّن حقیقت ہے کہ اس کے بارے میں بحث کرنا ایسا ہی ہے جیسے حرارت اور روشنی کے لئے سورج کی ضرورت کے اوپر بحث کرنا۔ بحث طلب بات دراصل یہ ہے کہ اس تعلیم کی شکل اور رنگ روپ کیا ہونا چاہئے۔

کہ سورج کے برج عقرب میں ہونے کے وقت پیدا ہونے والا یہ بچہ اس کے فیض اثر سے دنیا میں اپنے ملک و قوم کا نام روشن کرے۔

ہمارے خیال میں پنچایتی راج کی تعلیمی بنیاد کے حسب ذیل چار پہلو ہو سکتے ہیں:

الف۔ ابتدائی لازمی تعلیم اور اس کے تسلسلی نصاب

ابتدائی لازمی تعلیم کسی تشریح کی محتاج نہیں ہے۔ اسے ہمارے ملک کے دستور نے ریاستی پالیسی کے بنیادی اصول کے تحت تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے باب میں بحث طلب صرف اتنی بات ہو سکتی ہے کہ آیا ملک کی مالی حالت ابتدائی تعلیم کو لازمی کرنے کی اجازت دیتی ہے یا نہیں۔ اس ذیل میں ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ جو حکومت ایک واحد پنجسالہ پلان کے لئے اربوں کھربوں روپے کا بندوبست کر سکتی ہے وہ لازمی ابتدائی تعلیم پر چند کروڑ روپیوں کا بھی انتظام کر سکتی ہے۔ اس عنوان کے تحت ہمیں زور دے کر جو بات کہنی ہے وہ ہے لازمی تعلیم کی مدت کے بعد کی تسلسلی تعلیم اور اس میں طلبار کی بالغ ہونے تک لازمی شرکت۔ ترقی یافتہ ملکوں میں قریب قریب ہر جگہ اس تسلسلی تعلیم کا انتظام ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان ملکوں میں بھی طلباء کی شرکت لازمی قرار دی گئی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس تسلسلی تعلیم میں ابتدائی تعلیم کے فارغ التحصیل طلبار کی شرکت لازمی کس طرح کی جائے گی تو اس کا جواب صاف ہے کہ اوّل تو اس کی پشت پر قانون کی طاقت ہوگی — قانون خواہ پنچایت کمیٹیوں ہی کا ہو — دوسرے پورے گاؤں کا سماجی دباؤ ہوگا جس کی گرفت گاؤں میں اب بھی قانون سے زیادہ سخت ہوتی ہے۔

ب۔ خاتمۂ ناخواندگی کی مہم اور مدتِ خواندگی کے بعد کی تسلسلی تعلیم

"خاتمۂ ناخواندگی" یونہی ایک چلتا ہوا فقرہ نہیں ہے بلکہ جبل پور نیشنل سیمنار کی وضع کردہ ایک باضابطہ اصطلاح ہے۔ اس باب میں بھی ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ جبل پور نیشنل سیمنار کی سفارشات میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس کا ذکر موجود ہے۔ اس موقعے پر ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ جبل پور سیمنار کی اس تجویز پر پوری تیاری کے ساتھ شاید اب تک کہیں تجربہ نہیں ہوا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ تجویز کی پوری پوری مطابقت کرتے ہوئے تجربہ کرنے کے امکانات نہیں تھے۔ لیکن پنچایتی راج کے نفاذ سے اب ایسا ماحول پیدا ہو گیا ہے جس میں خاتمۂ ناخواندگی کی اس تجویز پر اچھی طرح تجربہ کیا جا سکتا ہے۔

اس ذیل میں بھی خواندگی کے بعد کی تسلسلی تعلیم کی وہی حیثیت اور اہمیت ہے جو ابتدائی لازمی تعلیم کے بعد کے تسلسلی نصابوں کی۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں طلبار کی نوعمری کا فائدہ اٹھا کر اس کی شرکت ان کے لئے آسانی سے لازمی کی جا سکتی ہے، یہاں اس مقصد کے لئے قانون کے بجائے تحریک و تشویق (موٹیویشن) سے کام لینا ہوگا، اور جب گاؤں کی فضا میں ہر طرف پڑھنے پڑھانے ہی کا چرچا ہوگا — جو خاتمۂ ناخواندگی کی تجویز کا ایک لازمی جزو ہے — تو ان نوسکھ بالغوں کو تسلسلی تعلیم کے نصابوں میں آسانی سے شریک ہونے کے لئے آمادہ کیا جا سکے گا۔

ج۔ نوشکھ بالغوں کی اونچی تعلیم — لوک ودیا پیٹھ

حکومتِ ہند نے ۱۹۵۴ء میں ڈنمارک ٹیم کے نام سے تعلیمی کارکنوں کی جو ٹیم ڈنمارک بھیجی تھی، اُس نے اپنی رپورٹ میں اب سے چھ سال پہلے یہ تجویز دیا تھا کہ ہر ڈیولپمنٹ بلاک میں لوک ودیا پیٹھ کے نام سے ایک ایک اسکول عوام کی اونچی تعلیم کے لئے قائم کیا جائے۔ اِس تجویز کے اوپر بھی شاذ و نادر ہی کہیں عمل ہوا ہوگا۔ ہم بھروسے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اُس وقت اِس تجویز پر عمل شروع ہو گیا ہوتا تو آج پنچایتی راج کی اسکیم کے لئے راستہ بہت کچھ ہموار ملتا۔ ممکن ہے اُس وقت چونکہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگرام کا آغاز تھا اِس لئے اس تجویز پر عمل کرنا سمجھ میں نہ آیا ہو یا ممکن نہ سمجھا گیا ہو لیکن اب جب کہ پنچایتی راج کے نفاذ نے ترقیاتی پروگراموں کا پورا ماحول بدل دیا ہے اور عوام میں اُس کے زیرِ اثر جوش و خروش بھی ہے، لوک ودیا پیٹھ کا تجربہ یقیناً کامیاب رہے گا اور اس انقلابی تحریک میں اُس سے تیزی بھی آئے گی اور نفاست اور عمدگی بھی۔

لیکن اِس باب میں بھی ہمیں اپنے گزشتہ تجربوں سے سبق لینا ہوگا۔ ہمارے خیال میں لوک ودیا پیٹھ کے تجربے کی ناکامی کے دو بنیادی اسباب تھے۔ ایک یہ کہ ان اداروں کی سربراہی ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اور تو چاہے جو کچھ بھی رہے ہوں، مگر بالغوں کے معلّم ہرگز نہیں تھے، جو اُن کے اندر جوشِ عمل پیدا کر سکتے۔ دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ یہ لوک ودیا پیٹھ چند پیشوں کی ٹریننگ کے مرکز بن کر رہ گئے تھے۔ ان میں وہ روح نہیں تھی جو ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں میں تھی۔ پنچایتی راج کے ماحول میں ضرورت اِس بات کی ہے کہ لوک ودیا پیٹھ کو زندگی کی تعلیم کے عام ادارے تسلیم کر کے قائم کیا جائے خواہ وقتاً فوقتاً انھیں پنچوں اور سرپنچوں کی ٹریننگ کے لئے بھی استعمال کر لیا جائے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ڈنمارک میں تو اِن اسکولوں کے معلّم یونیورسٹیوں کی اونچی اونچی علمی کرسیاں چھوڑ کر آئے تھے، ہندوستان میں اِس کا موقع کہاں ہے؟ اِس کا جواب ہمارے پاس صرف یہ ہے کہ اگر پنچایتی راج کی تحریک نیک نیتی سے چلائی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ عوام کی تعلیم کو اس کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے، تو حکومت کے اشارے کی دیر ہوگی، یونیورسٹیوں کے پروفیسر تو کیا، حکومتِ ہند کے وزرا بھی اپنی اپنی کرسیاں چھوڑ کر گاؤں میں دھونی رما کر بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ بہرحال وقت کا اہم ترین تقاضا ہے اور اگر سیمینار یا پالیسی متعین کرنے والی دوسری جماعتیں اسے اصولاً تسلیم کر لیں تو تفصیلات کا طے کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔

د — جمہوریت کی غیر رسمی ٹریننگ کا مرکز

پنچایتی راج کی تحریک کے پیچھے، اگر ہمارا خیال غلط نہیں ہے تو، ایک یہ اصول بھی کارفرما ہے کہ چونکہ ذمّے داری اٹھانے کی ٹریننگ ذمّے داری اٹھانے کا موقع دے کر ہی ہو سکتی ہے، اِس لئے ملک میں عالمگیر جمہوریت کی بنیاد ڈالنے کے لئے عوام کو ذمّے داری اٹھانے کی تربیت دینا ضروری ہے۔ جس طرح یہ اصول صحیح ہے بالکل اُسی طرح یہ اصول بھی اٹل ہے کہ خود پنچایتی راج

کے اداروں میں جمہوری روح اُسی وقت پڑے گی جب عوام کو اپنی اصل زندگی میں جمہوری آداب و اطوار کی مشق کا موقع ملے گا۔ عوام کی اصل زندگی سے ہماری مراد اُن کے اُن بےضابطہ گروہوں سے ہے جو مقصد اور شوق کے اشتراک سے اپنے آپ بن جاتے ہیں اور آگے چل کر باقاعدہ انجمنوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جیسے نوجوان برادریاں، کسانوں کی انجمنیں، حقہ نوشی کے گوشے، عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کی سہیلی سبھائیں، ناٹک اور سنگیت منڈلیاں، پہلوانوں اور پٹھوں کے اکھاڑے، اس قسم کے بےضابطہ گروہوں کی تنظیم کا ذکر بلا استثنا سب لوگ کرتے ہیں لیکن غالباً کسی مفکر نے یہ نہیں سوچا کہ ان گروہوں اور انجمنوں کی سرگرمیوں کا آیا کوئی مرکز ہوگا جہاں یہ الگ الگ بھی اور ایک دوسرے سے مل کر بھی جمہوری انداز پر باہم تبادلۂ خیال کریں گے یا سب اپنی ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں الگ بنائے بیٹھے رہیں گے۔

اس ذیل میں ہمیں انگلستان کے کمیونٹی سنٹروں سے سبق لینا ہوگا۔ گاؤں کے ان شوقینوں کے ایک مرکز کے طور پر پنچایتی راج کے اداروں کو ایک ایک گرام بھون بنانے کے لئے آمادہ کرنا ہوگا جہاں اپنی اپنی باری پر شوقینوں کے مختلف گروہ الگ الگ اور پورے گرام بھون کی مجلسِ منتظمہ میں مجموعی طور پر جمہوری طرز کے کاروبار کی عملی مشق کریں۔

سوشل ایجوکیشن کو کچھ زیادہ دائرۂ فکر و عمل محدود کر لینا چاہیئے اس لئے کہ بیک وقت بہت سے کام کا دعویٰ کرنے والا شخص ہو یا ادارہ یا تحریک، کوئی ان میں سے ایک کام بھی صحیح طور پر نہیں کر سکتا اور ہمارے خیال میں سوشل ایجوکیشن کی بدنامی کا ایک سبب اُس کا یہ ہر دبیلاپن بھی ہے۔ اگر سوشل ایجوکیشن اپنے دائرے کو مذکورۂ بالا چند جانے بوجھے ہوئے کاموں تک محدود کرے تو وہ پنچایتی راج کے حق میں بہت مفید کام کرے گی۔

افکار و مسائل

- کوئمبٹور سیمینار کے عنواناتِ بحث کا خاکہ
- جنرل سکریٹری کا خط
- بلونت رائے مہتہ کمیٹی کی رپورٹ: تاریخ اور خلاصہ

سوشل ایجوکیشن اور پنچاتی راج

بارہویں نیشنل سیمنار کے عنوانات بحث کا خاکہ

تعارف

۲ اکتوبر ۱۹۵۹ء وہ تاریخی دن ہے جب راجستھان میں پنچایت سمیتی اور ضلع پریشد کا قانون نافذ ہوا۔ قانون میں قرار دیا گیا ہے کہ گاؤں، بلاکوں اور ضلعوں میں با اختیار جماعتیں قائم ہوں، انھیں مناسب حد تک اختیارات دیئے جائیں اور ان کے لئے آمدنی کے مزید وسائل فراہم کئے جائیں تاکہ وہ جمہوری نظام کا موثر جزو بن سکیں۔ راجستھان کے نمونے کو دوسری ریاستوں نے بھی اختیار کر لیا ہے اور امید ہے کہ بقیہ ریاستوں میں بھی بہت جلد ضلعے یا بلاک کی سطح پر مقامی جماعتوں کو اختیارات سونپ دیئے جائیں گے۔ دوسری ریاستوں میں اگرچہ بنیاد کے طور پر نمونہ اختیار کیا جا رہا ہے تاہم عملی اعتبار سے ان کے یہاں چند امور میں خاصہ فرق ہے مثلاً (۱) ان مقامی جماعتوں کے سپرد کئے جانے والے کام (۲) اُن کا دستور خصوصاً چیرمین کے معاملے میں (۳) مالی وسائل جو انھیں حاصل ہوں گے اور (۴) باہر کا کنٹرول جو ریاستی حکومت کی طرف سے ہوگا یا ہو رہا ہے۔

مقامی با اختیار جماعتیں قائم کرنے کی ضرورت اب پورے طور پر تسلیم کی جا چکی ہے۔ اس لئے سوچنا یہ ہے کہ جن اسباب کی بنا پر ان جماعتوں کے قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، آیا اُن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے یا نہیں۔

دوسرا سوال جو غور و بحث کے لئے اٹھ سکتا ہے یہ ہے کہ "گاؤں میں جماعتی یکجہتی پیدا کرنے کی غرض سے پنچایتی راج سوشل ایجوکیشن کے عمل کو کس طرح تیز کر سکتا ہے؟"

پنچایتوں کے غیر سرکاری افسروں کی ٹریننگ کی ضرورت کا پورا پورا احساس ہے، لیکن اس کے لئے آمادگی کا اظہار پورے ذوق و شوق کے ساتھ نہیں ہوا ہے اور نہ اس سے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس کے لئے ابھی اور زیادہ بیداری پیدا کرنے کی ضرورت ہے

میرا خیال ہے کہ سیمنار میں اگر اس موضوع پہ بحث ہو کہ ان غیر سرکاری افسروں اور کارکنوں میں ٹریننگ لینے کا شوق اور امنگ پیدا کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے تو یہ بڑی مفید بحث ہوگی۔

سوشل ایجوکیشن کو اِس کا اہتمام بھی کرنا ہوگا کہ مختلف مقامی جماعتیں اُن کی مختلف کمیٹیاں اور سرکاری اور غیر سرکاری افسران یہ سمجھ جائیں کہ اُن کو کیا کردار ادا کرنا ہوگا۔ اس سیمنار میں اس سوال پر بحث ہوسکتی ہے کہ سوشل ایجوکیشن کو اس مقصد میں کس طرح کامیابی ہوگی۔

لوکل سیلف گورنمنٹ کی اہمیت بہت عرصہ ہوا، اس ملک میں تسلیم کی جاچکی ہے۔ سالہا سال سے مقامی جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات سونپنے کا مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن بہرحال محکومیت کے زمانے میں مقامی جماعتوں کی نشو ونما اُسی حد تک ہوسکتی تھی کہ وہ دیسی حکمرانوں کے گماشتوں کی حیثیت سے کام کریں اور ہمہ وقت اُن کی نیازمند بنی رہیں۔ مقامی جماعتوں کو اس حیثیت سے دیکھ کر عوام مشکل ہی سے اُن کے مرتبے اور عزت کو تسلیم کرسکتے تھے۔ مگر آزادی نے ایسا ماحول مہیا کردیا ہے کہ مقامی خود مختار جماعتیں ملک کے جمہوری نظام اور سماجی اور اقتصادی ترقی کی بنیادی اکائیوں کی حیثیت سے اب ترقی کرسکتی ہیں۔

لوکل سیلف گورنمنٹ کی منظم اور باقاعدہ تحریک کا سہرا بلونت رائے مہتہ کمیٹی کے سر ہے جو کمیونٹی پروجیکٹوں اور نیشنل ایکس ٹنشن کی سروسوں کے کاموں کا جائزہ لینے کے لئے بنی تھی۔ اس کمیٹی نے دیکھا کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور این ای ایس کو سب سے کم کامیابی عوام کے اندر جوش و ولولہ پیدا کرنے میں ہوئی ہے چنانچہ ٹیم نے سفارش کی کہ موجودہ مقامی جماعتوں کے بجائے عوام کے منتخب کئے ہوئے با اختیار مقامی ادارے قائم کئے جانے چاہئیں اور ڈیولپمنٹ کا تمام کام ان کی ذمے داری میں دے دیا جانا چاہیئے۔ اسی کے ساتھ انھیں اس کام کو انجام دینے کے قابل بنانے کی غرض سے مناسب حد تک انتظامی عملہ اور مالی وسائل بہم پہنچانا چاہیئے۔ کمیٹی نے غرض ان اداروں کو جو جمہوری طرز پر بنیں گے۔ اختیارات منتقل کرنے کی حمایت کی تھی۔

کمیٹی نے اپنی سفارشات میں یہ بہرحال واضح کردیا تھا کہ "اختیارات کی منتقلی" اور "لامرکزیت" میں فرق ہے۔ ان کے قول کے مطابق "اختیارات کی منتقلی سے حکومت اس ادارے کے فعل و عمل سے بری نہیں ہوجاتی جسے اختیارات منتقل کئے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ ادارے ہر لحاظ سے حکومت کی نگرانی اور ماتحتی میں ہوتے ہیں۔ دوسری طرف لامرکزیت اُس عمل کو کہتے ہیں جس کے ماتحت حکومت اپنے بعض فرائض اور ذمے داریوں سے کلیۃً سبک دوش ہوجاتی ہے اور انھیں دوسرے اداروں کے سپرد کردیتی ہے جمہوری لامرکزیت سے ہماری مراد یہ ہے کہ اختیارات، فرائض اور ذمے داریاں جن کا تعلق مقامی حکومت سے ہو اور جو ترقی کے تمام پہلوؤں سے متعلق ہوں، وہ جمہوری طرز پر بنے ہوئے با اختیار اداروں کو

منتقل کر دیئے جائیں (ان کے سپرد نہ کئے جائیں)۔

مہتہ کمیٹی کا زور اس بات پر تھا کہ جمہوری لامرکزیت کی اسکیم مقامی ترقیاتی کاموں میں عوام کے ذوق و شوق کو ابھارنے کی ایک تدبیر کے طور پر ہے، اگرچہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس اسکیم کو جمہوری نظام کے استحکام کے نقطۂ نظر سے بھی ناگزیر سمجھا گیا ہے۔

اب "جمہوری لامرکزیت" کی اصطلاح کی جگہ "پنچایتی راج" کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ جمہوری نظام میں اصل طاقت اور اختیار لازمی طور پر گاؤوں میں زندگی گذارنے والے عوام کے نمائندوں کو حاصل ہوتا ہے اور وہ تمام کام جو ان گاؤوں کی جماعتی زندگی سے مناسبت رکھتے ہیں انھی منتخب مقامی اداروں کے ہاتھوں انجام پذیر ہونے چاہئیں۔ جمہوری نظام کی اونچی اکائیوں کو اپنے پاس وہی کام اور فرائض رکھنے چاہئیں جنھیں وہی بہتر طریقے پر انجام دے سکتی ہیں اور جو مقامی اداروں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس انداز فکر کے اعتبار سے لامرکزیت کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ سیاسی طاقت کے اصل اور قدرتی مخزن یہی پنچایتیں اور پنچایت سمتیاں ہیں۔ اس اعتبار سے ایسا سیاسی نظام جو پنچایتی اداروں کو اختیار مطلق کی بنیاد تسلیم کرتا ہو، اسے بجا طور پر "پنچایتی راج" کہا جا سکتا ہے۔

پنچایتی راج کو ایک بڑے سے بڑے انقلاب سے جو انسانی ذہن میں آسکتا ہے تعبیر کیا گیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا ہے، "پنچایتی راج جمہوریت کی سنگین بنیاد کا حکم رکھتا ہے اور یہ بات صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ سماجی اور اقتصادی میدان میں بھی کامیابی کا ایک زبردست وسیلہ ثابت ہو گا۔"

پنچایتی راج کے نفاذ سے جس انقلابی تبدیلی کا تصور باندھا گیا ہے، اس سے ظاہر ہے، سوشل ایجوکیشن کو گہری دل چسپی ہے اس لئے کہ سوشل ایجوکیشن کا پروگرام بھی انھی خوابوں کا نتیجہ ہے جو پنچایتی راج کی اسکیم میں دیکھا گیا ہے۔ دونوں کا مقصود اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونے والی بستیاں تعمیر کرنا ہے جو اپنے مسائل کو آپ اپنی تحریک اور وسائل کے ذریعے حل کر لیا کریں دونوں ایسے شہری تخلیق کرنا چاہتے ہیں جنھیں اپنے حقوق اور فرائض کا پورا پورا احساس ہو اور جو اپنی بستی کی حکومت میں ذوق و شوق اور سمجھ داری کے ساتھ حصہ لیں۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ پنچایتی راج یہ کام قانونی اور عاملی اقتدار کے ایک نظام کے ماتحت انجام دینا چاہتا ہے اور سوشل ایجوکیشن ان مقاصد کو تعلیم کی راہ سے حاصل کرنا چاہتی ہے۔

سوشل ایجوکیشن کا تعلق زندگی کے ان تمام پہلوؤں سے ہے جہاں ترقی کا حصول تعلیم کی راہ سے ممکن ہوتا ہے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں سوشل ایجوکیشن کا زور اس بات پر رہا ہے کہ لوگ امداد باہمی اور سہکار کی بنیاد پر بستی کے مسائل کو سمجھنا اور حل کرنا سیکھیں۔ شہریت کی تعلیم کا جو پروگرام ہے اس کا منشا عوام کی اس طرح مدد کرنا ہے کہ وہ ایک شہری کے

حقوق و فرائض کو اچھی طرح سمجھ جائیں اور مقامی انتظام و انصرام میں پوری پوری دلچسپی لیں۔

سیمنار کے لئے اس میں بحث کے پہلو یہ نکل سکتے ہیں کہ پنچایتی راج کا مفہوم و منشا کیا ہے، اس خاموش انقلاب کو کامیاب بنانے میں سوشل ایجوکیشن کا کتنا حصہ ہے اور اسے پورا کرنے کے اب کیا مواقع ہیں؛ اس کا اس سلسلے میں یہ بھی کام ہے کہ ان موضوعات سے متعلق تجاویز اور سفارشات مرتب کرے جو ان مقاصد کو حاصل کرنے کی غرض سے کام کا نقشہ بنانے میں مددگار ثابت ہوں۔

بحث کے بنیادی سوالات

(اِن سوالات کی مختصر الفاظ میں وضاحت بھی کردی گئی ہے)

ا۔ تعریفات، مقاصد اور ربط

۱۔ "جمہوری لامرکزیت" اور پنچایتی راج کے معنی کیا ہیں؟

۲۔ پنچایتی راج کے مقاصد کیا ہیں؟

۳۔ پنچایتی راج کے نفاذ سے کون کون سی سماجی قوتیں اُبھر کر سامنے آئی ہیں۔ جن ریاستوں میں پنچایتی راج کی اسکیم نافذ ہوئی ہے، وہاں کے کیا تجربات ہیں؟ اِن سماجی قوتوں اور عناصر کا سوشل ایجوکیشن کے اوپر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

پنچایتی راج کے اثر سے جو سماجی قوتیں اُبھر کر سامنے آئی ہیں، اُن کے اوپر چند پڑتالوں سے روشنی پڑتی ہے۔ ان پڑتالوں میں "ادارڈ" اور رگھوبیر سہائے "کمیٹی رپورٹیں قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جائزہ کمیٹی پنچایتوں کی رپورٹ، پروگرام ایویلوایشن آرگنائزیشن، کی پڑتال اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی وزارت کی اپنی مقرر کی ہوئی کمیٹی کی رپورٹیں ہیں جن سے مذکورۂ بالا سوالات کو سمجھنے میں مفید اعداد و شمار مل سکتے ہیں۔ پھر اخباروں کی رپورٹیں بھی ہیں اِن سے بھی کام کی باتیں اور معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

یہ بات عام طور پر کہی گئی ہے کہ پنچایتی راج سے دیہی علاقوں میں بڑا جوش و خروش اور بیداری پیدا ہوئی ہے۔ "ادارڈ" کی پڑتال سے معلوم ہوتا ہے کہ پنچایت سمیتوں کو جو اختیارات منتقل کئے گئے ہیں اُن سے وہ اچھی طرح واقف ہیں اور اختیار کی اس منتقلی کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ پڑتالیوں نے یہ بھی دیکھا کہ اس سے انتظامی مشینری کی

کارکردگی میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ انتظام و انصرام کی بد اعمالیوں کو روکنے میں پنچایتی راج کے نفاذ سے بڑی مدد ملی ہے۔

پنچایتی راج سے تعلیم کے انتظام میں بھی مدد ملی ہے۔ اوارڈ کے ہڑتالیوں نے دیکھا ہے کہ اسکول کے استاد اپنے کام پر اب زیادہ حاضر رہنے لگے ہیں اس لئے کہ سرپنچ لوگ اُن کے اوپر نظر رکھتے ہیں۔ اسی طرح رگھوبیر سہائے کمیٹی نے دیکھا ہے کہ اب اسکولوں میں طلبا کی حاضری بڑھ گئی ہے بعض مقامات پر اسکولوں کے استادوں سے فرمائش کی گئی ہے کہ وہ اپنے اسکول کے اوقات میں ایک گھنٹے کی کمی کر دیں اور اس گھنٹے میں اڈلٹ ایجوکیشن کے درجوں میں پڑھایا کریں۔ ان ہڑتالیوں کا خیال ہے کہ اس تدبیر سے اور اسی طرح کی دوسری ترغیبوں سے اڈلٹ ایجوکیشن کی رفتار میں بھی تیزی آئی ہے۔

جائزہ کمیٹی جس نے پنچایتوں کے کام کا معائنہ کیا تھا، اس نے دیکھا کہ پنچایتوں کی ممبری اور خصوصاً سرپنچی سمٹ کر اونچی ذاتوں اور زمینداروں کے چھوٹے سے طبقے کے چند خوش حال لوگوں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ نیچی ذاتوں اور بے زمین طبقے کے لوگوں کی نمائندگی بہت کم ہے۔ اس بات کی شہادتیں بھی موجود ہیں کہ کم سے کم ابتدائی مراحل میں پنچایتی راج سے رقابت، جتھے بندی، ذات پات، منافرت اور کشمکش کو بڑھاوا ملا ہے۔ لوگوں کو ان انتخابی عہدوں پر پہنچ جانے سے خاندانی عداوتوں اور ذات پاتی یا طبقاتی اختلافات کو ہوا دینے اور ان کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنے کا بڑا اچھا موقع ملتا ہے۔ چنانچہ انتخابات عام طور پر سماجی توازن کو بگاڑ دیتے ہیں اور تناؤ اور کشمکش کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اس چیز کا سوشل ایجوکیشن کے اوپر بڑا مہلک اثر پڑ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جو پارٹیاں اقتدار میں ہوں وہ تو سوشل ایجوکیشن کے باب میں جوش دکھائیں لیکن جو پارٹیاں برسر اقتدار پارٹی کی مخالف ہوں وہ پنچایت سمیتیوں کی تجویز کی ہوئی اسکیموں میں کوئی دلچسپی نہ لیں۔

"اوارڈ" کی ہڑتالی ٹیم نے محسوس کیا کہ ہے کہ بلاک میں اختیارات کی باگ ڈور بی ڈی او کے ہاتھ سے نکل کر پردھانوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عوام کی نمائندگی کرنے والے پردھانوں اور وکاس ادھیکاریوں اور ان کے اسٹاف کے دوسرے کارکنوں کے درمیان اقتدار و اختیار کے لئے مسلسل رسہ کشی رہنے لگی ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنچایتی راج کی تحریک میں ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے کا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ اگر دونوں طرف سے سمجھ سمجھا کر نباہ کرنے کی فضا پیدا نہ ہوئی تو ہو سکتا ہے کہ بلاک کا اسٹاف ڈیولپ منٹ کے کام میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حصہ اور دلچسپی لینا ترک کر دے۔ اس سے سوشل ایجوکیشن کے اوپر بہت برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے)

۴۔ پنچایتی راج کے نظام میں سوشل ایجوکیشن کا کیا کردار ہو سکتا ہے۔

دکھا جاتا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کا کردار لوگوں کو ایسے مواقع اور سہولتیں بہم پہنچانا ہے جن کے اثر سے وہ اتنی تعلیم

پا جائیں کہ اپنی بستی کے مسائل کو سمجھ سکیں اور انھیں اپنے آپ حل کر سکیں۔ سیمنار میں پنچایتی راج کو سامنے رکھتے ہوئے سوشل ایجوکیشن کے اس کردار پر بحث کی جا سکتی ہے۔م

ب۔ پنچایتی راج کی تعلیمی ضرورتیں

ا۔ سوشل ایجوکیشن کے ایک پروگرام کی حیثیت سے خواندگی کی پنچایتی راج میں کیا اہمیت ہے؟

(یہ بات بڑے وسیع پیمانے پر کہی گئی ہے کہ بستی کی جماعتی زندگی میں سمجھداری کے ساتھ حصہ لینے کے لئے خواندگی بنیادی شرط کا درجہ رکھتی ہے۔ خواندگی کو اکثر و بیشتر انسان کی چھٹی حس سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تعلیم اور ترقی کے اتھاہ خزانے کی یہی کنجی ہے۔ اَن پڑھ پن سے احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے اور سماج میں گھٹیا درجہ ملتا ہے۔ نتیجے کے طور پر یہ سماجی مساوات کے خلاف پڑتی ہے حالانکہ سماجی مساوات ہی وہ بنیاد ہے جس کے اوپر پنچایتی راج کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔ تازہ ترین مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ خواندگی کے میدان میں ہم نے بس برائے نام ترقی کی ہے۔ اس لحاظ سے ناخواندگی کا مسئلہ پہلے ہی کی طرح جوں کا توں پہاڑ بنا کھڑا ہے۔ سیمنار کو سوچنا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں خواندگی کی اسکیموں کو کیا درجہ دیا جانا چاہیئے)۔

۲۔ پنچایتی راج میں سوشل ایجوکیشن کے ایک پروگرام کے طور پر شہریت کی تعلیم کو کیا درجہ حاصل ہے۔

(یہ دلیل اکثر موقعوں پر دی گئی ہے کہ عوام کو صرف خواندہ ہی نہیں بنانا ہے بلکہ ان کے لئے ایسی تعلیمی سہولتیں بھی بہم پہنچانی ہیں جن کے ذریعے وہ پنچایتی راج کے مفہوم و منشا کو سمجھ سکیں اور اس کے ماتحت اُن کے جو حقوق اور فرائض ہیں، اُن کو پہچان سکیں۔ پنچایتی راج کو کامیابی اُسی حد تک ہوگی جس حد تک گرام سبھائیں، گاؤں کے انتظام اور ترقی کی اسکیموں میں ذوق و شوق کے ساتھ حصہ اور دلچسپی لیں گی۔ اس لئے تعلیم کے مختلف وسائل سے کام لے کر مسلسل اور مستقل کوشش کرنے کی ضرورت ہے کہ لوگوں میں بستی کے جماعتی مسائل پر دلچسپی کے ساتھ بحث کرنے کا شوق اور جوش و ولولہ پیدا ہو۔ جماعتی بحث مباحثے اور بات چیت میں حصہ لینے کا جو فن ہے، لوگوں کو اس کی مشق کرانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ اِس طرح کی غیر رسمی تعلیم کی سوشل ایجوکیشن کے ایک پروگرام کے طور پر کیا اہمیت ہے؟ اس سوال پر بھی سیمنار کو بحث کرنا ہے۔)

۳۔ کیا کمیونٹی آرگنائزیشن[1] کی تربیت پر بھی بہ حیثیت سوشل ایجوکیشن کی ایک اہم شاخ کے زور دیا جانا چاہیئے۔

---

[1] یہاں کمیونٹی آرگنائزیشن سے غالباً وہ کمیونٹی آرگنائزیشن مراد نہیں ہے جو سوشل ورک کی ایک منظم شاخ ہے یہاں اس سے بستی کے اندر چھوٹی چھوٹی تنظیمیں کھڑی کرنا مراد ہے۔ م

(پنچایتی راج قانونی سیاسی اداروں کا ایک نظام پیش کرتا ہے یہ بات اکثر و بیشتر کہی گئی ہے کہ سیاسی اداروں کے اس نظام کو تقویت پہنچانے کے لئے ضرورت ہے کہ بستی کے اندر ضمنی تنظیموں مثلاً نوجوان برادریوں، بچوں کے کلب، عورتوں کی انجمنوں، بھجن اور ناٹک منڈلوں وغیرہ کو رواج دیا جائے۔ اُن کی ہمت افزائی کی جائے۔ اور انھیں جاندار بنایا جائے اس اعتبار سے اگر یہ مقصود ہو کہ یہ ضمنی انجمنیں مناسب ڈھنگ سے اپنا کام کریں تو کمیونٹی آرگنائزیشن کی تربیت ضروری قرار پاتی ہے لہٰذا سیمنار کو یہ بھی سوچنا ہے کہ کمیونٹی آرگنائزیشن کی تربیت کو کتنی اہمیت دی جانی چاہیئے)

۴ - کیا سوشل ایجوکیشن کو جماعتی یک جہتی کا معاملہ بھی اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے؟

(جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے، اس بات کی شہادتیں موجود ہیں کہ پنچایتوں کے انتخابات کے وقت رقابتوں، جتھے بندیوں، خاندانی عداوتوں اور ذات پاتی اور طبقہ وارانہ کشمکشوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ سیمنار کو سوچنا ہے کہ خاندانی عداوتوں، ذات پاتی تفریقوں یا سیاسی عقائد کے راستے سے سماجی نفاق و انتشار کا جو زہر پھیلتا ہے آیا سوشل ایجوکیشن کو اس کے تریاق کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے)

۵ - کیا ان با اختیار اداروں کے عہدہ داروں کی ٹرننگ میں سوشل ایجوکیشن مدد بہم پہنچا سکتی ہے؟

(منتخب شدہ پنچوں اور دوسرے عہدہ داروں کی یہی ضرورت نہیں ہے کہ انھیں پنچایتی راج کے قاعدے اور ضابطے معلوم ہو جائیں بلکہ انھیں مسائل کو حل کرنے کے فن کی بھی ٹرننگ ملنی چاہیئے۔ اب مقامی ترقیاتی کاموں کی بھی اُن کے اوپر ذمے داری ہے۔ انھیں بستی کی شدید ترین ضرورتوں پر انگلی رکھنے، اپنے وسائل کا جائزہ لینے، پورے ملک کے لئے جن کاموں کو ترجیح دی گئی ہے انھیں سمجھنے، مجوزہ اسکیموں سے واقفیت، ان کی منصوبہ بندی، اور سب کے ساتھ مل کر کام کرنے کا گُر سمجھانے اور لوگوں میں ان کاموں کے لئے جوش و ولولہ پیدا کرنے کی غرض سے عوامی تعلیم کا منصوبہ بنانے کے فن کی پوری پوری ٹرننگ دینی ہوگی۔ اسی کے ساتھ انھیں سوشل ایجوکیشن کے اصول اور طریقے بھی سمجھانے ہوں گے۔ مثلاً خواندگی کی مہم کس طرح منظم کی جاتی ہے، کتب خانہ، ریڈنگ روم، ریڈیو کی مجلسیں، کمیونٹی سینٹر کس طرح قائم کئے اور چلائے جاتے ہیں یعنی وہ تمام پروگرام جو سوشل ایجوکیشن کی سرگرمیوں کی تعریف میں آتے ہیں۔ سیمنار کو یہ سوچنا ہے کہ آیا سوشل ایجوکیشن کے کارکن پنچوں اور دوسرے عہدہ داروں کی ٹرننگ میں مدد دے سکتے ہیں۔)

۶ - کیا سوشل ایجوکیشن لوگوں کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی تعلیم دینے میں مدد کر سکتی ہے؟

(جوں جوں پنچایتی راج کے ادارے قائم ہوں گے اور کام کرنا شروع کریں گے اُسی نسبت سے امید ہے کہ ڈیولپمنٹ کے کاموں میں بھی تیزی آئے گی۔ چونکہ ترقی کے مقامی پروگرام بھی مقامی ادارے بنائیں اور چلائیں گے اس لئے ان کی کامیابی سے

ملک کی خوشحالی وابستہ ہو گی۔ اس اعتبار سے لوگوں کے اندر ہمت و حوصلہ پیدا کرنے کی غرض سے عوامی تعلیم کے ایک عظیم الشان پروگرام کی ضرورت ہو گی اور اس مجوزہ تبدیلی کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے میں تعلیم کے جملہ وسائل مثلاً دیہی ناٹک، ریڈیو کی مجلسیں، خبرناموں کی اشاعت، دیواری اخبار، اطلاعات کے مرکز، بات چیت کی مجلس اور نقلیں، غرض ان تمام ذرائع تعلیم کا بڑے پیمانے پر استعمال کیا جائے تو اس کے بہت مفید نتائج نکلیں گے۔ سیمنار کو یہ سوچنا ہے کہ آیا سوشل ایجوکیشن تعلیم اور اطلاع رسانی کے ان وسائل کی ماہر ہونے کی حیثیت سے لوگوں کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی تعلیم دینے کے معاملے میں مدد کر سکتی ہے۔)

۷۔ قومی یکجہتی (NATIONAL INTIGRATION) کی تعلیم میں سوشل ایجوکیشن کا کیا حصہ ہو سکتا ہے؟

(یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اگرچہ مقامی لوگوں کو اپنے مقامی مسائل ہی سے سروکار ہو گا تاہم اس بات کی احتیاط رکھنی ہو گی کہ اس سے کہیں ان میں وطن پرستی کا وہ تنگ جذبہ نہ راہ پائے جسے تنگ نظری کہتے ہیں اور جس کے اثر سے یہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے کہ ملک و قوم جہنم میں جاتے ہیں۔ ہمیں تو اپنی بستی اور اپنے گاؤں کے بھلے سے مطلب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ذات برادری، طبقہ، مذہب، زبان اور مقامیت کی مصلحتیں انھیں اپنے قومی فرض کی طرف سے بے خبر بنا دیں۔ سیمنار اس موضوع پر بھی غور کر سکتا ہے کہ وہ کیا تدبیریں ہیں جن سے لوگوں میں قومی نقطۂ نظر کی پرورش ہو اور یہ کہ سوشل ایجوکیشن کا اس کام میں کتنا حصہ ہے۔)

۸ — آیا پنچایتی راج کی کچھ اور بھی تعلیمی ضرورتیں ہو سکتی ہیں جنھیں پورا کرنے کے لئے سوشل ایجوکیشن کوئی پروگرام بنا سکتی ہے۔

ج پنچایتی راج میں سوشل ایجوکیشن کا طریقہ کار

(چند تجاویز اور سفارشات)

ا۔ پنچایتی راج کے لئے لوگوں کے ذہن کی تربیت کرنے کا کام بہت بڑا کام ہے۔ اس میدان میں بہت سی دوسری جماعتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ کیا یہ صورت حال سوشل ایجوکیشن کو امداد باہمی کا راستہ اختیار کرنے کی دعوت دیتی ہے؟ امداد باہمی کا راستہ اختیار کیسے کیا جائے؟

(جس ڈھنگ کی سوشل ایجوکیشن کا اوپر جو مفہوم بتایا گیا ہے اُسی ڈھنگ پر بہت سی رضاکار جماعتیں اور سرکاری ادارے کام کررہے ہیں۔ اُن کے کاموں میں اگر ربط اور تال میل نہیں پیدا کیا گیا تو اِس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہونے کا ڈر ہے مثلاً کام کا ٹکراؤ، غلط فہمی، رقابت اور کشمکش اور مایوسی اور بددلی وغیرہ۔ یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے اندر مایوسی اور بددلی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کیونکہ اُس کے منصب اور کردار کو مسلسل نکتہ چینی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اُسے یقین دلانا چاہیئے کہ جو کام اُس کے سپرد کیا گیا ہے، اس کا نقشہ بنانے اور اُسے انجام دینے میں جو سہولتیں بھی مناسب ہوں گی، بہم پہنچائی جائیں گی۔ یہ بہت سے لوگوں کا ایمان ہے کہ سوشل ایجوکیشن کا کام اتنا بڑا ہے کہ اس میں تمام جماعتوں اور اداروں کے کام کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے۔ لیکن بہرحال انھیں آپس میں ایک دوسرے سے اشتراک کرنا چاہیئے اور ایک دوسرے کے کام کی قدر و قیمت کی تحقیر نہیں کرنی چاہیئے۔ سیمنار کو سوچنا ہوگا کہ مختلف اداروں کے کاموں کو درمیان ربط اور تال میل کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اُسی کے ساتھ اُسے اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے حوصلے کو کس طرح ابھارا جائے۔)

۲- کیا سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں خواندگی کو سب سے پہلا درجہ دیا جائے گا؟ خاتمۂ ناخواندگی کو بڑے پیمانے پر منظم کرنے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟

(یہ مشورہ عام طور پر دیا جا رہا ہے کہ چونکہ خاتمۂ ناخواندگی کی رفتار بہت دھیمی رہی ہے اِس لئے خواندگی اور بعد کے مشقی پروگراموں کو سب کاموں پر ترجیح دی جانی چاہیئے، اور اس مقصد کے لئے معقول مقدار میں سرمایہ فراہم کیا جانا چاہیئے۔ پنچایت سمیتیوں کے ممبروں خصوصاً اُن کی تعلیمی کمیٹیوں کے ممبروں کو خواندگی کے مقصد و منشا اور اس کے متعلق جملہ پروگراموں کی ٹریننگ دی جانی چاہیئے۔ دوسری طرف گاؤں پنچایتوں کو اُبھارنا چاہیئے کہ اُن کے اپنے گاؤں میں خواندگی کی جو مہم چلائی جائیں، اُن کا زیادہ سے زیادہ بوجھ وہ خود اُٹھائیں۔ اُدھر سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کو واضح طور پر ہدایت ہونی چاہیئے کہ وہ خواندگی کے پروگرام کو بڑے سے بڑے پیمانے پر منظم کریں۔ سیمنار کو یہ تجویز بھی کرنا ہوگی کہ خواندگی کو بڑے پیمانے اور نتیجہ بخش طور پر منظم کرنے کے لئے کیا کیا ڈھنگ ہو سکتے ہیں۔)

۳- کیا مختلف منازل مثلاً بلاک، ضلع، کمشنری اور ریاست میں سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کا ایک باضابطہ نظام مدارج قائم ہونا چاہیئے؟

(کہا جاتا ہے کہ چونکہ بہت سی ریاستوں نے اپنے یہاں ڈسٹرکٹ سوشل ایجوکیشن آفیسروں کے تقرر میں سستی برتی ہے اس لئے سوشل ایجوکیشن کے کام کو نقصان پہنچا ہے۔ سیمنار اس مسئلے پر بحث کر سکتا ہے اور بتا سکتا ہے کہ سوشل ایجوکیشن

آرگنائیزر کی نگرانی اور رہنمائی کا کیا طریقہ ہوگا۔)

۴ - کیا تعلیمات عامہ کے ریاستی محکموں کو اپنے یہاں سامعی، بصری سامان تعلیم، لٹریچر اور دوسرے تعلیمی وسائل کی تیاری کے یونٹ قائم کرنے یا (اگر وہ پہلے سے قائم ہیں) ان کی رفتار کو تیز کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے؟

(یہ استدلال اکثر پیش کیا جاتا ہے کہ سوشل ایجوکیشن کی کامیابی کی سست رفتاری کا ایک سبب یہ ہے کہ جن تعلیمی سامانوں کی ضرورت پڑتی ہے ان کی فراہمی نہیں ہو پاتی۔ سوشل ایجوکیشن کے کام میں تیزی آئے گی تو اسی نسبت سے سامان تعلیم کی ضرورت بھی شدید ہوگی۔ چند ریاستوں نے اپنے اپنے یہاں تعلیمی سامان تیار کرنے والے یونٹ قائم کر رکھے ہیں۔ سیمینار کو غور کرنا ہوگا کہ سوشل ایجوکیشن میں کس قسم کے تعلیمی سامانوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی تیاری کے لئے کیا بندوبست کیا جاتا ہے۔

۵ - آیا سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کی ٹریننگ کے لئے بھی تجویزیں مرتب کی جا سکتی ہیں۔

(پنچایتی راج میں فیصلے کرنے کا اختیار بھی منتقل کیا گیا ہے۔ بلاک کے علے کے لوگ جواب تک ترقیاتی اسکیموں سے متعلق فیصلے کرنے اور انھیں انجام دینے کے معاملے میں ثانوی اہم کردار ادا کرتے تھے انھیں اب ایک مختلف کردار ادا کرنے کی عادت ڈالنی ہے یعنی مقامی منصوبے بنانے اور انھیں انجام دینے میں پنچایت سمیتیوں کو مشورہ دینے، رہنمائی کرنے اور امداد بہم پہنچانے کا کردار۔ لیکن اس کے باوجود ترقیاتی کاموں میں اُن کی دلچسپی اور ذوق و شوق مردہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس باب میں یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ انسانوں کے ساتھ ربط ضبط قائم کرنے کے فن کی ٹریننگ حاصل کرنے اور اس کی مہارت بہم پہنچانے میں ان کی مدد کرنے کی ضرورت ہے۔ سیمینار کو غور کرنا ہے کہ آیا سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کی ٹریننگ کو پنچایتی راج کے پیش نظر کوئی نئی شکل دینے کی ضرورت ہے۔)

۶ - آیا سوشل ایجوکیشن کے باب میں کچھ اور تجویزیں ہو سکتی ہیں جن کی بنا پر وہ پنچایتی راج کے نظام میں کوئی مفید اور کارگر کام انجام دے سکتی ہے۔

انڈین اڈولٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے

جنرل سکریٹری کا خط

شفیق میموریل

۱۷۔ بی۔ پرستھ مارگ

نئی دہلی

۷ ستمبر ۱۹۷۱ء

برادرم برکت صاحب

میں آپ کا شکرگذار ہوں کہ آپ نے مجھے پنچایتی راج کے اس مسئلے اور اس سے متعلق ہمارے سامنے جو کام ہے اس کے بارے میں "تعلیم و ترقی" کے ناظرین سے تبادلہ خیال کا موقع عنایت فرمایا۔ آپ کا پرچہ "تعلیم و ترقی" ایک ایسے تصور کی ترجمانی کرتا ہے، جسے قبول تو سب کرتے ہیں مگر اس پر عمل بہت کم لوگ کرتے ہیں اور کم سے کم ہمارے منصوبہ ساز اور افسرانِ عاملہ تو کرتے ہی نہیں۔ وہ تصور یہ ہے۔ کہ تعلیم کے بغیر ترقی واقع نہیں ہو سکتی۔ تعلیم اور ترقی دونوں کا عمل ساتھ ساتھ ہونا چاہیے اور اس عمل میں تعلیم کو بہر حال ترجیح حاصل ہونی چاہیے۔

میں سماج کے سیاسی اور اقتصادی نظام میں لامرکزیت کی حمایت کرنے والوں کے ساتھ رہا ہوں اور اس حیثیت سے ملک میں پنچایتی راج کے قیام کے فیصلے کو خوش آمدید کہنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ لیکن اگرچہ میں اس فیصلے سے خوش ہوں تاہم اس کی تعمیل میں جو رکاوٹیں پیش آئیں گی ان سے بے خبر نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارے عوام کی جہالت، ذات پات کی وجہ سے ہمارے سماج کا انتشار اور صدہا سال کی پسماندگی ہماری کامیابی کے راستے میں روڑے اٹکائے گی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں۔ کہ ہماری سوسائٹی کا سماجی نظام ہمارے گاؤں میں حقیقی جمہوریت کو بروئے کار لانے میں حائل ہوگا لیکن اس کے باوجود مجھے اپنے ملک کے رہنے والوں پر پورا پورا اعتماد ہے اور اس اعتماد کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام مشکلات اور دشواریوں کے ہوتے ہوئے مجھے پنچایتی راج کی کامیابی کا یقین ہے۔ اس بڑے کام میں بالغوں کے معلموں کا کردار بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ انہیں کے اوپر اس زبردست سیاسی انقلاب کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ اس لئے تیسرے پنجسالہ پلان میں سوشل ایجوکیشن کے حق میں جو

کچھ کیا گیا ہے اُس سے قطع نظر کر کے ہمیں اپنے کام پر ڈٹے رہنا چاہیے۔ اس لئے کہ اسی کے اوپر ہمارے عوام کے مستقبل کا انحصار ہے۔

سماجی معلّم کو گاؤں میں ایسی فضا تیار کرنی چاہیئے کہ جس کے اثر سے وہاں کے لوگ پنچایتی راج کے خیال کو آسانی سے قبول کر لیں اسی طرح اسے لوگوں میں ذمّہ داری کے احساس کا جذبہ بھی پیدا کرنا چاہیئے۔ اِس لئے کہ احساسِ ذمّہ داری کی ضرورت صرف پنچایتوں کے ممبروں ہی کو نہیں ہے۔ بلکہ پورے عوام کو ہے۔ سماجی معلّم کو کچھ ایسا کرنا چاہیئے کہ لوگ پنچایتی راج کے اثرات و نتائج کو سمجھ سکیں اور اِس سلسلے میں اپنی ذمّہ داریوں کو پورا کرنے کے اہل بن سکیں۔

ہمیں یہ نہیں سوچ لینا چاہیئے کہ پنچایتوں کے ممبروں کی نام نہاد ٹریننگ سے ہمارا مقصد بہت کچھ حل ہو جائے گا۔ پہلا اصل زور عام انسانوں کی تیاری کے اوپر ہونا چاہیئے۔ تعلیمی پروگرام پورے عوام کے لئے منظم کئے جانے چاہئیں تاکہ وہ اپنے خوابِ غفلت سے بیدار ہوں اور اپنی طاقت کا احساس کر سکیں۔ اگر ایک مرتبہ عوام جاگ گئے اور انھیں ان کی طاقت کا احساس کرا دیا گیا تو پھر وہ اپنے آپ ترقّی کی راہ پر تیزی سے چل پڑیں گے۔

ایک بات اور کہہ کر میں اپنا خط ختم کر دوں گا۔ اور وہ یہ کہ سماجی معلّموں کو لازماً ایسے کام کرنے ہوں گے جن کے اثر سے دیہی سماج کے لوگ نئی سماجی قدروں کو قبول کر لیں ——— صرف وہی سماجی قدریں نہیں جن کا تعلّق زندگی کے معمولات سے ہو بلکہ وہ سماجی قدریں بھی جن کا تعلّق زندگی کے اقتصادی پہلو سے ہوتا ہے۔ ایک ایسا سماج جس کا دستور یہ ہو کہ چند آدمی لاتعداد آدمیوں کی لوٹ کھسوٹ کے اوپر زندہ رہیں ایک زبردست سماجی تضاد ہے اور سماجی معلّم کو اپنی پوری طاقت لگا کر اس کے خلاف کام کرنا چاہیئے۔ اور اس دستور کی جگہ اقتصادی تنظیم کا نیا نمونہ قائم کرنا چاہیئے۔ زمین کو برتنے والا اصلی زمین اس کے جوتنے میں ہو اس کا مالک قرار دیا جانا چاہیئے۔ اور دیہاتی صنعتیں سہکاری بنیاد پر چلائی جانی چاہئیں۔ دیہی سماج میں سہکاری سوسائیٹیاں اتنی رچ بس جانی چاہئیں کہ دیہی زندگی گذارنے کا معمول بن جائیں۔ اِس تمام کام میں سماجی معلّم کو پہل قدمی کرنی چاہیئے اور دیہی عوام کی ان تمام سرگرمیوں میں مدد کرنا چاہیئے۔ غرض سوشل ایجوکیشن کو نئے سماجی نظام کے ہراول دستے کا کام کرنا چاہیئے۔

اس نئے سماجی نظام کو بروئے کار لانا بہت بڑا کام ہے مگر اُسی اور صرف اُسی نظام میں ہماری جمہوریت کی نجات مضمر ہے۔

آپ کا مخلص

(دستخط) ایس۔ سی دتّا

آنریری جنرل سکریٹری

بلونت رائے مہتہ کمیٹی کی رپورٹ
تاریخ اور خلاصہ

بلونت رائے مہتہ کمیٹی کا قیام

پنجسالہ پلان کے مختلف پہلوؤں کے سلسلے میں کچھ ایسے آثار نظر آئے کہ ان میں سست روی اور کارکردگی کی کمی کی وجہ سے نقصان ہو رہا ہے اور بہت سا سرمایہ فضول خرچی میں چلا جاتا ہے۔ اِس صورتِ حال کو روکنے اور پلان کے پروگراموں میں تیز رفتاری پیدا کرنے کے مقصد سے حکومتِ ہند نے ۱۹۵۶ء کے اخیر میں پلان کے تمام پروگراموں کا معائنہ کرانے کے لئے ایک مخصوص کمیٹی مقرر کی جس کے صدر سابق وزیر داخلہ پنڈت گوبند ولبھ پنت (مرحوم) تھے۔ اس کمیٹی نے اپنی سہولت کے لئے پلان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لئے علحدہ علحدہ کمیٹیاں مقرر کر دی تھیں جن میں سے ایک کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام سے متعلق تھی۔ اُس کے صدر شری بلونت رائے ایم۔ پی تھے۔ یہ جائزہ کمیٹی ڈاکٹر ایس۔ ڈی۔ شرما وزیر مدھیہ پردیش، ٹھاکر پھول سنگھ نائب وزیر اترپردیش، شری بی۔ جی راؤ (آئی۔ سی۔ ایس) سابق چیف سکریٹری مدھیہ بھارت اور مشہور گاندھی وادی مفکر شری جی۔ راماچندرن پر مشتمل تھی۔ پنچایتی راج کی اسکیم اِسی کمیٹی کے غور و فکر کا نتیجہ تھی جس سے ملک کے ترقیاتی پروگراموں میں ایک انقلابی تحریک کی بسم اللہ ہوئی ہے۔

کمیٹی کے غور طلب امور

یہ کمیٹی جو دراصل کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کی کارکردگی کو بڑھانے اور اس میں عوام کی زیادہ سے زیادہ شرکت حاصل کرنے کی تدابیر سوچنے کے لئے مقرر کی گئی تھی، اس کے سامنے غور طلب امور کی جو فہرست تھی اُس میں آگے چل کر ایک بات یہ بھی بڑھا دی گئی تھی کہ ضلع کے نظم و نسق کی تنظیم کیا ہونی چاہیے اور آیا ترقیاتی پروگراموں کو عوام کے منتخب

ہوئے مقامی اداروں کے سپرد کرنے کا کس حد تک امکان ہے۔ اس نئے سوال کی بنیاد دراصل دوسرے پنج سالہ پلان کی وہ تجویز
ی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ "عام نظم و نسق اور مقامی ترقی کے کاموں کی ذمہ داری اور اختیارات ضلعے کے یا اُس سے نیچے کی
سطح کے خود مختار عوامی اداروں کو کیوں نہ سونپ دیئے جائیں"۔ نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل نے اپنے آٹھویں جلسے میں پلاننگ کمیشن
تجویز پر غور کرتے ہوئے محسوس کیا کہ اس پر کافی تفصیل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ شری وی۔ ٹی کرشنا چاری
ی تجویز پر، جنھوں نے کونسل کے سامنے اختیارات کی لامرکزی تنظیم سے متعلق ایک خاکہ بھی پیش کیا تھا، یہ مسئلہ بھی بلونت رائے مہتہ
یٹی کو غور کرنے اور اپنی تجاویز پیش کرنے کے لئے سونپ دیا گیا۔

دو بنیادی باتیں

اس کمیٹی کے سامنے نظم و نسق کی نئی تنظیم اور مقامی اداروں کو اختیارات کی منتقلی کے سلسلے میں اہم دو باتیں تھیں ایک
ہ حکومت ان اداروں کو کس حد تک اختیار منتقل کرے۔ دوسری یہ کہ اختیارات کی منتقلی کس سطح پر کی جائے، ضلع کی سطح پر
حصیل، تعلقے، بلاک کی سطح پر یا سیدھے گاؤں پنچایت کی سطح پر۔

(۱) جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے کمیٹی اِس نتیجے پر پہنچی کہ موجودہ حالات میں حکومت کے لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ وہ
ام نظم و نسق اور مقامی ڈیولپمنٹ سے متعلق تمام کاموں کی ذمہ داری اور اختیارات عوام کے مقامی اداروں کو منتقل کر دے
یولپمنٹ کے کاموں میں زراعت کی ترقی، افزائش نسل، کوآپریشن، آبپاشی کے چھوٹے موٹے منصوبے، دیہی صنعتیں، ابتدائی
علیم، مقامی نقل و حمل، صحت و صفائی، طبی سہولتیں اور مقامی آسائشوں کے ساز و سامان کی فراہمی شامل ہوگی۔ ان کاموں میں حکومت
و چاہیئے کہ اپنی تمام ذمہ داری اور اختیارات مقامی قانونی جماعتوں کو منتقل کر دے اور ان معاملات میں اپنا کام صرف رہنمائی
گرانی، اونچی سطح کی منصوبہ بندی اور حسب ضرورت مالی وسائل کی فراہمی تک محدود رکھے۔

(۲) دوسرے معاملے میں کمیٹی اِس نتیجے پر پہنچی کہ اختیارات کی منتقلی نہ ضلعے کی سطح پر مناسب ہوگی اور نہ گاؤں پنچایت کی
سطح پر۔ بعض ضلعے اتنے بڑے ہیں کہ اگر اس سطح پر عوامی اداروں کو اختیارات منتقل کئے جائیں گے تو اس سے "لامرکزیت" کا اصول
ہی فوت ہو جائے گا۔ دوسری طرف گاؤں پنچایتیں اتنی نچی سطح پر واقع ہوئی ہیں کہ اس سطح پر اختیارات منتقل کرنے سے یہ سودا
بہت مہنگا پڑے گا۔ اس سے کارکردگی گھٹ اور فضول خرچی بڑھ جائے گی اور ترقیاتی منصوبوں کے کام ٹھیک طریقے سے
نہیں چل سکیں گے۔ پھر تحصیل یا تعلقے کو بھی ترقیاتی پروگراموں کا یونٹ نہیں بنایا جا سکے گا اور نہ مناسب ہوگا اس لئے کہ یہ علاقے
اپنے رقبے کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ کچھ تحصیلیں بہت بڑی ہیں اور کچھ بہت چھوٹی۔ کمیٹی کی رائے میں ڈیولپمنٹ بلاک

جنھیں ترقیاتی پروگراموں کا یونٹ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوں گے۔ اِس سطح پر خود مختار مقامی اداروں کو جسے کمیٹی نے "پنچایت سمیتی" کے نام سے موسوم کیا ہے، انہی کو نظم ونسق اور ترقیاتی پروگراموں کے اختیارات منتقل کرنا مناسب ہوگا۔

ان بنیادی باتوں کے پیش نظر کمیٹی نے بلاک کی سطح پر علاقے کی تمام گرام پنچایتوں کے نمائندوں پر مشتمل پنچایت سمیتی کی تشکیل کرنے اور ضلع کی سطح پر سابقہ ڈسٹرکٹ بورڈوں کے بجائے ضلع پریشد کے نام سے مشاورتی کمیٹی قائم کرنے کی سفارش کی۔ پنچایت سمیتی اور ضلع پریشد کے اختیارات وفرائض وغیرہ کے سلسلے میں کمیٹی نے جو تجاویز پیش کیں اُن کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

الف۔ پنچایت سمیتی

۱۔ ڈیولپمنٹ بلاک کی سطح پر پنچایت سمیتی متعلقہ علاقے کی گاؤں پنچایتوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔ جس کی تشکیل بالواسطہ انتخاب کے ذریعے ۵ سال کے لئے ہوگی۔

۲۔ پنچایت سمیتی کے کام

پنچایت سمیتی کے کاموں میں زراعت کی ترقی سے متعلق تمام کام، مویشیوں کی افزائش نسل، مقامی صنعتوں کی ترقی، صحت وصفائی، سماجی بہبود کے کام، پرائمری اسکولوں کا انتظام اور علاقے سے متعلق ضروری اعداد وشمار کی جمع وترتیب وغیرہ شامل ہوں گی۔ اس کے علاوہ ریاستی حکومت کے کارندے کی حیثیت سے بھی وہ پروگرام منظم کریں گی۔ جو ریاستی حکومت وقتاً فوقتاً اُن کے سپرد کرتی رہے گی۔

جب پنچایت سمیتیاں زندہ وجاندار جمہوری ادارے کی حیثیت سے اپنا کام انجام دینے لگیں گی اُس وقت انھیں کچھ اور اختیارات بھی سونپے جا سکتے ہیں۔

۳۔ آمدنی کے وسائل

(الف) ۔ پنچایت سمیتی کے آمدنی کے وسائل حسب ذیل ہوں گے :-

(۱) بلاک کے علاقے کی مجموعی مال گذاری کا ایک مقررہ اوسط فی صد

(۲) آراضیاتی ٹیکس

(۳) پیشوں کے ٹیکس

(۴) غیر منقولہ جائدادوں کی فیس بیعنامہ

(۵) سرکاری جائدادوں کا کرایہ

(۶) لگان اور پٹے کی آمدنی

(۷) تیرتھ ٹیکس، تفریحی ٹیکس، تعلیمی ٹیکس، میلوں اور بازاروں کی آمدنی

(۸) موٹروں اور گاڑیوں کے ٹیکس کا مقررہ حصہ

(۹) عطیات

(۱۰) حکومت کی گرانٹ

(ب) ریاستی حکومت کو چاہیے کہ وہ پنچایت سمیتیوں کے لئے معقول مقدار میں امدادی گرانٹ کا انتظام کرے۔ امدادی گرانٹ کو سمیتی کی آمدنی سے مشروط بھی کیا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا کرنے میں اقتصادی اعتبار سے پسماندہ علاقوں کا خیال رکھنے کی ضرورت ہوگی۔

(ج) ایک ڈیولیپمنٹ بلاک میں مرکزی اور ریاستی حکومت کی جانب سے جتنی بھی رقم خرچ کی جانے والی ہو وہ سب کی سب پنچایت سمیتی کو سونپ دی جانی چاہیئے۔

۴۔ بلاک کا عملہ

سمیتی کا پورا ٹکنکل اسٹاف انتظامی اعتبار سے سمیتی کے وکاس ادھیکاری کے ماتحت ہوگا۔ مگر ٹکنکل معاملات میں وہ ضلع کے متعلقہ محکموں کے زیر نگرانی ہوگا۔

۵۔ حکومت کا دخل

حکومت کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ مفادِ عامہ کے حق میں اگر چاہے تو کسی سمیتی کو معطل یا برخاست کردے۔ ضلع کلکٹر کو بھی یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ سمیتی کے کسی فیصلے کو جس سے قانون کی خلاف ورزی یا نقص امن کا خطرہ ہو کالعدم قرار دے دے۔
پنچایت سمیتی کے پردھان کا انتخاب ہوا کرے گا۔ مگر شروع کے دو سال میں پردھان کے عہدہ پر حاکم تحصیل کا بھی تقرر ہوسکتا ہے۔ یہ محض اس لئے کہ بلاک کی انتظامی مشنری کو ایک تجربہ کار شخص نئے حالات کے مطابق ڈھال کر اسے چالو کردے۔
عام حالات میں ریاستی حکومت کو پنچائت سمیتی کے دائرہ اختیارات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔

(ب) - گاؤں پنچایت

ا - گاؤں پنچایت کی تشکیل براہ راست انتخاب کے ذریعے ہوگی۔ منتخب شدہ ممبروں کے علاوہ پنچایت میں عورتوں کے دو اور اچھوت اور قبائلی فرقوں کے ایک ایک نمایندے نامزد ہو کر شامل ہوں گے۔

۲ - گاؤں پنچایت کی آمدنی کے وسائل

(الف) جائداد یا مکان کا ٹیکس، بازاروں اور گاڑیوں کا ٹیکس، پانی اور روشنی کا ٹیکس، محصول چنگی، مویشی خانو اور مویشیوں کے بیعنامے کی فیس اور پنچایت سمتیوں کی امدادی گرانٹ۔

(ب) گاؤں پنچایت سے متعلقہ گاؤں کی مال گذاری وصول کرنے کا کام بھی لینا چاہیئے۔ اس کام کے لئے انھیں کچھ کمیشن بھی دیا جا سکتا ہے۔ مگر صرف انھی پنچایتوں کو یہ اختیار دینا چاہیئے جن کا کام کافی اطمینان بخش ہو۔

(ج) پنچایت کے بجٹ پر پنچایت سمتی کی منظوری لازمی ہوگی۔

۳ - گاؤں پنچایت کے کام

(الف) پنچایت کے لازمی کاموں کی فہرست میں پانی کی فراہمی، روشنی اور صفائی کا انتظام، سڑکوں کی مرمت، آراضیات کا انتظام، ضروری کاغذات اور اعداد و شمار کی جمع و ترتیب اور پسماندہ طبقوں کی بہبود کے کام شامل ہوں گے۔

(ب) ان کے علاوہ پنچایت سمتی اگر اس علاقے میں کسی خاص اسکیم کو چلانے کی ذمہ داری اُسے سونپے تو اس معاملے میں سمتی کے کارندے کی حیثیت سے کام کرنا۔

(ج) ضلع پریشد

پنچایت سمتیوں کے درمیان تال میل قائم رکھنے کے لئے ایک ضلع پریشد قائم کی جانی چاہیئے۔ اس ادارے کی حیثیت بیشتر مشاورتی ہو اور اس کے ممبر پنچایت سمتیوں کے پردھان، ضلع کے ایم ایل اے، ضلع کے حلقۂ انتخاب سے منتخب کئے ایم۔ پی اور ضلع کے مختلف محکموں کے افسرانِ بالا ہوں گے۔ ضلع کا کلکٹر اُس کا صدر اور کوئی ایک افسر اُس کا سکریٹری ہوگا۔

ظاہر ہے کہ بلونت رائے مہتہ کمیٹی نے ترقیاتی کاموں سے متعلق اختیارات کی منتقلی کی جس نظام کی سفارش کی ہے اس میں گاؤں پنچایتیں اِن خود مختار اداروں کی ایجنسیاں ہوں گی اور ضلع پریشد ان خود اختیار اداروں یعنی پنچایت سمیتیوں کے نمایندوں اور دوسرے متعلقہ لوگوں کی ایک ایسی انجمن ہوگی جن کی ماتحتی سے خود اختیار پنچایت سمتیاں آزاد ہوں گی۔

مگر بلونت رائے مہتہ کمیٹی کے سامنے کچھ ریاستوں میں اس کے برعکس ضلع کی سطح کے عوامی اداروں کو اختیارات منتقل کرنے کا خیال بھی رکھا گیا تھا۔ اس سلسلے میں کمیٹی نے سفارش کی کہ اگرچہ اِس مقصد کے لئے بلاک ہی سب سے زیادہ موزوں اکائی ہوگی، تاہم اختیارات ضلع کی سطح کے اداروں کو بھی منتقل کئے جا سکتے ہیں مگر اس شرط پر کہ ان اداروں کو پنچایت سمیتیوں کے مجوزہ اختیارات حاصل ہوں، مگر اس کے باوجود اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ مقامی ترقیاتی پروگراموں کا اختیار بلاک کی سطح کے اداروں کو منتقل کر دیا جائے۔

اس کمیٹی نے دسمبر ۱۹۵۷ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی تھی۔ اِس رپورٹ نے ملک میں "جمہوری لامرکزیت" کا چرچا بہت عام کر دیا اور بہت سی ریاستوں نے اس نمونے پر عمل کرنے کی آمادگی بھی ظاہر کر دی۔ اب یہ کیفیت ہے کہ اِس کمیٹی کی سفارشات کو اصولوں کی حد تک تقریباً سبھی ریاستوں نے تسلیم کر لیا ہے اور آندھرا، راجستھان، میسور، مدراس، آسام اور اڑیسہ نے اُن کی بنیاد پر حالات کے مطابق پنچایتی راج کے قانون بھی بنا لئے ہیں۔ اتر پردیش، مدھیہ پردیش، پنجاب اور بہار نے اِس مقصد کے لئے کمیٹیاں مقرر کر دی ہیں۔ مہاراشٹر اور گجرات میں بھی وہاں کی کمیٹیوں کی رپورٹیں شائع ہو گئی ہیں اور عنقریب وہاں بھی اب قانون بن جائے گا۔

ہمارے ملک میں بلونت رائے مہتہ کمیٹی کی رپورٹ کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اور اُس کا جس جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا، وہ بہت کم کمیٹیوں کو نصیب ہوا ہے۔ اِس رپورٹ نے نہ صرف اہلِ ملک کے اندازِ فکر کو متاثر کیا ہے بلکہ اُن میں اس کا عملی تجربہ کرنے کا حوصلہ بھی پیدا کیا ہے۔

نظریات اور رائیں

- قدیم پنچایتیں: چند روشن اور تاریک پہلو
- عوام کا سوراج
- راجستھان میں پنچایتی راج
- پنچایتی راج کے کچھ مسائل
- پنچایتی راج اور کمیونٹی آرگنائزیشن
- پنچایتی راج: سماجی تبدیلی کا ایک وسیلہ
- پنچایتی راج کی ایک مستحکم بنیاد: سوشل ایجوکیشن
- پنچایتی راج کی نشوونما میں خواندگی کی اہمیت
- پنچایتی راج میں رضاکار اداروں کا کردار (سفارشات)

ہندوستان کی قدیم پنچایتیں

چند روشن اور تاریک پہلو

گاؤں پنچایتوں کا رواج ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے ہے۔ چنانچہ ان گاؤں کا ذکر ویدوں میں بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ اُس زمانے میں گاؤں کی بستیاں ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور آزادانہ حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ بستیاں گاؤں کے تحفظ سماجی معمولات، رفاہِ عامہ کے کام اور قیام امن و عدل میں اپنے تجربہ کار بزرگ اور معاملہ فہم بوڑھوں کی رہنمائی میں کام کرتی تھیں۔ سماج کے اِس پنچایتی نظام کا ذکر منو اسمرتی میں جا بجا آیا ہے۔ اُس زمانے میں گاؤں کی تنظیم کی بنیاد گاؤں کی وہ روشن روایات ہوتی تھیں جنھیں یہ بزرگ رہنما بنانے اور برقرار رکھنے میں سب سے نمایاں کام انجام دیتے تھے۔ مگر زمانے کے ساتھ ساتھ سماج میں بھی تبدیلی آتی گئی اور نئے نئے خیالات اور نئے نئے اداروں نے لوگوں کے ذہن کو متاثر کیا، جن کا پنچایتوں کی تنظیم اور کاموں پر اثر پڑنا لازمی تھا۔

اِن گاؤں پنچایتوں کی اہمیت اِس لحاظ سے تو ہے ہی کہ وہ ہمارے تہذیبی ورثے کے امین اور گاؤں کے نظم و نسق کے سب سے قدیم ادارے ہیں۔ مگر اس کے علاوہ سماج میں یکجہتی اور استحکام پیدا کرنے اور گاؤں کو ایک مضبوط اکائی کی شکل میں قائم رکھنے والی سنستھا کی حیثیت سے بھی اُس کا کام کم اہم نہیں ہے۔ ہمارے ملک پر باہر کی قوموں نے کتنے ہی حملے کئے، تباہیاں آئیں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں، مگر ان حوادث کی لپٹ سے ہمارے گاؤں بہت حد تک محفوظ رہے۔ اور یہ ممکن اس لئے ہو سکا کہ ہمارے گاؤں میں ایک پائیدار تنظیم تھا اور پنچایتیں ہر حال میں اس کی پائداری اور تسلسل کو قائم کئے ہوئے تھیں۔ گاؤں کو اپنی ضروریات کے لئے باہر کی دنیا کا منھ شاذ و نادر ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ یہ خود کفیل اکائیاں تھیں جو اپنے تمام معاملات میں آزاد تھیں۔ اور بادشاہ وقت ہو یا مقامی راجے مہاراجے ان کی اس آزادی میں دخل نہیں دیتا تھا۔ اور یہ وہ زندہ حقیقت ہے جس کی شہادتوں سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔

ملک کے یا مقامی حکمران صرف یہی نہیں کہ ان اداروں کی آزادی میں مخل نہیں ہوتے تھے بلکہ سماجی زندگی میں اُن کی حیثیت اور مرتبے کا احترام بھی کرتے تھے۔ ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ بادشاہ وقت اکثر ایسے بہت سے معاملات جو مقامی اداروں کو نظر انداز کر کے اُس کے پاس پہنچائے جاتے تھے اُن پر غور کرنے سے انکار کر دیتا تھا اور انھیں گاؤں کی عدالتوں کے سپرد کر دیتا تھا۔

ہندوستان کی قدیم گاؤں پنچایتوں کی اس مختصر داستان میں سب سے زیادہ قابل توجہ بات ان سنستھاؤں کا موافق و ناموافق ہر طرح کے حالات میں قائم اور برقرار رہنا ہے۔ سوچا جا سکتا ہے کہ ان سنستھاؤں میں کتنی جان تھی اور اُن کی جڑیں سماج میں کتنی گہری تھیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ گاؤں کے سب کے سب لوگ بھائی چارے کے اشتراک مفاد کے زیر اثر کس طرح بڑی سے بڑی ذمے داری اپنے اوپر لے لیا کرتے تھے۔ برطانوی دورِ حکومت میں کچھ انگریز افسروں نے بھی ان گاؤں پنچایتوں کا جائزہ لیا تھا۔ چارلس مٹکاف نے ان گاؤں پنچایتوں کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:۔

"گاؤں کی بستیاں چھوٹی چھوٹی آزاد جمہوریتیں ہیں جو بیرونی دنیا سے آزاد رہ کر اپنی تمام ضرورتیں خود پوری کر لیتی ہیں۔ گاؤں کی بستیوں کی یہ انجمن بجائے خود چھوٹی سی ریاست ہوتی ہے۔"

زمانۂ قدیم میں سیاسی تنظیم کی جو کیفیت تھی اس کے ماتحت پنچایتوں کی اس طرح نشو و نما قدرتی بات تھی۔ آبادی کم تھی، ضرورتیں محدود تھیں، گاؤں میں جو کچھ پیدا ہوتا تھا اُسی کے اوپر ساری بستی صبر و شکر کے ساتھ گذارا کر لیتی تھی، اس لئے نہ تو بے روزگاری کا مسئلہ تھا اور نہ کم روزگاری کی شکایت۔ اُس زمانے میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ گاؤں والے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود ہی پیدا کر لیں۔ آنے جانے کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ اِس لئے باہری دنیا سے تعلقات بڑھانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

مگر ان روشن پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان قدیم گاؤں پنچایتوں کے کچھ تاریک پہلو بھی تھے جنھیں ہم اپنے اس تجزیے میں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اُس زمانے میں گاؤں کا دائرۂ فکر محدود تھا۔ وہ صرف اپنے ہی متعلق سوچتے تھے، یہ بات اس کے پیش نظر نہیں ہوتی تھی کہ وہ ایک بڑے اجتماعی وجود یعنی اپنے ملک کا جزو ہیں اور اس حیثیت سے اُن کے اوپر کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان کی دنیا بس اپنے گاؤں تک محدود تھی اور وہ اس سے کبھی باہر نہیں نکلتے تھے اور اُسی محدود دنیا میں اپنی آزادی کی حفاظت اور تحفظ کی بات سوچتے تھے۔

دوسری طرف سماج میں طبقاتی تفریق، ذات پات کے امتیازات اور چھوت چھات کی بنا پر ایک دوسرے سے پرہیز کی وجہ سے سماج میں جو برائیاں رائج تھیں اُن کے خلاف قدم اٹھانا تو در کنار یہ گاؤں پنچایتیں انھیں سماجی نظام کا

اصل الاصول اور مذہبی نظامِ عقائد کی بنیاد تسلیم کرتی تھیں۔ اِس اعتبار سے دیکھئے تو یہ گاؤں پنچایتیں ایک طرف جہاں گاؤں میں اتحاد اور یک جہتی کی فضا قائم رکھتی تھیں وہاں دوسری طرف ان سماجی لعنتوں کو نہ صرف یہ کہ روا رکھا بلکہ سماج میں ان کی جڑوں کو مضبوط بھی کرتی رہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے قدیم گرام پنچایتوں کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے :-

"سماجی آزادی اور خود مختاری، جو ان گاؤں کو حاصل تھی، وہ بلاشبہ اچھی بات تھی، اس کے علاوہ اُن میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں۔ مگر اس نظام میں جو خرابیاں تھیں اُن کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ باہر کی دنیا سے بے تعلق گاؤں ہی کی حدود میں سمٹی ہوئی یہ زندگی ترقی کے لئے سازگار نہیں ہو سکتی تھی یہی وجہ ہے کہ گاؤں کی یہ بستیاں اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ترقی کی محرک نہیں بن سکتی تھیں۔"

قدیم گاؤں پنچایتوں کے اِس تجزیئے کے پیشِ نظر پنچایتی راج کی موجودہ تحریک میں ہم مقامی حکومت کے ان قدیم اداروں کی ہو بہو نقل نہیں کر سکتے۔ اُن سے ہمیں صرف اُسی حد تک سبق لینا چاہیئے جس حد تک ماضی سے اکتسابِ فیض کے لئے تاریخ ہمیں اجازت دے۔ ماضی ہمارے تمدّنی ترکے کا گنج گرانمایہ ضرور ہے، لیکن اگر ہم چاہیں کہ اس گڑے ہوئے خزانے کے سکوں کو آج کے بازاروں میں چلائیں تو ہمارے ہوش و حواس کے اوپر شبہہ کیا جائے گا۔ اس تمدّنی ترکے سے استفادہ کرنے کے باب میں دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ دھات تو وہی رہنے دیں جو ان قدیم سکوں کی گرانمایگی کی ضمانت تھی البتہ انھیں رائج الوقت سکوں کے سانچے میں ڈھال لیں تاکہ دیکھنے والے یہ نہ کہنے پائیں کہ ہم نے اپنی موجودہ دولت کے لئے مواد کہیں باہر سے حاصل کیا ہے۔ بلکہ وہ کسوٹیوں پر پرکھنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ یہ سونا اُسی مٹی کا اُگلا ہوا ہے جو سونا اگلنے کے لئے صدیوں سے مشہور رہی ہے۔

عوام کا سُوراج

زیر نظر مضمون شری جے پرکاش نرائن کے پمفلیٹ "سوراج فار دی پیپل" سے لیا گیا ہے جو اکھل بھارت سرو سیوا سنگھ، راج گھاٹ بنارس کی طرف سے اسی سال شائع ہوا ہے۔ اِس پمفلیٹ میں شری نرائن نے ملک کی سیاسی تنظیم کے سلسلے میں اپنے نظریئے کے سب پہلوؤں پر بحث کی ہے، لیکن ہم نے اُن میں سے ایک باب "پنچایتی راج" سے زیادہ استفادہ کیا ہے اور اس سے متعلق اُن کے خیالات جوں کے توں دے دیئے ہیں۔

چونکہ مضمون میں شری نرائن ہی کے خیالات کو مرتب کیا گیا ہے اور ایڈیٹر کے الفاظ کی حیثیت محض اِن خیالات کو جوڑ دینے والی کڑی کی ہے اس لئے اس مضمون کو اُنہی کے نام نامی سے منسوب بھی کیا گیا ہے۔ جہاں کہیں ایڈیٹر کے الفاظ ہیں، اُنھیں شری نرائن کے خیالات سے الگ رکھنے کی غرض سے بریکٹ میں رکھا گیا ہے۔ —— ایڈیٹر

موجودہ سیاسی تنظیم میں عوام کی حیثیت

ہمارے دستور پر دس سال تک عمل ہونے سے سب سے نمایاں طور پر جو حقیقت سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ ملک کے عوام یعنی "۳۰ کروڑ ووٹروں کو" اس سے الگ رکھا گیا ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ گزشتہ دو انتخابات میں اُنھیں حصّہ لینے کا موقع ملا ہے۔ لیکن جمہوریت کے عمل میں اس دو ہبر کے تعلق کے علاوہ اُنھیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ عوام کو یہاں تک کہ گاؤں کے عوام کو بھی اکثر کہتے سنا گیا ہے کہ سُوراج آیا تو سہی، مگر اُن کے لئے نہیں۔ اُنھیں شکایت ہے کہ جس طرح انگریزی حکومت کے زمانے

میں دستور رہا تھا، اُسی طرح اُن کے اوپر اب بھی حکومت کی جاتی ہے اور جو حکومت کرتے ہیں وہ بھی اُسی طرح کے لوگ ہیں۔ ۔ ۔ ۔
اِس سچائی سے انکار نہیں کرنا چاہیئے کہ سوراج کی سنسنی عوام تک نہیں پہنچ پائی ہے، صرف تعلیم یافتہ طبقے کے کچھ لوگ ہیں، اور ان میں سے بھی صرف وہ لوگ جن کا سیاسی سرگرمیوں سے براہِ راست تعلق رہتا ہے، وہی ہماری جمہوریت کے عمل سے وابستہ ہیں۔

اِس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری جمہوریت بہت بودی اور پتلی بنیاد پر کھڑی نظر آرہی ہے یہ اُس اُلٹے اہرام کی طرح ہے جو سر کے بل کھڑا ہو۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اس تصویر کو سیدھا کر دیں اور اس اُلٹے اہرام کو سیدھا کر کے اُسے اُس کی بنیاد کے بل کھڑا کر دیں۔ یہ کروڑوں افراد اور ایک دوسرے سے غیر متعلق ووٹر ریت کے ذرّات کی مانند ہیں جو کسی عمارت کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ کسی عمارت کا سنگِ بنیاد بننے کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ انھیں ملا کر اینٹوں کی شکل میں ڈھال لیا جائے۔ یا سیمنٹ اور کنکریٹ کے سانچوں میں جما کر سلوں میں منتقل کر لیا جائے۔ اس لئے یہ ظاہر ہے کہ اگر ہماری جمہوریت کو پائدار بنانا ہے تو اُس کی بنیاد کو چوڑا کرنا پڑے گا اور اوپر کی منزلوں کی تعمیر بنیاد کی مطابقت سے کرنی ہوگی۔ اگر بنیاد مضبوط ہوئی تو اس کا بہت کم خطرہ رہے گا کہ جہاں کسی نچلے نے چھوا پوری کی پوری عمارت نیچے آرہی۔

عملی روپ

(اس بنیادی تصوّر کا عملی روپ شری جے پرکاش نرائن کے نزدیک یہ ہے:)

"یہ طے ہے کہ اگر حکومت کا مرکز دہلی یا ریاستوں کے صدر مقامات ہوں تو ہندوستان کے کروڑوں ووٹروں کے لئے اس کے کاموں میں شرکت کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انھیں حکومت میں شریک کرنے کی غرض سے خود حکومت کو اُن سے جتنا ممکن ہو قریب لانا ہوگا۔ اِس مقصد کے لئے ضرورت ہوگی کہ سیاسی اور معاشی لامرکزیت کا ایک مکمل نظام بروئے کار لایا جائے۔

"اِس باب میں میرا تصوّر وہی ہے جس کے اوپر گاندھی جی اکثر و بیشتر زور دیا کرتے تھے یعنی آپ جوں جوں حکومت کی نچلی سطح سے چل کر چوٹی پر پہنچیں گے۔ اُسی نسبت سے حکومت کے بالائی اداروں کے اختیارات کم سے کم تر ہوتے جائیں گے۔ اسے سمجھنے کے لئے اُلٹے اہرام کی مثال پھر لیجئے۔ ہونا یہ چاہئے کہ جمہوریت کے موجودہ ڈھانچے کی چوڑی چوڑی تہوں کو کاٹ دیا جائے تاکہ بالائی منزلوں کے بھاری حصے زمین پر آکر وہیں جم جائیں اور جمہوریت کا یہ اہرام صحیح معنی میں اہرام بن سکے — یعنی چوٹی پر پتلا اور نیچے بنیاد میں چوڑا۔ ایسے سیاسی نظام کے ماتحت ہر منزل میں عوام کو اپنے اُن معاملات کا آپ انتظام کرنے کا پورا پورا موقع ملے گا جن کا اُس منزل سے تعلق ہوگا۔ ایسے جمہوری نظام سے عوام کے اندر سوراج کی سنسنی بھی پیدا ہوگی

جمہوریت سے براہِ راست وابستہ بھی ہو جائیں گے۔

دشری نرائن نے اس تنقید کا کہ سیاسی اور معاشی لامرکزی تنظیم سے مرکز کے کمزور ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا جواب دیتے ہوئے کہا ہے۔

"اس بات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر عوام کو اپنے معاملات کا آپ انتظام کرنے اور اپنی بے مثال حیثیت کو برقرار رکھنے کی زیادہ سے زیادہ آزادی ملے تو ہمارے اندر بحیثیت ایک قوم کے آج کی بہ نسبت کہیں زیادہ یک جہتی ہوگی اور جن رنگارنگ قومیتوں سے مل کر ہندوستان بنا ہے، وہ کہیں زیادہ خوشی و خرمی کے ساتھ رہیں گی۔ ایک مختارِ مطلق مرکز جسے بے شمار کام انجام دینے ہوں، اوپر اوپر سے تو طاقت ور معلوم ہو سکتا ہے لیکن اندر سے یہ اپنے بھاری بوجھ سے دبا دبا رہے گا اور اس کے گر کر پاش پاش ہو جانے کا خطرہ ہر وقت لگا رہے گا۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ایک طاقت ور مرکز کا رجحان بتدریج جمہوریت سے دور رہا پڑنے کی طرف ہوتا ہے اور اس طرح اس کا مزاج زیادہ سے زیادہ آمرانہ ہو جاتا ہے۔"

"اختیار کے اس طرح پر منتقل کئے جانے پر کہ مرکز کے پاس اتنا ہی اختیار رہے جتنا اس کے فرائض کی تکمیل کے لئے ضروری ہو اور باقی سب کا سب نچلی سطح کے اداروں کے پاس رہے، ضروری نہیں کہ مرکز کمزور ہو جائے۔ یہ سارا معاملہ صلاحیت کا ہے ہر منزل پر مقامی حکومت بس وہی کچھ کر سکتی ہے جس کی اُس کے پاس صلاحیت ہو۔ اور چونکہ مقامی حکومت کو احساس ہوتا ہے کہ کچھ ایسے کام ہیں جو اُس کی قوت و صلاحیت سے باہر ہیں، اس لئے ایسے کاموں کو انجام دینے کی غرض سے وہ اپنی ہی حیثیت کی دوسری حکومتوں سے وفاق کر لیتی ہے تاکہ سب کی صلاحیت اتنی ہو جائے کہ وہ کام بھی پورے ہو سکیں۔ جو کسی ایک کے بس کے نہیں ہیں۔ یہی صلاحیت کی بات ہے جو اس نظام میں مرکز کی قوت و استحکام کی ضمانت کرتی ہے اِس لئے کہ مقامی حکومتیں مرکز کو جو ایسے فرائض انجام دینے کی غرض سے موقع اور اختیار سونپتی ہیں جن کا انجام دینا اُن کے بس کی بات نہیں ہوتی تو یہ اُن کے اپنے بھلے کے لئے ہوتا ہے۔

"مثال کے طور پر دفاع، امورِ خارجہ، بین ریاستی تعلقات، سکّہ، درآمد و برآمد کا کنٹرول، قومی وحدت کا تحفظ، ایسے منصب ہیں جنھیں انجام دینے کی صلاحیت صرف مرکز کو ہوتی ہے۔ ایک ایسے مرکز کو جس کے پاس اس قسم کے اختیارات ہوں، صرف اس لئے کہ اُس کے فرائض کا دائرہ وسیع نہیں ہے، کمزور قرار دینا عقل و فہم کے کسی گوشے تک میں نہیں سما سکتا۔ اس کے برخلاف اوپر بھاری نیچے ہلکا اور بے قاعدگی سے پھیلا ہوا مرکز جو ادنیٰ سے ادنیٰ بات پر حکم چلائے، دیکھنے میں چاہے طاقت ور و توانا معلوم ہو، مگر دراصل وہ کمزور، پلپلا، لڑھڑا اور بے اثر ہوتا ہے۔

پنچایتی راج

(سیاسی تنظیم کے بارے میں اپنے خیالات کی بنیاد بیان کرنے کے بعد شری نرائن نے پنچایتی راج کی نئی تحریک سے اطمینان کا اظہار کیا ہے)

گذشتہ چند مہینے سے پنچایتی راج کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لئے اس تحریک سے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن پھر بھی چند باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔

سب سے پہلے یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ پنچایتی راج کی تحریک اس مقصد کے پیش نظر نہیں اٹھائی گئی ہے کہ ہماری جمہوریت کی بنیاد کو چوڑا کرنا ہے یا اُس چیز کا سنگِ بنیاد رکھنا ہے جسے میں "عوامی جمہوریت"[1] سے تعبیر کرتا ہوں بلکہ اُس کی بنیاد وہ پریشانی ہے جو ترقیاتی پروگراموں میں عوام کی عدم شرکت سے لاحق ہو رہی ہے۔ اس محدود مقصد کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا منشا عوام تو دور رہے، خود ملک کے محتاط سیاسی عناصر کی سمجھ میں بھی اچھی طرح سے نہیں آیا ہے۔ اتنی بات بہر حال واضح ہے کہ تحریک کے پیچھے جو منطق ہے وہ اسے آگے منھ کوٹے جا رہی ہے اور اُس کے منشا و مفہوم میں مستقل طور پر وسعت اور گہرائی آتی جا رہی ہے مگر اس بات کی اب بھی ضرورت ہے کہ اس اقدام کے حق میں عوام کے جوش و خروش کو ابھارا جائے اور انہیں محسوس کرایا جائے کہ اس کے پیچھے صرف اتنی ہی بات نہیں ہے کہ مقامی حکومت کے موجودہ ضابطے میں اصلاح ہو جائے بلکہ یہ تحریک عوام کے حق میں ایک زبردست سیاسی انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

پنچایتی راج عوامی جمہوریت کی بنیاد اُسی وقت بن سکے گا جب حسب ذیل شرائط پوری ہوں گی۔

۱۔ تعلیم

عوام کی ہمہ گیر تعلیم اِس تجربے کی کامیابی کی بنیادی شرط ہے۔ یہ تعلیم بہترین طریقے پر وہ ادارے دے سکتے ہیں جنھیں نہ کوئی لاگ لپٹ ہو اور نہ کسی پارٹی سے اُن کا تعلق ہو بلکہ سماج سیوا اور دیہات سدھار ہی اُن کا مشن ہو۔

۲۔ سیاسی پارٹیوں کی عدم مداخلت

---

[1] شری نرائن کا لفظ PARTICIPATING DEMOCRACY ہے جس سے مراد ہے جمہوریت کا ایسا نظام جس میں عوام کی براہ راست شرکت ہو۔ اس لئے اردو کے سانچے میں فٹ بیٹھنے کی غرض سے اس کے لئے "عوامی جمہوریت" کا لفظ اختیار کیا ہے۔ م

یہ بات زور دے کر کہنے کی ہے کہ پنچایتی راج کو اُسی حد تک کامیابی ہوگی جس حد تک سیاسی پارٹیاں اس کے اندر دخل دینے، اُسے اپنے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنانے اور اُسے حصولِ اقتدار کا ذریعہ بنانے سے پرہیز کریں گی ..... اِس کے بجائے اِن سیاسی پارٹیوں کو چاہیئے کہ اُن کی تعلیم کا کام کریں۔ خواہ اُن کی تعلیم کے اثر سے عوام کے سامنے متضاد نظریات اور پالیسیاں ہی کیوں نہ آجائیں۔ اگر تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈر سر جوڑ کر بیٹھیں اور اِس باب میں ایک معاہدہ کر لیں تو اس مقصد کو حاصل کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

۳۔ خلوصِ نیت

اختیار کی منتقلی صحیح معنی میں اختیار کی منتقلی ہونی چاہیئے نہ کہ مصنوعی منتقلی۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ پنچایتی راج کا پنجر تو بنا دیا جائے مگر اس میں جان نہ ڈالی جائے۔۔۔۔ ہم میں سے جن لوگوں نے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لی ہے، وہ بالعموم عوام کی صلاحیتوں اور سمجھ بوجھ پر شبہ کرنے کی عادی ہیں چنانچہ ہو سکتا ہے کہ اختیار کی منتقلی زبان سے تو ہو جائے لیکن دراصل سرے سے کوئی اختیار منتقل نہ کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک کسی کو ذمّے داری سونپی نہ جائے اُس وقت تک وہ ذمّے داری کو پورا کرنے کا آرٹ سیکھ ہی نہیں سکتا۔

پنچایتی راج میں انتظام اور اختیار کے تین درجے ہیں۔ گاؤں پنچایت، پنچایت سمیتی اور ضلع پریشد۔ اِن تینوں درجوں میں عوام کو پورا پورا موقع ہونا چاہیئے۔ کہ جو کچھ بھی کرنے کی اُن کے اندر صلاحیت ہو وہ سب کچھ وہ خود کریں۔ برطانوی نظامِ حکومت میں اختیارات کی کنجی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ اُس کی آج بھی وہی حیثیت قائم ہے۔ لیکن پنچایتی راج میں اگر اختیار کی منتقلی سچ مچ کی منتقلی ہو تو پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، اور اگر وہ رہے بھی تو اس کی حیثیت ضلعے میں صرف ریاستی حکومت کے نمائندے کی ہونی چاہیئے، اُسی طرح جیسے ریاستوں میں مرکزی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے گورنر ہوتا ہے۔

۴۔ معقول مالی وسائل

یہ بات بے حد ضروری ہے کہ مقامی حکومت کے پاس مالی کی ضرورت کے مطابق اس کے اپنے مالی وسائل موجود رہیں۔ اگر مالی وسائل ریاستی حکومت کے کنٹرول میں رہیں گے تو اختیار کی منتقلی محض برائے نام ہوگی۔ "جو خرچ اُٹھائے اسی کو اختیار بھی حاصل رہتا ہے" یہ کہاوت یہاں بھی صادق آتی ہے۔

اس باب میں میرا مشورہ یہ ہے کہ زمین کی مال گذاری بجائے اُس کی مقدار کتنی ہی کم کیوں نہ ہو سب کی سب گاؤں پنچایت اور پنچایت سمیتی کے پاس رہنی چاہیئے۔ ریاستی حکومت کو اب یہ حق حاصل نہ ہونا چاہیئے کہ مال گذاری کی رقم میں سے وہی ان مقامی حکومتوں کو حصہ تقسیم کرے۔ مگر مال گذاری کی رقم کا پنچایت اور پنچایت سمیتی کے پاس رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پنچایتی راج کے ماتحت ان اداروں کو وہ روپیہ نہ ملے جو ترقیاتی پروگراموں کے لئے مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے آتا ہے۔

۵۔ سرکاری ملازموں کے اوپر کنٹرول

پنچایتی راج کو جس قدر جلد ممکن ہو اس قابل ہو جانا چاہیئے کہ وہ سرکاری ملازمین جو اُس کی ماتحتی میں اُس کے سامنے جواب دہ ہوں اس کے تابع فرمان ہوں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ بھرتی اور تقررات کے معاملے میں بھی مناسب ہوگا کہ مقامی حکومتوں یا ان کے نمائندوں کو بھی شریک کیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس بات کی ضمانت بھی ہونی چاہیئے کہ ان ملازموں کے ساتھ انصاف ہوگا، ان کی ملازمت محفوظ ہوگی انہیں کام کرنے کی آزادی ہوگی اور خواہ مخواہ کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

۶۔ گرام سبھا۔ بااختیار قانونی جماعت کی حیثیت سے

پنچایتی راج کے تین درجوں میں بظاہر گرام پنچایت جو سب سے نچلا درجہ ہے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پورے نظام کی قوت و حیات ۔۔۔ اور اس کی جمہوری روح ۔۔۔ کا دارومدار اسی گرام پنچایت کی قوت و حیات اور جمہوری روح کے اوپر ہوگا۔ اس باب میں میں نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ جمہوریت کا صحیح معیار عوام کی براہ راست شرکت ہوگی۔ اس لحاظ سے مقامی حکومت کا اگر کوئی درجہ ممکن ہے جس میں عوام کی پوری پوری شرکت قابلِ عمل ہو سکتی ہے تو وہ درجہ ہے گاؤں یہی وہ مقام ہے جہاں جمہوریت براہِ راست عمل پیرا ہو سکتی ہے۔

لیکن اگر گاؤں کے درجے پر بااختیار جماعت گرام پنچایت کو قرار دیا جائے اور گاؤں کے لوگوں کو اس کے معاملات بجز اس کے کہ وہ پنچایت کے انتخاب میں ووٹ دے دیں، اور کوئی دخل نہ ہو تو پھر یہ گاؤں کی جمہوریت بھی مکمل اور اطمینان بخش اور صحت مند نہ ہوگی اور پورے پنچایتی راج کے نظام کو درہم برہم کر دے گی۔ گاؤں پنچایت کی کارکردگی اور اس کی قوت و حیات کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ گاؤں کا پورا سماج برابر سمجھداری اور پورے جوش و خروش کے ساتھ اس کے کاموں میں دلچسپی لیتا رہے اور اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرے۔

پنچایتی راج کے عمل میں آنے سے پہلے بھی گاؤں پنچایتیں موجود تھیں مگر وہ گاؤں کی جمہوریتیں نہیں تھیں بلکہ ان کی حیثیت

ریاستی حکومتوں کی اور اس سے بھی بدتر مقامی حکومتوں کے کارندوں کی تھی۔ اب اگر پنچایتی راج کے نظام میں بھی گاؤں پنچایتوں کی قوت وحیات، حاکمیت اور استحکام کا سرچشمہ گاؤں کے سماج کو قرار نہ دیا گیا تو پہلے ہی کی طرح وہ بدستور ریاستی حکومتوں اور اُن کے افسروں کے ہاتھ میں آلۂ کار بنی رہیں گی جسے وہ گاؤں کے باشندوں کو قابو میں رکھنے اور اُن سے اپنا مطلب نکالنے کے لئے استعمال کرتے رہیں گے۔

اس لئے ہمیں اپنی جمہوریت کو صحیح بنیاد پر اٹھانے اور عوام کو اُس سے عملاً وابستہ کرنے کی غرض سے گرام پنچایت کی سطح سے بھی نیچے جاکر خود عوام کے پاس پہنچنا ہوگا اور گاؤں سماج کے تمام بالغ افراد پر مشتمل ایک "گرام سبھا" کو قانونی حیثیت دینی ہوگی۔ گرام پنچایت کی حیثیت اس صورت میں منتظمہ کی ہوگی جسے بہرحال دوسری کمیٹیاں اور خاص خاص کاموں کے لئے کارکنوں کی ٹولیاں مقرر کرنے کا اختیار ہوگا۔

جب یہ ہوگا اُسی وقت عوام کو اپنی ذمّے داریوں اور آگے بڑھنے کے مواقع کا احساس ہوگا اور گرام پنچایتیں ریاستی حکومتوں کے افسروں اور خود گاؤں سماج کے خود غرض اور مفاد پرست عناصر کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بننے سے محفوظ ہوسکیں گی اور عوام کی خواہشات اور ارادوں کی تکمیل کرنے والے ادارے کی حیثیت اختیار کرسکیں گی۔ جب یہ ہوجائے گا اُس وقت جمہوریت کی دل پذیر عمارت کی نچلی منزل "گرام پنچایت" نہیں بلکہ "گرام سبھا" ہوگی جو اس کے لئے چوڑی چکلی اور مستحکم بنیاد کا کام کرے گی۔

۷۔ ریاستی حکومت کی مداخلت سے آزادی

پنچایتی راج کا روز مرہ کا کاروبار ریاستی حکومت کے دائرۂ قانون سے باہر رہنا چاہیئے؟ پنچایتی راج کا نظام ریاستی اسمبلی کے قانون کے ذریعے عمل میں لایا جارہا ہے۔ یہ بات بالکل صحیح اور مناسب ہے یہ بھی صحیح ہے کہ پنچایتی راج کے قانون کے ماتحت قاعدے اور ضابطے بنانے کا اختیار بھی ریاستی حکومت کو حاصل رہے بشرطیکہ اُن کے وضع کرنے میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ یہ قاعدے ضابطے قانون کی روح یا منشار کے خلاف نہ ہوں۔ یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات قانون کے اہم حصے مبہم اور غیر واضح رہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منتظمہ اس کے ماتحت جو قاعدے اور ضابطے مرتب کرتی ہے، وہ خود قانون سے زیادہ اہمیت اختیار کرلیتے ہیں۔ اس معاملے میں بہرحال مجلسِ قانون ساز کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

ایک خودمختار پنچایتی راج کمیشن کی ضرورت

اِس موقعے پر میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب پنچایتی راج کے لئے قانون اور اُس کے ماتحت قاعدے اور ضابطے بن جائیں اس کے عمل درآمد کی ذمے داری ایک خودمختار جماعت کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ جیسے پبلک سروس کمیشن ہے، یا الیکشن کمیشن یا یونیورسٹی گرانٹس کمیشن وغیرہ۔

ریاستی حکومتیں پارٹی کی حکومتیں ہوتی ہیں جیسا کہ پارلیمانی جمہوریت کے مطابق سب کہیں دستور ہے۔ اس لئے اُن کو نامناسب حد تک جانب داری کا ملزم نہ ٹھہرائیں جب بھی یہ قدرتی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے وہ تامل کریں گی اور سوچیں گی کہ اِس اقدام کا پارٹی کے اوپر کیا اثر پڑے گا اور اگر وہ ایسا نہیں کریں تو انھیں انسان نہیں فرشتہ قرار دیا جائے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ پارٹی کا مفاد ضروری نہیں کہ عوام کے مفاد سے ہم آہنگ ہی ہو۔ ممکن ہے کہ پنچایتی راج کے اداروں پر قبضہ کرکے اُنھیں اپنے گُن میں رکھنا پارٹی کے مفاد کے حق میں ضروری قرار پائے اور اِدھر پنچایتی راج کے اداروں کی صحت اور قوت کے لئے یہ ضروری ہو کہ اُنھیں اقتدار کی اِس طرف داراانہ جنگ میں شطرنج کے مہرے بننے سے محفوظ رکھا جائے۔

اِس مسئلے کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ جن لوگوں کو اقتدار حاصل ہوتا ہے اُسے اُنھیں چھوڑنے میں بہت پس و پیش ہوتا ہے۔ موجودہ ریاستی تنظیم میں اختیار و اقتدار کے دو ساجھی دار ہیں۔ ایک وزیر اور اس کے حمایتی اور افسر شاہی نظام۔ اِن دونوں کے اِس کمزوری کا شکار ہونے کا امکان ہے اور اس کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ ترکِ اختیار کے معاملے میں وہ زبانی جمع خرچ تو دکھا دیں مگر اس کے پیچھے اصلیت کچھ نہ ہو۔

مذکورۂ بالا مصلحتوں کی بنا پر یہی مناسب ہوگا کہ پنچایتی راج کے قیام، عمل درآمد اور نشوونما میں مدد اور رہنمائی اور نگرانی کا کام ایک غیر سیاسی خودمختار جماعت کو سونپ دیا جائے اور اس کا سربراہ ایک ایسے شخص کو بنایا جائے جو سِول سروس کا آدمی نہ ہو۔ یہ موخرالذکر شرط اس لئے ضروری ہے کہ سول سروس کا آدمی ہو سکتا ہے، حکومت کے انگوٹھے کے نیچے رہے اور پنچایتی راج کے ماتحت کام کرنے والے سرکاری ملازموں کے حقوق و اختیارات کے معاملے میں جانبداری کا کام

دو تنقیدیں

قبل اس کے کہ میں پنچایتی راج کے باب میں اپنی بحث ختم کروں دو تنقیدوں کے بارے میں مختصراً اپنی رائے ظاہر

گرووں جو پنچایتی راج کی مخالفت میں پیش کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گاؤں کے لوگ اتنے پسماندہ، جاہل اور بے خبر ہوتے ہیں کہ اُن سے اپنے آپ پر حکومت کرنے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اِس میں شک نہیں کہ ہمارے سماج کا ڈھانچہ صدیوں سے ایسا رہا ہے کہ گاؤں کے عوام کو بعض معاملات میں مجبوراً انتہائی پسماندگی کا شکار ہونا پڑا ہے۔ مگر وہ شہروں کے عالی دماغ لوگوں کے مقابلے میں نہ اخلاقی اعتبار سے پست ہوتے ہیں نہ ذہنی اعتبار سے کم تر۔ لیکن محض اس بنیاد پر انھیں اپنی خود مختار حکومت کے حق سے محروم رکھنا نہ صرف غلط اور غیر جمہوری حرکت ہوگی بلکہ گستاخی اور شوخ چشمی بھی ہوگی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے بدیسی حکمران بھی ہمیں ہماری آزادی سے محروم رکھنے کے لئے بالکل اسی طرح کی دلیل دیا کرتے تھے۔ اس قسم کی دلیل کا جواب بہت عرصہ ہوا دیا گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ اچھی حکومت خود مختار حکومت کا بدل کبھی نہیں ہو سکتی۔

میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ گاؤں کے لوگ ان اختیارات اور وسائل کا جو پنچایتی راج کے نفاذ سے اُن کو حاصل ہوں گے، شروع ہی سے بہترین استعمال کرنے لگیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اُن سے غلطیاں سرزد ہوں گی۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ خود مختار حکومت کی لیاقت اور صلاحیت پیدا ہی اُس وقت ہوتی ہے جب ذمہ داری عملاً سنبھالنی پڑے۔ دوسرے عوام کی پسماندگی کا علاج اُن کو اُن کے حقوقِ خود اختیاری سے محروم کرنا نہیں ہے بلکہ انھیں جتنی زیادہ سے زیادہ تن دہی کے ساتھ ممکن ہو تعلیم دینا اور اُن کے دماغوں کو روشن کرنا ہے۔ ملک کے "گنواروں" کی پسماندگی کا ذکر اس فراخی سے صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو اِس کام سے پہلو بچانا چاہتے ہیں۔

پنچایتی راج کی مخالفت میں دوسری دلیل جس کی بنیاد پر کچھ لوگ اس کی بسم اللہ کرنے کے منکر ہیں، یہ دی جاتی ہے کہ دیہاتی سماج اس قدر قدامت پسند ہے اور اُس کے اُوپر بالادست طبقوں کا اتنا زبردست غلبہ ہے کہ گاؤں کی جمہوریت کا بے انتہا قدامت پسند اور تنگ ظرف ہونا یقینی ہے۔ اِس بنیاد پر اس خطرے کا اظہار کیا جاتا ہے کہ دیہی سماج کے بالادست طبقے پنچایتی راج کے سیاسی اور معاشی اداروں کو اپنی بالادستی برقرار اور بحال رکھنے کے لئے استعمال کریں گے۔ اِس نقطۂ نظر میں یقیناً بڑا وزن ہے۔ مگر میں پھر وہی بات کہوں گا کہ اِس کا علاج عوام پر شبہہ کرنا اور جمہوریت کی سرحدوں کو پھیلنے سے روکنا نہیں ہے۔ یہاں بھی علاج سماجی تعلیم ہے جس کے بغیر کسی انقلابی تبدیلی کا بروئے کار آنا ممکن نہیں ہے۔ اوپر سے کیسا ہی ترقی پسندانہ قانون کیوں نہ بنا دیا جائے، تعلیم کی ایک حوصلہ مندانہ اور مؤثر مہم کی غیر موجودگی میں اُس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

اس کا ایک دوسرا علاج خود پنچایتی راج کے قانون کے اندر ایسے تحفظات قائم کرنا ہے جن کے اثر سے وہ لوگ جو اِس نظام کو چلانے والے ہوں، سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقوں کو اُوپر اُٹھانے کے لئے کام کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

آخر میں اس بات سے خبردار کردینا چاہتا ہوں کہ عوام کو خود مختار حکومت کی شکل میں موقع اور اختیار دینے سے انکار کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس ملک میں جمہوریت کو گھن لگ جائے گا اور ہم یا تو اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مارلیں گے یا کسی نہ کسی شکل میں ڈکٹیٹر شپ کا شکار ہوجائیں گے۔

[شری جے پرکاش نرائن نے اپنی اس کتاب میں پنچایتی راج کی سیاسی تنظیم سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد اس کی معاشی تنظیم کے باب میں بھی اپنی رائے پیش کی ہے۔ اگر موقع ملا تو ہم اُن کی بحث کا یہ پہلو بھی "تعلیم و ترقی" کے کسی اگلے شمارے میں ہدیۂ ناظرین کریں گے]

یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شہری اپنے شہر، قصبے یا گاؤں کی حکومت میں کوئی نمایاں حصہ نہ لے جس کی وجہ شاید یہ ہوتی ہے کہ سب کام اپنی اپنی جگہ خوش اسلوبی سے ہو رہے۔ لیکن اگر گلی یا محلّے کی صفائی کرنے والا ناغے کرکر کے آئے، یا سڑک کے گڑھوں کی فوراً کے فوراً مرمت نہ ہو یا کتب خانہ وقت سے بند ہونے لگے تو وہ بلا تامل کاؤنسل میں اس کی شکایت کرے گا اور یہ شکایت بے نتیجہ نہیں ہوگی بلکہ اس کا اُسے باضابطہ جواب دیا جائے گا اور معاملے کی اصلاح بھی کی جائے گی۔

"برطانیہ میں مقامی حکومت کا نظام"

راجستھان میں پنچایتی راج

شہریت کی تعلیم کے بغیر تجربہ ناکام ہے

راجستھان میں جمہوری لامرکزیت کی جو اسکیم شروع کی گئی ہے وہ اپنے ظاہر اور باطن دونوں میں بلونت رائے مہتہ کمیٹی کی سفارشات کا نمونہ ہے، جس کے چند پہلو بلا شبہ مذکورہ کمیٹی کی سفارشات سے زیادہ جمہوری حیثیت رکھتے ہیں۔ اِس سلسلے میں ایک بات تو پنچایت سمتی کی تشکیل میں عوام کی براہ راست نمائندگی ہے۔ پنچایت سمتی جس میں متعلقہ علاقے کی گاؤں پنچایتوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں، گاؤں پنچایتوں کے سرپنچوں پر مشتمل ہے۔ ان سرپنچوں کا انتخاب پنچایتوں کے ممبروں کے بجائے براہ راست عوام کرتے ہیں۔ اِس طرح پنچایت سمتیوں میں عوام کی بالواسطہ نمائندگی نہ ہو کر براہ راست نمائندگی ہو جاتی ہے۔ دوسری بات ضلع پریشد میں افسروں کی رکنیت سے متعلق ہے۔ یہاں ضلع کے افسروں میں صرف ضلع کلکٹر ہی ضلع پریشد کا ممبر ہو سکتا ہے اور اُسے بھی ووٹ دینے کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اور ڈیولپمنٹ سے متعلق مختلف محکموں کے افسر اس کی بیٹھکوں میں صرف مشیر کی حیثیت سے شریک کئے جا سکتے ہیں، جب کہ مذکورہ کمیٹی نے یہ سفارش کی تھی کہ ضلع پریشد کی بیٹھکیں ضلعے کے کلکٹر کی صدارت میں کی جائے اور اس میں ڈیولپمنٹ سے متعلق ضلعے کے تمام محکموں کے افسر بھی ممبروں کی حیثیت سے شامل ہوں۔

ضلع پریشد

راجستھان کی مقامی حکومت میں سب سے اُونچی منزل پر ضلع پریشد ہے جو اس بلندی کے ساتھ ہی ساتھ سب سے زیادہ کم بھی ہے۔ ضلع پریشدوں کے پاس آمدنی کے اپنے مخصوص وسائل نہیں ہیں۔ اُن کے پاس جو بھی فنڈ ہوتا ہے وہ یا تو ریاستی حکومت کی امداد سے حاصل ہوتا ہے یا پنچایت سمتیوں اور عوام کی طرف سے عطیات کی شکل میں موصول ہوتا ہے۔ اس کے اخراجات کی مد میں بھی بیشتر ملازمین کی تنخواہیں اور ممبروں کے بھتّے ہی شامل ہوتے ہیں۔

ضلع پریشد کے اختیار میں نظم و نسق کا کوئی کام نہیں ہے اور نہ اس طرح کے کام انجام دینے کے لئے اُس کے پاس وسائل ہی ہیں۔ مختلف کاموں میں تال میل پیدا کرنا اور ان پر نگرانی رکھنا اور مشورے دینا اُن کا خاص کام قرار دیا گیا ہے اور اس حیثیت سے اُسے پنچایتوں، اور پنچایت سمیتیوں اور اُن کے ممبروں کا رہنما اور ہی خواہ تسلیم کیا گیا ہے اور اس مقصد کے لئے اُسے کافی اختیارات بھی سونپے گئے ہیں مگر اس کے باوجود اُسے وہ اختیارات حاصل نہیں ہیں کہ وہ پنچایت سمیتیوں کو اپنی ماتحت سنستھا تصور کریں، جیسا کہ پنچایتوں کے معاملے میں پنچایت سمیتیوں کو اختیارات حاصل ہیں۔ اُسے کاموں میں تال میل لانے، کاموں کی نگرانی اور رہنمائی کرنے کے اختیارات جو دیئے گئے ہیں اُسے قانونی طاقت کی پشت پناہی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اُس کے فیصلوں کی قدر و قیمت پنچایت سمیتیوں کے سامنے بہت کم ہو گئی ہے اس کے فیصلے اُن کے لئے نیک مشوروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جسے وہ چاہیں تو آسانی سے نظر انداز بھی کر سکتے ہیں۔ ضلع پریشد کے بارے میں پنچایت سمیتیوں اور پردھانوں کے اِس طرح کے رویئے کی نظیریں اب بہت ملنے لگی ہیں۔

ضلع پریشد اور ضلع کلکٹر کے اختیارات میں تکرار

ضلع پریشد کو تال میل اور نگرانی کے جو اختیارات حاصل ہیں وہی سارے اختیارات ضلع کے ڈیولپمنٹ افسر کی حیثیت سے ضلع کلکٹر کو بھی حاصل ہیں اور اس معاملے میں اکثر و بیشتر کاموں کی تکرار اور دہراؤ کی کیفیت پائی گئی ہے۔

ضلع پریشد اپنی تنظیم کے اعتبار سے کافی بڑی جماعت ہے اور اِس بات کا بہت اندیشہ ہے کہ اس سے اُس کی یک جہتی پر بُرا اثر پڑے اور اس کے ممبر مختلف چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو کر بٹ نہ جائیں اور پھر اس میں پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلی کے متعلقہ علاقے کے ممبر بھی شامل ہوتے ہیں جو ضروری نہیں کہ ایک ہی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں ان کی سیاسی رسہ کشی اِس خطرے کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ اتنے محدود اختیارات والی جماعت میں آخر کن مقاصد کی تکمیل کی اُن سے امید کی جاتی ہے۔ پھر ایک بات اور ہے کہ جس طرح کے کام کرنے کے عادی یہ ہوتے ہیں وہ ان مقاصد سے قطعی میل نہیں کھاتے جن کے پیش نظر ضلع پریشدوں کی تشکیل ہوئی ہے۔

اس نئی تنظیم میں ضلع کلکٹر کی حیثیت بھی کچھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات ایک ضلع کلکٹر کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اُسے ایک ایسی جماعت میں موجود ہوتے ہوئے رائے دینے کا حق نہ ہو، جس کے فیصلوں کو عمل درآمد ہونے سے موقوف یا ملتوی رکھنے کا اُسے کلیۃً اختیار حاصل ہے۔

ضلع کلکٹر کے اُس منصب پر بہت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے جو ضلع کا ڈیولپمنٹ افسر ہونے کی حیثیت سے اُسے تکمیل دینے ہوتے ہیں۔ ان کاموں پر اُس کی موجودہ مصروفیتوں اور کام کے بار کو سامنے رکھ کر غور کرنا چاہیئے۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ کلکٹر کو ضلع کا افسر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے صرف ضابطے اور معمولات کے کاموں تک ہی ذمہ دار قرار دیا جائے۔ مقامی خود اختیار

اداروں کے بارے میں اُسے ریاستی حکومت کے چیف ایجنٹ کی حیثیت سے اتنے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں کہ وہ ان اداروں کے کاموں پر بیرونی کنٹرول رکھ سکے۔ اور انھیں اپنے کاموں کی تکمیل میں نظم و نسق اور تکنیکل معاملات سے متعلق ہر طرح کی امداد کی فراہمی کا یقین دلا سکے اور کچھ غیر معمولی حالات میں جب کہ یہ ادارے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی برت رہے ہوں اُن کے نام احکامات جاری کر سکے لیکن عام حالات میں اُسے مقامی اداروں کے ان اختیارات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیئے۔ جو انھیں قانون کی رو سے دیئے گئے ہیں۔ اِس سے ایک طرف تو ضلع کلکٹر کو جس پر پہلے سے ہی کام کا کافی بوجھ ہے ڈیولپمنٹ کے کاموں سے فرصت مل جائے گی اور وہ اپنے منصبی کاموں کو زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکے گا اور دوسری طرف جمہوریت کی لامرکزی تنظیم کو آزادی سے پھولنے پھلنے کا موقع بھی ملے گا۔

ضلع میں ایک ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ آفیسر کے تقرر کی ضرورت

اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر ضلع میں علاحدہ سے ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ افسر کا تقرر کیا جائے اور اُسے ضلع پریشد کا اُسی طرح افسرِ اعلیٰ مقرر کیا جائے جس طرح پنچایت سمیتیوں کے افسرِ اعلیٰ کی حیثیت سے وکاس ادھیکاری (بی۔ ڈی۔ او) مقرر کئے گئے ہیں ایسا ہو جانے سے رہنمائی، نگرانی اور تال میل پیدا کرنے کے اہم کاموں میں تکرار اور دہراؤ اور اختیارات کے استعمال میں دوعملی کی شکایت کی موجودہ کیفیت دور ہو جائے گی۔

ضلع پریشد کے منصب اور اس کے اختیارات پر بھی نئے سرے سے غور کرنا چاہیئے۔

ریاستی حکومت جب کسی پنچایت سمیتی کو برخاست یا معطل کرنا ضروری سمجھے تو اُس کا انتظام کسی ایڈمنسٹریٹر کے حوالے کرنے سے بہتر ہوگا کہ اُسے ضلع پریشد کو سونپ دیا جائے۔ ایسا کرنا جمہوری تقاضوں کے عین مطابق بھی ہوگا اور اُس سے کام میں بہتری پیدا کرنے کا منشا بھی پورا ہو سکے گا۔

ضلع پریشد کو یہ بھی اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ دو یا زائد بلاکوں پر مشتمل منصوبوں اور اسکیموں کو اور ایسے پروگراموں کو جنھیں ضلع کی سطح پر کرنا ہی زیادہ مناسب ہو، اپنی نگرانی میں عمل درآمد کرا سکے۔ موجودہ قانون کی رو سے یہ اختیار ریاستی حکومتوں کو حاصل ہے اور یہ اس کی مرضی پر موقوف ہے کہ وہ مناسب سمجھے تو اِس طرح کے کام ضلع پریشد کے حوالے کر دے۔

پنچایت سمیتی

(۱) پنچایت سمیتی جو علاقے کی تمام گاؤں پنچایتوں کے سرپنچوں پر مشتمل ہے اور جو ڈیولپمنٹ کے تمام مقامی پروگراموں

کے لئے ذمہ دار ہے اس اسکیم کی سب سے اہم کڑی ہے، پنچایت سمیتی کو اکثر جگہوں میں عوام کا تعاون حاصل کرنے میں بہت نمایاں کامیابی ہوئی ہے اور اس حیثیت سے وہ پرانی بلاک ڈیولپمنٹ کمیٹی سے زیادہ کامیاب ہیں جو نامزد ممبروں اور مختلف سرکاری افسروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ میں نے خود اجمیر کے ضلع میں دیکھا ہے کہ جور سیاواس میں سیکڑوں مرد و عورت، بوڑھے اور جوان سب مل کر تین بڑے بڑے تالاب کی تعمیر میں جی جان سے لگے ہوئے تھے۔ جو کام آج وہ خود اپنے شوق سے اور رضا کارانہ محنت سے تکمیل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں وہ کام نہ تو برطانوی دورِ حکومت میں ہو سکتا تھا اور نہ آزاد ہندوستان کا ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ ہی اس کام کو کرا سکتا تھا۔ گرام راج کے اس نئے دور میں جور سیاواس کا یہ کارنامہ قابلِ تعریف ہے جسے دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔

مگر اس طرح کی مثالوں کو دیکھ کر یہ بات کہہ دینا کہ اس اسکیم نے تمام علاقوں میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور لوگوں میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا ہے، مبالغے سے خالی نہ ہوگا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا ہے کہ بہت سے علاقوں کے پنچوں اور پردھانوں نے اس تبدیلی کو اور اس کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور وہ پورے خلوص کے ساتھ چاہتے بھی ہیں کہ وہ اس نئے انتظام سے فائدہ اٹھا کر گاؤں میں تعمیر و ترقی کا کچھ کام کریں۔ اُن میں سے اکثر لوگوں میں نہ صرف یہ کہ اس طرح کے کام کرنے کا حوصلہ موجود ہے بلکہ اس کے لئے ان میں عملی صلاحیت بھی موجود ہے۔ جہاں تک بلاک کے انتظامی عملے کا تعلق ہے اس کے کاموں میں مستعدی اور کارکردگی کے ساتھ لوچ بھی پیدا ہوئی ہے۔

بلاک کا ترقیاتی منصوبہ

پنچایت سمیتیوں کو اپنے قیام کے فوراً بعد ہی اپنے بلاک کے لئے پنج سالہ منصوبے کا ایک خاکہ تیار کرنا تھا۔ بلاک کا یہ منصوبہ چونکہ ریاستی منصوبے کے ڈھانچے کے اندر ہی بننا تھا اس لئے سب پنچایت سمیتیوں نے ایک بنے بنائے نمونے کو ہی اختیار کیا، جن کے معنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں مقامی لوگوں کی خواہشات اور ضروریات کی پوری طرح عکاسی ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود منصوبہ بندی میں مقامی اداروں کی شمولیت بذاتِ خود ایک بہت اہم بات ہے۔ اُن کے اخراجات کے مدوں کی تقسیم سے مختلف جگہوں کی مقامی ضرورتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

وسائل

مختلف بلاک کے بجٹ کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ بلاک کی اوسطاً آبادی ۶۰ سے ۷۰ ہزار کے درمیان ہے

اور بلاک کے پنج سالہ منصوبے کا خرچ ۳۱ اور ۳۴ لاکھ روپئے کے درمیان ہے، یعنی پنچایت سمیتی کے ذریعہ گاؤں کی تعمیر و ترقی کے منصوبوں پر جو رقم خرچ کی جائے گی اُس کا اوسط ۱۰ روپیہ فی کس سالانہ ہوگا۔ ساری ریاست کے منصوبے پر اُسے پھیلایا جائے تو یہ رقم ۱۲ اور ۱۳ کروڑ روپئے کے درمیان ہوتی ہے۔ اس رقم کی فراہمی کے سلسلے میں اصول یہ مانا گیا ہے کہ نصف رقم ریاستی حکومت پنچایت سمیتی کو فراہم کرے گی اور باقی نصف رقم پنچایت سمیتیاں اپنے طور پر عوام سے امداد حاصل کر کے یا محصول وغیرہ لگا کر مہیا کریں گی۔

پنچایت سمیتیوں کی اپنی آمدنی کی اِس مد میں وہ رقم بھی شامل ہے جو انھیں حکومت کے خزانے سے اپنے حصے کے طور پر علاقے کی لگان کی کل رقم میں سے ۲۵ فی صدی کے حساب سے اور آبادی پر ۲۵ پیسے فی کس کے حساب سے ملا کرے گی۔ اس کے علاوہ وہ تمام رقم بھی اس میں شامل ہے جو ٹیکس فیس، ترقیاتی کاموں میں رضاکارانہ محنت اور دوسرے عطیات کی شکل میں پنچایت سمیتی کو ملتی ہے۔

پنچایت سمیتیوں کو ٹیکس کے ذریعہ اپنی آمدنی بڑھانے کا جو اختیار دیا گیا ہے اُس میں آراضی ٹیکس عائد کرنے میں سب سے زیادہ ڈھیل دیکھنے کو ملی ہے ۲۳۱ پنچایت سمیتیوں میں سے ۱۶۰ سمیتیوں نے ۱۹۶۰ء کے آخر تک اس ٹیکس کے عائد کرنے کا فیصلہ ہی نہیں کیا تھا۔ اُن کے اِس تذبذب اور پس و پیش کی بنیاد شاید انتخاب جیتنے کی مصلحت تھی جو عنقریب منعقد ہونے والا تھا۔

ٹیکس، محصول اور عطیات کی شکل میں مقامی ذرائع سے رقم فراہم کرنا گاؤں کے ڈیولپمنٹ کے کاموں میں سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اسی آمدنی پر ڈیولپمنٹ کے کاموں کی رفتار منحصر ہے۔ ریاستی حکومت اپنی امداد کی رقم کا تعین بھی اسی اندرونی ذرائع سے حاصل ہونے والی رقم کی بنیاد پر کرتی ہے۔ دراصل پنچایت سمیتیوں کو اختیارات منتقل کرنے میں جہاں اور مصلحتیں کارفرما تھیں وہاں سب سے بڑی مصلحت یہ تھی کہ اُس کے نتیجے کے طور پر ریاستی حکومت کی کچھ مالی ذمہ داریاں بھی ان مقامی اداروں کو منتقل ہو جائیں گی۔ اگر پنچایت سمیتیاں ان مالی ذمہ داریوں کو اُٹھانے میں کوتاہی دکھاتی ہیں تو اِس سے لامرکزیت کی اِس اسکیم کا وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جن کے ماتحت اِن اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ ترقیاتی منصوبوں کی کامیابی کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ پنچایت سمیتیاں کس حد تک عوام میں خود اپنے مالی وسائل پر بھروسہ کرنے کا حوصلہ اور ہمت پیدا کرتی ہیں

وکاس ادھیکاری اور پردھانوں کے باہمی تعلقات

پنچایت سمیتی کے پردھان اور وکاس ادھیکاری کے درمیان تعلقات کا معاملہ بہت کچھ دونوں کی شخصی خصوصیات

کے فرق پر منحصر ہوتا ہے۔ کچھ پردھان ایسے ہیں جن کو وکاس ادھیکاری کے بلند مرتبہ منصب کی طرف سے پورا اطمینان ہے اور انھوں نے اُسے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی پوری آزادی دے رکھی ہے۔ کچھ پردھان ایسے بھی ہیں جو وکاس ادھیکاریوں کے کاموں پر انتظامی نگرانی رکھنے کے اپنے قانونی اختیار کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے پردھانوں میں سے کچھ نے تو اپنے وکاس ادھیکاری کے بلند مرتبہ کا خیال رکھا ہے، مگر کچھ ایسی مثالیں بھی دیکھنے کو ملی ہیں جہاں ان کے درمیان مفاہمت کا قائم ہونا مشکل ہو گیا ہے

پنچوں اور افسروں کی ٹرننگ

ریچایتی راج کی اس اسکیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں یہ بات پہلے سے محسوس کر لی گئی تھی کہ اچھی سے اچھی اسکیم کامیاب صرف اُسی وقت ہو سکتی ہے جب اُسے تکمیل دینے والوں کے ذہن اُس کی طرف سے صاف ہوں اور انھیں اس کام کی تربیت مل چکی ہو) اسی لئے پنچایتی راج کی اس اسکیم کے نفاذ سے پہلے ہی ڈھائی ہزار (سرکاری کلاؤ غیر سرکاری) لوگوں کو ایک مختصر کورس کے ذریعہ ٹریننگ دی گئی تھی جس سے انھیں یہ معلومات ہو سکے کہ اس نئی اسکیم کی خصوصیات کیا ہیں اور اختیارات کی لامرکزی تنظیم ہو جانے سے ان کی اور اُن کے نمایندوں پر کیا ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی۔ سب سے بڑی ذمہ داری گاؤں کے سرپنچوں پر آنے والی تھی جو اپنے منصب کے لحاظ سے پنچایت سمیتی کے ممبر بنائے جانے والے تھے۔ انھیں اس نئی ذمہ داری کے لئے تیار کرنے کے لئے ایک ہفتے کی ٹریننگ دی گئی۔ ان کے علاوہ ریاست میں پانچ مستقل ادارے قائم کئے گئے ہیں جن کے توسط سے پنچایت سمیتی کے ممبروں کے لئے مطالعے اور ٹریننگ کا ایک باقاعدہ پروگرام چلایا جا رہا ہے۔ نئے قانون میں اس بات کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ پنچایت سمیتی کا کوئی بھی ممبر اپنی ممبری کے حق سے محروم کر دیا جائے گا اگر وہ ضلع پریشد کے نامزد کرنے کے بعد " ادھین کیندر" (حلقۂ مطالعہ) میں شرکت کر کے ایک متعینہ نصاب کی تکمیل نہیں کر لیتا ہے۔

اس بات کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ فنی خدمات انجام دینے کے لئے جو اسٹاف مقرر ہوتے ہیں اُن کے اوپر سے انتظامی ذمہ داریوں کا بار کم کر دیا جائے" جس سے کہ وہ اپنی فنی خدمات سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکیں۔

اعلیٰ انتظامی عملے کو ڈیولپمنٹ کے کاموں سے روشناس کرانے اور ان میں اس کی طرف سے دلچسپی پیدا کرنے کی بہت سی تدبیریں کی گئی ہیں۔ نوجوان افسروں کے لئے بی۔ ڈی۔ او کی حیثیت سے دو سال کام کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بغیر وہ نہ تو اسپیشل تنخواہ کے مستحق ہوتے ہیں اور نہ انھیں ترقی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ راجستھان کی حکومت بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کو ۵۰ روپے ماہانہ زائد الاؤنس بھی دیتی ہے جس سے کہ راجستھان ایڈمنسٹریٹیو سروس کے قابل لوگ گاؤں میں جا کر کام کرنا پسند کریں۔ --

شہریت کی تعلیم کے بغیر تجربہ کامیاب نہیں ہو سکتا ہے

(اس اسکیم کی کامیابی کا دارومدار صرف اس بات پر نہیں ہے کہ محض کارکنوں اور لیڈروں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر دیا جائے۔ بلکہ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ عوام میں جمہوری نظام اور شہریت کے تقاضوں کا احساس پیدا کیا جائے)۔ راجستھان میں اس طرح کے کام کرنے کی بہت ضرورت ہے جس کے اثر سے عوام کے اندر پھیلی ہوئی افسردگی، مایوسی اور بے حسی کی کیفیت دور ہو اور ان میں اس نئے نظام کی قدر و قیمت اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو۔ لوگوں میں آگے آگے بڑھ کر اور اشتراک و تعاون سے کام کرنے کا جب تک حوصلہ پیدا نہیں ہوگا۔ آزادی اور گرام راج کے اس نئے دور میں تعمیر و ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

ہندوستان میں جمہوریت کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ یہاں کے لوگ ایک جمہوری ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو کس حد تک انجام دیتے ہیں ہندوستانی جمہوریت کے سامنے آج سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ لوگوں میں جمہوریت اور شہریت کے اصول اور طریق کار کا شعور کیونکر پیدا کیا جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں سب سے زیادہ ناانصافی اسی اہم پروگرام کے ساتھ برتی گئی ہے۔ راجستھان میں وہ لوگ بھی، جن کا تعلیم اور ڈیولپمنٹ کے کاموں سے براہ راست تعلق ہے۔ اس مسئلہ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ سوشل ایجوکیشن، جسے ڈیولپمنٹ پروگرام میں بہت معمولی درجہ دیا گیا ہے، اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتی ہے۔ مگر یہاں بھی شہریت کی تعلیم کو اس کا بنیادی کام نہیں قرار دیا گیا ہے۔ سوشل ایجوکیشن کے پروگرام بیشتر کٹھ پتلی کے تماشوں اور گاؤں کے کلاکاروں کی فن کاری کے مظاہروں تک محدود ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کٹھ پتلیاں نچانے والے عوام کو باقاعدہ شہریت کی تعلیم نہیں دے سکتے ہیں۔ اپنے سوانگوں کے ذریعہ یہ کٹھ پتلی والے جمہوری شہریت کی تعلیم کے مضحکہ خیز بنا سکتے ہیں۔ کتھاواچک دوسروں کو نئے زمانے کے تقاضوں سے کیا واقف کریں گے جب کہ وہ قدیم روایات سے خود اپنے کو آزاد نہیں کر سکے ہیں۔

جمہوری شہریت کی تعلیم سوشل ایجوکیشن کا ایک بنیادی کام اور ڈیولپمنٹ پروگرام کا ایک اہم جزو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو چاہیے کہ وہ اس طرف سب سے زیادہ توجہ دے۔ اس کام میں وہ پرائمری اور سکنڈری اسکول کے اساتذہ سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔ تعلیم خواہ وہ بچوں کی ہو یا بالغوں کی، اُسے جمہوری شہریت کی تعلیم سے مربوط ہونا چاہیے۔

پنچایت

اس نئی تنظیم کے ماتحت پنچایتوں کی ذمہ داریاں پہلے سے بہت بڑھ گئی ہیں، مگر مالی وسائل کے اختیارات پر پنچایت سمتیوں کا کنٹرول ہونے کی وجہ سے اس معاملے میں ان کی پہلی سی آزادی ختم ہو گئی ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں دیکھنے کو ملی ہیں جن کی بنیاد پر یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ جمہوری لامرکزیت کی یہ اسکیم گاؤں پنچایتوں میں نئی روح نہیں پھونک سکی ہے۔ ان معاملات میں جن میں اُسے پنچایت سمیتی کے توسط سے اور اس کی ایک ایجنسی کی طرح کام کرنا ہوتا ہے، اس کی آزادانہ حیثیت قائم نہیں رہ گئی ہے۔

پنچایت کے علاقے کے سارے بالغ لوگوں کا سال میں دو جلسہ بلانے کا قانون میں جو ذکر ہے اس کی بہت ہی کم پابندی کی گئی ہے اور بیشتر گاؤں میں اب تک ایک جلسہ بھی نہیں بلایا گیا ہے۔

انتخابات

پنچایتوں میں بلامقابلہ انتخابات کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے حکومت نے ایسی پنچایتوں کو جہاں سرپنچ اور ۸۰ فی صدی پنچ کا بلامقابلہ انتخاب ہوا ہو اُن کی ساری آبادی پر ہر فی کس کے حساب سے مزید گرانٹ دینے کا اعلان کیا تھا گذشتہ دسمبر میں جو انتخابات ہوئے ہیں اس میں ۲۰ سے ۲۵ فی صدی کے درمیان پنچ اور سرپنچ بلامقابلہ منتخب ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس میں کس حد تک حکومت کے اِس اعلان کو دخل ہے اور کس حد تک لوگوں نے خود گاؤں پنچایتوں میں اچھے آدمیوں کو اتفاق رائے سے بھیجنے کے سلسلے میں پرخلوص کوشش کی ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جنہیں لوگوں نے اُن کی اہلیت اور موزونیت پر غور کئے بغیر کسی اثر یا دباؤ میں آکر بلامقابلہ منتخب کر لیا ہوگا۔ کہیں کہیں سرکاری دباؤ کا بھی شبہہ کیا جا سکتا ہے۔

انتخابات کو سب سے زیادہ دھکا پارٹیوں کے باہم جھگڑوں، اندرونی جتھہ بندیوں، ذات پات کی تفریق اور کہیں کہیں حکومت کے کچھ وزیروں کی غیر پسندیدہ کارروائیوں سے پہنچا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ پنچایتوں اور پنچایت سمیتیوں میں آدھی سے زیادہ تعداد پر پرانے جاگیرداروں اور رجواڑوں نے قبضہ جما لیا ہے۔ اس طرح یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ جمہوری لامرکزیت ابھی تک عوام کے ہاتھ میں اختیارات اور ذمہ داریاں نہیں سونپ سکی ہے اور اصل طاقت آج بھی سماج کے اونچے طبقے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس پر لامرکزیت کی مزید اسکیم شروع کرنے سے پہلے اچھی طرح غور کر لینا چاہیے۔

پنچایتی راج کے کچھ مسائل

سماجی مفکروں کو پنچایتی راج سے گہری دلچسپی ہے اس لئے کہ ہمارے سماج کو جس سمت میں چلنا ہے اس سے ان کو صرف دلچسپی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں وہ ماخوذ بھی ہیں اور پنچایتی راج وہ تحریک ہے جو سماج کو اس سمت میں چلنے سے روک بھی سکتی ہے اور اس کی ہمت افزائی بھی کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ پنچایتی راج کی تحریک کو ہمیں اس نظر سے دیکھنا ہے کہ یہ ہم سے وابستہ ہو گئی ہے اور اگر کسی مقام پر ہمیں اس کے اوپر نکتہ چینی کرنی ہی پڑ جائے تو ہمیں نکتہ چینی اس طرح کرنی چاہئے جیسے ہم ان لوگوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں جن سے ہماری زندگیاں وابستہ ہیں۔

کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو پنچایتی راج کو جزو ایمان سمجھتے ہیں لہذا اس کے خلاف کسی قسم کی تنقید برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک اس کے اوپر شبہہ کرنا اس کا ثبوت دینا ہے کہ شبہہ کرنے والے کے دل میں بنیادی انسانی قدروں کا کوئی احترام نہیں ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسے کچھ لوگوں کے نزدیک جمہوریت میں شبہہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ شبہہ کرنے والے کے دل میں انسانی وقار کا احترام نہیں ہے یا کم سے کم اُسے اس کا احساس نہیں ہے۔

ایک طبقہ اُن لوگوں کا ہے جنھیں پنچایتی راج میں کوئی فائدہ نہیں نظر آتا اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک دوسری نحوست ہے جو مادی سیاست بازوں کے ہاتھوں ملک کے سر پہ آئی ہے۔

ہم انسانی وقار کے احترام کے مقابلے میں اوّل الذکر طبقے سے متفق ہیں لیکن اس بات سے ہمیں انکار ہے کہ یہ کسی سیاسی منصوبے سے اتنی وابستہ ہے کہ اس سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ اسی طرح ملک کے مستقبل کے معاملے میں فکرمند ہونے کا جہاں تک تعلق ہے ہمیں موخرالذکر طبقے سے بھی اتفاق ہے مگر ہم یہ نہیں مان سکتے کہ سیاست باز کی ذات میں جبلّی طور پر شیطنت ہوتی ہے چنانچہ اُس نے یہ سیاسی منصوبہ ہمارے مستقبل کا بیڑا غرق کرنے کی غرض سے بنایا ہے۔

خیالات کی اس کشمکش میں ہم اگر ایسا کریں کہ جو لوگ پنچایتی راج پر تنقید کرتے ہیں، ان کے شکوک و شبہات کو قلمبند کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہیں تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ ان تنقیدوں کا تجزیہ سات عنوانات کے تحت

کیا جا سکتا ہے جن پر ہم ایک ایک کرکے بحث کریں گے۔

۱- کہا جاتا ہے کہ پنچایتوں اور پنچایت کمیٹیوں میں جو لوگ منتخب ہو کر آتے ہیں انہیں منصوبہ بندی اور ترقیاتی سرگرمیوں کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا یا ان کے اوپر ان کاموں کا ذمے داری ڈالنا، جیسا کہ واقعہ ہے، ناکامی کو دعوت دینا ہے۔

یہ اسی طرح کا استدلال ہے جو سابقہ انگریزی حکومت ہندوستان کی سوراجی رائے عامہ کے خلاف پیش کیا کرتی تھی جس طرح بچہ چلنا سچ مچ چل کر سیکھتا ہے بالکل اسی طرح عوام ذمے داری اٹھانے کا گر ذمے داری اٹھا کر ہی سیکھتے ہیں۔ سیکھنے کا یہی واحد طریقہ ہے۔ رہا غلطیاں کرنا تو غلطیاں کرنا تو سیکھنے والے کا پیدائشی حق ہوتا ہے۔

۲- پنچایتوں کے کاموں اور انتخاب کے مفہوم و منشا کے معاملے میں عوام حتیٰ کہ پنچ صاحبان بھی بالکل کورے ہوتے ہیں چنانچہ انتخابات کا وقت سماج دشمن حرکات کا موقع بن جاتا ہے اور اپنے پیچھے تلخیاں اور عداوتیں چھوڑ جاتا ہے اور اس طرح پنچایت کے اختیارات کا بیجا استعمال ہونے لگتا ہے۔

یہاں ان بداعمالیوں سے بحث اسی حد تک مد نظر رہے جس حد تک ان کا واقع ہونا جہالت کے سبب سے ہو۔ ان کا دوسرا بڑا سبب جتھے بندی ہے جس پر ہم ذرا آگے چل کر بحث کریں گے۔ جہالت کا علاج تعلیم ہے نہ کہ ادارے کا بند کر دیا جانا جسے اگر علم و بصیرت سے چلایا جائے تو اس سے دیہی عوام کو فیض پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے اس اعتراض کا تو جواب موجود ہے اور وہ ہے سوشل ایجوکیشن۔

۳- اگر پنچ لوگ اپنے منصب اور کام سے واقف بھی ہوں، تب بھی یہ بات نمایاں طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ اگر ان کا منصب ان کے اوپر کوئی فرض عائد کرے تو وہ اپنے اوپر فرض عائد کرنے کے لئے رضامند نہیں ہوتے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے دیہی سماج کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ عزیز داری کے مصالح ادائیگی فرض میں تزلزل پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹیکس لگانے کی بات لے لیجئے جو پنچ ہونے کی حیثیت سے اس کا ایک اہم فرض ہے۔ کوئی شخص جس کے اوپر ٹیکس لگانے کا فرض عائد ہوتا ہے اپنے فرض کی ادائیگی کی خاطر اپنے کسی عزیز کے اوپر ٹیکس لگانا گوارا نہیں کرے گا۔ اس طرح کا کوئی غیر مقبول کام کرنے سے گریز کرنے کی اس عادت میں ہمارے سماج کے ذات پاتی نظام کی وجہ سے مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال کا تعلق بنیادی طور پر تعمیر اخلاق سے ہے اور اخلاق کی تعمیر جیسا کہ تمام ماہرین تعلیم کا متفقہ فیصلہ ہے ذمے داری سونپ کر ہوتی ہے نہ کہ اسے روک کر رکھ کر۔

۴۔ اگر پنچایتوں کو ترقیاتی کاموں کی انجام دہی کا ذمے دار بنایا جائے تو یہ طے ہے کہ ڈیولپمنٹ کا عملہ پنچایتوں کے کنٹرول میں ہونا چاہیے۔ جب ڈیولپ کا عملہ پنچایتوں یا پنچایت سمتیوں کے کنٹرول میں ہوگا تو ظاہر ہے ان کے لئے شرائط ملازمت بھی پنچایت سمتیاں ہی طے کریں گی۔ لیکن اگر عملے کے لئے شرائط ملازمت پنچایت سمتیاں طے کرتی ہیں؛ اور چونکہ سمتیاں اُن کے لئے اتنی خوش آیند شرائط ملازمت پیش نہیں کر سکتیں جتنی ریاستی حکومتیں تو ظاہر ہے انھیں کو محض ناکارہ قسم کے لوگ کام کرنے کے لئے ملیں گے جن کے سامنے کام پر اُکسانے والا کوئی محرک نہ ہوگا۔

یہ صورتِ حال اتنی مایوس کن نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ایسی انتظامی مشینری جو پنچایت سمتیوں کے فیصلوں پر لبیک کہے، اور جس میں قابل اور حوصلہ مند نوجوانوں کو ایک اچھے مستقبل کی جھلک نظر آئے، ابھی تک نہیں بن پائی ہے۔ اس مسئلے کو ٹریننگ اور ایک ہمہ گیر تعلیم کے ذریعے سلجھانا ہوگا اور ریاست کی تمام پنچایت سمتیوں کو خوب سوچ سمجھ کر ایک ایسی پالیسی متعین کرنی ہوگی جس کے زیر اثر ان کی خدمت کرنے والا عملہ اپنے دل میں اشتراک و تعاون کا جذبہ لے کر آئے۔ اِس معاملے پر ذرا اور آگے تک سوچیے تو یہ نتیجہ نکلے گا کہ جیسے جیسے دیہی علاقے سماجی اور اقتصادی اعتبار سے ترقی کریں گے اُسی نسبت سے پنچایت سمتیوں کے عملے کی اصلاح و ترقی بھی ہوگی۔

۵۔ پنچایتی راج کے خلاف نسبتۃً زیادہ شدید اعتراضات پر غور کرنے سے پہلے آیئے ایک کمتر درجے کے اعتراض پر غور کرلیں۔ وہ یہ کہ خود ہمارے نظام محاصل کی نوعیت کا تقاضا ہے کہ پنچایتیں اور پنچایت سمتیاں غریب جماعتیں ہوں گی اور جو ذمے داریاں اُن کے اوپر ڈالی جانے والی ہیں وہ مالی اعتبار سے اُن کی متحمل نہیں ہوں گی۔

یہ مالی مسئلہ ایسا ہے کہ پنچایتی راج کے تمام حامی اس کی طرف سے باخبر ہیں۔ ایک حد تک اُسے حل بھی کیا جا رہا ہے جس کی صورت یہ نکالی جا رہی ہے کہ انھیں زمین کی مال گذاری میں حصّہ دیا جائے، ریاستی حکومتیں اُنھیں اُن کی اپنی آمدنی کے برابر گرانٹ دیں، انھیں مقامی طور پر ٹیکس لگانے کا اختیار دیا جائے اور دو... ے اور ذرائع بھی سوچے جائیں۔ بنیادی مسئلہ دراصل دیہی علاقوں کی اقتصادی خوش حالی کا ہے اور یہ کہ ہمارے عوام اپنے لئے تہذیبی آسائشیں بہم پہنچانے کی غرض سے اپنے اوپر ٹیکس لگانے کے لئے رضامند ہو جائیں۔ اِس اعتبار سے پنچایتی راج کے خلاف یہ کوئی اعتراض ہی اعتراض نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کسی غیر ترقی یافتہ ملک کے سامنے اس کی آزادی یا قومی اقتدار کے خلاف اس کی مالی کم حیثیتی کو عذر کے طور پر پیش کیا جائے جو نہایت لچر عذر ہوگا۔

۶۔ ہماری دیہی آبادی کا ایک بڑا حصّہ اَن پڑھ اور جاہل ہے۔ ایک اَن پڑھ شخص مجرّد تصورات سے جیسے ہندوستانی قومیت کا تصور ہے آشنا نہیں ہو سکتا اور اس سبب سے اُس کی وفاداریوں کا دائرہ وسیع نہیں ہو سکتا جو اس

وقت زمانے کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے پنچایتی راج کے اداروں کو دیہی آبادی کے اس اَن پڑھ جم غفیر کے ہاتھوں میں دے دینا دوسرے الفاظ میں وطن پرستانہ تنگ نظری اور محدود وفاداری کو زندگی بخشنا ہے اگرچہ یہ بات کوئی شخص پسند نہیں کرے گا۔ ناخواندگی کے جہاں اور بہت سے نقصانات ہیں جن کی بدولت اَن پڑھ شخص آج کی نئی دنیا میں باہر کا کر عجوبہ جانور قرار پاتا ہے، یہ اُن نقصانات سے قطع نظر ایک مزید نقصان ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ اعتراض اپنی جگہ پر ایسا نہیں ہے جس کا جواب نہ ہو۔ ناخواندگی بلاشبہ ہماری ترقی کے راستے میں بہت تشویشناک قسم کی رکاوٹ ہے اور اس سے اسی قدر تشویش پنچایتی راج کی کامیابی کے باب میں بھی ہے۔ پھر ہماری قومی پالیسی بھی کسی حد تک خواندگی کے معاملے میں تنگ نظر واقع ہوئی ہے۔ اب ایک امید لے دے کر یہی رہ گئی ہے کہ پنچایتی راج کے ادارے خود دیہی عوام پر یہ واضح کریں کہ اُن کی مادی اور اخلاقی پسماندگی میں ان کی جہالت اور ناخواندگی کا کتنا ہاتھ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس بات کا احساس انھیں اِس لعنت کو دور کرنے کے لئے اپنے وسائل کو کام میں لانے پر اُبھار دے۔ اِس باب میں یہ دلیل پیش کرنا کہ عوام پر پنچایتی راج کی ذمے داری ڈالنے سے پہلے ہمیں اُس وقت کا انتظار کر لینا چاہیئے تھا جب وہ پورے طور پر خواندہ ہو جاتے، حقیقت پسندانہ استدلال نہیں ہے۔ اب تو اچھا ہوا یا بُرا، پنچایتی راج سے ہم وابستہ ہو گئے ہیں اور اس حالت میں وابستہ ہوئے ہیں کہ ہماری آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اَن پڑھ ہے۔ چنانچہ اب ہمیں کوئی نہ کوئی ایسی تدبیر ڈھونڈھنی یا ایجاد کرنی ہے جس سے ناخواندگی کے راکشش کو ختم کیا جا سکے۔ سوال سوشل ایجوکیشن سے ہے کہ آیا وہ اس معرکہ کے لئے تیار ہے۔؟

۷۔ آخری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ہمارے گاؤں میں دھڑے بندی، رقابت اور دشمنی کی آگ لگ رہی ہے اور پنچایتی راج کے ادارے اِس آگ کو صرف ہوا دیتے ہیں۔ راجستھان سے ہمارے پاس اس سلسلے میں دل ہلا دینے والی اور ہیبت ناک خبریں آتی ہیں مگر کوئی شخص اس کے لئے راضی نہیں ہوتا کہ ان خبروں کی صداقت کی جانچ کرے۔ بات یہیں تک ختم نہیں ہوتی، ان عداوتوں کا سرچشمہ ذات پات کے وہ جذبات ہیں جو ہماری رگ رگ میں سرایت کر گئے ہیں اور ذات پات ہمارے سماج کا وہ عنصر ہے جس کی جڑیں ہمارے "اجتماعی تحت شعور" تک پہنچ گئی ہیں۔

یہ اگر اور کچھ نہیں تو ہمارے سماجی نظام کے خلاف بڑی سنگین فردِ جرم ہے اور جس حد تک ذات پات کا ہمارے ملک میں دخل ہے ــــ اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دخل یقیناً ہے، پنچایتی راج کے خلاف یہ اعتراض بڑا مہلک اعتراض ہے، خصوصی موجودہ حالات میں یعنی اس حالت میں کہ پنچایتی راج کے ادارے انتخابات کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں۔ لیکن خود انتخابات اور وہ

بھی عالمگیر بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر ہونے والے انتخابات ہمارے سیاسی نظام کا جس کے ماتحت ہم نے زندگی گذارنا طے کیا ہے، ایک ایسا جزو ہے جسے اِس نظام سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

لیکن بہ ایں ہمہ میں یہ نہیں کہوں گا کہ ناخواندگی اور ذات پات کی موجودگی پنچایتی راج کے خلاف کوئی بہت زبردست استدلال ہے۔ اس لیے یہاں سے کہہ کر پنچایتی راج کے لئے یہ ایک دعوتِ پیکار ضرور ہے۔ پنچایتی راج کے بارے میں وعدہ خلافی کرنا، کم سے کم اُن مقامات پر جہاں اس کا نفاذ ہو چکا ہے، سماجی اعتبار سے بہت مہنگا پڑے گا بہ مقابلہ اس کے کہ ناخواندگی اور ذات پات کے رُجحان کو ختم کرنے کے لئے وہ کوششیں عمل میں لائی جائیں جو اِس مقصد کے لئے ضروری ہیں۔ یہ بات میں اُس سیاسی فضا کے پیش نظر کہہ رہا ہوں جو آج کل ہمارے ملک پر مسلط ہے۔ اس لئے دانش مندی کی بات یہ نہیں ہے کہ ہم ان خیالات و افکار کی پرورش کریں جو پنچایتی راج کے خلاف پڑتے ہیں یا اس کی عیب جوئی میں لگے ہوئے ہیں بلکہ یہ ہے کہ جن دو رکاوٹوں کا ذکر ہوا ہے اُن سے بچ کر آگے نکل جانے کی تدبیریں سوچیں۔ "بچ کر نکل جانے" کی بات میں نے اِس لئے کہی کہ جس رفتار سے ہم چل رہے ہیں، اُس کو دیکھتے ہوئے ان دونوں لعنتوں کو دور کرنے کی مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان لعنتوں سے بچ نکلنے کی تدبیریں سماجی سائنس دانوں کو سوچنی ہوں گی اور یہ ضرورت بھی ہوگی کہ بڑے پیمانے پر تمام سیاسی پارٹیاں ان تدبیروں کی تائید و حمایت کریں۔ چھوٹے پیمانے پر یعنی گاؤں اور بلاکوں حتیٰ کہ ضلعوں میں بھی سماجی معلم اس کام میں مدد دے سکتے ہیں بشرطیکہ انھیں مدد کرنے کا موقع اور ٹریننگ دی جائے۔

اگر میرے دل میں ان لوگوں کی محبت نہیں ہے جن سے میں واقف ہوں تو نسلِ انسانی کے لئے میرے دل میں کیسے محبت ہو سکتی ہے جو صرف ایک مجرّد تصور ہے؟ اگر میں نے محدودے چند لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنا نہیں سیکھا ہے تو میں ایک بڑی تعداد کے لئے کس طرح کارآمد ہو سکتا ہوں؟

آرتھر مارگن

پنچایتی راج اور کمیونٹی آرگنائزیشن

زیرِ نظر مضمون کی بنیاد مقالہ نگار نے راجستھان کے تجربے پر رکھی ہے اور وہاں جو عملی دشواریاں پیش آرہی ہیں اُن کا تجزیہ کرنے کے بعد اپنی رائے پیش کی ہے۔ آخر میں پنچایتی راج کی تحریک اور اُس کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے مقالہ نگار نے کمیونٹی آرگنائزیشن اور کمیونٹی آرگنائزر کے کردار پر بحث کی ہے اور اِس کو اُن کے لئے خدمت کا نہایت موزوں میدان قرار دیا ہے۔

— ایڈیٹر

حکومتِ ہند نے سب سے پہلا انقلابی قدم ۱۹۵۲ء میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا پروگرام نافذ کرکے اٹھایا تھا جس کا منشا گاؤں کو ترقی دینا تھا۔ ارادہ یہ کیا گیا تھا کہ اِس پروگرام کی منصوبہ بندی اور انجام دہی خود گاؤں والوں کے ہاتھوں ہو اور حکومت اس کام میں انھیں روپے پیسے اور فنی مشورے سے مدد بہم پہنچائے۔ اس کے بعد پروگرام کے معائنے ہوئے ان کی رپورٹوں سے معلوم ہوا کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگرام سے عوام میں کوئی جوش و ولولہ نہیں پیدا ہوا اور نہ اُسے اُن کی طرف سے سہارا ملا۔ "اپنا کام اپنے آپ کرنے" کا جو ایک شوق ہوتا ہے اور جو لوگوں کو کام پر ابھارنے کا خاص ذریعہ ہے اُسے پورے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی ادارے اور سنستھائیں پروگرام سے وابستہ نہ ہو سکیں اور اُن کا جوش و خروش اور اشتراک آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا گیا۔

عوام اور حکومت دونوں کو اس مسئلے کا احساس تھا۔ چنانچہ بلونت رائے مہتہ کمیٹی کی سفارش پر حکومت نے گاؤں کی ترقی کے باب میں جمہوری لامرکزیت کی اسکیم نافذ کرکے دوسرا انقلابی قدم اٹھایا۔

جمہوری لامرکزیت کا مطلب

ملک ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا اور طاقت انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل ہوگئی۔ دوسرے الفاظ

ہیں ملک کا انتظام مرکز اور ریاستوں میں عوام کے نمایندوں کے ہاتھ میں آگیا۔ ملک نے ریاست کے انتظام کے لئے جمہوری طرز اختیار کیا لیکن جمہوریت گاؤں تک نہ پہنچ سکی۔ ملک کے انتظام و انصرام میں عوام کا حصہ صرف بالواسطہ یا اِس لئے کہ انھیں صرف ریاستوں اور مرکز کی مجالس قانون ساز کے لئے اپنے نمایندے منتخب کرنے کا اختیار تھا۔ اِس طرح ترقیاتی پروگراموں کی منصوبہ بندی اور انجام دہی میں جو حکومت کی مقرر کی ہوئی عارضی کمیٹیوں اور کارکنوں کے توسط سے ہوتی تھی، عوام کا عمل دخل بالواسطہ رہا۔ اِن کمیٹیوں کی نوعیت بالعموم مشاورتی تھی اور اُن کے بیشتر ممبران مقامی ضروریات و مسائل سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں۔ طاقت و اقتدار کے ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل ہونے کے باوجود نظم و نسق کی تنظیم جوں کی توں عوام کی خواہش اور ارادے کی طرف سے بے نیاز رہی کیونکہ عوام کو پلان بنانے اور اُسے انجام دینے کے کام میں شریک نہیں کیا گیا جو اُن کے اندر یا خود منظم کے اندر جمہوریت کی روح پھونکنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اِن حالات میں یہ وقت کی بہت بڑی اور اہم ضرورت تھی کہ جمہوری طریقۂ کار حکومت کی اُوپر سے لے کر نیچے تک تمام منزلوں خصوصاً گاؤں تک میں جڑ پکڑ جائے۔ اِس مخصوص صورتِ حالات کی روشنی میں دیکھئے تو جمہوری لامرکزیت خود جمہوریت کو تقویت پہنچانے کا ایک اہم جزو بن جاتی ہے اور ترقیاتی پروگراموں میں ہر سطح پر عوام کی شرکت و تعاون حاصل کرنے کا ایک کامیاب وسیلہ ثابت ہوتی ہے۔

بلونت رائے مہتہ کمیٹی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اختیار کی منتقلی کا مطلب غلطی سے "لامرکزیت" نہیں سمجھ لینا چاہئے۔ اوّل الذکر یعنی اختیار کی منتقلی سے حکومت اس ادارے کے عمل و فعل کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو جاتی جسے اختیار منتقل کیا جاتا ہے اور اس لئے سے یہ ادارے حکومت کی نگرانی اور اُس کی ماتحتی میں ہوتے ہیں۔ کمیٹی کی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ "لامرکزیت" اُس عمل کو کہتے ہیں جس کے ماتحت حکومت اپنے بعض فرائض اور ذمے داریوں سے کلیتہً سبکدوش ہو جاتی ہے اور اُنھیں دوسرے اداروں کے سپرد کر دیتی ہے۔ ذمے داری سے سبکدوشی کا عمل صرف اُس حالت میں پورا ہوتا ہے جب ذمے داریوں کی منتقلی کے ساتھ ساتھ متعلقہ عہدے اور اسامیاں بھی کلیتہً ان اداروں کے کنٹرول میں دے دی جائیں۔

دوسرے الفاظ میں "جمہوری لامرکزیت" کی اصطلاح میں ہم دو الفاظ دیکھتے ہیں: ایک "جمہوری" اور دوسرا "لامرکزیت" "جمہوری" کا مطلب ہے عوام کی تائید اور حمایت کا حصول جس میں انتخاب کا پہلو بھی شامل ہے۔ "لامرکزیت" سے مراد ہے انتظامی اکائیوں اور اسی کے ساتھ طاقت و اختیار اور وسائل کو توڑ کر انھیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنا اور اس طرح انھیں مقامی عوام سے قریب تر لانا۔ گویا جمہوری لامرکزیت کا مقصد مقامی خود مختار حکومت کو رواج دینا اور اس راستے سے جمہوریت کی تعمیر کرنا ہے۔

جمہوری لامرکزیت کا طریقۂ عمل ایک متحدہ جاندار سہ منزلہ ڈھانچہ پر مبنی ہے جس میں گاؤں پنچایت سب سے نچلی اور بنیادی

منزل ہے، ضلع پریشد سب سے اوپر کی اور پنچایت سمتی بیچ کی منزل ہے۔

اِس وقت اِس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کا کام مختلف ریاستوں میں مختلف مرحلوں میں ہے۔ راجستھان اور آندھرا میں اس پر پورا پورا عمل ہو رہا ہے، مدراس، میسور، آسام اور اڑیسہ میں قانون پاس ہو گئے ہیں اور دوسری ریاستوں میں یہ قانون اسمبلیوں میں زیرِ غور ہیں۔

اِس مضمون میں میں اپنی بحث کو راجستھان کی اسکیم تک جسے میں ذرا تفصیل سے لوں گا، محدود رکھوں گا۔ میرا یہ ارادہ اس وجہ سے ہے کہ ایک موقعے پر میں نے راجستھان کا دورہ کیا تھا اور اِس اسکیم پر عملاً کام ہوتے دیکھا ہے۔ اِس کے علاوہ میں اور "ایسوسی ایشن آف والنٹری ایجنسیز فار رورل ڈیولپمنٹ" کی ٹیم کے چند ممبروں سے جو راجستھان کی جمہوری لامرکزیت کی اسکیم کا مطالعہ کرنے کے لئے بنی تھی اور جس نے راجستھان میں تقریباً ایک پکھواڑہ صرف کیا تھا، اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کا بھی موقع ہوا ہے۔ اس ٹیم کی رپورٹ شائع ہو گئی ہے اور جن لوگوں کو اس موضوع سے دلچسپی ہے، ان کے لئے اس میں بڑے کام کی باتیں ملیں گی۔

راجستھان میں جمہوری لامرکزیت کا ڈھانچہ

راجستھان کے پنچایت سمیتیوں اور ضلع پریشدوں کے ۱۹۵۹ء کے قانون کی رُو سے سب سے نیچے کی سطح پر گاؤں پنچایتیں ہیں۔ جو براہِ راست انتخاب کے ذریعے گاؤں کے چُنے ہوئے نمائندوں پر مشتمل ہیں۔ بلاک میں پنچایت سمتیاں ہیں جو گاؤں اور تحصیل پنچایتوں کے سرپنچوں پر مشتمل ہیں۔ اور ضلع کی سطح پر ضلع پریشد ہیں ضلعے کی پنچایت سمیتیوں کے چیرمینوں سے مل کر بنے ہیں۔

گاؤں پنچایت کے کام

گاؤں پنچایت میں اوسطاً چھ سے سولہ تک ممبر ہوتے ہیں۔ قانون میں عورتوں، اچھوت ذاتوں اور قبیلوں کے لئے جگہیں محفوظ کر دی گئی ہیں۔ گاؤں پنچایت کو گاؤں سے متعلق ترقی کے جملہ پروگرام سونپ دیئے گئے ہیں اور اِس کے علاوہ حکومت نے ایسے قانون بنا دیئے ہیں جن کی رو سے وہ زمین کی مال گذاری بھی وصول کر سکتی ہیں۔ گاؤں پنچایتوں کو جو کام سونپے گئے ہیں وہ دو طرح کے ہیں (۱) لازمی اور (۲) اختیاری۔ لازمی کاموں کی فہرست میں حسب ذیل کام شامل ہیں۔

(الف) صاف پانی کی کافی مقدار میں سپلائی (ب) بیج والے سانڈوں کی نگہبانی (ج) اسکول کی عمارت کی تعمیر وغیرہ وغیرہ۔ اختیاری کاموں کی فہرست میں اِس طرح کے کام آتے ہیں جیسے (۱) ترقی اور امداد باہمی (۲) سینچائی کے

میں پنچایت منصوبے (۳) ضبط تولید (۴) مردم شماری (۵) زندگی اور دوسرے قسم کے بیمے وغیرہ
ہر معاملے کا فیصلہ حاضر پنچوں کی اکثریت رائے سے ہوتا ہے لیکن حسب ذیل امور میں تمام پنچوں کی دو تہائی اکثریت ضروری قرار دی گئی ہے۔ (۱) نئی عمارتوں کی تعمیر (۲) پبلک سڑکوں کی تعمیر (۳) کنوؤں، تالابوں اور پارکوں کی تعمیر اور (۴) عوامی پاخانوں کی تعمیر۔

پنچایتوں کو اپنا بجٹ آپ بنانے کا اختیار ہے لیکن اسے انھیں پنچایت سمیتیوں کے پاس منظوری کے لئے بھیجنا پڑتا ہے۔

پنچایت سمتی

پنچایت سمیتی ڈیولپمنٹ بلاک کے علاقے میں تمام ترقیاتی پروگراموں کی واحد ایجنسی بن گئی ہے۔ پنچایت سمیتی پنچایتوں کے منتخب شدہ سرپنچوں پر تو مشتمل ہوتی ہی ہے، اس کے علاوہ اس میں اچھوت ذاتوں، قبیلوں اور عورتوں کے نمائندے اور اچھے کسان لوگ بھی ممبر ہوتے ہیں۔ علاقے کے ممبران اسمبلی بھی اس کے ممبر ہوتے ہیں لیکن انھیں رائے دینے کا حق نہیں ہوتا۔

پنچایت سمیتیوں کے کام، جیسا کہ قانون کے ساتھ منسلک ایک فہرست میں بتایا گیا ہے، حسب ذیل ہوتے ہیں:
(الف) زراعت (ب) کمیونٹی ڈیولپمنٹ (ج) مویشیوں کی افزائش نسل (د) صحت و صفائی (ہ) ابتدائی تعلیم (و) سوشل ایجوکیشن (ز) گھریلو صنعتیں (ح) مصیبت کے زمانے میں امداد رسانی کا کام وغیرہ

سمیتی اپنے ان کاموں اور ذمے داریوں کی تعمیل تین مستقل کمیٹیوں کے توسط سے کرتی ہے۔ ایک پیداوار سے متعلق پروگراموں کو دیکھتی ہے۔ دوسری سماجی خدمات کی نگرانی کرتی ہے اور تیسری کے سپرد مالی اور انتظامی امور ہوتے ہیں۔ پنچایت کے فرائض میں محصول لگانا اور ان کا وصول کرنا بھی شامل ہے۔ ہر کمیٹی کے سات ممبر ہوتے ہیں۔ پنچایت سمیتی بہ حیثیت مجموعی کام کے پروگراموں کی جانچ اور انجام دہی کی ذمے دار ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ پنچایتوں کو مدد بہم پہنچانا اور ان کے کام کی نگرانی کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔

بلاک ڈیولپمنٹ آفیسر یا وکاس ادھیکاری پنچایت سمیتی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا ہے اور سمیتی کے پردھان کو اس کی ذمے داریوں کے اچھی طرح انجام دینے میں ماہرانہ اور فنی مشورہ اور رہنمائی بہم پہنچاتا ہے۔ سمیتی کے پردھان کو وکاس ادھیکاری اور بلاک کے دوسرے ملازموں کے اوپر عالی اختیارات حاصل ہیں۔

ضلع پرشد

ضلعے میں ایک ضلع پرشید ہوتا ہے جس کے ممبران حسب ذیل ہوتے ہیں : (۱) ضلعے کی تمام پنچایت سمیتیوں کے پردھان (۲) ضلعے میں رہنے والے کاونسل کے ممبران (۳) پارلیمنٹ کے وہ ممبران جو ضلعے کے حلقہ ہائے انتخاب سے منتخب ہوئے ہوں (۴) ریاستی اسمبلی کے وہ ممبران جو ضلعے سے منتخب ہوئے ہوں اور (۵) ضلعے کے کوآپریٹیو بنک کا صدر

ضلع پرشید کا کام پنچایت سمیتیوں کے تیار کئے ہوئے منصوبوں میں تال میل قائم کرنا ہے۔ اور اگر کہیں ضرورت ہو تو وہ اُن کے کام میں مضبوطی بھی پیدا کرے گا۔ ریاستی حکومت کی طرف سے ترقیاتی کاموں کے لئے جو یکمشت سرمایہ ضلعے کو ملتا ہے اُسے وہی پنچایت سمیتیوں میں تقسیم کرے گا۔ ضلع پرشید کو پنچایت سمیتی کے بجٹ کے معاملے میں ایک مخصوص اختیار حاصل ہے۔ اگر وہ کسی پنچایت سمیتی کی بجٹ کی مدات آمد و خرچ سے مطمئن نہیں ہے، تو وہ اسے سمیتی کے پاس اپنے اصلاحی سجھاؤں کے ساتھ نظرثانی کے لئے واپس بھیج سکتا ہے۔ پنچایت سمیتی ان سجھاؤں اور مشوروں پر غور کرنے کے لئے مجبور ہے مگر ان کی پابندی اس کے اوپر لازم نہیں ہے۔ ضلع پرشید "پرمکھ" کے نام سے اپنا ایک صدر منتخب کرتا ہے جسے پنچایتوں اور پنچایت سمیتیوں کے کام کا معائنہ اور نگرانی کرنے کے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔

ضلع پرشد کا ایک سکریٹری ہوتا ہے جسے ریاستی حکومت نامزد کرتی ہے۔ کام کے مختلف محکموں کے درمیان تال میل قائم رکھنے کا کام ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ آفیسر کے سپرد ہوتا ہے جو بلا استثناء ضلعے کا کلکٹر ہوتا ہے۔ کلکٹر اس بات پر نظر رکھتا ہے کہ پنچایت سمیتیوں کو جو روپیہ دیا جاتا ہے وہ مقررہ مقاصد کے لئے پورا پورا صرف ہو۔ وہ اس بات کا اہتمام بھی کرتا ہے کہ وکاس ادھیکاری اور اس کے دوسرے ساتھی اپنے ان نئے فرائض کو نتیجہ بخش طور پر پورا کریں۔

ریاست

ریاستی حکومت کو بہرحال اختیار حاصل ہے کہ اگر کوئی پنچایت سمیتی یا ضلع پرشد اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرے تو وہ انھیں معزول کردے۔ اسی طرح اسے یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ پنچایت سمیتی یا اس کی کسی مستقل کمیٹی کے پاس کئے ہوئے کسی بھی ریزولیوشن یا نافذ کئے ہوئے احکام کو منسوخ یا معطل کردے۔ ضلعے کے کلکٹر کو بھی یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ فوری اور ناگہانی حالات کے تحت پنچایت سمیتی کے کسی ریزولیوشن کو معطل کردے اور ریاستی حکومت کو مناسب کارروائی کے لئے اس کی اطلاع کرے۔

نتائج اور اثرات

جب یہ اسکیم نافذ ہوئی ہے اُس وقت سے عوام میں بڑا جوش ہے اور ان کا اشتراک و تعاون حاصل ہونے لگا ہے۔ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ اُن کا مستقبل خود انہی کے ہاتھ میں ہے اور اپنی ترقی کے لئے منصوبے اور پروگرام وہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بنا سکتے ہیں سمتیوں کے پردھان اور ضلع پریشد کے پرمکھ بڑی تیزی دکھا رہے ہیں اور اپنے کاموں میں مستعدی سے مصروف ہوگئے ہیں۔ اس کا ایک بہت مفید اثر یہ بھی ہوا ہے کہ افسر لوگ یہ دیکھ کر کہ اُن کے کام کے اوپر مقامی لوگ مستقل اور کڑی نظر رکھتے ہیں، اپنے فرائض مستعدی اور احتیاط کے ساتھ انجام دینے لگے ہیں۔ پنچایت سمیتی کا پردھان چونکہ بیشتر اوقات بلاک کے دفتر ہی میں رہتا ہے اِس لئے لال فیتے (ریڈ ٹیپ) کا اثر بہت کم ہوگیا ہے اور کاغذات تیزی سے آنے جانے لگے ہیں۔ عوام سمجھنے لگے ہیں کہ ترقیاتی پروگراموں کی منصوبہ بندی اور انجام دہی میں اُن کا عمل دخل بھی ہے اور ان کی لیاقت، سوجھ بوجھ اور ذوق و شوق کا استعمال ہو رہا ہے۔

نباہ کے مسائل

نباہ کے سلسلے میں سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ بلاک کے افسران کام کے اس نئے ضابطے میں اپنے آپ کو کس طرح فٹ کریں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب اُن کے اختیارات عوام کے نمائندوں کو منتقل کر دیئے گئے تو عوام ہی کے اوپر تمام کام کی ذمّے داری بھی ہے چنانچہ ان میں اب ذمّے داری سے بچنے اور اُسے عوام کے اوپر لادنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔

وکاس ادھیکاری کو دراصل وہ کردار ادا کرنا چاہیئے جو ایک کمیونٹی آرگنائزر[1] کا ہوتا ہے یعنی عوام میں کام کے لئے آمادگی اور جوش کی ایک فضا پیدا کرنا تاکہ وہ اپنی نئی ذمّے داریوں کو پوری سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ پورا کر سکے۔

نباہ کا یہ مسئلہ اِس لئے اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے کہ ان سنستھاؤں کے معاملے میں یہ بات صاف نہیں ہے کہ انھیں کس حد تک پالیسی بنانے کے اختیارات حاصل ہیں اور کس حد تک عاملی اختیارات۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پنچایت سمیتی کا پردھان ایک عاملی افسر کا کردار ادا کرنے لگا ہے۔ اور بلاک کے روزمرہ کے انتظامی امور میں بہت زیادہ وقت صرف کرنے لگا ہے۔ پردھان کا اصل کام

---

[1] یہاں کمیونٹی آرگنائزر کا لفظ ہمارے خیال میں غالباً اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے جو سوشل ورک کی شاخ "کمیونٹی آرگنائزیشن" میں استعمال ہوتی ہے اور جس کا مفہوم ایک ٹرینڈ پیشہ ور کا ہوتا ہے۔ م

وہ ہونا چاہئے جو عموماً پالیسی مقرر کرنے والی سنستھا یا شخص کا ہوتا ہے اور ان پالیسیوں کو عمل میں لانے کا اختیار بی۔ ڈی۔ او۔ اور اس کے اسٹاف کو حاصل ہونا چاہئیے۔ یہ بات ضروری ہے کہ بلاک کے اسٹاف کے لوگ اپنے علم اور مہارت کی بنیاد پر آزادی کے ساتھ مشورہ دیں اور جو پالیسی طے ہو جائے اس کے اوپر وفاداری کے ساتھ عمل کریں۔

پالیسی بنانے والے اور تعمیل کرنے والے ادارے

موجودہ ضابطے نے پنچایت سمیتی کو بہت زیادہ اہمیت دی دی ہے چنانچہ اس سہ منزلہ نظام کی باقی دو منزلیں یعنی گاؤں پنچایت اور ضلع پریشد اس قابل نہیں رہ گئے ہیں کہ اپنا کام پوری مستعدی کے ساتھ انجام دیں۔ گاؤں پنچایتوں کو گرانٹ دینے اور ان کے کام کے منصوبوں کی منظوری دینے کا اختیار انہی پنچایت سمیتیوں ہی کو حاصل ہے۔ سمیتی گاؤں پنچایتوں کے سرپنچوں پر مشتمل ہوتی ہے جنھیں گاؤں کے لوگ براہ راست انتخاب کے ذریعے منتخب کرتے ہیں۔ یہ سرپنچ حالانکہ براہ راست انتخاب کے ذریعے چُنے جاتے ہیں اور سمیتی میں اپنی گاؤں کی پنچایت کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن سمیتی سے گاؤں کے پروگراموں کے لئے جو گرانٹ ملتی ہے اُسے وصول کرنے کے بڑے آرزومند رہتے ہیں اور اس معاملے میں بعض اوقات پنچایت کے ممبروں کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عوام کی خدمت کی ذمے داری ان کے منتخب کئے ہوئے دوسرے ممبروں کے مقابلے میں ان کے اوپر سب سے زیادہ ہے۔ گاؤں کے پروگراموں کے معاملے میں پنچایت سمیتی کی امداد اور رہنمائی کے اوپر بہت زیادہ بھروسہ کرنے کا رجحان بھی پیدا ہوگیا ہے اور خود گاؤں کے اپنے وسائل کو بڑھانے اور ان سے کام لینے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ پنچایت سمیتی گاؤں پنچایتوں کے بھیجے ہوئے منصوبوں کے مطابق پروگرام بناتی ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لئے ان کے پاس واپس بھیج دیتی ہے۔ یہ گرام پنچایتوں کو گرانٹ بھی دیتی ہے اور ان کے کام کی نگرانی بھی کرتی ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنچایت سمیتی پالیسی مقرر کرنے والی جماعت کا کردار ادا کرتی ہے اور گاؤں پنچایتیں اس پالیسی کی تعمیل کرنے والی جماعتوں کا۔ پالیسی بنانے اور اس کی تعمیل کرنے کے مفہوموں میں جو اُلجھاؤ ہے اس سے بچنے کے لئے یہ کہنا زیادہ اچھا ہوگا کہ انھیں کام پر اُبھارنے والی (ENABLING) اور کام کو انجام دینے والی (DOING) سنستھائیں کہا جائے، کیونکہ خود پلان بنانے میں ہم موجودہ وسائل اور دوسری تمام باتوں کا خیال رکھتے ہیں جو پلان پر عمل کرنا ممکن بنا سکتی ہیں۔ اس طرح پلان بنانا اور اسے عملی جامہ پہنانا، دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

گروہ بندی

کہا جاتا ہے کہ گاؤں میں اختلافات اور لڑائی جھگڑے جو بڑھ گئے ہیں اس کا سبب جمہوری لامرکزیت کے ضابطے کا

نعاقد ہے۔ پنچایتوں کے انتخابات دوسری مصلحتوں کی بنیاد پر لڑے جاتے ہیں اور اس بات سے لوگوں میں فرقہ واریت، ذات برادری کی تفریق اور خویش پروری کا زور ہو گیا ہے۔ اِن اختلافات اور تفریقوں کو کم کرنے کی غرض سے ایک ترکیب یہ بتائی جاتی ہے کہ سیاسی پارٹیوں کو پنچایتوں کے انتخابات میں نہیں پڑنا چاہیے اور جہاں تک ممکن ہو، پنچوں کا انتخاب اتفاق رائے سے ہونا چاہیے۔ ریاستی حکومتوں نے اعلان کیا ہے کہ جن گاؤں میں پنچایتوں کے انتخاب اتفاق رائے سے عمل میں آئیں گے انھیں زیادہ سے گرانٹ دی جائے گی۔ اِس بڑھاوے کا عوام غلط استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ جو گروہ دباؤ ڈال سکتے ہیں وہ انتخاب میں کامیاب ہونے کی غرض سے اس کا مطلب یہ سمجھا اور سمجھا سکتے ہیں کہ حکومت خود یہ نہیں چاہتی کہ انتخابات لڑے جائیں اور اِس طرح اِس بڑھاوے کا مقصد فوت ہو سکتا ہے۔

انتخابات جہاں کہیں بھی ہوئے ہیں، وہاں ذات برادری، دولت مندی اور رشتے داری کا بہت دور دورہ رہا ہے۔ اقلیتوں کے لئے سیٹیں محفوظ کر دینے سے بھی جس کا مقصد یہ تھا کہ گاؤں کے ہر طبقے کے لوگوں کا اشتراک حاصل ہو، طاقت ور طبقوں میں عداوت اور ایذا رسانی کے جذبات پیدا ہو گئے ہیں اور اس کی بدولت گاؤں میں تفرقے بڑھ گئے ہیں۔ گاؤں پنچایتوں کے لئے اچھے لوگوں کو منتخب کرنے کے معاملے میں حسب نسب اور مرتبے کا روایتی تصور ابھی تک بڑا زبردست کردار ادا کر رہا ہے۔

گرام سبھا اور بستی کی بیداری کی بات

نئے ضابطے سے عوام میں کچھ بیداری آئی ہے اور گاؤں کا سرپنچ ایسا محسوس کرنے لگا ہے کہ بلاک میں گرام سیوک کی موجودگی بے کار ہے کیونکہ گاؤں کی سطح پر جو کام ہوتے ہیں، اُن کی ذمے داری اب سرپنچ کے اوپر ہے۔ پنچایت کی جو بناوٹ ہے اور اُس کا جو مقصد ہے اُس کے لحاظ سے اُس کا منصب پورے گاؤں کی بھلائی کے لئے کام کرنا ہے نہ کہ افراد کے فائدے کے لئے۔ پنچایت کا سرمایہ پورے گاؤں کی بھلائی کے اوپر صرف ہونا ہے لیکن کوئی ایسی اسکیم مرتب کرنا جس سے سب لوگوں کو یکساں طور پر فائدہ پہنچے، بے حد مشکل ہے۔ مثال کے طور پر سینچائی کا کوئی پروگرام سب کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا اور جن لوگوں کے لئے یہ مفید ثابت ہو گا ان کے یہاں بھی یہ بات بہرحال باعثِ اختلاف ہو گی کہ کس کو کتنا فائدہ پہنچا۔ اسی طرح کی بیسیوں اور مثالیں ایسی ہو سکتی ہیں جن سے گاؤں کے صرف چند یا تھوڑے سے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اِس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک ایسا مفصل پروگرام ترتیب دیا جائے جس میں افراد و اشخاص کی ضرورتوں کو بھی سامنے رکھا گیا ہو اور جو گاؤں کی زراعتی معیشت کے تمام پہلوؤں کی تسکین کا سامان کرتا ہو۔

میرا خیال ہے کہ اگر ہم جمہوریت کے اس تجربے کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ عوام زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس مہم میں حصہ لیں تو ہمیں گرام پنچایت کے ساتھ ساتھ ایک گرام سبھا بھی بنانی چاہیئے۔ گرام سبھا کے ممبر گاؤں کے تمام بالغ لوگ ہونے چاہئیں۔ یعنی مرد، عورتیں، اور تمام ذات برادریوں کے لوگ جو بلوغت کی عمر کو پہنچ گئے ہوں۔ یہی گرام سبھا گاؤں کی پنچایت منتخب کرے جس کے ذمے اس پروگرام کی تعمیل ہو جو گرام سبھا نے خود ترتیب دیا ہو۔ سبھا کی سال میں تین سے چار تک بیٹھکیں ہونی چاہئیں جن کا مقصد یہ ہو کہ پنچایت کے تجویز کئے ہوئے منصوبوں اور اسکیموں پر غور کیا جائے اور اگر ان میں کچھ پھیر بدل اور اضافہ وغیرہ کرنا ہو تو وہ بتا دیا جائے۔ پنچایت جب منصوبے کا مسودہ تیار کرے اُس وقت اسے گاؤں کے ہر قسم کے وسائل ــــ انسانوں کی طاقت، نقد اور جنس کی شکل میں سرمائے کی مقدار وغیرہ ــ کو اپنے سامنے رکھنا چاہئیے تاکہ جو منصوبہ بنے وہ گاؤں کی ہر قسم کی ضروریات ــــ انفرادی اور اجتماعی ــــ کے لئے موزوں ہو۔

کمیونٹی آرگنائیزیشن اور جمہوری لامرکزیت

جمہوری لامرکزیت کے نفاذ سے سوشل ورکروں کے لئے وقت کی پکار پر خم ٹھونک کر سامنے آنے اور ملک کی فلاح و بہبود کی تحریک میں اپنا حصہ پورا کرنے کے بہت اچھے موقعے نکل آئے ہیں۔ اس باب میں سوشل ورکروں کا حصہ ابھی تک بہت معمولی رہا ہے جسے انھیں اب تکمیل کو پہنچانا ہے۔ ایک مضبوط اور مستحکم پنچایتی راج قائم کرنے میں کمیونٹی آرگنائیزیشن کے طریقۂ کار کا بہت اہم کردار ہوگا۔

کمیونٹی آرگنائیزیشن کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ "اپنی ضرورتوں کو سمجھنے اور اُنھیں اپنے نجی یا باہر کے وسائل کے ذریعے پورا کرنے میں کمیونٹی کی مدد کی جائے"۔ یہ اصول جمہوری لامرکزیت کی تینوں سنستھاؤں کی نشو و نما میں بہت مدد دے سکتا ہے۔ کمیونٹی آرگنائیزر اپنے سائنٹفک علم، اپنے طرز عمل، اور عوام میں کام کرنے کی اپنی مشق و مہارت کو استعمال کر کے انھیں جمہوری طرز کے منصوبے اور پروگرام بنانے میں بڑی مدد دے سکتا ہے۔ حاکم اور افسر لوگ اب تک اپنے مقرر کئے ہوئے نشانوں (ٹارگیٹ) تک جلدی سے پہنچ جانے کی دھن میں عوام کو نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ بہ حیثیت کمیونٹی آرگنائیزر کے اس کا رشتہ انسانوں سے ہوتا ہے، اور اس کا کام تیزاب کا عمل رکھتا ہے جس کی آمیزش سے کیمیائی عملوں کے عمل میں تیزی آجاتی ہے۔ اس حیثیت سے اسے لوگوں کی مدد اس مقصد کو سامنے رکھ کر کرنی چاہئیے کہ وہ اپنے لئے پروگرام اور منصوبے خود بنائیں نہ یہ کہ دوسرا کوئی بنائے۔ وہ ایک مبلغ (ENABLER) کے طور پر کام کر کے فرد کو اپنے ذاتی اور بیرونی جماعت

مختلف ذرائع سے کام لینا اور اُن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا سکھاتا ہے کیمونٹی آرگنائیزر ان کاموں کے علاوہ مختلف کاموں اور سرگرمیوں کے لئے نوجوانوں کی جماعتیں بھی منظم کرتا ہے اور اس وسیلے سے انھیں جماعت کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کے قابل بناتا ہے اور مستقبل میں جو ذمہ داریاں انھیں اٹھانی ہیں ان کی انھیں ٹریننگ دیتا ہے۔ کیمونٹی آرگنائیزر کو جب بڑی بڑی آبادی اور علاقوں میں کام کرنا ہوتا ہے تو وہ نوجوان، بچوں، عورتوں کی انجمنوں اور دوسری نیم تنظیموں کے وسیلے سے لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

ایک مضبوط اور مستحکم پنچایتی راج کی تعمیر میں کیمونٹی آرگنائیزیشن کا طریقۂ کار سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایک سوال یہاں یہ اٹھ سکتا ہے کہ آیا کیمونٹی آرگنائیزیشن اور اس کے استعمال سے وہی باتیں مراد ہیں جو امریکہ میں رائج ہیں اور آیا وہ ہندوستان کے حالات میں ٹھیک بیٹھیں گی؟ ہم ہندوستان میں ایک ایک گاؤں کے لئے ایک ایک کیمونٹی آرگنائیزر کا انتظام نہیں کر سکیں گے۔ ممکن ہے ہم سو سو گاؤوں پر ایک ایک کیمونٹی آرگنائیزر مقرر کر سکیں۔ ہمیں اپنے کام کی تنظیم اور طریقۂ کار ایسا رکھنا ہوگا کہ کیمونٹی آرگنائیزر مختلف حیثیتوں کی رضاکار جماعتوں کی مدد سے اپنا کام چلا سکے اور نوجوانوں اور اس کام سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے اشخاص اور اداروں کو اپنے ساتھ ملا سکے۔

میری رائے میں وکاس ادھیکاری کو جو اپنے بلاک کی ٹیم کا کپتان سمجھا جاتا ہے اور جسے پنچایت سمیتی کے ساتھ کام کرنا ہے، ایک تربیت یافتہ سوشل ورکر ہونا چاہیے۔ اپنی ٹیم کا کپتان ہونے کی حیثیت سے اُسے دراصل ایک "گروپ ورکر" (پیشہ ور کارکن جسے لوگوں کی ٹولیوں کے ساتھ کام کرنے کی باقاعدہ ٹریننگ ملی ہوتی ہے اور جو نفسیات کے مطالعے کے ذریعے لوگوں کی افتاد مزاج اور سوچنے اور کام کرنے کے طریقوں سے واقف ہوتا ہے اور جو شخص جس کام کا نفسیاتی اعتبار سے اہل ہوتا ہے اس سے وہی کام لیتا ہے) کے طور پر کام کرنا ہے جس کے ماتحت وہ اپنی ٹیم کے ممبروں کو ایک مشترک مقصد کے لئے کام پر اُبھار سکے۔ دوسری طرف پنچایت سمیتی کے سکریٹری کی حیثیت سے اُسے ایک کیمونٹی آرگنائیزر کا کردار ادا کرنا چاہیے جو پنچایت سمیتیوں اور اُن کے توسط سے گرام پنچایتوں کو اپنی مدد آپ کرنے پر اُبھارے اور ان میں اپنی ترقی و خوش حالی کے لئے آپ اپنے اوپر بھروسہ کرنے کی رُوح بیدار کرے۔

نتیجۂ بحث

جمہوری لامرکزیت کا مسئلہ کوئی جادو کا ڈنڈا نہیں ہے جس کے ذریعے ہم اپنے مقاصد میں ایک دن کے اندر اندر کامیاب ہو جائیں گے لیکن اس سے امید اور ولولے کی کرنیں ضرور پھوٹی ہیں اور اگر اس کے اوپر پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ کام ہوا اور اس کے لئے تربیت یافتہ کارکن حاصل کئے گئے تو اس کی بدولت آہستہ آہستہ ہمارے سماج کی سماجی اور اقتصادی صورتِ حال بدلے گی اور جمہوریت کے انعامات گاؤں کے ایک ایک فرد کے دروازے تک پہنچ جائیں گے۔

پنچایت : سماجی تبدیلی کا ایک وسیلہ

سوشل ایجوکیشن کی ضرورت

مہتہ کمیٹی کی رپورٹ

بلونت رائے مہتہ کمیٹی جو کمیونٹی پروجیکٹوں اور این ای ایس بلاکوں کے کام کا جائزہ لینے کے لئے بنی تھی، اُس نے محسوس کیا کہ ڈیولپمنٹ کی اسکیم کو عوام کے اندر ذوق و شوق اور بیداری پیدا کرنے میں اطمینان بخش کامیابی نہیں ہوئی ہے اس نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ ڈیولپمنٹ کا کام قانون کے ماتحت بنی ہوئی منتخب مقامی انجمنوں کو سپرد کر دینا چاہیئے۔ سیاسی لیڈروں نے اس سفارش کی بڑے زور شور سے حمایت اور تائید کی جس سے بہت سی ریاستوں میں پنچایتی راج کا قانون لانے کے لئے راستہ ہموار ہو گیا، اور عام طور پر سوچا جانے لگا کہ جمہوری طرز پر بنے ہوئے ان پنچایتی اداروں کو اختیارات سونپ دینے سے دیہی علاقوں کی ترقی کے پر لگ جائیں گے۔

پنچایتی راج اور مقامی ترقی

مقامی خود مختار اداروں کو ذمے داریاں اور اختیار سونپنے کا مطالبہ ہندوستان میں کچھ نیا نہیں تھا۔ مگر اب سے پہلے اس مطالبے کی نوعیت سیاسی اصلاح کی تھی۔ پنچایتی راج کو مقامی ترقیاتی کاموں سے وابستہ کرنا ایک بالکل نیا خیال ہے اس لئے اس کے اوپر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے۔

اس باب میں بعض لوگوں کو اس طرح کی باتیں کرتے سنا گیا ہے کہ پنچایتی راج کا نظریہ محض خیالی ہے اور ایک ایسا تصور ہے جو کبھی عمل میں نہیں آسکتا، یا یہ کہ اس میں جلد بازی سے کام لیا جا رہا ہے اور دیہاتوں کی سماجی زندگی سے میل نہیں کھاتا۔ دوسری طرف اس اسکیم کے جوشیلے حامی ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ اگر پنچایتوں کو طاقت اور اختیار دے کر صرف قائم ہی کر دیا جائے تو اس سے ایسی ترقیاتی قوتیں ابھر آئیں گی اور ہندوستان کے گاؤوں کا نقشہ بدل دیں گی۔ اِن دو انتہا پسندوں کے درمیان کا بھی

ایک طبقہ ہے جو یہ سوچتا ہے کہ پنچایتی راج کے قیام کے ساتھ ہی ساتھ کچھ کام ایسے ہونے ہونے چاہئیں جو اسے تقویت پہنچائیں اور سہارا دیں۔

پرانے زمانے کی روایتی پنچایتیں

پنچایتوں کے رواج کی ابتدا تاریخ کے ابتدائی دور ہی سے ہوتی ہے۔ قدیم ہندوستان میں پنچایتیں بڑی جاندار تھیں اور خوب پھول پھل رہی تھیں۔ لیکن ایک صدسالہ بدیسی راج نے جس کے ماتحت ملک کے طول و عرض میں ایک جابرانہ مرکزی کنٹرول رہتا تھا، اِن پنچایتوں کی کمر توڑ دی؛ عدالتوں کا قیام، ایک نیا تعلیمی نظام، نقل و حمل اور رسل و رسائل کے تیز رفتار ذرائع کی بدولت نقل و حرکت میں اضافہ اور گاؤں سے عقل مند طبقے کا نکل نکل کر شہروں میں بس جانا، اِن سب چیزوں نے مل کر پنچایتوں کی حیثیت کو کم سے کم تر کر دیا۔ لیکن اِس کے باوجود مختلف ذاتوں، اور گاؤں اور پرگنوں کی روایتی پنچایتیں قائم رہیں اور انھوں نے جتنا بھی کچھ اُن سے ہوسکا، عوام کے تہذیب و تمدن کو سینے سے لگائے رکھا۔

ہندوستان کے سیاسی مفکر اور رہنما پنچایتوں کے زوال پر بجا طور پر آنسو بہاتے رہے ہیں اور اُن کے احیاء کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ بہر حال یہ ہوا کہ ہمارے دستور میں گاؤں پنچایتوں کی تنظیم کو ریاست کی پالیسی کے بنیادی اصولوں کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے۔ دستور کی دفعہ ۴۰ میں کہہ دیا گیا ہے کہ "ریاستیں اپنے اپنے یہاں گاؤں پنچایتیں منظم کریں گی اور انھیں اس حد تک قوت و اقتدار دیں گی کہ وہ مقامی خودمختار حکومت کی اکائیوں کی حیثیت سے اطمینان کے ساتھ کام کر سکیں"۔ مہتہ کمیٹی کی رپورٹ نے دستور کے اِس بنیادی اصول کو عملی جامہ پہنانے کی طرف سماج کو پھر سے متوجہ کر دیا ہے۔

مقاصد کی وضاحت

کسی ادارے کے کام کی کامیابی کی بنیادی شرط یہ ہوا کرتی ہے کہ اس کے ارکان کے ذہن میں اُن مقاصد کا تصور واضح ہو جو وہ ادارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ادارے اور جماعتیں جانے بوجھے اور طے شدہ مقاصد کے لئے وجود میں آتی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ اُسی حد تک کامیاب ہوں گی جس حد تک اُن کے درمیان مقصد کا اتحاد ہوگا جو انھیں انجام دینا ہو۔ روایتی پنچایتوں کے سامنے سماج میں ایک طے شدہ منصب کی انجام دہی ہوتی تھی یعنی بستی کے مسائل کا حل اور جھگڑوں ٹنٹوں کو نمٹانا۔ عوام پنچایتوں کے اِس منصب کو اچھی طرح جانتے اور تسلیم کرتے تھے۔ وہ اس منصب کی انجام دہی میں اُن کو سہارا دیتے تھے اور ان کے فیصلوں کے سامنے خلوصِ دل سے اپنی گردن خم کر دیتے تھے۔

اب تین پنچایتوں کا ایک نیا کردار ہے۔ انہیں گاؤں کے جھگڑوں ٹنٹوں کو نمٹانا نہیں ہے۔ انہیں سماج میں تبدیلی کی تحریک کرنی ہے۔ لوگوں کو اس کے لئے تیار کرنا ہے، ترقیاتی منصوبے بنانا اور انہیں انجام دینا ہے اور اس طرح سماجی تبدیلی کی جو تحریک چل پڑے اُسے جاری رکھنا ہے۔ آج سائنس اور مشین کے میدان میں جو عظیم الشان ترقیاں ہو رہی ہیں ہمیں دوڑ کر ان کے برابر پہنچنا ہے۔ ہمیں سائنس کے انعامات سے فائدہ بھی اٹھانا ہے اور اُسی کے ساتھ اپنی تہذیب کی روح کو بھی قائم و برقرار رکھنا ہے جو خود ہمارے وجود کو با مقصد اور قابلِ توجہ بناتی ہے۔ غرض پنچایتوں کو ایک نیا سماج تعمیر کرنا ہے۔ ہمیں سوچنا ہے کہ آیا اس نئے کردار کو ہم اچھی طرح سمجھ گئے ہیں یا نہیں۔

اگر تحقیق کی جائے کہ آیا پنچایتوں کے ممبر پنچایتوں کے اس نئے کردار کو سمجھتے اور پسند کرتے ہیں تو بڑے دلچسپ نتائج نکلیں گے۔ سوال یہ ہے کہ آخر پنچایتوں کے ممبروں کا انتخاب کیوں ہوتا ہے اور وہ یہ انتخابات کیوں لڑتے ہیں؟ آیا ان کے نزدیک انتخاب میں کامیابی تبدیلی کے عمل کو تیز کرنے کے لئے ہوتی ہے یا اس سے سماج میں جو ایک نئی حیثیت قائم ہو جاتی ہے اُسے محض حاصل کرنے، قائم رکھنے اور اس میں اضافہ کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔

اسی طرح اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ عوام خود پنچایتوں سے کیا امیدیں رکھتے ہیں، تو اس تحقیق سے بھی نتیجہ نکالنے میں آسانی ہوگی۔ آیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ پنچایتیں سماجی اور اقتصادی صورتِ حال اور دوسرے تہذیبی روابط کو جوں کا توں قائم رکھیں یا یہ چاہتے ہیں کہ ایسی تبدیلیوں کی تحریک کریں جن سے ذات پات اور طبقات کی تمیز سے پاک ایک صاف ستھرا سماج تعمیر ہو؟ ان سوالات کا جواب ایسی ہی کوئی تحقیق دے سکتی ہے جو ٹھوس تجربات پر مبنی ہو۔ لیکن اتنی بات بہر حال طے ہے اور عام طور پر تجربے میں آئی ہے کہ گاؤں کے ناخواندہ لوگ جنھیں تعلیم کے وسائل سے بہت کم فیض پہنچا ہے اور جو گاؤں میں معمول سے ہٹی ہوئی زندگی گذارتے ہیں، سماج میں تبدیلی لانے کے سخت خلاف ہیں، اور اُن کی اس مخالفت کا توڑ بہت مشکل ہے۔

اگر پنچایتوں کو اپنے مشن میں کامیاب ہونا ہے تو کچھ ایسی ترکیب بہر حال کرنی ہوگی جس سے پنچایتوں کے ممبر پنچایتوں کے نئے کردار کو اچھی طرح سمجھ لیں، اُسے جزو ایمان بنالیں اور اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کرنے کا حوصلہ باندھ لیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ سوشل ایجوکیشن کی ایک ہمہ گیر اسکیم نافذ کی جائے تاکہ اس کے اثر سے عوام کے ذہنی اُفق میں وسعت پیدا ہو، اُن کا تنگ نظری کے مورچے ٹوٹ جا سکیں، اُن کا ذہن تبدیلی کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے اور وہ پنچایتوں کو اس تبدیلی کے آلۂ کار کے طور پر تسلیم کریں۔

پنچایتوں کی بناوٹ

پنچایتوں کی بناوٹ کا تجزیہ کر لیا جائے تو اس سے یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ سماجی تبدیلی کے لئے پنچایتیں کہاں تک

ڈٹ کر کوشش کر سکتے ہیں۔ پروگرام کا جائزہ لینے والا محکمہ (پروگرام ایویلیوایشن آرگنیزیشن) پنچایتوں کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ پنچایت ممبروں کی تقریباً ۷۰ فی صدی اور پردھانوں کی ۸۰ فی صدی تعداد ان لوگوں کی ہے جو اونچی ذاتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور جو اقتصادی اعتبار سے نچی ذات والوں کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہیں۔ ان میں ممبروں کی تعداد کا ۸۰ فی صدی اور پردھانوں کی تعداد کا ۹۲ فی صدی حصہ ان لوگوں کا ہے جن کے پاس زمینیں ہیں۔ پنچایت ممبر ۵۰ فی صدی اور پردھان ۵۳ فی صدی کی تعداد میں ۴۰ سال یا اس سے اوپر کی عمر کے ہیں۔ عمر کی ہمارے سماج میں بڑی اہمیت ہے۔ جو شخص جتنا عمر رسیدہ ہوتا ہے اتنا ہی تجربہ کار اور اسی قدر قدامت پسند سمجھا جاتا ہے۔

سماج میں جو لوگ اونچی ذاتوں کے ہیں، یا زمیندار ہیں یا عمر رسیدہ ہیں ان میں موجودہ صورتِ حال کو جوں کا توں قائم رکھنے کا بڑا زبردست رجحان پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ صورتِ حال سے بیشتر لوگوں کی اغراض وابستہ ہوتی ہیں اس لئے بھی وہ تبدیلی کے مخالف ہوتے ہیں۔

انتخابات

لوگ پنچایتوں کے ممبر کس طرح منتخب ہوتے ہیں؟ یہ بات عام طور پر دیکھی گئی ہے کہ پنچایتوں کے انتخابات سے ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے جس سے خاندانی عداوت، ذات پات کا تفرقہ اور پشتینی مخالفتیں اور جتھے بندیاں اور زیادہ شدت اختیار کر لیتی ہیں۔ سماجی اونچ نیچ کی جو جو شکلیں بھی ہو سکتی ہیں اُن سب کو ہوا دی جاتی ہے اور اپنا الّو سیدھا کرنے کے لئے کھلے بندوں استعمال کیا جاتا ہے۔ پنچایتوں کے انتخابات کے سلسلے میں اخبارات میں بدامنی اور قتل و خون ریزی کے جو واقعات چھپتے ہیں اُن سے سننے والوں کے دل ہل جاتے ہیں۔ ان انتخابات کے وقت سماجی اختلافات اور عداوتوں کو چھوٹ ملنے سے جو فضا پیدا ہو جاتی ہے وہ سماجی تبدیلی کے اُس پاک مقصد کو ملیامیٹ کر دیتی ہے جو ہم سب لوگوں کا نصب العین ہے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص ذات پات اور جتھے بندی کے بل بوتے پر پنچایت کا ممبر منتخب ہوتا ہے آیا وہ دشمنی اور عداوت کے جذبات سے بلند ہو کر ایسے سماج کی تعمیر کے لئے کام کر سکتا ہے جس میں ذات پات کی تمیز ہوگی نہ طبقات کا فرق؟

ہاں اگر ان انتخابات کی نگرانی اچھے طریقے پر ہو، قدم قدم پر رہنمائی کی جائے اور انتخاب کا اچھی طرح سے سوچا سمجھا ہوا کوئی ضابطہ وجود میں ہو تو ہو سکتا ہے حالات میں کچھ سدھار ہو جائے۔ پنچایتوں کے قانون میں ایسی دفعات رکھی جا سکتی ہیں جو انتخابات میں ذات برادری کی مصلحتوں کی اہمیت کو کم سے کم کر دیں۔ مرض بہرحال بہت زیادہ جڑ پکڑ گیا ہے اور اس کا

ملاح صرف تعلیم کے ایک مسلسل عمل ہی کے ذریعے ممکن ہے ۔

پنچایتوں کا ڈھچر

کسی ادارے کی کامیابی کا ایک اہم پیمانہ اس کی اجتماعی تنظیم یعنی اُس کے آپس کے تعلقات کی نوعیت ہوتی ہے۔ ادارے اپنی باہمی تعلقات کی بنیاد پر کامیابی سے کام کرتے ہیں ۔

رسمی اور باضابطہ ادارے جن کی بنیاد غیر شخصی اور محض قانونی تعلقات پر ہوتی ہے، انہی کے اندر غیر رسمی اور بے ضابطہ گروہ اور ادارے بنتے ہیں جن کی بنیاد خالصتہً ذاتی اور شخصی تعلقات کے اوپر ہوتی ہے۔ جب یہ غیر رسمی چھوٹے چھوٹے ادارے رسمی اور بڑے ادارے کو سہارا دیں گے، اُسی وقت اُس کے اندر آپس میں خوشگواری اور قوت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے برخلاف ایسی صورت میں کہ ایک دوسرے سے لڑتا جھگڑتا رہے، باضابطہ ادارے کے ختم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ رابرٹ بیرسٹیڈ نے اپنی کتاب "سوشل آرڈر" میں بڑی معقول بات کہی ہے کہ "اچھے سے اچھا کوئی رسمی ادارہ کیوں نہ ہو اگر اُسے غیر رسمی اداروں کی حمایت حاصل نہیں ہوتی، تو صرف اپنی اچھائی کی وجہ سے وہ کامیاب ادارہ نہیں بن سکتا۔ دوسرے الفاظ میں رسمی ادارے کا تنظیمی ڈھچر کتنا ہی منظم اور کارپردازانہ کیوں نہ ہو، اُس کے انتظامی منصوبے کامیاب نہیں ہو سکتے اگر ان کے ارکان میں باہم خوشگوار تعلقات نہیں ہیں، اگر ان کے درمیان ذاتی عداوت ہے، اگر وہ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے اور آپس میں مل کر نہیں چل سکتے۔ ایسے حالات میں عموماً قانونی اختیار کو استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے لیکن اس سے صرف غم و غصے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور غم و غصے کا ماحول انسانوں کے باہمی ربط و ضبط کو اگر نا ممکن نہیں تو مشکل تو بنا ہی دیتا ہے، اور یہ صورتِ حال جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو یہ قانونی اختیار بھی بے اثر ہو جاتا ہے اور صرف "طاقت" باقی رہ جاتی ہے۔"

رسمی اور غیر رسمی اداروں کے یہ باہمی مناقشات، چاہے اُن کی بنیاد ذات پات پر ہو یا جتھے بندی پر یا کسی اور سماجی اختلاف پر، انہیں تعلیم اور خبر رسانی کے عمل سے مٹایا جا سکتا ہے۔ اکثر اوقات خبر رسانی اور اطلاعات کے وسائل کے راستے جہالت، غلط فہمی اور تعصب کی وجہ سے بند ہو جاتے ہیں۔ اُس وقت اُس کا توڑ صرف تعلیم کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔

گرام سبھا

اب یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ پنچایتوں کے ذریعے سماجی تبدیلی صرف اُسی حالت میں واقع ہو سکتی ہے جب گرام سبھاؤں سے اُن کے نہایت خوشگوار اور اپنائیت کے تعلقات قائم ہوں۔ پنچایتوں کے ممبر کتنے ہی لائق اور تیاگی کیوں

نہ ہوں، اگر وہ گرام سبھا کو نظر انداز کریں گے تو اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اگر آپ غور کریں کہ منصوبے بنانے کے وقت پنچایتیں گرام سبھاؤں کو کس انداز سے اپنے ساتھ شامل کرتی ہیں، ان گرام سبھاؤں کے کتنے جلسے ہوتے ہیں اور اُن کی کارروائی کس طرح ہوتی ہے تو بڑے دلچسپ انکشافات ہوں گے۔

پنچایتوں کی طرف سے ہونے والے نظم ونسق اور مقامی منصوبہ بندی کے کام میں گرام سبھائیں مستعدی اور وابستگی کے ساتھ اُسی وقت حصہ لے سکتی ہیں جب اُن کی سطح اونچی ہو۔ اس لئے ضرورت ہے کہ خواندگی اور شہریت کی تعلیم کو سب سے پہلا درجہ دیا جائے یہ بات کہنا خوش اخلاقی اور سعادت کی دلیل تو ہو سکتی ہے کہ گاؤں کے لوگ اَن پڑھ ہونے کے باوجود غضب کے ذہین اور موقع شناس ہوتے ہیں لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے تو کیا اِسے اِس بات کے جواز کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے کہ ناخواندہ لوگوں کو خواندگی کی ضرورت نہیں ہے؟ میرے خیال میں جب تک عوام اَن پڑھ، ناواقف اور اس اعتبار سے تبدیلی کی طرف سے بدشوق رہیں گے اُس وقت تک پنچایتوں کے ممبر گرام سبھاؤں کو سماجی تبدیلی کے لئے آمادہ کرنے میں ناکام رہیں گے۔

ضمنی انجمنیں

اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے پنچایتوں کو ایک بڑی تعداد میں ضمنی انجمنوں کی امداد کی ضرورت ہوگی یہ ضمنی انجمنیں مختلف طرح کی ہو سکتی ہیں مثلاً نوجوانوں کے کلب، عورتوں کی انجمنیں، ڈراما سوسائیٹیاں وغیرہ۔ اِن رضاکار جماعتوں کی اگر بڑے پیمانے پر نشو ونما ہو تو اُس سے پنچایتوں کا بوجھ ہلکا ہوگا، ترقیاتی اسکیموں کو عوام کی حمایت حاصل ہوگی اور ان کے کام سے سماجی تبدیلی کے عمل میں تسلسل قائم رہے گا۔

ان ضمنی انجمنوں کو اس قابل بنانے کے لئے کہ اُن سے پنچایتوں کے کام کو سہارا ملے، اِس بات کی ضرورت ہوگی کہ خود اُنھیں سہارا اور قوت پہنچائی جائے اور ہر طرح سے اُن کی امداد کی جائے۔ یہ سوشل ایجوکیشن کا ایک بنیادی منصب ہے۔

مالیات

پنچایتوں کو اپنے کام میں سرمائے کی کمی کی بہت پہلے سے شکایت ہے۔ یہ واقعہ بھی ہے کہ جب تک سرمائے کی طرف سے اطمینان نہ ہو جائے اُس وقت تک سماجی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ پنچایتوں کی آمدنی کے وسائل نہ مستقل ہیں نہ لوچدار کہ ضرورت کے مطابق آمدنی میں کمی بیشی کر لی جائے۔ یوں کوشش تو بہت کی جا رہی ہے کہ پنچایتوں کی آمدنی کے وسائل میں پھیلاؤ ہو لیکن ایک غریب ملک میں جس کی آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہو، اِن کوششوں کے راستے میں مجبوریاں بھی بہت ہیں۔

آگے چل کر جب ملک معاشی حیثیت سے ترقی کر جائے گا، اُس وقت امید کی جا سکے گی کہ پنچایتوں کی آمدنی میں بھی اُن کی ضرورت کے مطابق اضافہ ہو جائے۔ لیکن بحالت موجودہ ابھی کچھ عرصے تک پنچایتوں کو زیادہ تر اپنی ہی کوششوں ہی کے اوپر بھروسہ کرنا ہوگا اور سرمائے کا بیشتر حصہ انھیں اپنے اپنے گاؤں ہی سے حاصل کرنا ہوگا۔ اب اُس کا طریقہ چاہے جو ہو یا مقامی محاصل۔ اِس سلسلے میں یہ بات بہر حال طے شدہ ہے کہ پنچایتوں کو اس قسم کے محاصل عائد کرنے اور گاؤں کے لوگوں کو انھیں ادا کرنے کے معاملے میں اس بات کی شدید ضرورت ہوگی کہ لوگوں کی کافی اونچی حد تک تعلیم ہو چکی ہو اور اُن میں باہمی سمجھوتے کی روح پیدا ہو چکی ہو۔

پنچایتی راج صرف تنظیم کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے۔

اوپر جو تجزیہ کیا گیا ہے اُس کا یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ پنچایتی راج کی مخالفت مقصود ہے۔ نہ اس کے معنی یہ لینے چاہئیں کہ پنچایتی راج کا یہ تجربہ ناکام ثابت ہوگا۔ سوشل ایجوکیشن کا کارکن تو بس یہ چاہتا ہے کہ باہمی تعلقات کا ایک ایسا نظام قائم ہو جائے جس سے مقامی مسائل خود دیہی لوگ مل کر حل کر لیا کریں جو ان مسائل سے دوچار ہوں۔ سوشل ایجوکیشن کا منشا لوگوں کو اس حد تک تعلیم یافتہ بنا دینا ہے کہ وہ اپنے مسائل کو جماعت کے اپنے فیصلے سے حل کر لیا کریں۔ اس کام میں پنچایتی راج ایک انتظامی اور قانونی ضابطہ فراہم کرتا ہے جس کی بنیاد پر لوگوں کو موقع ملے گا کہ وہ اپنے مسائل اپنے آپ حل کر لیا کریں۔

لیکن پنچایتیں صرف تنظیم کا ایک نمونہ ہی پیش کرتی ہیں۔ خود تنظیم میں کوئی جادو نہیں ہوتا۔ اس کی شکل کتنی ہی دل پذیر کیوں نہ ہو اور اُسے متعین کرنے میں زیادہ سے زیادہ دانش مندی سے کیوں نہ کام لیا گیا ہو اگر لوگ اُس کا استعمال اچھا نہیں کرتے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ کسی تنظیم میں جان خود عوام کے ڈالنے سے پڑتی ہے۔ اُنہی کے اُبھارنے اور احساس دلانے سے اس میں اپنے فرائض کا شعور پیدا ہوتا ہے اور وہ جماعت کی زندگی کا مرکز بنتی ہے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ پنچایتی راج سماج میں ایک انقلاب پیدا کر سکتا ہے بشرطیکہ پنچایتوں کے ممبر سیاسی اختلافات و امتیازات کی بدولت پیدا ہونے والی عداوتوں اور لڑائی جھگڑوں سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لیں جماعت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں، اور باہر کی جماعتوں مثلاً ترقیاتی کاموں کے کارکن اور گرام سبھاؤں سے اپنے تعلقات میں خوشگواری اور اپنائیت کا رنگ پیدا کر لیں۔ پنچایتی راج کے ہاتھوں ایک نئے سماج کا سنگ بنیاد پڑے گا بشرطیکہ لوگ ان کے کاموں میں سمجھ داری اور دلچسپی کے ساتھ حصہ لیں اور انھیں اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لئے تقویت پہنچائیں۔ سوشل ایجوکیشن کو بہر حال ان کاموں میں بہت بڑا کردار ادا کرنا ہے۔

پنچایتی راج کی ایک مستحکم بنیاد
سوشل ایجوکیشن

۱۔ دیہی سماج کا ڈھانچہ

ہندوستان امتیازی طور پر ایک زراعتی ملک ہے۔ اس کی قومی آمدنی کا قریب قریب نصف زراعت اور اس سے متعلق دوسرے پیشوں سے آتا ہے اور اس کی کام سے لگی ہوئی آبادی کا تقریباً تین چوتھائی حصہ یعنی زمتعلقین کو شامل کرکے ۱۵ کروڑ ۲۰ لاکھ آدمی اُس سے وابستہ ہیں۔

ہم اپنے پنج سالہ پلانوں کے ذریعے شہراتی اور دیہاتی صنعتوں کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ زمین پر سے بوجھ کم ہو اور جب یہ کام پورا ہو جائے گا تو اُس وقت زراعت کی اہمیت اتنی نہیں رہ جائے گی جتنی اب ہے۔

لیکن صنعتوں کو فروغ حاصل ہو جانے پر بھی ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے جس کی دال روٹی اسی سے چلتی ہے، زراعت پھر بھی روزگار بہم پہنچائے گی اگرچہ اس کے طریقے اب تک پسماندہ حالت میں ہیں اور مشین کا استعمال عام نہیں ہوا ہے جو اس سبب سے ہے کہ الگ الگ افراد کے الگ الگ قطعات آراضی ہیں اور وہ چھوٹے چھوٹے سائز کے بھی ہیں اور اس پر طرہ یہ ہے کہ یہ قطعات بھی چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں۔

۲۔ قانونِ آراضی میں اصلاحات

لیکن قانونِ آراضی میں اصلاح اور زرعی تعلیم کے بارے میں اقدامات کیے جا رہے ہیں اور اُن کی بدولت یہ حالات بدل رہے ہیں۔ گذشتہ چند سال سے مختلف ریاستوں میں قانونِ آراضی میں جو اصلاحات ہوئی ہیں اُن کی موٹے طور پر حسب ذیل چار

تیں کی جا سکتی ہیں:

۱۔ سرکار اور کاشت کار کے مابین متوسلوں کا خاتمہ
۲۔ ضابطۂ کاشتکاری کی اصلاح جس سے حسب ذیل باتیں مقصود ہیں۔
(ا) لگان کی شرح میں تخفیف یعنی پیداوار کے چوتھے سے پانچویں حصے تک شرح لگان مقرر کرنا
(ب) (زمین دار کو یہ حق دیتے ہوئے کہ وہ اپنی آراضی کی ایک مقررہ کم سے کم مقدار کو ایک مدود ملنے تک اپنی ذاتی خود کاشت میں رکھ سکتا ہے) کاشت کار کو اس کی زیر کاشت آراضی پر دوامی قبضے کا حق دینا۔
(ج) (زمیندار کو اپنی آراضیات پر ذاتی کاشت کا حق دیتے ہوئے) کاشت کار کو موقع دینا کہ وہ زمیندار کو معاوضہ ادا کرنے کے بعد جس کی ادائیگی کئی سال میں قسط وار ہو گی اپنی زیر کاشت آراضی کا خود مالک بن جائے۔
۳۔ رقبۂ آراضی کی حد کا تعین (سیلنگ)
۴۔ زراعت کی نئی تنظیم جس میں حسب ذیل باتیں شامل ہیں:
(ا) چک بندی۔
(ب) آراضی کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانا۔
(ج) گاؤں کے انتظام کے سہکاری طریقے کی نشوونما اور سہکاری کھیتی۔

ان زرعی اصلاحات کے ٹھوس نتائج حاصل کرنے کے لئے تعلیم کے ایک نئے روپ کی ضرورت ہے یعنی سماجی تبدیلی یا نئے سماجی نظام معاشرت کی تعمیم۔ تعلیم کے اس نئے روپ کو سوشل ایجوکیشن کہتے ہیں۔

۳۔ آبادی کی صورتِ حال اور دیہی مسائل سے اس کا تعلق

۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی ۴۳ کروڑ ۶۰ لاکھ ہے جس میں سے ۳۵ کروڑ ۸۰ لاکھ گاؤں اور ۷ کروڑ ۹۰ لاکھ شہروں کی آبادی ہے۔ گذشتہ دس پندرہ سال سے آبادی میں اضافے کی شرح ناہموار رہی ہے شہروں میں اور صنعتی مرکزوں کی آبادی میں ۱۹۵۱ء کے بعد سے ۲۶ فی صدی اضافہ ہوا ہے حالانکہ ملک کے باقی ماندہ حصے میں ۲۱ فی صدی۔ یہ صورتِ حال صنعتی پھیلاؤ کے سبب سے گاؤں کے لوگوں کا شہروں اور صنعتی مرکزوں میں آ کر بسنے کا نتیجہ ہے۔ لیکن پھر بھی کھیتی کے لئے جتنے مزدوروں کی ضرورت ہے اس میں کمی واقع ہونے کے آثار نہیں ہیں۔ کاشت کار اپنی کریز بڑی تنخواہیں دینے کے معاملے میں صنعتی کارخانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کھیتوں پر کام

کرنے والے مزدوروں کی قلیل آمدنی لوگوں کو گاؤں سے شہروں کی طرف "دھکیلنے" کا کام کرتی ہے اور صنعتی ترقی کے روز افزوں مواقع انھیں اپنی طرف "کھینچنے" کا عمل کرتے ہیں۔

قدرتی بات ہے کہ جب تک زرعی پیداوار قلیل رہے گی اور اس کے نتیجے کے طور پر زرعی مزدوروں کو اجرت کم ملتی رہے گی اُس وقت تک گاؤں سے شہروں کی طرف ہجرت کا یہ سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ اس ہجرت سے ایک سیاسی خطرہ بھی ہے یعنی اس سے گاؤں ذہین اور عالی دماغ عناصر سے خالی ہو جائیں گے اور شہروں میں ہجوم بڑھ جائے گا۔ اس لئے سوشل ایجوکیشن کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہجرت کے اِس سیلاب کو روکنے کی غرض سے گاؤں میں پیداوار، پیشوں کی تعداد اور تنوع اور سماجی زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں میں اصلاح اور اضافہ ہو جائے۔

۴۔ گاؤں میں تعلیم کا پھیلاؤ

اِس مسئلے کو حل کرنے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ دیہی اداروں اور تنظیموں کے توسط سے پیشوں کی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے تاکہ گاؤں کی زمین کے ایک ایک ایکڑ سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو سکے۔ کیا ترکیب کی جائے کہ کم سے کم لاگت پر عمدہ سے عمدہ چیزوں کی زیادہ سے زیادہ فصل ہو، اور ساتھ ہی زمین کی زرخیزی بھی قائم رہے؟ یہ جدید زراعت کا سب سے پہلا تقاضا ہے۔ اِس سوال کے حل کا زیادہ انحصار عملی تعلیم کے اوپر ہے جس کا دامن تہذیبی ماحول سے نہ چھوٹنے پائے۔

زراعت کے فن میں حال میں جو ترقیاں ہوئی ہیں اور سائنس اور مشین کے ہاتھوں کھیتی کے عمل میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ اِس مقصد کے لئے مختلف قسم کی دیہی تنظیموں مثلاً نوجوان برادریوں، کسانوں کی انجمنوں اور سہکاری سوسائٹیوں کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ یہ ایک جانی بوجھی بات ہے کہ پیدائش دولت کے ایک عامل کی حیثیت سے کسان کے کام کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ اُس کا تمدن، رہن سہن کا انداز اور ماحول انفرادیت پسندانہ ہو جاتا ہے لیکن جماعت سے کٹ کر الگ ہو جانے والے فرد کی حیثیت سے وہ اپنے مسائل سے اچھی طرح نمٹ نہیں سکتا۔ لہٰذا اِس بات میں خود کسانوں ہی کا فائدہ ہے کہ وہ اپنے مسائل کو حل کرنے کی غرض سے اپنے آپ کو تنظیموں کی شکل میں منظم کریں۔

اس کے علاوہ ہمارے کاشت کاروں کی حیثیت چھوٹے چھوٹے قطعاتِ آراضی کے کاشت کاروں کی ہے۔ چنانچہ اس غرض سے کہ اُن کا معیارِ زندگی بلند ہو، انھیں آمادہ کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو سہکاری اکائیوں میں منظم کریں۔

۵۔ سوسائٹیاں پہلے سے موجود ہیں

کسانوں کی سہکار سوسائٹیوں اور دوسری انجمنوں کو سماج کے پہلے سے بنے بنائے ماحول کے اندر رہ کر کام کرنا ہوگا۔ صدہا سال سے دستور چلا آرہا ہے کہ ہر جماعت اپنی زندگی کا ایک ڈھرہ بنا لیتی ہے جس کے اندر سماجی میل جول اور جماعتی تنظیم کے کچھ ضابطے بن جاتے ہیں جنھیں جماعت کے "معمولات" اور اس کا طریقہ کار تسلیم کیا جاتا ہے۔ سماج کو بدلنے کی جو بھی کوشش ہو اسے موجودہ سیاسی تنظیم کو سمجھ کر اور اُسے ذہن میں رکھتے ہوئے ابتدا کرنی ہوگی۔ اگر ہم اِس سماجی تنظیم کے اجزا کو جن کی ترکیب سے یہ بنی ہے، سمجھ لیں اور ساتھ ہی یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ ان کا ایک دوسرے سے بہت گہرا ربط ہے تو اس تنظیم کے خدوخال کو نسبتاً بہتر طریقے پر سمجھ سکیں گے۔

ا۔ خاندان

خاندان وہ یونٹ ہے جس سے تولید و تناسل کا سلسلہ چلتا ہے، اور اس کا تہذیبی ورثہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتا ہے۔ اگر کوئی خاندان کے قائم و دائم رسم و رواج کو بدلنا چاہے۔ تو اُسے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ خاندانی روایات، رسومات اور تقریبات کی اُن کی زندگی میں کتنی اہمیت ہوتی ہے، اور پھر اُن میں سے ایسے پہلوؤں کو تلاش کرنا چاہیے جو تبدیلی کی تحریک میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔

ب۔ امدادی ادارے

یہ وہ ادارے ہیں جن کے ذریعے عوام کی مادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ ہر جماعت اپنی تنظیم اس انداز پر کرتی ہے کہ اشیاء غذا فراہم ہوتی رہیں، سر چھپانے کا سامان ہو جائے، پہننے کپڑے کی ضرورت اتنا کپڑا میسر آجائے اور نقل و حمل کے ذرائع مہیا ہو جائیں۔ اس طرح کے تمام کام سیدھے سادے اصولِ معیشت کے مطابق بنیادی طور پر خاندانوں ہی میں ہوتے ہیں لیکن سائنس اور مشین کی روز افزوں ترقی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہر کام میں پیچیدگی آگئی ہے مثلاً جائداد اور ملکیت کا نیا نظام، پیشوں میں زیادہ سے زیادہ تخصیص و مہارت کا رواج، محنت اور کام کا نیا ضابطۂ تقسیم، ایک نیا سماجی دستورِ عمل اور ان ہی کی بنیاد پر مشترک کوشش سے مادی ضرورتوں کی تیاری اور تقسیم کا انتظام رائج ہو گیا ہے۔ یہ درست ہے لیکن اس کے باوجود پیداوار کے طریقوں کو بدلنے، تقسیم کی مساوات، یا گاہکوں کی ضروریات و مطالبات کو دوسری راہ پر لگانے کی

کوشش میں موجودہ سیاسی اداروں کو لازمی طور پر پیش نظر رکھنا ہوگا۔ مثال کے طور پر مروجہ حقوق ملکیت کو اندھے پن سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ عوام کو اس بات پر آسانی سے آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو اپنی غذا میں شامل کر لیں جنھیں وہ گندہ اور ناپاک سمجھتے ہیں یا جنھیں مقدس وجود کی حیثیت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ بیشتر کسانوں کی آمدنی کم ہے اس لئے ان کے اندر اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ نئے طرز کے آلات، خالص نسل کے مویشی، مویشیوں کے چارے اور تجارتی کھاد کے لئے پیسہ نکال سکیں گے۔ زراعتی حلقوں کو پہلے پہل یہ چیزیں لا کر انھیں دینی ہوں گی۔

ج۔ تعلیمی نظام

ایک تعلیمی نظام کا منصب ہوتا ہے بچوں کو بالغ زندگی کے لئے تیار کرنا۔ اس منصب کو وہ ان کے اندر بنیادی سماجی قدروں کی ہم آہنگی کرکے اور انھیں شہری کی حیثیت سے جماعت کے ساتھ شریک ہونے کے گر سکھا کر اور فرد کی حیثیت سے کفایت شعارانہ اور خود کفیل زندگی گذارنے کے ڈھنگ بتا کر پورا کرتا ہے۔ تعلیمی ادارے اگر ایک طرف سماجی تبدیلی کے رخ کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ ماضی کی قدروں کو بحال و برقرار رکھنے کا وسیلہ بھی بنتے ہیں۔

سماجی تبدیلی کی تیز رفتاری کا تعلق براہ راست خواندہ اور تعلیم یافتہ ہونے کی صلاحیت سے ہے اس لئے کہ یہ صلاحیتیں انسان میں تلاش و جستجو کا ذوق پیدا کرتی ہیں اور رسالوں اور کتابوں کی مدد سے اُن کے سامنے علم و واقفیت کی مزید راہیں کھلتی ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو خواندگی کی مہموں اور کتب خانوں کے قیام کی بڑی اہمیت ہے۔

ہماری زراعت پیشہ آبادی کو نئے حالات اور اُن کے مطالبات سے واقف کرانے اور ان کے اندر سائنٹفک روح پیدا کرنے میں نوجوانوں اور بالغوں کی تعلیم سے بڑی مدد مل سکتی ہے اور ایک ایسی بنیاد پڑ سکتی ہے جس کے اوپر قومی اور مقامی حکومتیں اپنے صحتی، زراعتی اور خانہ آرائی کے اصلاحی پروگراموں کی عمارتیں بھروسے کے ساتھ کھڑی کر سکتی ہیں۔

د۔ مذہب

مذہب نام ہے اقدار کے اُس نظام کا جن کی بنیاد پر انسان کائنات کی ان قوتوں کے ساتھ جن کے اوپر اس کا قابو نہیں ہوتا نباہ کرتا ہے اور جو افراد کو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ خوش اطواری سے سلوک کرنا سکھاتا ہے۔ یہ صرف عقائد و عبادات کا مجموعہ ہی نہیں ہوتا جن کے مطابق ریاضت و قربانی کے ذریعے فرد اپنے اندر قوت و حرکت پیدا کرتا ہے بلکہ اس میں متوسلوں کا بھی ایک نظام شامل ہے جو دیوتا اور عبادت گذار کے درمیان کھڑے ہو کر ان کے سامنے دیوتا کی خوشنودی اور رضامندی

کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔

کسی جماعت کی تاریخ کا مطالعہ کر لیجئے وہ اس قسم کے واقعات سے بھری ملے گی جن میں ان متوسلوں اور کٹر قسم کے عبادت گذاروں نے سماجی تبدیلی کی اس بنیاد پر مخالفت کی ہے کہ یہ تبدیلی خدا کی مرضی کے خلاف ہے۔ لیکن انہی تاریخوں کے اوراق اس بات کی شہادت بھی دیتے ہیں — اور یہ بات ہمارے زمانے میں نسبتاً زیادہ تیزی سے واقع ہو رہی ہے — کہ بعض بزرگوں مثلاً سنت تکارام اور سنت رام داس وغیرہ نے اپنے معتقدین کی روحانی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ اُن کی غیر روحانی اور مادی ضرورتوں کی تکمیل کا سامان بھی کیا تھا اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا تھا۔ آج سنت ونوبا بھاوے اور سنت تکادوجی مہاراج اپنی تعلیمات کے ذریعے سماجی تبدیلی کی تحریک بڑے شدومد سے کر رہے ہیں۔

اگر زندگی کے کسی شعبے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوتی ہو تو اس کے حق میں مذہب کی تائید حاصل کرنے کے لئے قریب قریب تمام مذاہب کی مقدس کتابوں میں اس طرح کی تبدیلی کی نظیریں مل جائیں گی جنھیں اس مطلوبہ تبدیلی کی مذہبی تائید کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرکے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ تبدیلی کو بروئے کار لانے میں مذہب سے ہمیں کیا امدادی مواد مل سکتا ہے۔ اس معلومات اور تحقیق کو مقامی مذہبی پیشواؤں کی ٹریننگ کے لئے بھی آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ مقامی گروہ

ہر سماج میں چھوٹے چھوٹے مقامی گروہ ہوتے ہیں جو افراد کی روزمرہ کی زندگی میں بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ گاؤں میں پڑوس جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہونے والے خاندانوں سے مل کر بنتا ہے، ایک دوسرے کی مدد، مسلسل ملاقات اور بچوں کے لئے کھیل کود کے مواقع کا بہت اچھا وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔ پڑوس سے آگے بڑھ کر گلی یا محلہ اور اکثر پورے گاؤں کا نمبر آتا ہے۔ جس میں ہر فرد ایک دوسرے کو اپنا یگانہ سمجھتا ہے اور جو اُس کی چھوٹی سی دنیا کا مرکز ہوتا ہے۔ یہاں وہ اپنے متعلق گاؤں کی رائے عامہ کا اثر قبول کرتا ہے اور اُس کی بیشتر ضرورتیں وہیں کے وہیں پوری ہو جاتی ہیں۔

دیہی سماج کے اس نظام میں مختلف اداروں کے نمائندے ایک دوسرے سے رقابت یا اشتراک عمل کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر کسی کو گاؤں کے گھروں اور خاندانوں تک رسائی حاصل کرنی ہو تو وہ خاندانوں کے بزرگوں یا کسی مذہبی پیشوا، کسی سرمایہ دار، ساہوکار، کسی اسکول ٹیچر، کسی دکان دار یا وید حکیم کے توسط سے ہو سکتی ہے۔ یہ باتیں جاننے کی ضرورت ہے اس لئے کہ اگر خطاب براہ راست افراد کے بجائے ان گروہوں کے توسط سے کیا جائے تو ترقیاتی پروگراموں کے کامیاب ہونے کا زیادہ امکان ہے۔

ہر محلے یا گاؤں یا بستی میں بہت سے بے ضابطہ گروہ بھی ہوتے ہیں جو کسی چوپال یا بیٹھک میں لوگوں سے گپ شپ، حقہ نوشی
یا سیر گشتی کی غرض سے ایک جگہ جمع ہونے سے اپنے آپ بن جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہی لوگ مل کر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور
ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور اس طرح پورے گاؤں میں ایک عام چرچا پھیل جاتا ہے جیسے ترقیاتی پروگراموں
کے لئے رائے عامہ تیار کرنے میں بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

و۔ نظام مراتب اور سرداری

ہر سماج اپنا ایک نظام مراتب رکھتا ہے جس کے مطابق وہ افراد میں سے کچھ لوگوں کو سب سے اوپر، کچھ کو بیچ میں اور کچھ کو
سب سے نیچے رکھ دیتا ہے اور ان سے امید رکھتا ہے کہ وہ گاؤں کے نظام کو قائم رکھنے میں اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے حسب حال
اپنا اپنا کردار ادا کریں گے۔ یہ نظام مراتب یوں ہی الل ٹپ نہیں ہوتا بلکہ اُس کا گاؤں کی سماجی قدروں سے براہِ راست تعلق ہوتا
ہے جن سے لوگوں کی اکثریت متفق ہوتی ہے۔

چونکہ پروگرام کو چلانے کے لئے لیڈرشپ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے جن لوگوں کے اوپر ان پروگراموں کو چلانے کی
ذمے داری ہو انھیں چاہئے کہ صرف اپنے اداروں کی لیڈرشپ کا محتاج رہنے کے علاوہ کچھ اور بھی کریں۔ انھیں ان مختلف سماجی
گروہوں کے نمائندوں کو بھی اپنے کام میں ساتھ لینا چاہئے جن کا پروگرام سے واسطہ ہو۔ اس لئے کہ ضروری نہیں کہ ایک زمین دار
اپنے اسامیوں کا سب سے اچھا ترجمان ہو نہ یہ ضروری ہے کہ ایک چھوٹا کسان بڑے بڑے زمین داروں کے مسائل کو کسی قسم کی
لاگ لپیٹ سے پاک رہ کر سمجھ لے۔ دست کاروں کے گروہ کا نقطۂ نظر کھیتی باڑی کرنے والے کسانوں کے نقطۂ نظر سے مختلف
ہو سکتا ہے۔ اسی طرح گاؤں کا بنیا، ہو سکتا ہے، سہکاری سرگرمیوں کا شدت سے مخالف ہو جس سے اس کے نزدیک اُس کی پوزیشن
خطرے میں پڑ جائے گی۔ الغرض پروگراموں کی کامیابی کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو سکتی ہے بشرطیکہ "برسرِ اقتدار" طبقات کی
دعائیں اُس کے شاملِ حال ہوں۔ لیکن صرف یہی ایک شرط پروگرام کی مقبولیت کی ضمانت نہیں کر سکتی۔

ز۔ گاؤں پنچایت

گاؤں پنچایت سے یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ وہ سماج میں امن و امان قائم رکھے گی اور اس کی فلاح و بہبود کے جتن کرے گی
اوپر جتنی تنظیموں اور اداروں کے نام لئے گئے ہیں یہ اُن سب کی نمائندہ ہوتی ہے۔ پنچایتوں کی انہی صفات کا احساس کر کے
حکومت ایسے پروگراموں کی روز بروز ہمت افزائی کر رہی ہے جن کا مقصود دیہات کے اندر مشینی طور طریقوں کو بدل کرنا

اور عقل و ہوشش پر مبنی اطوار و عادات کو رائج کرنا ہے اور یہ کام وہ انہی پنچایتوں کے توسط سے انجام دینا چاہتی ہے۔

پنچایتوں کو جو کام انجام دینے ہیں اُن کی بڑی لمبی چوڑی فہرست ہے جس میں شہریت اور گاؤں کی سماجی اور اقتصادی ترقی سے متعلق تمام امور و انتظامات شامل ہیں۔

۶۔ سوشل ایجوکیشن کے کرنے کے کام

دیہی سماج کے آئے دن اُلجھتے ہوئے مسائل کو دیکھتے ہوئے جن سے پنچایت کو عہدہ برا ہونا ہے۔ سوشل ایجوکیشن سے کام میں بہت کچھ مدد مل سکتی ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے تحقیق و ریسرچ سے حاصل کئے ہوئے حقائق کی روشنی میں کافی مقدار میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ سوشل ایجوکیشن مسائل کو حل کرنے کے معاملے میں مل جُل کر سوچ بچار کرنے کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور مل جل کر سوچنا اور کوشش کرنا جس میں خود اپنے ہی ارادے اور تحریک کا دخل ہوتا ہے، ایک ایسا عمل ہے جس سے لوگوں میں اپنے مسائل کو آپ حل کرنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ جب مسئلے کی شناخت ہو جاتی ہے تو متعلقہ فن کے ماہر کی مدد سے اُسے حل کرنے کے پروگرام بنانے میں آسانی ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں سوشل ایجوکیشن سے حالات و مسائل کی اصلاح کرنے کے لئے پروگرام کا خاکہ بنانے میں مدد ملتی ہے۔ وہ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ بستی کے مختلف عناصر مثلاً افراد، گروہوں، محلّوں اور بستیوں، اسکول، نوجوان برادریوں، کسانوں کی انجمن، سہکاری سوسائٹی، پنچایت اور بلاک کے ماہرین کو اس پروگرام کے کن کن پہلوؤں کو اپنے ذمّے لینا چاہیئے۔ اِس طرح سوشل ایجوکیشن دیہی عوام کی زندگی کو بہتر بنانے میں پروگرام کی تعلیمی بنیاد کا حکم رکھتی ہے۔

جب سوشل ایجوکیشن منظم گروہوں اور مقامی لیڈروں کو تعلیمی عمل کے لئے کام پر لگاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس عمل میں ہر قسم کا تعلیمی سامان اور مواد، بہم پہنچائے گی اور ٹرینڈ لیڈرشپ کا اہتمام کرے گی۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ رضا کار لیڈر اور مقامی گروہوں کے سرگروہ بھی بڑے موثر اور کارگر وسائل ہوتے ہیں جن کے ذریعے ندامت اور اس سے متعلق دوسرے مضامین کی عملی تعلیم کامیابی سے دی جا سکتی ہے۔

گاؤں کے سماجوں میں سرداروں کی شناخت اور ان کی نشوونما سوشل ایجوکیشن آرگنائیزر کی ذمّے داری ہے۔ یہاں اُن کی کھوج کرے گا اور ٹریننگ دے گا جو اُس کے کام کو پھیلائیں گے اور ترقی دیں گے۔ رضا کار لیڈر تعلیم کے ہاتھ میں بڑا کارگر آلہ کار ثابت ہوتا ہے۔ سینڈرسن کا قول ہے کہ "کسی تنظیم یا تحریک کی قوت و حیات کا راز اپنے شوق سے اور رضا

تحریک کو حرکت دینے والے لیڈر ہوتے ہیں جنہیں اسے اپنے ساتھ لینا چاہیے۔"

(دیہی سماجیات اور دیہی تنظیم)

پنچایتی راج کے نئے نظام میں سوشل ایجوکیشن آرگنائیزر کا منصب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ دیہی اداروں اور رضا کار انجمنوں کو اپنے ساتھ ملا کر جتنے زیادہ سے زیادہ مقامی لیڈر ملیں انھیں سرداری کے ابتدائی اور بنیادی گُر سکھائے تاکہ اُن میں ایک اچھے اور قابل لیڈر کی صفات پیدا ہو جائیں، لیکن یہ واضح رہے کہ ان عامی لیڈروں کو پیشہ ور لیڈروں کے ہاتھ میں محض پیغام رسانی کا آلۂ کار نہیں سمجھنا چاہیے، وہ بہت بڑی حد تک نئے خیالات کی ایجاد و اختراع کے اہل ہوتے ہیں اور اپنے ذاتی اثر سے اپنی اپنی بستیوں میں ادارے اور انجمنیں قائم کر سکتے ہیں۔

اصل میں اپنے مسائل کو حل کرنے کی کوشش ہی سے افراد اور گروہوں کو ذمے داری کی تربیت ملتی ہے۔ یہی غیر نصابی تعلیم جو اسکول کی چہار دیواریوں سے باہر ملتی ہے وہ تعلیم ہے جس سے لوگ متحد عمل اور گاؤں کے فلاحی کاموں کو سہکاری طریقے پر انجام دینے کا ہنر سیکھتے ہیں اور آگے چل کر اُس سے کام لیتے ہیں۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اور زرعی معیشت کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرنے کی خاطر ہمیں سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں، پیشوں کی تعلیم کے اسکولوں، نوجوان برادریوں، کسانوں کی انجمنوں، سہکاری سوسائٹیوں، پنچایت اور ایکس ٹینشن کا کام کرنے والے افسروں اور کارکنوں کے درمیان تعلیمی بنیاد پر ربط و اشتراک کے تعلقات قائم کرنا چاہئیں غرض سوشل ایجوکیشن کے پروگرام سے بالواسطہ یا براہِ راست ایسے مواقع ہاتھ آسکتے ہیں جن سے مزید آمدنی کی راہیں مستقل طور پر کھل سکتی ہیں۔

۷۔ سوشل ایجوکیشن آرگنائیزر کا منصب

سوشل ایجوکیشن کا منصب دیہی عوام کو اپنے لئے ایک جامع اور متوازن پروگرام مرتب کرنے میں مدد بہم پہنچانا ہے۔ اس کا مخصوص مشن لوگوں کو ماہرانہ مشورے اور سرداری کی صفات سے کام لے کر اپنی مدد آپ کرنے کے قابل بنانا ہے۔ یہ ایک مسلسل تعلیمی عمل ہے جو سیکھنے کے متنوع مواقع پیدا کر کے انجام دیا جاتا ہے مثلاً ٹریننگ کیمپ، سماج سیوا کے کیمپ، کام کی تفصیلات طے کرنے والے ورک پروجیکٹ، نوجوان برادریوں کے شغلے، سیمنار، ریڈیو سننے والوں کی انجمنیں، تعلیمی سیریں، تہوار منانے کی تقریبیں، میلے اور نمائشیں وغیرہ۔ اس کا رشتہ گروہ بننے کے نفسیاتی عوامل اور تبدیلی کے تہذیبی محرکات سے ہوتا ہے۔ سوشل ایجوکیشن آرگنائیزر کو چونکہ عوام، مقامی گروہوں

اور اداروں کے اندر کام کرنے کے فن کی ٹریننگ ملی ہوتی ہے اور عوامی پیمانے پر اطلاعات رسانی کے آلات و وسائل اور ان کے طریق استعمال کا وہ ماہر ہوتا ہے۔ اس لئے گاؤں کی ترقی کے پروگرام میں سرداری کا کردار ادا کرنے اور اس راہ سے پنچایتی راج کو پختہ اور مستحکم بنیادوں پر اٹھانے کے کام میں پنچایت کے ممبروں کو مدد بہم پہنچانے کے لئے وہ ہر طرح موزوں اور کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔

انسان کی کہانی کم و بیش گاؤں یا دوسری چھوٹی بستیوں کی زندگی کی کہانی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں بڑے بڑے شہر ابھرے اور غائب ہو گئے مگر گاؤں اپنی جگہ بحال و برقرار رہا۔ بڑی بڑی تہذیبیں نمودار ہوئیں اور بجھ گئیں، لیکن قائم و دائم تہذیب جس کے ذریعے ماضی اپنا بنیادی ترکہ مستقبل کو منتقل کرتا رہا ہے گاؤں ہی کی تہذیب رہی ہے۔

آرتھر مارگن

خواندگی کی تحریک میں پنچایت کا کردار

۱- پنچایتی راج ایک نیا تجربہ

ایک ایسے ملک میں جہاں کے عوام "دورِ حاضر کی بلندیوں" پر پہنچ جانے کے لئے بے تاب ہوں ہر نئی اسکیم سے جو ملک کی خوش حالی کے لئے شروع کی گئی ہو یہ امید قائم کر لینا کہ اس میں اُن کی تمام بیماریوں کا علاج مضمر ہے قدرتی بات ہے۔ لیکن اصل چیز ان اسکیموں کے بارے میں عوام کا گہرا اعتماد ہے جو کامیابی کی سب سے بڑی ضمانت ہے، کیونکہ یہی اعتماد لوگوں میں ان کاموں کو پورے طور پر کر گذرنے کا جذبہ پھونکتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ لوگ اپنے کاموں کا محاسبہ بھی خود سے کرتے رہیں تاکہ ان کاموں کی منظم طریقے سے منصوبہ بندی ہو اور اُن کی تعمیل و تکمیل میں ایسی احتیاط برتی جا سکے کہ ان کی ناکامی کے امکانات کم سے کم رہ جائیں۔

۲- پنچائتی راج کے ماحول میں سوشل ایجوکیشن کے ایک جامع پروگرام کی ضرورت

قدیم ہندوستان کی یہ شاندار "چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں" جنہیں دوبارہ زندہ اور سرگرم عمل بنایا جا رہا ہے ان کے ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا کام کی تشکیل کا ایک مسلسل اور صبر آزما کام ہے ایک ایسے سماجی نظام کی تشکیل جو ایک طرف سائنس اور جدید ترین دولت سے مالا مال ہو اور دوسری طرف ان روایاتی قدروں اور قدیم تہذیبی ورثے کے گنج گرانمایہ کی امین جو ہمارے ملک کی امتیازی شان رہی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انہیں اپنی اس بڑی ذمہ داری سے واقف کرایا اور یہ بتلایا جائے کہ وہ کیا طریقے ہیں جنہیں اختیار کر کے وہ ان ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی نبھا سکتی ہیں۔ یہاں ڈنمارک

مشہور و معروف معلم بشپ گرونڈوگ کا قول نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو اس نے ۱۸۳۶ء میں فوک ہائی اسکول سے متعلق اپنے رسالے میں اُس وقت لکھا تھا جب ڈنمارک میں صوبائی مشاورتی کونسلوں کو قائم ہوئے ابھی دو سال ہی گذرے تھے۔ صوبائی مشاورتی کونسلوں کا قیام دراصل ڈنمارک میں جمہوری نظام حکومت کی سمت میں پہلا قدم تھا۔ گرونڈوگ لکھتا ہے۔

"ان کونسلوں کے قیام سے ڈنمارک کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے . . . . اب ضرورت ہے کہ ان کونسلوں کے دوش بدوش عوام کی تعلیم کا بھی کچھ ایسا انتظام کیا جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ رائے دہندوں اور ان کے ساتھ ہی ساتھ کونسلوں کے ممبروں کو وہ تربیت مل جائے جس کی ان بدلے ہوئے حالات میں سخت ضرورت ہے۔ اگر یہ قدرتی، شریفانہ اور صحت مند تعلیم انھیں نہ دی گئی، تو وہ وقت آسکتا ہے جب عوام جن کے ساتھ غیر قدرتی اور جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا رہا ہے، جلد یا بدیر، وحشی اور خوفناک جنگلی جانوروں کی طرح بپھر پڑیں گے اور انسانیت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیں گے۔ یہ نیا مدرسہ ہمیں انقلاب کی ہلاکتوں سے نجات دلائے گا اور ملوکیت سے جمہوریت کے درمیان کا یہ عبوری دور شرافت اور اطمینان وسکون کے ساتھ گذر جائے گا"۔

میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی اِس منزل پر کم وبیش یہی کچھ کرنا ہے۔ اس کے لئے سوشل ایجوکیشن کے ایک سوچے سمجھے منظم اور وسیع پروگرام کی شدید ضرورت ہے جو ہمارے رائے دہندوں اور مختلف درجوں کی پنچایتوں کے ممبروں، دونوں کے حسب حال ہو۔ جب ہم اس صورتِ حال پر بلان کی جائزہ کمیٹی کی رپورٹوں کی روشنی میں غور کرتے ہیں تو یہ ضرورت اور بھی شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے۔ جائزہ کمیٹی کی پانچویں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:-

"پنچایتوں کے ٹھیک ڈھنگ سے کام کرنے میں آج سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ پنچایت کے پردھانوں میں بیشتر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اِس کام کے اہل ہی نہیں ہیں۔ نہ تو اُن کی تعلیم ہوئی ہے اور نہ انھیں ان کاموں اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی ٹریننگ ہی ملی ہے جو پنچایتوں کو قانون کی رو سے سونپے گئے ہیں۔ اُن کا تعلیمی معیار بہت پست ہے اور ان میں سے بیشتر لوگوں کو اس بات کا علم بھی نہیں ہے کہ ان کی ذمہ داریاں اور فرائض کیا ہیں"۔

اسی کمیٹی کی چھٹی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

"ایک گروپ سے جس میں اَن پڑھ اور خواندہ دونوں طرح کے لوگ تھے، بات چیت کرنے پر یہ نتیجہ نکلا کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر خواندہ لوگ پردہ، جہیز، ذات پات کی پابندیوں اور مشترک پاخانوں کی ضرورت وغیرہ کے بارے میں ناخواندہ لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسند رائے رکھتے ہیں"۔

اس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ سوشل ایجوکیشن خصوصاً خواندگی کا سماجی زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ اس کے پیش نظر

یہ بات بہت ضروری ہو جاتی ہے کہ پنچایتوں کے ممبروں کو اس اہم ترین تقاضے یعنی خواندگی کی ضرورت اور افادیت کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل کیا جائے۔

۳۔ سوشل ایجوکیشن کے دو بنیادی پہلو — خواندگی اور شہریت کی تعلیم

عوام کے عام تعلیمی معیار کو بلند کرنے کی ضرورت کا احساس اب ہر گوشے میں لوگوں کو ہو گیا ہے جو بڑی صحت مند علامت ہے۔ جمہوریت کی کامیابی کا دار و مدار صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ اس میں عوام کی شرکت کی کیا نوعیت اور شان ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں میں بیداری، جمہوری روح اور ذمہ داری کا احساس ہو۔ اس لئے سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کا سب سے اہم پہلو جمہوری شہریت کی تعلیم ہونا چاہیئے۔

مہتہ کمیٹی نے بھی، جسے صورتِ حال کا اچھی طرح اندازہ تھا، سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے دو بنیادی کام بتائے ہیں۔ (۱) بالغوں کو جمہوری شہریت کی تعلیم دینا اور (۲) خواندگی۔

۴۔ خواندگی کے لئے پانچ سازگار شرطیں

یہاں اس مختصر مضمون میں میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ میں پنچایتوں کے ممبروں کی ٹریننگ کے جو پروگرام چلائے جا رہے ہیں اُن کا جائزہ لوں۔ میرا مقصد صرف اس سلسلے کی چند باتوں پر ناظرین سے تبادلۂ خیال کرنا ہے۔ مثلاً یہ کہ پنچایتی راج میں سوشل ایجوکیشن کے کارکن خواندگی کی تحریک کے سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔

اس طرح کا تجزیہ اگرچہ بارہا کیا گیا ہے اور اُسے دہرانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس موقعے پر کہ ایک طرف گذشتہ دس سال میں ہماری رفتار بہت سُست رہی ہے اور دوسری طرف پنچایتی راج کے نفاذ سے امیدیں پھر قائم ہو گئی ہیں، ان باتوں کو دہرانے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

خواندگی کے میدان میں ہمیں سائنٹفک تحقیقات کی ابھی بہت ضرورت ہے، خاص طور سے ان حالات کا پتہ لگانے کی جن میں خواندگی کی تحریک پھل پھول سکتی ہے۔ اس سلسلے میں کارکنوں کے تجربے میں جو باتیں آئی ہیں ان میں سے پانچ خاص باتیں یہ ہیں۔

۱۔ لوگوں میں پڑھنا لکھنا سیکھنے کا ذوق اور خواہش اور اُس کی قدر و قیمت کا واضح تصوّر۔

۲۔ لائق اور کام کے لئے آمادہ اُستادوں اور سُپروائزروں کا عملہ۔

۳۔ معقول سرمایہ اور دوسرے وسائل سے لیس ایک عمدہ تنظیم

۴۔ ایک آزمودہ اور موثر طریقۂ تعلیم۔ اور

۵۔ ایک موثر و منظم مشقی پروگرام جس کے ماتحت مشقی موادِ تعلیم بہم پہنچتا رہے اور بالغوں کے مناسب حال آدب کی تالیف اور تقسیم کا انتظام ہو۔

خواندگی کے ایک کامیاب پروگرام کے لیے بالغ نوآموزوں میں سیکھنے کی خواہش اور تحریک کا موجود ہونا، اچھے اور قابل استادوں کی فراہمی اچھی تنظیم اور معقول وسائل بنیادی شرط کا درجہ رکھتے ہیں۔

۵۔ خواندگی کا ذوق و شوق پیدا کرنے میں پنچایتوں کا کردار

اب جب کہ پنچایتی راج کے قیام سے لوگوں میں حوصلہ اور ایک نیا جوش پیدا ہو رہا ہے اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیے اور خواندگی کی مہموں کو کامیاب بنانے میں ان سے مدد لینی چاہیے۔ یہی وہ نادر موقع ہے جب ناخواندگی کے راکشس کے اوپر کامیابی سے حملہ کیا جا سکتا ہے اس لئے کہ عوام کی بیداری اس راکشس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اس وقت لوگ اپنی جہالت کے داغ کو دھونے کے لئے ذہنی اعتبار سے تیار ہیں اس لئے کہ انھیں احساس ہو چلا ہے کہ ان کی خود اختیاری اور اپنے معاملات کو خود سنبھالنے کی ترقی پسند راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ یہ جذباتی اپیل لوگوں میں رغبت اور ذوق و شوق پیدا کرنے کا سب سے کارآمد ذریعہ ہے۔ اس وقت لوگوں میں "آمادگی" بھی ہے اور بڑھانے کے لئے فضا بھی سازگار ہے ہمیں چاہیے کہ ہم ان نادر مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں اور انھیں کامیابی کی کرنیں پھوٹتی ہوئی دکھاتے چلیں اور اس طرح انھیں اس مقام پر پہنچا دیں جب انھیں خود احساس ہونے لگے کہ خواندگی ان کے لئے کتنی کارآمد چیز تھی اور اس کا حصول کس قدر آسان۔ تحریک و ترغیب کے سلسلے میں نفسیات کے نقطۂ نظر سے جو تحقیقات ہوئی ہیں، ہمیں انھیں بھی اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

۶۔ گاؤں کے اسکول اور ان کے اساتذہ کے باب میں پنچایتوں کا کردار

گاؤں کے اسکول اور اُن کے استادوں کا بستی کی زندگی سے رشتہ جوڑنا سوشل ایجوکیشن کا ایک بہت اہم منصب ہے۔ یہ بات خود اسکول کے حق میں بھی مفید ہوگی اس لئے کہ اس سے انھیں اپنی کارکردگی بڑھانے، اپنی آمدنی کے لئے مزید وسائل ڈھونڈنے اور اسکول کے طلبا کو جو کل اسی بستی کے سرگرم ممبر بن جائیں گے، سماجی خدمت کے کاموں کی عملی تربیت دینے کا موقع

جے۔ پی۔ نائک۔

پنچایت کے ممبروں کو لازمی تعلیم کی کامیابی کے لئے سب سے زیادہ کام کرنا ہے۔ اِس سلسلے میں اُن کے اوپر جو ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں اس سے انھیں باخبر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً داخلے کی کیا کیفیت ہے، بچّوں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے، اسکول کا ماحول کیسا ہے، تعلیم کی کیا حالت ہے۔ ان تمام معاملات سے اُن کا عملاً وابستہ رہنا ضروری ہے۔ اسکول کو صحیح معنوں میں ایک کمیونٹی سنٹر ہونا چاہیئے۔ اس نئی تنظیم میں اُستادوں کی حیثیت اور رُتبے کو اُبھارنا ہوگا، سماج میں ان کو ادب و احترام کا مرتبہ دینا ہوگا، اُن کے پیشہ ورانہ معیار کو بلند کرنا ہوگا۔ پھر اسکول کے معمولات کے علاوہ خواندگی اور سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں میں عملاً اور ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہونے کی انھیں دعوت دی جائے گی تو اس دعوت پر وہ لبیک کہیں گے۔

دیہی اسکول کے اساتذہ کے سماجی اور اقتصادی مرتبے میں استواری آنے سے اس پیشے میں اچھے لوگ شامل ہوں گے اور اگر پنچایتیں اچھے اور لائق اساتذہ کی خدمات حاصل کرلیں اور انھیں قائم و برقرار بھی رکھیں تو اتنے ہی سے عوام کو تعلیم دینے اور ان کے اندر زندگی کی حرارت پیدا کرنے کے سفر کا نصف حصّہ طے ہو جائے گا۔ پنچایتوں کو ہمت اور حوصلہ کرکے اور سمجھ بوجھ کے ساتھ اساتذہ کو ان کی موجودہ تلخ زندگی سے نجات دلانی ہوگی اور قدیم ہندوستان میں "گرو" کی حیثیت سے اُن کا جو مرتبہ تھا اُسے بحال کرنا ہوگا۔ جہاں تک تعلیم بالغان کا کام انھیں سپرد کرنے کا تعلق ہے، جب تک وہ اس کے لئے راضی نہ ہوں، یہ کام ہرگز ان کے سپرد نہ کرنا چاہیئے، اور اگر وہ اس کے لئے راضی ہو جائیں تو انھیں ان کی اس فاضل خدمت کا معقول معاوضہ دیا جانا چاہیئے۔

۷۔ سوشل ایجوکیشن یا لٹریسی کمیٹی

پنچایتیں اگر خواندگی کی مہم کامیابی سے چلانا چاہیں تو مناسب یہ ہوگا کہ سوشل ایجوکیشن کمیٹی یا ساکشرتا سمیتی کے نام سے اس مقصد کے لئے ایک مضبوط تنظیم بنالیں جس کے رکن پنچایتوں کے ایک یا دو ممبر اور ان کے علاوہ مقامی لیڈر اور اس کام سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے کچھ لوگ ہو سکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ پنچایت سمیتیوں کی نگرانی ایک لٹریسی یا سوشل ایجوکیشن فنڈ بھی قائم کیا جاسکتا ہے جس کی ابتدا امدادی گرانٹ کی قسم اور بستی کے چندوں سے ہو سکتی ہے۔ اس طرح کا فنڈ قائم ہونے سے یہ فائدہ ہوگا کہ تعلیمی سامان مثلاً تیل، لالٹین وغیرہ کے حصول میں عموماً جو تاخیر ہوا کرتی ہے وہ نہیں ہوگی۔ اسی طرح سوشل ایجوکیشن کمیٹی کے بننے سے سوشل ایجوکیشن کے کام کی نگرانی کرنے والے عملے کے کام میں مدد ملے گی اور وہ اِس کمیٹی کے اشتراک و تعاون سے اپنا کام موثر طریقے پر انجام دے سکیں گے۔

خواندگی کی منزل سے آگے چل کر جب مشغلی پروگرام کی منزل آتی ہے، اس وقت اگر دیہی اسکولوں کے اُستاد آگے آئیں تو بہتا

اچھا کام ہو سکتا ہے مثلاً دیہی کتب خانوں اور دارالمطالعوں کی تنظیم بڑے اچھے طریقے پر ان کی نگرانی اور اہتمام میں ہو سکتی ہے جہاں تک فنی امور کا معاملہ ہے جیسے خواندگی کے مناسب طریقے ایجاد کرنا اور نئی کتابوں کی تصنیف و تالیف یہ کام ضلعے اور ریاست کی سطح پر یہاں علوم کے ماہروں کے ہاتھوں ہونا چاہیئے۔ البتہ دیہی اسکولوں کے اساتذہ ان چھوٹی سے متعلق جو کاغذات مرتب کریں گے مثلاً مختلف قسم کی یادداشتیں (رجسٹر) اور نو آموزوں کی ضروریات کے بارے میں اپنے خیالات اور رائیں ان کی شکل میں وہ طریقۂ تعلیم اور بالغوں کے ادب کے ماہروں کو نہایت مفید مواد بہم پہنچا سکتے ہیں جن کی بنیاد پر یہ ماہرین اپنے کاموں میں اصلیت کا رنگ پیدا کر سکتے ہیں۔

نتیجہ بحث اور خلاصۂ کلام

پنچایتیں غرض گاؤں میں سوشل ایجوکیشن کی تحریک کے لئے بیش بہا خدمات انجام دے سکتی ہیں مثلاً بالغوں میں ذوق و شوق اور تحریک پیدا کر سکتی ہیں اور اسے قائم اور برقرار رکھ سکتی ہیں۔ اس کام کے لئے روپے پیسے اور جگہ کی شکل میں وسائل فراہم کر سکتی ہیں۔ ایک ایسی فضا پیدا کر سکتی ہیں جس سے اثر لے کر دیہی اسکولوں کے اساتذہ اپنے اوپر بوجھ سمجھ کر نہیں بلکہ اپنے شوق اور مرضی سے کام کریں گے۔ سوشل ایجوکیشن کمیٹی کے نام سے ایک جان دار اور مضبوط تنظیم کھڑی کر سکتی ہیں جو لگن اور دلچسپی کے ساتھ علم کے کارواں کو کامیابی سے منزل پر پہنچا سکتی ہے۔ ہم اس وقت جس "کھلونا بندوق" سے ناخواندگی کے "کوہ پیکر ہاتھی" کو مار گرانے کی کوشش کر رہے ہیں، اسے الگ رکھ کر اس کی جگہ "اصلی بندوق" کا استعمال کرنا ہوگا۔ عوام کے عزم و استقلال اور جوش عمل کی "لال بندوق" کا استعمال! اس لئے کہ اسی کی پنچایتی راج میں اصل حیثیت ہے۔ کار آمد خواندگی کا ایک جامع پروگرام جس میں شہریت کی تعلیم و تربیت بھی شامل ہے، وہی اور صرف وہی ایک مستحکم جمہوریت کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اس منزل پر پہنچنے کے لئے اس کے علاوہ بیچ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس کے بغیر ہم منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ اور منزل پر پہنچنا جلد ہے اس لئے ہمیں قدم بھی تیزی سے اٹھانا چاہیئے۔

پنچایتی راج اور رضاکار جماعتیں

نومبر ۱۹۶۰ء میں بنگلور میں لوکل سیلف گورنمنٹ کی مرکزی کاونسل کی ایک بیٹھک ہوئی تھی جس میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور سہکار کی وزارت سے فرمائش کی گئی تھی کہ وہ یہ معلوم کرے کہ پنچایتی راج کے اداروں کے کام میں رضاکار جماعتیں کیا اور کس طرح مدد کر سکتی ہیں۔ اِس فرمائش کو پورا کرنے کے لئے وزارت کے اہتمام میں پھر ۲۲ر اپریل ۱۹۶۱ء کو کل ہند پیمانے پر چند منتخب رضاکار جماعتوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس نے اِس موضوع پر ہر پہلو سے بحث کرنے کے بعد کچھ سفارشات منظور کیں۔ جنھیں ہم نیچے درج کر رہے ہیں۔

یہ سفارشات بڑے کام کی ہیں، اور پنچایتی راج کی تحریک میں کام کرنے والے کارکنوں کو ان سے اپنے کام میں مدد مل سکتی ہے۔ —— ایڈیٹر

۱

پنچایتی راج کے ادارے مقامی رضاکار جماعتوں کو سہارا دیں

۱۔ ہمارے ملک میں رضاکار جماعتیں پنچایتی راج کے نافذ ہونے سے پہلے ہی بہت عرصے سے چلی آرہی ہیں۔ انھیں سماجی کاموں کا گہرا تجربہ ہے اور وہ تیاگی اور خدمت کے جذبے سے سرشار شخصیتوں کی رہنمائی میں جماعت کے بھلے کے لئے برابر کام کرتی رہی ہیں چاہے سرکاری امداد انھیں ملی یا نہ ملی۔ پنچایتی راج کے یہ ادارے بھی، اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے قانونی جماعتیں ہیں، عوام کے اپنے ہی ادارے ہیں اِس لئے یہ ضروری ہے کہ رضاکار جماعتوں اور پنچایتی راج کے اداروں کے درمیان گہرا ربط ضبط ہو، اور دونوں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو اپنایت اور دوستی کے ماحول میں سمجھیں۔ اُن کے باہمی تعلق کی نوعیت

وہ ہونی چاہیئے جو ایک ساتھ مل کر کام کرنے والے "شریکوں" کی ہوتی ہے۔ مثلاً مختلف طریقوں سے عوام کو تعلیم دینے کے کام میں اور خاص طور پر مخصوص پروگراموں میں رضاکار جماعتیں پنچایتوں کی شریک کار نہیں اور پنچایتیں بات چیت کے لئے کھلے جلسوں کا اہتمام کریں جن میں بات چیت کرکے پروگراموں کے خاکے ایسے بنائے جائیں کہ ان میں سب کی شرکت بھی ہو اور کاموں کا ٹکراؤ بھی نہ ہو۔

۲۔ رضاکار جماعتیں گاؤں میں چھوٹی چھوٹی تنظیمیں، مثلاً نوجوان برادریاں، عورتوں کے کلب وغیرہ بنوانے کا کام اپنے ہاتھ میں لیں لیکن اگر کہیں کسی وجہ سے رضاکار جماعتوں کے لئے یہ کام کرنا مصلحت کے خلاف پڑے تو وہاں خود پنچایتیں اپنے اہتمام میں یہ کام کرا سکتی ہیں۔ ایک ہی گاؤں میں ایک ہی طرح کی بہت سی سنستھاؤں کے بننے سے کام میں ٹکراؤ ہو سکتا ہے جس سے خود ان سنستھاؤں کی نشو و نما میں خلل پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے اس لئے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

۳۔ پنچایتی راج کے مقصد و منشا کو لوگوں کے ذہن نشین کرانے اور اس کے لئے رائے عامّہ کی تربیت کرنے کی غرض سے ریاستی پیمانے کی ایک کانفرنس کی تنظیم ہونی چاہئے اور پھر اسی طرح کی کانفرنسیں ضلعوں میں ہونی چاہئیں جن میں بڑی بڑی رضاکار جماعتوں کی مقامی شاخوں، مقامی رضاکار جماعتوں، پنچایتوں اور ریاستی حکومت کے نمائندے شریک ہوں۔ ان کانفرنسوں میں یہ بتایا جائے کہ وہ کیا طریقے ہیں جن پر عمل کرنے سے پنچایتوں اور رضاکار جماعتوں کے درمیان اشتراکِ عمل پیدا ہو سکتا ہے۔ ریاست، ضلع، بلاک اور گاؤں، غرض ان مختلف درجوں میں اس اشتراک کی کیسا نوعیت ہو سکتی ہو؟ جیسے پنچایتی راج کے غیر سرکاری کارکنوں اور نوجوانوں اور عورتوں کی ٹریننگ کا معاملہ ہے تو یہ کام کون کرے اور کس طرح کرے۔ وغیرہ

۴۔ پنچایتی راج کی اسکیم کے منشاء کے مطابق ترقیاتی پروگراموں کے لئے سرکار جو روپیہ دیتی ہے وہ مقامی خود مختار حکومتوں کے توسط سے آنا چاہئے۔ یہ اصول طے کر دینے کے بعد اس کی تفصیلات اور ضابطے طے کرنا مرکز کے لئے مناسب نہیں ہے۔ یہ کام رضاکار جماعتوں، ضلع پریشدوں، اور پنچایت سمیتیوں کے مشورے سے ریاستی حکومتوں کو کرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ رضاکار جماعتوں کو سرکاری امداد بہم پہنچانے کا جو طریقہ ہے آیا اس میں پنچایتی راج کے اداروں کے قائم ہو جانے سے کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہے اور اگر ہے تو اس کی کیا شکل ہونی چاہیئے۔

۲

رضاکار جماعتیں پنچایتی راج کے اداروں کی کیا مدد کر سکتی ہیں؟

۱۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہر رضاکار جماعت اپنے ہی بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق کام کرتی ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بالکل وہی یا اسی سے ملتے جلتے کام اُسی علاقے میں کام کرنے والی کوئی دوسری جماعت بھی کر رہی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ بات متفقہ طور پر طے پائی کہ ہر رضاکار جماعت کو اپنے اپنے لئے چند کام مخصوص کر لینے چاہئیں اور انہی میں مہارت پیدا کرنی چاہئے نہ یہ کہ وہ سب کی سب ایک وقت میں بہت سے کام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ رضاکار جماعتوں کے لئے مناسب ہوگا کہ سماج کی ترقی کے لئے وہ ایک مشترک راستہ اختیار کریں اور چند مانے ہوئے بنیادی کاموں میں پنچایتی راج کے اداروں کی مدد کریں جیسے بے کار پڑی ہوئی انسانی طاقت سے کام لینا اور سماجی اور اقتصادی ترقی کے لئے موافق فضا پیدا کرنا۔ اگر کسی علاقے میں ایک سے زیادہ رضاکار جماعتیں ایک ہی کام کرنا پسند کریں تو اُن میں سے ہر ایک کے لئے کام کا ایک مقررہ رقبہ طے ہو جانا چاہئے تاکہ ایک دوسرے کے کام میں تکرار یا ٹکراؤ نہ ہونے پائے۔

۲۔ کام کے چند میدان ایسے ہیں جن میں رضاکار جماعتیں بڑا اہم اور نتیجہ بخش کردار ادا کر سکتی ہیں اور پنچایتی راج کے اداروں کو اُن سے مدد مل سکتی ہے مثلاً

(الف) پنچایتی راج اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے مضمون کی عوام کو تعلیم دینا۔

(ب) مشترک پروگراموں خصوصاً ان پروگراموں میں جو زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لئے چلائے جا رہے ہوں ہاتھ بٹانا۔

(ج) مخصوص مضامین کی تعلیم اور ٹریننگ دینے کا کام جیسے رضاکار جماعتوں کے کارکنوں اور پنچایتی راج کے ملازموں کی ٹریننگ۔

(د) پنچایتی راج کے اداروں میں خود غرض اور نیچی ذات کے لوگ اپنے اختیارات کے غلط استعمال سے دیہی سماج کے کمزور طبقوں کو تکلیف اور نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ان طبقوں کو ایسے خود غرض عناصر کے ظلم و زیادتی سے بچانے کا کام — اس کام میں لوگوں کو تعلیم دینے کی ضرورت پڑے گی۔ کمزور طبقے کے لوگوں کو بھی اور اس نام نہاد طاقت ور طبقے کے لوگوں کو بھی — تاکہ اس کے اثر سے لوگوں میں انفرادی اور خود غرضانہ طریقۂ فکر چھوڑ کر جماعتی طریقۂ فکر اختیار کرنے کی عادت پڑے۔

(۵) جانچ اور محاسبہ — خود اپنے کام کا بھی اور پنچایتی راج کے اداروں کے کام کا بھی۔

۳- ترقیاتی پروگراموں کے لئے عوام کی تائید وحمایت کی اور انسانی طاقت کو حرکت میں لانے کی ضرورت بمنزلہ شرط کے ہے۔ اگر اس ضرورت کو پورا کرنا مقصود ہے تو جوبات پیرا ۲ میں کہی گئی ہے اُسے اور زیادہ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ چند ٹھوس کام ایسے ہیں جنھیں اگر رضاکار جماعتیں اپنے ذمے لیں تو وہ جماعت اور سماج کی بہت بڑی خدمت کریں گی۔ مثلاً

(۱) سوشل ایجوکیشن — جو اگر ترقیاتی پروگراموں کے لئے فضا تیار کرنے کے مقصد سے کیا جائے تو بڑا جامع مضمون ہے۔

(۲) زرعی پیداوار کو بڑھانے کے پروگرام

(۳) دیہی صنعتوں کو فروغ دینے کے پروگرام

(۴) صحت وصفائی کے پروگرام

(۵) مقامی ترقی کے کام جیسے اسکول، کتب خانے، کمیونٹی سنٹر اور دوسرے تعمیری کام

(۶) سماج کے کمزور طبقوں کی فلاح وبہبود — جیسے پسماندہ، بوڑھے، معذور اور بے سہارا لوگوں کو آرام وراحت پہنچانے کا کام

(۷) عورتوں اور بچوں کی بھلائی کے پروگرام

(۸) نوجوانوں کی تنظیم کے پروگرام

۴- اس وقت سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے اداروں کو ہوس سی ہوگئی ہے کہ بیک وقت بہت سے کام ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کام تو بہت سے شروع ہو جاتے ہیں اور پورا اُن میں سے ایک بھی نہیں ہوتا اور روپیہ اور محنت مفت ضائع ہوتی ہے۔ اس لئے کانفرنس کی رائے یہ ہے کہ رضاکار جماعتیں اور پنچایتی راج کے ادارے، دونوں آپس میں مل بیٹھیں اور پہلے سے طے کرلیں کہ سال رواں میں فلاں فلاں کام پنچایتی راج کے ادارے کریں گے اور فلاں فلاں کام رضاکار جماعتیں انجام دیں گی اور پھر دونوں ایک دوسرے کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں مل کر زور لگائیں۔ کاموں کے اس طرح کے بٹے ہوئے پروگرام بناتے وقت اس بات کا بہرحال خیال رہنا چاہئے کہ قوم کے کیا مطالبات ہیں اور مقامی ضرورتوں میں سب سے زیادہ شدید کون سی ضرورتیں ہیں جنھیں پہلے ہاتھ میں لیا جائے۔

۵۔ لیکن اس طرح کا کوئی متفقہ پروگرام بنانے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ رضاکار جماعتوں کے بارے میں پوری پوری معلومات میسر نہیں ہے کہ اُن کے کام کیا ہیں تنظیم کی کیا نوعیت ہے اور کام کے کن میدانوں میں انھوں نے تجربہ حاصل کیا ہے۔ اس لئے کانفرنس کی رائے میں ہونا یہ چاہیئے کہ تمام رضاکار ادارے (کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی) وزارت کو اپنے بارے میں پوری پوری معلومات بہم پہنچائیں یعنی یہ کہ انھوں نے مخصوص طور پر کن میدانوں میں تجربے حاصل کئے ہیں، اُن کے پاس کام کرنے والے کتنے اور کس طرح کے لوگ ہیں، آیا اُن کی ماتحتی میں چلنے والے اور ادارے بھی قائم ہیں، پنچایتوں کے پروگراموں کو بڑھاوا دینے میں آیا وہ کوئی مخصوص سہولت بہم پہنچا سکتے ہیں۔ اِن معلومات کے حاصل ہو جانے پر رضاکار جماعتوں کے مشورے سے وزارت طے کرے گی کہ وہ کیا لائن اور کون سا میدان ہو سکتا ہے جس میں پنچایتی راج کے اداروں اور کسی خاص رضاکار جماعت کے درمیان اشتراک ممکن اور مناسب ہوگا۔

۶۔ جمہوری نظام میں عوامی تعلیم کا کام بڑے پیمانے کی تحریکوں اور مہموں، کانفرنسوں، نمائشوں، اور میلوں وغیرہ کے ذریعے ہونا چاہئے، اور رضاکار جماعتیں اس طریقۂ کار میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کے کاموں کے لئے وہ کیل کانٹے سے خوب لیس ہوتی ہیں۔ ریاستی حکومتوں کو رضاکار جماعتوں سے مل کر اس ذیل میں یہ سوچنا چاہئے کہ جمہوری آداب کی تعلیم دینے کے مشن میں رضاکار جماعتوں کی کس طرح مدد کی جائے کہ وہ مؤثر طریقے پر کام کر سکیں۔ عوامی تعلیم کے کام میں فلم، فلیش کارڈ اور لوک سنگیت جیسے وسائل کو ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیئے۔ اسی طرح اس کام کے لئے ایک جامع نصاب بھی مرتب کیا جانا چاہیئے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔

۷۔ رضاکار جماعتوں کے کارکنوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے اور انھیں ٹرننگ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا اور سفارش کی گئی کہ ان کارکنوں کے ریاستی اور مقامی پیمانے پر سیمینار منعقد کئے جانے چاہئیں۔ اس مقصد کے لئے ان کارکنوں کے چھوٹے چھوٹے کیمپ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کے کتنے کیمپ ہوں اس کا دار و مدار مختلف رضاکار جماعتوں کے کارکنوں کی تعداد پر ہوگا جو ان میں شامل ہونا چاہیں گے۔ ان کیمپوں میں سے چُنے ہوئے کارکنوں کو ڈسٹرکٹ انسٹی ٹیوٹوں کے کورسوں کی ٹرننگ کے لئے بھیجا جا سکتا ہے جو تیسرے پنجسالہ پلان کے دوران میں کسی وقت ضلعوں میں قائم کئے جانے والے ہیں۔ ریاستی پیمانے کے کیمپوں کے علاوہ مرکزی پیمانے کے کیمپ بھی منظم کئے جا سکتے ہیں۔

۸۔ ہر ریاست میں ریاستی حکومتوں اور ممتاز رضاکار جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک ایک کمیٹی ہونی چاہیئے جس کے سپرد عوامی تعلیم کے پروگرام اور رضاکار اداروں کے کارکنوں کی ٹریننگ کی اسکیمیں مرتب کرنا ہو۔

۹۔ رضاکار جماعتیں ترقیاتی پروگرام کے مختلف پہلوؤں میں جو کام ہوتے ہیں، ان کا اندازہ اور محاسبہ کرنے کا کام بھی اپنے ذمّے لے سکتی ہیں مثلاً اِس بات کا اندازہ کہ عورتوں، اچھوت ذاتوں اور قبائلی لوگوں کے اوپر کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگراموں کا کیا اثر ہوا ہے۔ یہ کام جن رضاکار جماعتوں کو دلچسپی ہو، چاہیں تو وہ خود اپنے طور پر بھی کر سکتی ہیں یا یہ ہو سکتا ہے کہ حکومتِ ہند اگر اس طرح کا کوئی محاسبہ کرنا چاہے تو ان جماعتوں کو اپنے ساتھ لے لے۔

۱۰۔ غیر سرکاری کارکن، جیسے پنچ، سرپنچ، پنچایت سمتی کے ممبر، پردھان اور پنچایت سکریٹری، نوجوانوں کے لیڈر اور خواتین میں کام کرنے والیاں، اُن کی ٹریننگ کے لئے وزارت نے جو پروگرام بنایا ہے، وہ سُنایا اور سمجھایا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ بعض رضاکار جماعتیں اپنے اداروں میں اِس طرح کی ٹریننگ پہلے ہی سے دے رہی ہیں تیسرے پلان کے دوران میں پنچایتی راج کے غیر سرکاری کارکنوں کی ٹریننگ کے لئے ڈسٹرکٹ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی جو اسکیم ہے، اُس کے اوپر بھی بات چیت ہوئی۔ اِس سلسلے میں یہ بات تسلیم کی گئی کہ رضاکار جماعتیں اس قسم کے انسٹی ٹیوٹ خود اپنے اہتمام میں چلا کر یا اُن کے چلانے میں حکومت کی مدد کر کے بڑا کام کر سکتی ہیں۔ اِس ذیل میں کانفرنس کی عام رائے یہ تھی کہ جن ضلعوں یا ریاستوں میں رضاکار جماعتوں کی اچھی تنظیم ہے اور اُن کے پاس ساز و سامان بھی ہے، وہاں ان رضاکار جماعتوں کو یہ نئی ذمّہ داری قبول کرنے میں پس و پیش نہیں ہونا چاہیئے۔

متفرق باتیں

کانفرنس میں سماج کے کمزور طبقوں کی مدد کرنے کے سوال پر بھی بحث ہوئی۔ اِس سلسلے میں یہ بات کہی گئی کہ رضاکار جماعتیں عوام کے اندر ایک ایسا شعور اور نفسیاتی ماحول پیدا کر سکتی ہیں جس کے اثر سے پنچایتی راج کے ادارے اِن طبقوں کے مسائل کو حل کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ کانفرنس میں جن رضاکار اداروں کے نمایندے شریک تھے اُن سے درخواست کی گئی کہ اس مسئلے کی چھان بین کرنے کے لئے جو ٹیم بنی ہے، اُس کے پاس وہ اس موضوع سے متعلق اپنے خیالات اور دائیں لکھ کر بھیج دیں۔

باہر کے چند نمونے

- سوئٹزر لینڈ کے کمیون
- روس کی دیلیج سوویت
- انگلستان کی پیرش کاؤنسل

سوئٹزرلینڈ کے کمیون[1]

(شہریت اور مقامی حکومت کا سوئستانی نمونہ)

سوئستان (سوئٹزرلینڈ) کو اکثر "کمیونوں کا ملک" کہا جاتا ہے۔ اِس بات پر پہلے پہل تو بہت سے لوگ چونک پڑیں گے اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ریاستیں بنتی ہی گاؤں اور شہروں کی ترکیب سے ہیں اور اگر سوئستان کمیونوں کا ملک کہا جاتا ہے تو اس میں نئی کیا بات ہے جو صرف سوئستان کے لئے مخصوص ہو؟

لیکن آیئے ذرا بات کی تہہ میں پہنچ کر دیکھیں کیا معاملہ ہے۔ ایک مثال لے لیجئے۔ اگر ایک فرانسیسی اور ایک سوئستانی کی ملاقات ہو جائے اور دونوں ایک دوسرے کے پاسپورٹوں کا مقابلہ کریں تو دونوں میں ایک فرق دور سے اور فوراً نظر آجائے گا۔ فرانسیسی پاسپورٹ میں اس کے حامل کی تصدیق ان الفاظ میں ہوگی کہ "فلاں شخص فرانس کا باشندہ ہے"۔ مگر سوئستانی پاسپورٹ میں اس کے حامل کے آبائی وطن یعنی کسی نہ کسی کمیون کا نام لکھا ہوگا اور اس کے بعد اس ریاست (کینٹن) کا نام ہوگا جس کے اندر وہ کمیون واقع ہے۔ اِس اعتبار سے یہاں سوئستانی شہریت کے نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کی نوعیت سہ گانہ ہے۔ سوئستانی اصلاً ایک کمیون کا شہری ہوتا ہے، دوسرے اُس ریاست کا جس کا وہ کمیون ایک جزو ہے۔ یہی دوگانہ شہریت خود بخود سوئستانی شہریت بن جاتی ہے۔ شہریت کی اِسی سہ گانہ نوعیت کے آئینے میں سوئستانی ریاست کے ڈھانچے کی شکل بھی صاف صاف دیکھی جاسکتی ہے جسے تاریخ کے تقاضوں نے ڈھالا تھا اور جو اب بھی اسی حالت میں موجود ہے۔ سوئستانی وفاق انہی آزاد کمیونوں کی ترکیب سے بنا تھا اور آج بھی انہی منضبط و مستحکم کمیونوں کی بنیاد پر کھڑا ہے۔

سوئستان کا نام سوئٹزرلینڈ کے ایک صوبے "شوئیز" (SCHWYZ) کے نام پر پڑا ہے، اور خود اس صوبے کا یہ نام ایک چھوٹے سے قصبے "شوئیز" کے نام پر پڑا تھا۔ ابتدا میں ریاست اور کمیون میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں کا ایک ہی

---

[1] کمیون چھوٹی سی بستی کو کہتے ہیں جس کی آبادی عموماً تین چار سو افراد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ہمارے یہاں ایسی بستیوں کو "قریہ" یا "پِنڈ" کے لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ م

مفہوم ہوتا [illegible] کمیون کی اسمبلی (لینڈسگمائنڈ) کو اقتدارِ اعلیٰ یعنی آخری اور مطلق اختیار حاصل تھا۔ زمانۂ قدیم کے سوئیستانی ایک دوسرے سے متصل کمیونوں کی علاقائی انجمنیں بنایا کرتے تھے جو جنگلوں اور چراگاہوں کے استعمال، سڑکوں اور پلوں کی تعمیر اور ندیوں اور نالوں پہ بند باندھنے کے معاملات میں صلاح مشورہ اور فیصلے کرتی تھیں۔ قدرت کے خلاف کمیونوں کو جو لڑائیاں لڑنی پڑتی تھیں، اُن کے معاملے میں کوئی صلاح مشورہ نہیں ہوتا تھا بلکہ انھیں سب کمیون اپنی ذاتی مہم سمجھتے تھے اور اُن کے خلاف مل کر لڑتے تھے اس طرح ساتھ مل کر کام کرنے والے ہم وطن اور ہم قصبہ بن گئے۔ مشترک کام کاج نے انھیں ملا کر ایک کیا اور مل جل کر کام کرنے کی روایت سے اُن کی باہمی تنظیم میں مضبوطی اور استحکام آیا۔ اب بھی یہ کیفیت ہے کہ "لوشین" کی وادی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ لکڑی ڈھونے کا کام سب کے اشتراک سے ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی باشندہ پہاڑ کے اوپر کوئی مکان بنانا چاہتا ہے تو مکان کے موقع پر شہتیر پہنچانے کا بیشتر کام کمیون کے سب شہری مل کر انجام دیتے ہیں "سب کے سب ساتھی ہیں" کی روایتی تدبیر کے ماتحت عورت مرد بچے بوڑھا، غرض ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اس کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔

سوئستانی کیمون تاریخ کے مختلف ادوار سے لے کر اب تک کام کرنے اور زندگی گذارنے میں متحد اور مشترک رہے ہیں چنانچہ آج کے دن بھی وہ بہت سے امور میں مثلاً تعمیرات، پانی، گیس اور بجلی کی سپلائی، تعلیم، غربا کی امداد اور اسی طرح کے اور بہت سے معاملات میں آپس کے صلاح مشورے کے ذریعے فیصلے کرتے ہیں۔ وہ اپنے کام کے لئے با اختیار جماعتیں بھی منتخب کرتے ہیں اور ان کے افسروں میں سے بعض کا تقرر بھی کرتے ہیں۔ اُن کی آزادی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کیمون کی اسمبلی کا اجلاس ہوتا ہے یہ کیمون کی اسمبلی زمانہ ماضی سے اب تک قریب قریب تمام کیمونوں میں جن کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ نہیں ہوا ہے ایک جاندار ادارے کی حیثیت سے قائم رہی ہے۔

یہ بات بہرحال اپنی جگہ طے ہے کہ سوئستانی کیمونوں کی آزادی مطلقانہ اور غیر محدود آزادی نہیں ہے۔ وہ جو کوئی بھی فیصلہ کرتے ہیں، وہ وفاقی اور ریاستی قانون کے اندر رہ کر کرتے ہیں۔ مثلاً شہری حقوق، قرضوں کی ادائگی، دیوالیہ پن اور وفاقی اور ریاستی انتخابات اور رائے دہندوں کے معاملات میں انھیں وفاقی اور ریاستی قوانین و ضوابط کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اپنے فرائض کی انجام دہی میں انھیں قانون اور ان احکام و ضوابط کی مطابقت کر کے چلنا ہوتا ہے جو اوپر کی قانونی جماعتوں کی طرف سے انھیں بھیجے جاتے ہیں۔ غرض اس معاملے میں یہاں بھی وہی کیفیت ہے جو کسی بھی دوسرے ملک میں ہو سکتی ہے، اور ہونا بھی یہی چاہئے کیونکہ ہر منظم سماج کی یہ ایک لازمی اور قدرتی شرط ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ کیمونوں کے لئے کام کا جو میدان چھوڑ دیا گیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ انھیں اس حد تک آزادی حاصل ہو جس کی مثال کسی دوسرے ملک میں نہیں مل سکتی۔ سوئستانی کیمونوں کی جمہوریت کے بارے میں اگر یہ بات بیان کی جائے ——— اور جو امر واقعہ ہے ——— کہ گاؤں کے لوگ خود اسی بات پر مثلاً گاؤں میں

ایک کارخانہ قائم ہونے والا ہے آیا اس کا یہ مناسب موقع ہے یا نہیں یا ایک جمنازیم یا تیراکی کے ایک تالاب کی ضرورت ہے۔ اس کی تعمیر کے لئے محصول لگایا جائے یا نہیں۔ انتخاب کر بیٹھتے ہیں تو یہ بات سن کر دنیا کی بہت سی جمہورتیں حیرت زدہ ہو جائیں گی۔ ان کے یہاں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس طرح کے کام عموماً خود حکومت یا ماہرین کی کسی مشاورتی جماعت کے کرنے کے ہوتے ہیں اور اگر ایسے معاملات میں فیصلہ عام انتخاب کے ذریعے کیا جائے تو ان ممالک میں اسے ایک "حوصلہ مندانہ تجربہ" قرار دیا جائے گا۔ لیکن سوئٹزرلینڈ میں شاید ہی کوئی اتوار ایسا آتا ہوگا جو ایک نہ ایک کمیون کے ہاتھوں اس قسم کے "حوصلہ مندانہ تجربے" سے خالی رہتا ہو۔ اس قسم کی حوصلہ مندی سے اندیشہ کیا جاتا ہے کہ کہیں ریاست ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے مگر یہاں ریاست ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے بجائے اور زیادہ طاقت ور اور مستحکم ہو گئی ہے۔

لوگوں کے لئے اپنے مقامی مسائل سے بروقت اور گہری واقفیت کا اگر کوئی وسیلہ ہے تو یہی کمیون ہیں اور یہیں سے ان کی سیاسی مشق کی ابتدا ہوتی ہے جس طرح سوئستانی ریاست کی ابتدا چھوٹے چھوٹے دیہی قریوں سے ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح سوئستانی شہریوں کے سیاسی تجربے اور بصیرت کا بسم اللہ چھوٹے چھوٹے مقامی مسائل سے ہوتی ہے۔ یہی ابتدائی تجربات آہستہ آہستہ انھیں اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ کمیون سے آگے بڑھ کر ریاستی اور آخر میں وفاقی معاملات میں ہاتھ ڈالیں۔ وفاقی پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں نے اپنی سیاسی زندگی سب سے پہلے کمیون کی انجمن کے ممبر کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ فوج کے سپاہیوں کی طرح سوئستان کا سیاست داں اونچے مقامات پر پہنچنے کے لئے سب سے نیچے کی منزل میں اپنی سرگرمیوں کی بسم اللہ کرتا ہے اور اُسے ترقی کی ہر منزل پر اپنی صلاحیت کا ثبوت دینا پڑتا ہے تب کہیں جا کر وہ یہ امید کر سکتا ہے کہ شاید اب اُسے اعلیٰ تر ذمے داریاں سونپی جائیں۔ اس طرح زینہ بہ زینہ چل کر عروج پر پہنچنے والا مدبر جب کسی اعلیٰ مرتبے کو پہنچ جائے تو اس سے یہ خطرہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ ان قریوں کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے گا، یا ڈکٹیٹروں کی طرح اپنے ہم قریہ و ہم قصبہ شہریوں کو کچل دے گا۔ اسی طرح ایک ایسی قوم جو اس طرح کی جان دار بستیوں کی زندگی کی عادی ہو، اُسے کوئی مٹی کا لوندہ نہیں قرار دیا جا سکتا جس کی پہلے سے کوئی شکل نہ ہو اور اسے کوئی جس سانچے میں چاہے ڈھال لے۔ نہ ایسی قوم کسی "آہنی انسان" کی رہنمائی کے سامنے اپنی گردن خم کر سکتی ہے۔ جن قوموں کی زندگیاں قریوں اور بستیوں کی روایات سے وابستہ ہوتی ہیں وہ گویا ایک مضبوط اور سنگین قلعے کے اندر ہوتی ہیں اور ان کے پاس ان لوگوں کے مقابلے میں جو اپنے آبائی وطن اور اس کی روایات سے کٹ کر تتر بتر ہو چکے ہوتے ہیں، کہیں زیادہ سرمایہ ہوتا ہے جس کی انھیں حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ وہ اس راز سے بھی واقف ہوتی ہیں کہ زندگی میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے اور انھی کو سینے سے لگائے رکھنے میں زندگی کی مسرتوں کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ اسے مختصر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کی خوشی کا دارومدار ذمے داری کے احساس کے اوپر ہوتا ہے۔

یہ انھی جان دار بستیوں کا طفیل ہے کہ سوئٹسانی اپنی ریاست کے باب میں اتنا "چکنا گھڑا" نہیں ہوتا جتنے دوسری قوموں کے لوگ عام طور پر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسروں سے اکثر و بیشتر شخصی طور پر واقف ہوتا ہے اور جب افسرانِ متعلقہ سے ذاتی تعلقات اور رسم و راہ ہو تو دفتر شاہی کا دور دورہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ سوئٹسانی بستیوں اور قریوں سے جو افسر متعلق ہوتے ہیں اُن کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوتی جتنی بالعموم اسی طرح کے نظم و نسق کے لئے دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے۔ عوام چوکس رہتے ہیں اور خاص طور پر سرکاری روپے کے استعمال کے معاملے میں نہایت کڑی نظر رکھتے ہیں۔ قریوں اور بستیوں کے اس ملک میں سرکاری حسابات جانچ پڑتال کے لئے ہر وقت اور ہر شخص کے لئے کھلے رہتے ہیں۔

ابتدا میں بیشتر سوئٹسانی اپنے آبائی گاؤں یا قریے میں رہا کرتے تھے۔ لیکن اب یہ صورتِ حال صنعت کا فروغ ہونے سے بدل گئی ہے۔ اقتصادی ترقی سے قانون سازی کے ڈھنگ میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ ہر شخص کو اپنی وطنیت کے انتخاب میں آزادی حاصل ہے اور ملک کے قانون نے اِس آزادی کی ضمانت بھی کردی ہے اور اُسے وسیع بھی کردیا ہے۔ ۱۸۴۸ء تک ان کمیونوں میں وہ اصلی شہریوں پر ایک "نووارد" کا حساب پڑتا تھا۔ مگر ۱۹۱۴ء میں ان کے اندر ایک پر اپنے شہری پر دو "نوواردوں" کا حساب پڑتا تھا جو دوسرے کمیونوں حتیٰ کہ دوسری ریاستوں سے آکر وہاں بس گئے تھے۔ اس کے بعد سے اپنے آبائی کمیونوں میں رہنے والے شہریوں کی تعداد برابر گھٹتی رہی ہے۔ لیکن اتنی بات طے ہے کہ اب ان "مہاجروں" کی حیثیت محض عارضی باشندوں کی نہیں ہے جیسا کہ کمیونوں میں اب سے بہت پہلے دستور تھا۔ اِس لحاظ سے عارضی باشندوں کے یہ کمیون سیاسی زندگی میں بڑی اہمیت اختیار کر گئے ہیں اور انھیں آج کل "سیاسی کمیون" کہا جانے لگا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کمیونوں کے اصلی شہری اپنے آپ کو اب بھی عملاً ان کا اصل وارث سمجھتے ہیں اور اس بنیاد پر اپنی امتیازی شان قائم کئے ہوئے ہیں چنانچہ اگر کوئی سوئٹسانی ایک کمیون یا ریاست سے آکر کسی دوسرے کمیون میں بود و باش اختیار کرتا ہے تو جب وہ کم سے کم تین مہینے اپنے اِس نئے کمیون میں قیام کرلے تب کہیں کمیون کے معاملات میں رائے دے سکتا ہے اور اُسے وہ سیاسی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں جو اس کمیون کے آبائی اور کئی سال سے رہنے والے شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۰۲ کا)

ٹیکس عائد کرنے کا اختیار پیرش کونسل کو نہ ہو کر ضلع کونسل (کاؤنٹی کونسل) کو ہوتا ہے۔ ضلع کونسل میں ہر پیرش انجمن یا کونسل کے دو ممبر شامل ہوتے ہیں۔ پیرش کی انجمن یا کاونٹی کونسل کی سفارش پر قرض بھی لیا جاسکتا ہے۔

یہ پیرش کونسل دیہی علاقوں کے لئے بنائی گئی تھیں، مگر جن کی آبادی کئی ہزار تک پہنچ جاتی ہے انھیں ضلع کی کونسلوں کے ماتحت کردیا جاتا ہے۔

روس کی ویلیج سوویت

روس کی اشتراکی جمہوریتوں کی یونین میں ویلیج سوویتیں جو کام کر رہی ہیں اس سے تمام دنیا کے کسانوں میں ایک جوش کی لہر پیدا ہو گئی ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں پروفیسر ووی کرسانوف نے ایک مخصوص ویلیج سوویت نو دوشا پو دوف کے حالات بیان کئے ہیں۔ جو نقشہ نو دوشا پو دوف کی ویلیج سوویت کا یہاں پیش کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر وہی نقشہ ان ہزاروں لاکھوں ویلیج سوویتوں کا بھی ہے جو یونین کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔

موضع نو دوشا پو دوف ماسکو سے ۵۹ کیلومیٹر کے فاصلے پر اُس سڑک کے کنارے آباد ہے جو لینن گراڈ سے ہرے بھرے کھیتوں اور گھنے گھنے باغات سے گذرتی ہوئی ماسکو سے شمال مغرب کو جاتی ہے۔ اس موضعے کی بڑی سڑک کے دونوں طرف اجتماعی فارم میں کام کرنے والے کسانوں کے مکانات واقع ہیں اور انھی کے درمیان ایک بڑی سی اسکول بلڈنگ، ایک نیا اسٹور، ایک کنڈرگارٹن، ایک صحتی مرکز اور ایک کلب بھی واقع ہے۔ اُن سے اور آگے چل کر اجتماعی فارم کے مویشیوں کے باڑے، حرارت خانے[1]، موٹر خانے، اناج گھر اور اسی طرح کے دوسرے ضروری چیزوں کے گودام ہیں جو فارم کے کام میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس فارم کا نام مشہور روسی ادیب میکسم گورکی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

گذشتہ چند سال سے اس مقامی فارم اور اس کے ممبروں کی تہذیب و معیشت میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور ان سب کا سہرا بہت بڑی حد تک نو دوشا پو دوف کی ویلیج سوویت کے سر ہے۔

اِس سوویٹ کے ۳۲ ڈپٹی یا عوامی نمائندے ہیں جو خفیہ بیلٹ کے ذریعے عالمگیر بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر منتخب ہوئے ہیں۔ ان ۳۲ ڈپٹیوں میں عمر رسیدہ بزرگ بھی ہیں جنہیں زندگی کے تجربات نے دانش مند بنا دیا ہے اور ۱۸ سال سے اوپر کے جوان سال بھی ہیں ــــ مرد بھی، عورتیں بھی، کاشت کار بھی اور تعلیم یافتہ طبقے کے نمائندے بھی مثلاً ٹیچر اور ڈاکٹر بھی

[1] سرد ملکوں میں غیر ملکی اور نازک پودوں کی حفاظت اور نشو و نما کے لئے کانچ کے مکانات بناتے ہیں۔ انھیں (HOT HOUSE) یا حرارت خانہ کہا جاتا ہے۔ م

یہ سب کا سب ایک مقصد میں متحد و متفق ہیں۔ اور وہ کہ اپنے بس بھر جو کچھ بھی ممکن ہو، اپنے ہم وطنوں، اپنے رائے دہندوں کی بہبود کے لئے کر گزرنا۔

سوویت کی مجلسِ منتظمہ

ویلیج سوویت کی مہینے میں دو بار میٹنگ ہوتی ہے جس میں ڈپٹی لوگ[1] پیچیدہ اور اہم معاملات پر بحث کرتے ہیں۔ میٹنگوں کی درمیانی مدت میں بھی گاؤں کی زندگی بہرحال مسائل کھڑی کرتی رہتی ہے مگر انھیں حل کرنے کے لئے ڈپٹیوں کی میٹنگ کا انتظار نہیں کیا جاتا۔ ان کا حل سوویت کی مجلسِ منتظمہ نکال لیتی ہے جس کے چار ممبر، ایک چیرمین اور ایک سکریٹری ہوتا ہے اور ان کے مددگار ہوتے ہیں۔

یہ مجلسِ منتظمہ کس قسم کے مسائل کو لیتی ہے؟

اس سوال کا جواب ایسٹونیا نا اوخالینا کی سوویت کی مجلسِ منتظمہ کے چیرمین سے پوچھئے۔ وہ کہتے ہیں:

"ہم جن مسائل کو ہاتھ میں لیتے ہیں، اُن کا دائرہ اچھا خاصا وسیع ہے۔ ابھی حال میں ہماری مجلسِ منتظمہ نے حسبِ ذیل مسائل کا فیصلہ کیا تھا: گاؤں سدھار کے منصوبے کی تکمیل، اسکول اور بچوں کے اداروں کی عمارتوں کی مرمت، موسمِ گرما کے لئے مختلف کلبوں کے تفریحی پروگراموں کی منصوبہ بندی۔"

اِن مجالسِ منتظمہ کو یہ اور اسی طرح کے اور بھی بہت سے کام دیکھنے پڑتے ہیں۔ اور اگرچہ سوویت کے اسٹاف میں صرف تین آدمی — چیرمین، سکریٹری اور لائبریرین — ہوتے ہیں مگر پھر بھی انھیں کام زیادہ ہونے کی شکایت نہیں ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ سوویت اپنے رائے دہندوں اور گاؤں کے لوگوں سے بہت زیادہ گہرا ربط ضبط رکھتی ہے اور یہی بات اس کی قوت کا راز ہے چنانچہ گاؤں والے بھی بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اپنے "ڈپٹیوں" کا ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں۔

مستقل کمیشن

سب سے زیادہ معروف سوویت کے مستقل کمیشن رہتے ہیں۔ اس وقت اِس طرح کے پانچ کمیشن بنے ہوئے ہیں: زراعتی کمیشن، بجٹ اور مالیاتی کمیشن، گاؤں سدھار کمیشن، تعلیمی، تہذیبی و تفریحی کمیشن اور قانونی اور امنِ عامہ کمیشن۔ ان کمیشنوں کی مدد کرنے کے لئے رضاکاروں کی تعداد میں رضاکار رہتے ہیں۔ یہی کمیشن سوویت کو صحیح فیصلے پر پہنچنے میں اور اس سے بھی بڑھ کر ان فیصلوں کی تعمیل کرانے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔

---

[1] سوویت کے ممبروں کو "ڈپٹی" یعنی نمائندے کہا جاتا ہے۔

مقامی عوام کی شرکت

گاؤں کے تمام باشندے اور اُن کی انجمنیں مثلاً عورتوں کی انجمنیں، محلہ کمیٹیاں اور پنشن یاب لوگوں کی سبھائیں وغیرہ سوویت کے کاروبار سے بہت گہری دلچسپی رکھتی ہیں اور ہر معاملے میں اُن کی مدد کرتی رہتی ہیں۔

ہم نے ڈپٹیوں اور اُن کے رضاکار معاونوں کے کام کا اوپر جو ذکر کیا ہے اس میں خاص بات یہ دیکھنے میں آئے گی کہ زراعتی پیداوار کا مسئلہ اُن کی توجہ کا خاص مرکز ہوتا ہے اور یہ قدرتی بھی ہے اِس لئے کہ کسانوں کی خوش حالی، گاؤں کا سُدھار اور نئے نئے تہذیبی اور پیشہ ورانہ مرکزوں کی تعمیر، غرض گاؤں کی فلاح و بہبود کے جملہ کاموں کا دار و مدار صرف فارم کی صورتِ حال پر ہوتا ہے۔

گاؤں کے دہ سالہ تعلیم کے اسکول میں پہنچنے پر سب سے پہلی چیز جو نظروں میں کھُبتی ہے، وہ ہے پھل دار درختوں کا جھنڈ۔ پھلوں کا یہ باغ، دو سال ہوئے، خود اسکول کے بچوں اور اُن کے والدین نے لگایا تھا اور اِس منصوبے کی تحریک ڈپٹی فلو پوف کی سرکردگی میں دیہات سُدھار کمیشن نے کی تھی۔

ڈپٹی فلو پوف کے علاوہ اس کمیشن میں پانچ اور ڈپٹی صاحبان ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے رضاکار معاونوں کے ساتھ نوو دشا پو ووف کو ترقی دینے کا ایک دو سالہ منصوبہ بنایا تھا۔ مسلسل دو سال سے کمیشن گاؤں کے سرکاری اداروں کی آرائش کی مہم چلا رہا ہے۔ یہ مہمیں جن میں گاؤں کی پوری بالغ آبادی حصّہ لیتی ہے، ہر سال بہار اور خزاں کے موسم میں اتوار کے دن منعقد ہوتی ہیں۔ عوام نے ان مہموں کے اثر سے بڑے بڑے نمایاں کام انجام دیئے ہیں۔ مثلاً ۱۲۰۰ میٹر لمبا پانی کا نل بچھا دیا ہے، آٹھ کنوئیں کھودے ہیں، دس تالابوں کی صفائی کی ہے، اور سڑکوں کے کنارے اور چوکوں میں دس ہزار درخت لگا دیئے ہیں۔

ہم نے ایک دیہی کلب کی سیر بھی کی جو گاؤں والوں کی من بھاتی جولانگاہ ہے۔ یہاں جو آتا ہے ایک نہ ایک شوق لے کر آتا ہے۔ مثلاً کوئی کتاب لینے آیا ہے تو کوئی ڈرامے یا سازسنگت میں حصّہ لینے، کوئی بینڈ باجے کا ایک ساز بجانے آیا ہے تو کوئی شطرنج یا چوسر کھیلنے، کوئی فلم یا ناچ دیکھنے آیا ہے تو کوئی صرف گپ شپ کرنے اور تھکان اُتارنے۔

کلب کے دیوان خانے میں سب سے پہلے جس چیز پر نظر جاتی ہے وہ ایک آراستہ و پیراستہ نمائش خانہ ہے جس میں ایک نمائش لگی ہے۔ اِس کا عنوان ہے "سوویت علاقے کے اندر سنہ ۱۹۶۱ء میں تعمیرات کے امکانات"۔ اِس نمائش میں سب سے نمایاں تعمیرات کا وہ پہلو ہے جو مویشیوں کے باڑوں اور دوسرے گوداموں اور کارخانوں کی تعمیر سے متعلق ہے۔ دوسرے گوشے میں دوسری قسم کی تعمیرات کا

منصوبہ دکھایا گیا ہے جیسے ایک "مرکز تہذیب" کی تعمیر، پانی کی فراہمی اور سیوریج کے سلسلے کی تعمیرات، ایک ہوٹل، ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور، کسانوں کے لئے نئے مکانات وغیرہ۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ان تعمیرات کے نقشے بن رہے تھے مگر اب زور وشور سے تعمیر کا کام شروع ہو گیا ہے۔

گاؤں کے مستقبل کا رخ کمیونزم کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھانے کی طرف ہے جب نوووشا پوووف کے باشندوں کی مادی اور تہذیبی سطح اور زیادہ بلند ہو جائے گی۔ ان کے روزمرہ کے کام ان کی ویلیج سوویت کی رہنمائی میں انجام پذیر ہوتے ہیں جو گاؤں میں عوام کے اقتدار کی بنیادی اکائی ہے۔

(بقیہ صفحہ کا)

جن پیرشوں نے کونسل بنانے کے لئے اجازت حاصل نہیں کی ہے۔ وہاں یہ انجمن ہی اپنے معاملات کی مختار کل ہوتی ہیں۔

جس پیرش کی آبادی ۳۰۰ سے زائد ہوتی ہے وہاں پیرش کونسل کا انتخاب لازمی ہو جاتا ہے۔ ان کمیٹیوں میں ۵ سے ۱۵ ممبر تک ہوتے ہیں۔ ممبر تین سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں۔ عہدہ داروں کا انتخاب پیرش کے سالانہ جلسے میں ہاتھ اٹھا کر ہوتا ہے۔ خاص حالات میں خفیہ انتخاب کا بھی انتظام کیا جاتا ہے۔ ان کمیٹیوں کی تشکیل دراصل اس لئے کی جاتی ہے کہ پیرش کا کام ٹھیک ڈھنگ پر چلتا رہے۔

حقوق اور فرائض

پیرش کونسل، انجمن کے کچھ کاموں کو اپنے ذمے لے لیتی ہے۔ اگر پیرش کی انجمن چاہے تو کسی بھی آراضی کی فروخت کو روک سکتی ہے۔ پیرش کونسل کی اپنی ایک عمارت اور ایک کتب خانہ ہوتا ہے۔ کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی ٹیکس کے عائد کئے جانے کے خلاف اپیل کرے۔ پیرش کونسل، ضلع کونسل کے انتظام سے تالابوں اور کھائیوں کی صفائی کا انتظام کر سکتی ہے۔ وہ گندگی کو دور کرنے کے سلسلے کی تمام کارروائیاں کر سکتی ہے۔ پیرش کونسل کسی زمین کو اپنے قبضے میں لے سکتی ہے اور اسے دفتر کی عمارت، کھیل کود کے میدان، کتب خانہ یا قبرستان جس مصرف میں چاہے لا سکتی ہے۔

ضلع کونسل یا کاؤنٹی کونسل

پیرش کونسل اپنے ممبروں میں سے ایک کلرک اور ایک خازن مقرر کر سکتی ہے۔ مقامی کونسلیں جو ٹیکس عائد کرتی ہیں وہ عموماً ڈیڑھ پونڈ فی ۲۴۰ پینس کے حساب سے عائد ہوتا ہے یعنی تقریباً دو فی صدی۔ یہ ٹیکس آمدنی پر لگایا جاتا ہے۔ (باقی ۹۵ پر)

انگلستان کی پیرش کونسلیں

انگلینڈ میں قدیم سیکسن بستیوں کی اکائیاں ٹن (TUN) کہلاتی تھیں جس سے مراد ہوتی تھی دیوار یا جھاڑیوں سے گھری ہوئی ایک محفوظ جگہ۔ بستی (TOWN) کا رقبہ اتنا مانا جاتا تھا جتنی دور تک وہاں کے لوگوں کا زمین پر قبضہ ہوتا تھا۔ یہ بستیاں قدیم آریائی بستیوں سے بہت ملتی جلتی ہوتی تھیں۔ بستی کے رہنے والے اپنی چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں بنا کر بستی کا خود انتظام کرتے تھے۔ بستی کے تمام لوگوں پر مشتمل ایک سبھا ہوتی تھی، جس میں باقاعدہ عہدیدار چنے جاتے قانون نافذ کیے جاتے تھے۔ عیسائی مذہب کی اشاعت کے بعد آرک بشپ تھیوڈور نے سیکسن بستیوں کی قدیم اکائی کی حیثیت کو تو تسلیم کر لیا مگر انھیں ایک دوسرا 'پیرش' (PARISH) کا نام دے دیا گیا۔ پیرش لفظ یونانی لفظ 'پیروکیا' سے بنا ہے، جس سے مراد ہوتی ہے چرچ کے قریب آباد بستی۔

پیرش کی انجمن اور پیرش کونسل

لوکل گورنمنٹ ایکٹ کے سنہ ۱۸۹۴ء میں پاس ہو جانے کے بعد اور حال میں سنہ ۱۹۳۲ء کے قانون کے مطابق 'پیرش' کو ایک بار پھر دیہی علاقوں میں مقامی حکومت کی اکائی کی حیثیت مل گئی ہے۔ اس قانون کا مقصد دیہی اصلاحات سے دیہی زندگی کی نئی تعمیر کرنا تھا۔ سارے انگلینڈ اور ویلس میں 'پیرش' موجود ہیں جن میں سے اب کچھ نے شہر کی شکل اختیار کر لی ہے مگر دوسری ابھی گاؤں ہی جیسی ہیں۔ ہر آدمی کا تعلق کسی نہ کسی پیرش سے ضرور ہوتا ہے۔ پیرش مقامی حکومت کی یونٹ ہی نہیں ہیں بلکہ وہ ایسی قدیم اکائیاں ہیں جن سے مقامی حکومت کی نشوونما ہوئی ہے۔ ابتدائی پارلیمنٹ کی نشوونما بھی انھیں بستیوں کی آزاد فضاؤں میں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۹۴ء کے قانون کو کسانوں کے حقوق کا ضمانت نامہ کہا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء کے قانون میں تمام باتوں کو کچھ رد و بدل کے ساتھ شامل کر لیا گیا ہے۔ 'پیرش' (گاؤں) کا نظم و نسق اُن کی انجمن یا کمیٹی کے ذریعہ عمل پذیر ہوتا ہے۔ پیرش کے تمام رائے دہندگان پر مشتمل ایک انجمن ہوتی ہے۔

ہمارے مضمون نگار

شری بی ایس مہتا: چیف سکریٹری، حکومت راجستھان۔ راجستھان میں پنچایتی راج کی تحریک موصوف کی خاص دلچسپی ہے۔

شری جے پرکاش نرائن: سیاسی اقتدار کی لامرکزی تنظیم اور سرودے تحریک کے سالارِ کارواں

ڈاکٹر مکٹ بہاری لال: سابق استاد سیاسیات، ممبر پارلیمنٹ

شری سوہن سنگھ: ڈائرکٹر نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر، نئی دہلی

پروفیسر کے۔ ڈی۔ گنگراڈے: استاد، دہلی اسکول آف سوشل ورک، دہلی یونیورسٹی، دہلی

شری ایچ۔ بی سکسینہ: اسسٹنٹ ڈائرکٹر نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر، نئی دہلی۔

شری جے۔ ایس۔ پردیشی: استاد نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر، نئی دہلی

شری این۔ اے۔ انصاری: استاد، نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر، نئی دہلی،

پروفیسر جیارگ تھورر: سوئستانی سفارت خانہ

مسٹر وی۔ کرسانوف: روسی سفارت خانہ

انگلستان کی پیرش کاؤنسل: پنچایت سندیش سے ماخوذ

ادارہ ماہنامہ تعلیم و ترقی ان حضرات کا دل سے شکر گذار ہے کہ ان کے تعاون کے بغیر اس خاص نمبر کی ترتیب و تکمیل ممکن نہیں تھی

—— ایڈیٹر

پرنٹر و پبلشر برکت علی فراق نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

ادارۂ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر، نئی دہلی

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

اکتوبر ۱۹۶۱ء

جلد ۱۲ — نمبر ۱۰

بانی:- شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر:-

پروفیسر محمد مجیب

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر:- ماہنامہ تعلیم و ترقی ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵

قیمت سالانہ ۴ روپے   فی پرچہ ۳۷ نئے پیسے

ٹیلیفون: ۷۲۶۲۰

ترتیب

ناشر و طابع برکت علی فراق نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر دفتر تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

کوئمبٹور نیشنل سیمنار

کچھ لوگوں کے کام کرنے کا دستور یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز کی ابتدا نقطۂ عروج سے اور بڑی دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ یہ طریقہ اچھا بھی ہے اور بُرا بھی۔ اچھا اس لئے کہ جن لوگوں کے لئے کام کیا جاتا ہے ان کے دل میں اس سے جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور انھیں یقین ہوجاتا ہے کہ موقع ملے تو وہ بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔ بُرا یوں ہے کہ اس صورت میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ابتدا نقطۂ عروج سے ہو، اُس کے ارتقا کا رخ کس سمت میں ہوگا؟ اس لئے کہ ارتقا کا اصول یہ ہوتا ہے کہ نیچے سے اوپر کی طرف کو جاتے ہیں۔

جو لوگ انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی ابتدا اور بارہ سال کی تاریخ سے واقف ہیں ان سے پوچھئے تو وہ نیشنل سیمناروں کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ کو بھی کچھ اسی طرح کے تضاد میں مبتلا بتائیں گے۔ ابتدا کے چند سیمناروں کی رپورٹوں کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ سیمناری اندازِ بحث کا جو نمونہ میسور کے ایشیائی سیمنار نے قائم کر دیا تھا، اس کی اگر پوری پوری نہیں تو بڑی حد تک پابندی ہوئی تھی۔ مفصل غور و بحث کے لئے معقول مدت، زیرِ بحث موضوع سے متعلق مطالعے کے مواد کی فراہمی، تجربات کے میدانوں سے حاصل کئے ہوئے اعداد و شمار، متعلقہ موضوع کی تشریح و تعبیر کے لئے ماہرین کی تقریریں اور مقالات، سیمنار میں شریک ہونے والے ہر نمائندے کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کی کوشش اور سیمنار کی کارروائیوں کی رپورٹ میں اسے جگہ دینے کا اہتمام۔ غرض قریب قریب وہ سب کچھ جو سیمناری طریقۂ بحث کو کانفرنسوں اور مباحثوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اور یہ سیمناری طریقہ اتنا کامیاب اور نتیجہ خیز سمجھا گیا تھا کہ میسور کے ایشیائی سیمنار کے بعد سرکاری اور غیر سرکاری جو بھی ادارے تھے سب نے کانفرنسوں کے طریقے کو ترک کرکے سیمناری طریقہ اختیار کر لیا اور ملک میں کانفرنسوں کی جگہ سیمناروں کی بہار آ گئی۔

لیکن اِدھر کچھ عرصے سے کم سے کم انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے نیشنل سیمناروں کی صورتِ حال کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ انھیں سیمنار کہنے میں بھی تکلف ہوتا ہے۔ گذشتہ سال گجرات نیشنل سیمنار کی مدت پانچ دن مقرر کی گئی تھی مگر وہ ساڑھے تین ہی دن میں ختم ہوگیا۔ اس سال کوئمبٹور سیمنار کی مدت   دن مقرر کی گئی تھی

اور دو ڈھائی دن سے کم مدت میں ختم ہو گیا۔ اب تک قاعدہ چلا آرہا تھا کہ آخری دن، سیمنار کے ڈائرکٹر کی رپورٹ پیش ہوتی تھی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ تمام گروپوں کا نقطۂ نظر اس میں آگیا ہے یا نہیں تاکہ اس کی بنیاد پر جب مفصل رپورٹ مرتب کی جائے تو یہ اطمینان ہو کہ اگر تمام نمائندوں کے نقطۂ نظر نہیں تو کم سے کم گروپوں کے نقطۂ نظر تفصیل سے دیئے جائیں گے۔ اس سال ڈائرکٹر کی رپورٹ کے پیش ہونے کی بھی نوبت نہیں آئی اور نہ ورکنگ پیپر کے عنوانات کے مطابق گروپوں کی مجموعی رپورٹیں ہی پیش ہو سکیں۔

کانفرنسوں کے طریقے کو ہم نے جن اسباب کی بنا پر چھوڑا تھا ان میں ایک سبب یہ بھی تھا کہ کانفرنسیں ایک دن یا حد سے حد دو دن میں ختم ہو جاتی ہیں اور زیر بحث موضوع کے باب میں صرف انہی نمائندوں کی بات اوپر رہتی ہے جنھیں فراٹے سے بولنے اور ڈبیٹ کے فن میں مہارت حاصل ہوتی ہے یعنی کانفرنسوں کا طریقہ جمہوری طریقہ نہیں ہوتا۔ اگر کانفرنس کے طریقے کی یہ خامی تسلیم ہے تو انصاف سے بتایئے کہ ہمارے اس زمانے کے نیشنل سیمنار ان کانفرنسوں سے کس طرح مختلف ہیں۔ اگر مدت کے اعتبار سے دیکھئے تو اب کانفرنسیں بھی تین تین چار چار دن تک ہوتی رہتی ہیں۔ خود ہماری آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس پورے دو دن تک چلتی رہتی ہے۔ اگر زیر بحث موضوع کے بارے میں تمام نمائندوں کی عملی شرکت کے لحاظ سے دیکھئے تب بھی یہی نظر آتا ہے کہ جو نمائندے ذرا تیزی سے بول سکتے ہیں، انہی کی بات شریک رپورٹ کی جاتی ہے۔ اور جو لوگ کسی وجہ سے بول نہیں سکتے انھیں نہ بولنے اور اپنی بات کہنے کے لئے ابھارا جاتا ہے اور نہ ان کی بات کو انہی کی زبان میں سمجھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس سال تو گروپوں کی رپورٹوں کی بنیاد پر تیار کی ہوئی مجموعی رپورٹوں کی نوبت ہی نہیں آئی، مگر جب کبھی یہ مجموعی رپورٹیں پیش بھی کی جاتی ہیں تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسٹیرنگ کمیٹی میں جو رپورٹ منظور ہو گئی ہے، وہی جوں کی توں پاس ہو جائے۔ جہاں تک زیر بحث موضوع سے متعلق مطالعے کے مواد کی فراہمی اور ماہرین کے مقالات و تقاریر کا تعلق ہے، اس کا سلسلہ مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ اب تو اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کبھی کوئی مقام ایسا آن پڑتا ہے جس کے بارے میں واقفیت نہیں ہوتی تو اُسے بس نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

ان حالات میں اگر کوئی یہ سوچے کہ سیناری طریقۂ بحث کے آداب و اطوار تو کب کے چھوٹ گئے تھے، لے دے کے ایک مدت کا پہلو تھا — جس کے طفیل میں تحریک میں کام کرنے والے ساتھی کم سے کم جی بھر کر ایک دوسرے سے مل جل لیتے تھے اور اگر سیمنار کے پلیٹ فارم پر نہیں تو آپس کی نجی گفتگوؤں ہی میں تبادلۂ خیالات اور تجربات کی ادلا بدلی کر لیتے تھے — سو وہ بھی سال بہ سال مختصر سے مختصر تر ہوتی جا رہی ہے تو اب ان سے حاصل کیا!

تو انصاف کیجئے کہ آیا وہ غلطی پر ہے یا اس کے سوچنے کا انداز صحیح ہے؟ اور اگر ہم یہ کہیں کہ نیشنل سیناروں کی ابتدا چونکہ نقطۂ عروج سے ہوئی تھی اس لئے اس کی رفتار کا رخ زوال کی طرف ہونا قدرتی بات ہے تو آیا یہ کہنا نا رہا ہوگا؟ کیا یہ سوچنے کے لئے مواقع نہیں ہیں کہ ابتداء آٹھ دن کی مدت سے ہوئی تھی، وہ کم ہو کر سات دن ہوئی، پھر چھ دن، پھر پانچ دن، پھر چار دن، کیا اسی حساب سے یہ کم ہوتے ہوتے صرف ایک دن اور آخر میں صفر دن تک نہ پہنچ جائے گی؟

لیکن اگر ایک دن ان سیناروں کا حشر یہی ہونا ہے تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم ابھی سے اس موضوع پر غور کریں اور یہ فیصلہ کریں کہ ان سیناروں کا پوری تیاری کے ساتھ ہر سال منعقد ہونا نہ ممکن ہے نہ ضروری۔ اس لئے ان کے لئے ایک سال کا ٹائم ٹیبل نہ ہو بلکہ انہیں دوسرے تیسرے سال طلب کیا جائے اور جب طلب کیا جائے تو پوری تیاری کے ساتھ تاکہ موضوع سے متعلق غور و بحث کا پورا پورا حق ادا ہو جائے اور جو لوگ اس میں شریک ہوں وہ جب واپس جائیں تو یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اُن کے علم و یقین میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

سینار کے منتخب ڈائرکٹر شری بی ایس مہتا، چیف سکریٹری حکومت راجستھان کے شریک نہ ہونے کی وجہ سے بھی خاصی بے کیفی رہی اور ان کی غیر موجودگی سینار کی بحثوں کے دوران میں متعدد مقامات پر بُری طرح محسوس ہوتی تھی لیکن شکر ہے کہ یہ کمی ایسوسی ایشن کے صدر محترم ڈاکٹر موہن سنگھ مہتا کی موجودگی سے پوری ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر مہتا کی علمیت اور ہمہ دانی اور ایسوسی ایٹ ڈائرکٹر شری ایچ۔ پی سکسینہ کی مہارتِ خصوصی کی بدولت جو بھی دو ڈھائی دن بات چیت اور غور و بحث کے لئے نصیب ہو سکے، اُن میں عالمانہ ماحول قائم رہا اور نمایندوں کی طبیعتیں بدمزہ نہیں ہونے پائیں۔

بی۔ ایس۔ جی۔ اسکول آف سوشل ورک جس نے سینار اور کانفرنس کی میزبانی کی ذمّے داری قبول کی تھی، اس نے بہر حال میزبانی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ شری د اموددن جو بی۔ ایس۔ جی۔ چیریٹی انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہیں اور مجلسِ استقبالیہ کے صدر تھے، انھوں نے اور ان کے ساتھیوں خصوصاً سکریٹری جنرل شری کرشنا مورتی اور ان کے مددگار ڈاکٹر پلے اور ان کے طالب علموں نے نمایندوں کے لئے آرام و راحت کا اہتمام کرنے میں دن اور رات کا فرق نہیں کیا۔ انسٹی ٹیوٹ کے کالج آف ٹکنالوجی کا محل نما ہوسٹل نمایندوں کی رہائش کے لئے پورا کا پورا وقف کر دیا گیا تھا، چنانچہ ہر نمایندے کے لئے الگ الگ کمرے الاٹ کئے گئے تھے۔ کھانے اور ناشتے کا انتظام نہایت معقول تھا اور اہتمام یہ تھا کہ شمالی ہند کے نمایندے بھی جب تک کوئمبتور میں رہیں، اپنے آپ کو کم سے کم ایک ہفتے کے لئے عملاً جنوبی ہند کے باشندے تصور کر لیں۔

ہم پی۔ایس۔جی چیریٹی انسٹی ٹیوٹ کی مخلصانہ مہمان نوازی کے لئے ان کے ممنون ہیں اور انہیں اس کے لئے دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

قومی یک جہتی

جمہوری نظام اور قومی یک جہتی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اگر ریاست کے جمہوری نظام کے ساتھ قوم میں انتشار ہو اور اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ کی کیفیت برپا ہو تو سمجھ لینا چاہئیے کہ یا تو جمہوری نظام میں کہیں کوئی نقص ہے یا پھر خود قوم کے جسم میں کہیں نہ کہیں کوئی ناسور رس رہا ہے۔ غالباً اسی کیفیت کا احساس کر کے پچھلے دنوں وزیر اعظم پنڈت نہرو نے قومی یک جہتی کانفرنس کے نام سے ملک کی تمام مقتدر سیاسی پارٹیوں کا ایک جلسہ طلب کیا تھا اور ہمیں بڑی مسرت ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ جلسے میں شریک ہونے والی تمام سیاسی پارٹیوں نے یک زبان ہو کر قومی اتحاد و یک جہتی کے اصول کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ملک کے سیاسی معاملات میں قول و فعل کا ایک دستور العمل اتفاق رائے سے منظور کیا اور اس پر عمل کرنے کا عہد کیا۔

لیکن کیا اگر کوئی بچہ اپنے والدین یا کسی اور برگزیدہ بزرگ کے سامنے یہ عہد کرلے کہ وہ ہمیشہ ادب و تہذیب کے دائرے کے اندر رہ کر عمل کرے گا تو اس کا یہ عہد کر لینا کافی سمجھا جائے گا؟ اور یہ قول دے دینے کے بعد اس کے لئے ضروری نہ ہوگا کہ اس کے دل و دماغ کی تربیت کے لئے اُسے کسی ماہر مربّی اور استاد کے زیر نگرانی مدرسے میں بٹھایا جائے؟ اور اُس وقت تک اُس کی تعلیم و تربیت کی جائے جب تک اس کی سمجھنے بوجھنے، فیصلہ اور کام کرنے کی تمام قوتیں پورے طور پر نشوونما نہ پا جائیں اور وہ وہاں سے تہذیب و تمدّن کا جیتا جاگتا نمونہ بن کر نہ نکل آئے؟

کانفرنس میں قومی یک جہتی کو بروئے کار لانے کے لئے جو فیصلے ہوئے، اُن کے پیش نظر عقل حیران ہے کہ یہ کیا ہوا کہ اُدھر ابھی اس کانفرنس کی روشنائی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ اِدھر فرقہ وارانہ فسادات کی نحوست ایک بار پھر ہمارے سروں پر مسلط ہو گئی، اور ہمارے رہنماؤں کی گردنوں کو مہذب دنیا کے سامنے ندامت سے جھک جانا پڑا۔

قومی یک جہتی کے باب میں ہمیں معاف کیا جائے اگر ہم یہ کہیں کہ قومی انتشار کے علاج کی تلاش میں ہم قانون اور سیاست کے مطب میں تو بار بار حاضری دیتے ہیں اور یہ حکمائے بعد دیگرے مختلف نسخے تجویز کرتے رہتے ہیں لیکن اس عیب ہم نے اب تک ارادہ اور اہتمام کرکے تعلیم کے مطب کی طرف غالباً رخ بھی نہیں کیا۔ علاج معالجے کے باب میں

قاعدہ یہ ہے کہ اگر ایک طبیب طویل مدت تک علاج کرتے رہنے کے باوجود بیمار کو اچھا کرنے میں کامیاب نہ ہو تو اس کا علاج تبدیل کر کے کسی دوسرے ماہر سے رجوع کیا جاتا ہے۔ لیکن پورے چودہ سال ہو گئے، ہم نے قانون اور سیاست کا مطب چھوڑ کر قومی انتشار کے علاج کے لئے تعلیم کا دامن اب تک نہیں پکڑا حالانکہ دیکھ چکے ہیں کہ مہذب دنیا میں جہاں کہیں بھی اس کی ضرورت پیش آئی ہے، لوگوں نے تعلیم ہی کا دامن تھاما ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تعلیم کا تجویز کیا ہوا نسخہ اثر کے اعتبار سے سست رو ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں قانون کا نسخہ انجکشن کا حکم رکھتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ انجکشن یا اسپرو قسم کی گولیاں تکلیف کو بس تھوڑی دیر ہی کے لئے رفع کرتی ہیں یا اس کے بدلے یہ ہوتا ہو کہ تکلیف ایک جگہ سے ہٹ کر کسی دوسرے مقام پر اپنا گھر بنا لیتی ہے یا اپنا روپ تبدیل کر کے کسی دوسرے مرض کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ تعلیم کا نسخہ اس کے برعکس تکلیف کے سبب پر اپنا وار کرتا ہے اور خواہ دیر ہی میں سہی، ایک بار جب مرض کی جڑ کٹ گئی تو اس کے بعد صحت و شفا کا ظہور اپنے آپ ہونے لگتا ہے۔

ہمارے نظام قومی کو جو مرض لاحق ہے اس کے متعلق ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کوئی موسمی پھوڑا پھنسی یا بخار نہیں ہے جو کسی مقامی لیپ یا دافع درد گولی سے چلا جائے گا۔ یہ بہت پرانا مرض ہے اور جب تک تعلیم کے عمل سے اس کی جڑ کو ختم نہیں کیا جائے گا اس کے عواقب ختم نہیں ہوں گے۔

پنچایتی راج میں

سوشل ایجوکیشن کا نیا منصب

ہندوستان میں اڈلٹ ایجوکیشن کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو اس کے تین دور صاف نظر آتے ہیں۔ ملک کی آزادی سے پہلے کا دور جب اُس کا منصب صرف ان پڑھ بالغوں کو خواندہ بنانا تھا اور وہ بھی بڑے اور وسیع پیمانے پر نہیں بلکہ اُسی حد تک جتنا غیر سرکاری اور رضاکار جماعتوں کے مقدور میں تھا (اس لئے کہ حکومتِ وقت کو بالغوں کی تعلیم سے کوئی لگاؤ نہ تھا) اسی دور میں اڈلٹ ایجوکیشن کو محض اس کے اس منصب کی بنیاد پر "خواندگی کی تعلیم" کا لقب ملا۔ دوسرا دور ملک کی آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے جب اس کے منصب میں اور وسعت پیدا ہوئی اور اسے سوشل ایجوکیشن کے نام سے یاد کیا گیا (اس دور میں اس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ لوگوں کو نئے آزاد سماج کے نہری کی حیثیت سے زندگی گذارنے کی تعلیم دے۔ اس مطالبے میں بھی اتنی شدت تھی کہ اڈلٹ ایجوکیشن کا نام شہریت ی تعلیم پڑ گیا اور یہی نام اب تک قائم ہے۔

اب ملک میں پنچایتی راج کے رواج کے ساتھ ساتھ اڈلٹ ایجوکیشن کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ میرے ال میں یہ دور اسے اس کا اصلی مقام اور منصب عطا کرے گا اور اس کے لئے اسے تیار رہنا چاہیئے ورنہ سکتا ہے کہ "زبان خلق" کے اثر سے وہ اپنی گم کردہ راہی کو "نقارۂ خدا" سمجھ بیٹھے اور اسی گم کردہ راہی کو یا فلسفۂ وجود قرار دے لے۔

اِس تیسرے دور کے آغاز سے شکر ہے، اڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک کے رہنما بھی غافل نہیں ہیں چنانچہ انہوں بروقت اس موضوع پر بحث کرنے کی غرض سے اپنا اجتماع کر لیا۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں اس اجتماع نیشنل سیمنار) میں بحث ابھی تشنہ رہی ہے اور ضرورت ہے کہ تحریک سے تعلق رکھنے والے اہلِ فکر مزید غور و

فکر کریں تاکہ اس دور کی مطابقت سے اڈلٹ ایجوکیشن کا یہ صحیح منصب ذہنوں میں صاف ہو جائے۔

پنچاتی راج کے مطالبے

اڈلٹ ایجوکیشن کے اس نئے منصب کا خاکہ بنانا آسان ہو جائے گا اگر ہم پہلے یہ دیکھ لیں کہ پنچاتی راج کے دور کے اس کے اوپر مطالبات کیا ہیں اس لئے کہ جب تک ضرورت نہ معلوم ہو اس کی تکمیل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

۱۔ بالغوں کی خواندگی : اس بات سے کوئی ہوش مند انسان انکار نہیں کرسکتا کہ جب تک انسان لکھنا پڑھنا نہ جان لے، اس کے اوپر علم و تہذیب کے دروازے نہیں کھل سکتے۔ کام کرنے اور زندگی گذارنے کا جمہوری طریقہ، سب کو معلوم ہے، نئی تہذیب کا تقاضا ہے، کہا جاتا ہے، اور بڑے زور شور سے کہا جاتا ہے کہ عقل مندی اور سمجھ داری کے لئے انسان کا خواندہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر اس نظریے کو مان بھی لیا جائے تو موجودہ ہندوستان کو پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ناخواندہ شخص کی عقل مندی اور سمجھ داری کی بنیاد اُن روایات و اقدار پر ہوگی جو جاگیردارانہ اور سامراجی نظام میں رائج تھیں۔ جمہوریت کی روایات و اقدار کا جب ہمارے موجودہ بالغوں کو پتہ ہی نہیں ہوگا تو ان معاملات میں اُن کی عقل مندی اور سمجھ داری کا کیا سوال!

اس مطالبے کی شدت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگر پچاس سال سے اوپر کی عمر کے بوڑھوں کو نظرانداز بھی کردیا جائے تب بھی خصوصاً گاؤوں میں اٹھارہ سے پچاس سال کی درمیانی عمر کے اَن پڑھ بالغوں ہی کی اکثریت ملتی ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جنھیں پنچایتی راج کے ادارے سونپے جائیں گے۔ اس حالت میں ہم یہ سوچ کر بھی اطمینان نہیں کرسکتے کہ "بالغوں کا کیا ہے، وہ تو چند دن میں زندگی سے مستغنی ہو جائیں گے۔ اصل مسئلہ ان کی جگہ لینے والی آیندہ نسل کا ہے"۔ آیندہ آنے والی نسل اگر حالات کے دباؤ سے اپنے لئے زندگی کی روایات و اقدار نئے سرے سے قائم کرنا چاہے تب بھی اس سے پہلے کہ نئی روایات قائم ہو جائیں، اُسے ایک عرصے تک اپنے باپ دادوں ہی کی روایات کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ ہماری موجودہ بالغ آبادی کی تعلیم و تربیت کی ضرورت اس نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے کہ اس کے اثر سے وہ اپنی آیندہ نسل کے لئے جمہوری زندگی کی نہایت صحت مند قدریں قائم کرسکیں۔

۲۔ سماجی یک جہتی اور جمہوریت کی عملی مشق : جس قوم کو ارادہ اور اہتمام کرکے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنا، آپس میں لڑنا جھگڑنا سکھایا

اور خود غرضی سکھائی گئی ہو اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ صرف کہنے سننے سے رات کی رات اپنا یہ شیوۂ زندگی بدل دے گی، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ لیکن اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ جب تک سماج میں یک جہتی نہ ہو، اُس وقت تک جمہوریت کا پودا برگ وبار نہیں لاسکتا۔ پنچایتی راج کے انتخابات میں جو افسوسناک واقعات دیکھنے میں آتے ہیں ان کا سب سے بڑا سبب یہی سماجی یک جہتی کا فقدان ہے۔ اور جب تک سماجی یک جہتی کا یہ فقدان باقی رہے گا اس قسم کے واقعات پیش آتے رہیں گے اور جمہوریت اپنا سر پٹختی رہے گی۔

مگر کیا سماجی یک جہتی صرف پنچایت راج قائم کردینے سے پیدا ہو جائے گی؟ اس سوال کا جواب میرے خیال میں نفی میں ہے۔ پنچایتی ادارے کا قیام ایک قانونی عمل ہے، اور سماجی یک جہتی صرف قانون کی کوشش اور وسیلے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ لوگوں کو جو اب تک ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے، سب کے بھلے کو بھاڑ میں ڈال کر صرف اپنے بھلے پر نظر رکھنے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دوسرے کا سر تک کاٹ لینے کے عادی رہ چکے ہیں اور اب تک ہیں، ان کو ایک دوسرے سے قریب لایا جائے، ایک دوسرے کے قریب رہنے بسنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں، اور اپنی بات کہنے اور اس سے زیادہ دوسروں کی بات صبر و سکون کے ساتھ سننے اور سمجھنے کی مشق کے لئے حالات پیدا کئے جائیں۔ دوسرے الفاظ میں ایسے حالات اور مواقع پیدا کرنے کی ضرورت ہے جہاں انھیں ہر چیز — اپنی شخصیت اپنی ذات برادری اور اس کے مقام و مرتبے غرض ہر چیز کو الگ رکھ کر صرف انسان اور انسانیت کا احترام کرنے کی عملی تربیت مل سکے۔

ایک شبہے کا ازالہ

میرے خیال میں پنچایتی راج کے یہ دو مطالبے بنیادی ہیں۔ اور بھی بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں لیکن وہ انہی دو مطالبوں کی تفصیلات ہیں اس لئے ہم ان تفصیلات میں نہ پڑ کر ان مطالبوں کی تکمیل کے مسئلے پر بحث کریں گے۔ مگر اس سے پہلے مناسب ہے کہ ایک شبہے کا ازالہ کر دیا جائے۔ جو تکمیل کی صورتیں تجویز کرنے کے وقت دماغوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔

میں نے مندرجہ بالا باتوں کو پنچایتی راج کے مطالبات قرار دیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ کیا یہی سب باتیں پنچایتی راج کے اس دور سے پہلے نہیں کہی جاتی تھیں؟ اگر کہی جاتی تھیں تو پنچایتی راج کے اس دور سے انھیں خاص

طور پر طے کرنے میں کیا مصلحت ہے۔

یہ سوال جس طرح اِن باتوں کے اوپر عائد ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح کومنٹو رنیشنل سیمنار کے ورکنگ پیپر کے ماتحت جو سوالات قائم کئے گئے تھے اُن کے اوپر بھی عائد ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ چونکہ ان سوالات کے بارے میں ہم ایک عرصے سے سوچتے اور فیصلے کرتے چلے آئے تھے اور ہمارے دماغ ایک خاص انداز میں سوچنے کے عادی ہوگئے تھے، اِس لئے اس مرتبہ بھی ہم نے اُن کے بارے میں الفاظ کے تھوڑے سے ہیر پھیر کے ساتھ وہی فیصلے کئے جواب سے پہلے کرتے آئے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو کومنٹو رنیشنل سیمنار کے فیصلوں میں کوئی نئی بات نہیں ملے گی اس لئے کہ جو سوالات قائم کئے گئے تھے، اُن میں بظاہر کوئی نیا پن نہیں تھا۔

ورکنگ پیپر کے اِن سوالات میں اور پنچایتی راج کے مطالبات کے ذیل میں اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں، اُن میں، ہم بھی کہتے ہیں، کوئی نیا پن نہیں ہے۔ نیا پن اُن کے اطلاق اور ایپلی کیشن میں ہے۔ پنچایتی راج کے نفاذ سے پہلے یہ باتیں پورے ملک کو خطاب کر کے کہی جاتی تھیں، اب اِن باتوں کا خطاب چھوٹی چھوٹی مقامی جماعتوں سے ہے۔ پہلے یہ باتیں کہنے والے اور ان پر عمل کرنے والے دوسرے لوگ ہوتے تھے، اب کہنے والے چاہے باہر کے دوسرے لوگ ہوں، مگر کرنے والے چھوٹے چھوٹے مقامی ادارے ہیں۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ پہلے یہ باتیں ہزاروں لاکھوں کے عام جلسوں میں کہی جاتی تھیں جن میں رام دین اور رحیم الدین موجود تو ہوتے تھے۔ مگر ان کی طرف انگلی اٹھا کر خاص ان ہی سے اُن پر عمل کرنے کی فرمائش نہیں کی جاتی تھی، اب رام دین اور رحیم الدین کا ہاتھ پکڑ کر اُن سے کہا جا رہا ہے کہ "یہ باتیں آپ کو اپنے گھر میں کر کے دکھانی ہیں"۔ نعمت پہلے بھی لٹائی جاتی تھی مگر اس طرح کہ ایک اونچی جگہ سے نیچے کو پھینک دی گئی، کسی کو ملی کسی کو نہیں، بہت سے لوگ یہ کہہ کر چپ بیٹھ گئے کہ "کون جائے اس بلوا میں پڑنے"، اب ہر شخص کا حصہ اُس کے گھر پر لے جا کر دیا جا رہا ہے اور اس سے کہا جا رہا ہے "لو یہ تمہارا حق ہے۔ اس کو اچھی طرح استعمال کرو گے تو فائدہ اٹھاؤ گے"، اور دیکھو، یہ تم کو لینا ہی ہے، اس سے تم انکار بھی نہیں کر سکتے!"

مذکورہ بالا باتوں میں یہ ہے وہ نیا پن جس کی طرف ان کے اوپر غور کرتے وقت ہماری نظریں نہیں گئی ہیں حالانکہ ہمیں اڈلٹ ایجوکیشن کے خدوخال کو حالات کے اسی نئے پن کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے تھا۔

اڈلٹ ایجوکیشن کے اوپر پنچایتی راج کے جو مطالبات بیان کئے گئے ہیں ان کی اہمیت اور نئے پن کو سمجھنے میں اب اس توضیح کے بعد آسانی ہوگی، اور ان مطالبات کو پورا کرنے کی جو صورتیں تجویز کی گئی ہیں ان کی صحت وسقم کے بارے میں زیادہ صحیح رائے قائم کی جا سکے گی۔

ان مطالبات کو پورا کرنے کی صورتیں

الف۔ بالغوں کی خواندگی

ا۔ خواندگی کے بجائے "خاتمۂ ناخواندگی"

ا۔ بالغوں کی خواندگی کے باب میں اب تک سوشل ایجوکیشن کی تحریک کا نعرہ "خواندگی پھیلاؤ" رہا ہے حالانکہ اب سے گیارہ بارہ سال پہلے اسی تحریک کے پلیٹ فارم پر (جبل پور میں) یہ بات صاف الفاظ میں طے ہو گئی تھی کہ "خواندگی کے پھیلاؤ" کے ذریعے ملک کے ماتھے سے ناخواندگی کا دھبّہ نہیں مٹایا جا سکتا۔ اسی نظریئے کی بنیاد پر وہاں فیصلہ کیا گیا تھا کہ سوشل ایجوکیشن کی تحریک کو "خواندگی پھیلاؤ" کی جگہ "ناخواندگی کو ختم کرو" کا نعرہ لگانا چاہیئے۔ پھر یہ فیصلہ ہی کر کے بات کو ختم نہیں کر دیا گیا تھا، بلکہ "خاتمۂ ناخواندگی" کا ایک ٹھوس پروگرام بھی پوری تفصیل کے ساتھ مرتب کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس فیصلے کے باوجود خود تحریک کی طرف سے "خواندگی پھیلاؤ" ہی کا نعرہ لگایا جاتا رہا چنانچہ اس سال بھی، یہ عجیب بات ہے کہ "آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کی قرارداد میں اسی نعرے کی تجدید کی گئی اور جب اس نعرے کے بے اثر ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی اور اُسے ترک کر کے "خاتمۂ ناخواندگی" کا نعرہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو اُسے صرف یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ یہ نگیٹیو اپروچ (منفی طرزِ فکر) ہے۔

لیکن تازہ ترین مردم شماری نے ثابت کر دیا ہے کہ "خواندگی پھیلاؤ" کا "پوزیٹیو اپروچ" (مثبت طرزِ فکر) کس قدر بے نتیجہ رہا ہے۔ یعنی گذشتہ دس سال میں خواندگی کے اوسط میں سالانہ ایک فی صدی کے اضافے کا بھی حساب نہیں پڑتا۔

خاتمۂ ناخواندگی کی تجویز پر گذشتہ بارہ سال میں غالباً کہیں تجربہ نہیں ہوا۔ میرے خیال میں اب تک اس کے اوپر عمل کا نہ ہونا ہی اب پنچایتی راج کے دور میں اس کے اوپر عمل ہو سکنے کا جواز ثابت کرتا ہے۔ اب تک اس کے اوپر عمل غالباً اس لئے نہیں ہوا کہ اس میں کام کے علاقے کا چھوٹا اور احاطہ بند ہونا شرط قرار دیا گیا تھا۔ پنچایتی راج سے پہلے اس شرط کا پورا ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ کام کرنے والی ایجنسی پہلے سوشل ایجوکیشن یا ایجوکیشن کا ریاستی محکمہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے لئے اس کام کی خاطر ریاست بھر میں، دو چار یا دس بیس علاقوں کو لینا اپنے اوپر فرق و امتیاز کا الزام مول لینا تھا۔ پھر کام کرنے والے باختیار حیثیت میں گاؤں یا بستی سے باہر ہی کے لوگ

ہو سکتے تھے جنھیں مقامی عوام کی ہمدردی اور تائید حاصل نہ ہوتی اور محکمے کے اوپر بے نتیجہ منصوبوں پر روپیہ صرف کرنے کا الزام آجاتا۔ لیکن اب جب کہ گاؤں پنچایتوں اور پنچایت سمیتیوں کو اپنے علاقے کی تعلیم کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی ہے ان رکاوٹوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں ہے جو راستے میں حائل ہو۔ گاؤں پنچایتوں کے با اختیار جماعت ہونے کی وجہ سے خاتمۂ ناخواندگی کے یونٹ کے چھوٹے اور احاطہ بند ہونے کی شرط پوری ہو جاتی ہے۔ اور کیونکہ پنچایت سمیتیوں کے ملازم ہوں گے اور پنچایت سمیتیاں ہی اس مہم کا فیصلہ کریں گی اس لئے گاؤں کی ہمدردی اور تائید حاصل نہ ہونے کا بھی اندیشہ نہیں رہے گا۔ پنچایت سمیتیوں کا علاقہ ایسا ہے کہ عموماً ہر گاؤں دوسرے گاؤں سے واقف ہوتا ہے اس لئے پنچایت سمیتی پورے علاقے میں گاؤں کو ایک ساتھ نہ لے کر دو دو چار چار گاؤں کو باری باری سے لے لیا کرنے سے اس کے اوپر فرق (امتیاز) یا پاسداری کا الزام بھی نہیں آئے گا۔

یہ وہ امکانات ہیں جو صرف پنچایتی راج کے نفاذ نے پیدا کئے ہیں اور جب کامیابی کے امکانات موجود ہوں تو ان کی موجودگی میں خاتمۂ ناخواندگی کی مہم کو شروع کرنے میں پس و پیش کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ میرے خیال میں خواندگی کے سلسلے میں سوشل ایجوکیشن کو اپنا پرانا اور بے نتیجہ نعرہ بدل کر خاتمۂ ناخواندگی کا نعرہ اختیار کرنے کا یہ سنہرا موقع ہے اور اگر اس موقعے کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دیا گیا تو ڈر ہے کہ ناخواندگی کی اندھیری رات اور طویل ہو جائے گی اور خواندگی کی صبح کا نہ جانے کب تک انتظار کرنا پڑے۔

یہ بات میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس تمام بحث میں جہاں کہیں خواندگی کا لفظ آیا ہے اُس سے خواندگی کا وہ معیار مراد ہے جسے عام اصطلاح میں کار آمد خواندگی (فنکشنل لٹریسی) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور جبل پور کی تجویز میں وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ خاتمۂ ناخواندگی کی مہم سے جو خواندگی حاصل ہوگی وہ کار آمد خواندگی ہوگی حروف شناسی والی خواندگی نہیں ہوگی۔

۲۔ مزید ناخواندگی کی روک تھام

بعض اوقات خواندگی کی صلاحیت مشق اور استعمال کی کمی کی وجہ سے پھر ناخواندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ناخواندگی کا اوسط جوں کا توں اپنی پہلی حالت پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی علاقے میں خاتمۂ ناخواندگی کی مہم تو چلائی جائے مگر بچوں کی لازمی تعلیم کا بندوبست نہ کیا جائے تب بھی کچھ فائدہ نہیں اس لئے کہ پھر بچے اچھی خاصی تعداد میں اسکول کی تعلیم سے محروم رہ کر ناخواندگی کی تعداد میں تقریب قریب اتنا ہی اضافہ کر دیں گے جسے

ناخواندہ سے خواندہ بنایا گیا ہے۔ اسی اندیشے کو مدنظر رکھتے ہوئے جبل پور کی تجویز میں زیرِ جم علاقے کے اندر لازمی ابتدائی تعلیم کو بھی شرط قرار دیا گیا ہے۔

اس لئے اگر پنچایت سمیتی کے گاؤں میں خاتمۂ ناخواندگی کی مہم چلائی جائے تو اس کے ساتھ ہی بچوں کے لئے لازمی ابتدائی تعلیم کا بندوبست بھی کرنا ہوگا تاکہ ناخواندگی کے مکمل خاتمے کے بعد اس کے از سرِ نو پھوٹ پڑنے کا اندیشہ نہ رہ جائے۔

۳۔ تسلسلی تعلیم کا انتظام

لیکن لازمی ابتدائی تعلیم سے اگرچہ ناخواندگی کا آگے کا راستہ یقیناً بند ہو جائے گا تاہم چھ سے گیارہ سال کے درمیان بچوں کو جو نصاب پڑھایا جائے گا اس سے یہ امید نہیں ہو سکتی کہ ان کی قابلیت کار آمد خواندگی (فنکشنل لٹریسی) کے معیار کی ہوگی، اور جب وہ بالغ ہو کر زندگی میں قدم رکھیں گے تو یہ ابتدائی پنج سالہ تعلیم اُن کے کام کی ثابت ہوگی۔ اس لئے ہونا تو یہ چاہیے کہ لازمی ابتدائی تعلیم کی مدت گیارہ کے بجائے چودہ سال کی عمر تک بڑھا دی جائے اور اس کے بعد اٹھارہ سال کی عمر تک طلباء کو تسلسلی کلاسوں (کانٹی نوئیشن کلاسیز) میں جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھی پابند کیا جائے۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو، جیسا کہ تیسرے پنج سالہ پلان کے تیور سے معلوم ہوتا ہے، تو یہ بھی غنیمت ہے کہ گیارہ سال تک کی لازمی تعلیم کے بعد چودہ سال تک تسلسلی تعلیم کو بھی لازمی قرار دیا جائے۔

میرے خیال میں اب جب کہ ابتدائی تعلیم کا انتظام پنچایت سمیتیوں کے سپرد ہے اِس تسلسلی تعلیم کو بچوں کے لئے لازمی بنانا آسان ہوگا، اس لئے کہ پنچایت سمیتی اور گاؤں پنچایت مل کر استاد، طالب علم اور سرپرست تینوں کے دبر اگر قانونی نہیں تو وہ مقامی سماجی دباؤ تو ڈال ہی سکتے ہیں جس کے لئے ہماری قدیم پنچایتیں مشہور رہیں اور چونکہ یہ دباؤ حصولِ تعلیم جیسے نیک کام کے لئے ہوگا اِس لئے اُس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی بھی کسی کو آسانی سے جرأت نہ ہوگی۔

ب۔ سماجی یک جہتی اور جمہوریت کی مشق

۔ ہر پنچایت سمیتی میں ایک لوک ہائی اسکول

سماجی یک جہتی اور لوگوں ــــ مختلف ذاتوں اور طبقوں کے لوگوں کو بہ یک وقت ـ ایک دوسرے سے قریب لانے کا عملی طریقہ اس سے زیادہ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگوں کو کچھ عرصے کے لئے ـ تین چار پانچ مہینے تک ــــ چوبیسوں گھنٹے ایک ساتھ رہنے سہنے کا موقع نکالا جائے۔ عام تجربے کی بات ہے کہ مہینے دو مہینے کی بات تو الگ رہی، اگر کوئی دو آدمی دس بارہ گھنٹے ریل کے سفر میں ساتھ رہ لیتے ہیں تو ان میں اتنی یگانگت پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر کبھی کہیں اتفاق سے مل جاتے ہیں تو نہایت سرگرمی سے مصافحہ اور بعض اوقات معانقہ تک کرتے ہیں۔ ان تجربات اور ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں کی زندۂ جاوید تحریک کی موجودگی میں قوم میں سماجی یک جہتی کو بروئے کار لانے کے لئے فوک ہائی اسکول (جنتا کالج) کے استعمال کی وکالت میں ہم اور کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ پنچایتی راج کے قائم ہو جانے کے بعد اس سلسلے میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اس باب میں بھی انتظامی علاقے کا چھوٹا اور مقامی بن اُسی طرح مفید اور کارآمد ہوگا جیسے خاتمۂ ناخواندگی کے سلسلے میں۔ یہ تجربہ جواب تک ناکام رہا ہے اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ جنتا کالج ریاستی محکمۂ تعلیم کے اہتمام میں قائم ہوتے تھے جہاں کام کی کارروائیاں کم اور دفتری کارروائیاں زیادہ ہوتی ہیں، جہاں سب کام کی بنیاد قانون اور ضابطہ ہوتا ہے، انسان کے آپس کے تعلقات کا دخل سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ ریاستی محکمے کو پوری ریاست کا مفاد پیشِ نظر ہوتا ہے اور اس مصلحت کے پیشِ نظر بہت سے مفید کام صرف اس لئے ملتوی کر دیئے جاتے ہیں کہ اگر ہو تو سب کے لئے ہو، ورنہ بہتر ہے کہ کسی کے لئے نہ ہو۔ پنچایت سمیتوں کے راستے میں یہ رکاوٹ کم سے کم نہیں ہے۔ انھیں اپنے اپنے علاقے میں ایسا صرف ایک ادارہ قائم کرنا ہوگا۔ جو وہ آسانی سے قائم کر سکتی ہیں۔

اُن کے راستے میں زیادہ سے زیادہ جو رکاوٹ آسکتی ہے وہ یہ سوال ہے کہ بہ یک وقت کم سے کم پچاس آدمیوں کے چار پانچ مہینے تک رہنے سہنے اور کھانے پینے کا انتظام کہاں سے ہوگا اور ایسے معلّم کہاں سے آئیں گے جو ان بالغوں کو اپنے تجربوں، اپنی شخصیت اور اپنی تعلیم سے متاثر کر سکیں۔ میرے خیال میں اگر پنچایت سمیتی کام کرنے پر تل جائے تو یہ دونوں رکاوٹیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ رہنے سہنے کے لئے چھپر کی چھت والا ایک سادہ سا مکان اور ایک کنواں پنچایتی گاؤں کی مدد سے آسانی سے بن سکتا ہے۔ رہا کھانے پینے کا سوال تو وہ اس طرح حل ہو سکتا ہے کہ جو طالب علم آئے اس سے فرمائش کی جائے کہ وہ مہینے مہینے یا ہفتے ہفتے اپنے کھانے پینے کا سامان (آٹا، دال، چاول، اچار، نمک وغیرہ) اپنے گھر سے لا کر اسکول کے مشترک بھنڈار میں جمع کر دے۔ اور جو کچھ کمی رہ جائے اُسے پنچایت سمیتی اپنے فنڈ سے پورا کر دے۔

معلموں کے میسر آنے کا سوال بھی اس طرح حل ہو سکتا ہے کہ تقریباً گاؤں کے علاقے میں دو چار درس پڑھے لکھے اور تجربہ کار آدمی ایسے ضرور ہوں گے جو اپنی ملازمتوں سے ریٹائر ہو کر گھر آ رہے ہوں۔ ان میں استاد بھی ہوں گے، انتظامی افسر بھی، ڈاکٹر بھی اور دنیا کے ملکوں کی خاک چھانے ہوئے فوجی سپاہی بھی۔ ان میں سے منتخب لوگوں سے پنچایت سمیتی اور گاؤں پنچایتیں فرمائش کر سکتی ہیں کہ وہ گھر پر بیٹھے بیٹھے حقہ پینے کے بجائے لوک اسکول ہی میں بیٹھ جایا کریں۔ ان کے ذمے بس اتنا کام ہو کہ وہ طالب علموں کے ساتھ گھل مل کر اٹھیں بیٹھیں، انہی کے ساتھ کھائیں پئیں، تفریح کریں۔ زندگی کا تجربہ رکھنے والے ان بزرگوں کا لوک ہائی اسکول کے جوان طالب علموں کے ساتھ اتنا ربط ضبط بھی ان کی تربیت کے لئے بہت غنیمت ہوگا۔ رہا تعلیم کا کام تو وہ انہی بزرگوں میں سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں، علاقے کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے استادوں اور کبھی کبھی ریاستی اور قومی شہرت رکھنے والے لیڈروں کے لیکچروں کے ایک سلسلے کے ذریعے پورا کیا جا سکتا ہے۔

مگر ہاں ہر اسکول کے لئے یونیورسٹیوں کے رجسٹرار کی طرح کے ایک کل وقتی انتظامی استاد کی بہرحال ضرورت ہوگی جس کی تنخواہ کا انتظام پنچایت سمیتی کے لئے مشکل نہیں ہونا چاہیے۔

۲۔ دو دو تین تین گاؤوں کے بیچ میں ایک ایک گرام بھون

ان گرام بھونوں (کمیونٹی سینٹروں) کی حیثیت وہی ہوگی جو عام طور پر چوپالوں کی ہوتی ہے۔ اچھا تو یہ ہوگا کہ اس طرح کے گرام بھون ہر گاؤں میں ہوں اور گرام پنچایت کے ادارے نہ ہو کر خالصتہً گاؤں کے لوگوں کے اپنے آزاد ادارے اور گاؤں کی پوری سماجی زندگی کا مرکز ہوں۔ لیکن شاید ہمارے گاؤوں کی موجودہ اقتصادی اور سماجی صورتِ حال ابھی کچھ عرصے تک ہر گاؤں کو اس کی اجازت نہ دے۔ اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی سی حیثیت کے دو دو تین تین گاؤوں کی پنچایتیں مل کر گاؤوں کے کسی مرکزی مقام پر ایک ایک گرام بھون بنوا دیں اور جب تک لوگوں کا سماجی شعور اتنا بیدار نہ ہو جائے کہ وہ اپنی خوشی اور مرضی سے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں اس وقت تک پنچایتوں ہی کی ایک سب کمیٹی انہیں اپنی ملکیت میں رکھے، اور ان کا انتظام کرے۔

ان گرام بھونوں میں گاؤں یا گاؤوں کے تمام صحت مند سماجی گروہوں کے جمع ہونے، اپنی تقریبیں منانے اپنے گروہوں کی انتظامی اور کاروباری میٹنگیں کرنے، باراتوں اور مہمانوں کو ٹھہرانے، غرض ہر بات کی نہ صرف آزادی ہو، بلکہ ان گروہوں کو ان کاموں کے لئے ابھارا جائے۔ اگر گاؤں کے سب لوگ یا کوئی ایک گروہ یا پارٹی ان

گرام سبھاؤں میں جمع ہو کر گاؤں پنچایت یا پنچایت سمیتی کے عام طرزِ عمل یا کسی فیصلے کے خلاف آواز بلند کرنا چاہے تو گاؤں پنچایت یا پنچایت سمیتی کو اس پر بھی اعتراض نہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ جمہوریت کی عملی مشق کے یہی طریقے ہوتے ہیں اور اگر انہیں ابھارنے کے بجائے ان کو دبایا جائے گا تو پنچایتی راج کے ذریعے عوام میں جمہوریت کی روح پھونکنے کا جو خواب دیکھا گیا ہے، اس کے پورا ہونے کا امکان خطرے میں پڑ جائے گا۔

ایک اہم سوال

میں نے مندرجہ بالا پر وگرام کو اڈلٹ ایجوکیشن کا نیا منصب قرار دیا ہے جو میرے خیال میں پنچایتی راج کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ گاؤں پنچایتیں اور پنچایت سمیتیاں ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ خود ان تقاضوں کو سمجھ سکیں اور انہیں پورا کرنے کی صورتوں پر عمل پیرا ہو سکیں۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پنچایتیں اور پنچایت سمیتیاں اس قابل ہیں ہی نہیں تو پھر یہ سب کچھ ہوگا کیسے اور اسے کرے گا کون ؟

یہ بڑا بنیادی سوال ہے اور اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بہرحال ایک امکان یہ نظر آتا ہے کہ اگر بی ڈی او صاحبان جو پنچایتی راج کے نئے انتظام کے ماتحت پنچایت سمیتیوں کے اعلیٰ انتظامی افسر ہوں گے وہ اپنے آپ کو افسر کے بجائے معلم تصور کریں اور گرام پنچایتوں اور پنچایت سمیتیوں کے ممبروں کو یہ ضرورتیں اور تدبیریں جتلاتے رہیں جو ان (ممبروں) کے ذہنوں میں ابھی ایک عرصے تک شاید اپنے آپ نہ آسکیں گی۔ تو وہ بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔

لیکن یہاں پھر وہی اڑچن سامنے آتی ہے کہ بیس تیس سال کے ایک نوجوان بی ڈی او کے لئے آیا یہ ممکن ہوگا کہ وہ تیس تیس چالیس چالیس اور ۵۰۔۵۰ سال کے بزرگوں پہ اثر ڈال سکے ؟ میرے خیال میں یہ اسی وقت ممکن ہے جب بی ڈی او یا تو علمی مرتبے کے اعتبار سے بہت اونچا ہو یا پھر وہ خود بھی چالیس پچاس سال کا پختہ کار بزرگ ہو۔

کیا ڈیولپمنٹ ڈپارٹمنٹ کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ پنچایت سمیتیوں کے ماتحت کام کرنے کے لئے ایسے بی ڈی اوز کا انتخاب کرے جو اگر نوجوان ہوں تو ان کا علمی معیار کافی بلند ہو یا پھر وہ کم سے کم چالیس پینتالیس سال کی عمر کے ہوں

قومی یک جہتی

اڈلٹ ایجوکیشن کا نیا فریضہ

ذیل میں ہم اٹھارویں آل انڈیا اڈلٹ ایجوکیشن کانفرنس کے صدر منتخب پروفیسر این۔ اے نکم کا خطبۂ صدارت پیش کر رہے ہیں جو موصوف نے کانفرنس کے کوئمبٹور کے اجلاس میں پڑھا تھا پروفیسر نکم میسور یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں اور فلسفے کے ایک ممتاز عالم۔

پروفیسر صاحب نے قومی یک جہتی کے لئے جد و جہد کرنا اڈلٹ ایجوکیشن کا نیا منصب قرار دیا ہے اور ہندوستانی تمدن کی فلسفیانہ تعبیر کر کے واضح کیا ہے کہ قومی یک جہتی ہمارے ملک کے لئے کوئی نیا نعرہ نہیں ہے بلکہ خود ہمارے تمدن میں اس کی روح موجود ہے۔

——— ایڈیٹر

میں ڈاکٹر موہن سنگھ مہتا اور انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے دوسرے عہدہ داروں کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے اس کانفرنس کی صدارت کا اعزاز بخشا۔ ایسوسی ایشن گذشتہ ۲۳ سال سے قائم ہے اور اس نے نہایت عمدہ کام کئے ہیں۔ اڈلٹ ایجوکیشن کے متعدد پہلوؤں پر اس سے پہلے اس کانفرنس کے صدر بحثیں بھی کرتے رہے ہیں۔

ہمیں اڈلٹ ایجوکیشن کے باب میں اب نظریات کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس اڈلٹ ایجوکیشن کے ایک باضابطہ پروگرام، ایک پالیسی کی ضرورت ہے جس کے مطابق قومی پیمانے پر عمل ہو سکے، اس لئے اب ہمیں "خواندگی" اور "تعلیم" کے درمیان ایک فلسفیانہ لائن کھینچنے پر زیادہ وقت نہیں صرف کرنا چاہیئے۔ اڈلٹ ایجوکیشن "خواندگی" سے

دسیع تر [illegible] "تعلیم" پر دگمنڈے سے مختلف اور متاثر۔

اگرچہ اب ہم نے سیاسی معاملات میں بھی جمہوریت کو اپنایا ہے لیکن تہذیب کی بنیادی قدریں ہمیشہ سے جمہوری رہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے فرد (پُرودشا رتھ) کی تعلیم کو سب سے زیادہ قابلِ قدر مانا ہے اور ہمارے تعلیمی فلسفے کی رُو سے فرد کی تعلیم وہ تعلیم ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ اِس اعتبار سے انڈین اڈلٹ ایجوکیشن کی کتاب کا عنوان "دوام کی راہ پر" (ON TO ETERNITY) نہایت بامعنی اور برمحل عنوان ہے۔

ایک جمہوری طرز کی حکومت کا سب سے اہم فریضہ قانون سازی اتنا نہیں ہے جتنا تعلیم ہے۔ افلاطون نے اپنی تصنیف "ریاست" میں کہا تھا کہ "اگر کوئی جماعت بخوبی تعلیم یافتہ ہو تو قانون سازی غیر ضروری ہے لیکن اگر اس کی تعلیم ناقص ہو تو قانون بے فائدہ ہے"۔

ہمارے ملک کے سامنے جو اہم مسائل ہیں، ان میں ایک مسئلہ ایک مسلسل نظامِ تعلیم کی ضرورت بھی ہے وہ تعلیم جو جمہوریت کی نشوونما کرے اور اس طرح جو جمہوریت وجود پذیر ہوگی اس کا منصب ہوگا (الف) قومی یک جہتی (ب) عالمی امن (اور (ج) ایک ایسے نظامِ تعلیم کا قیام جو لوگوں کو بدلے ہوئے سماجی معاشرے سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے ذرایع فراہم کرے مگر اسی کے ساتھ اس کا بھی اہتمام کرے کہ ہمارے فلسفے، ہمارے مذہب اور ہمارے تمدن کی بنیادی اخلاقی قدریں ہم آہنگی کے اس عمل میں گُم نہ ہونے پائیں۔

یونیسکو کے دستور کا بیان ہے کہ "چونکہ جنگیں انسانوں کے دماغوں میں شروع ہوتی ہیں اس لئے امن کے مورچے بھی انسانوں کے دماغوں ہی میں جمائے جانے چاہئیں"۔ اگر ہمیں انسانوں کے دماغوں تک رسائی حاصل کرنی ہے تو اس کا واحد ذریعہ صحیح قسم کی تعلیم ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ کسی جماعت کا کوئی بھی شخص اس تعلیم سے جو وہ حاصل کر چکا ہے یا حاصل کر رہا ہے، نہ مطمئن ہے نہ کبھی مطمئن ہو سکتا ہے۔

تعلیم وہ بڑی سے بڑی دولت ہے جو کسی انسان کو حاصل ہو سکتی ہے اور یہی وہ دولت ہے جو کبھی کھو نہیں سکتی۔ لیکن چونکہ تعلیم غلط سمت بھی اختیار کر سکتی ہے اس لئے ہمیں اس کی طرف سے ہوشیار اور چوکس رہنا چاہیئے۔ اس اعتبار سے تعلیم ہی ایک ایسا مضمون ہے جس میں کسی درجے کی بھی مہارت کامل نہیں ہو سکتی۔ تعلیم وہ چیز ہے کہ اس کا ہر شخص سے اور ہر شخص کا اس سے تعلق ہوتا ہے، لہٰذا عملاً ہم میں سے ہر شخص تعلیم کی اصلاح میں مصروف رہتا ہے۔ اور کوئی تعلیمی نظام کیوں نہ ہو اس کی مسلسل اصلاح کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ تعلیم ایک عمل ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا، اور تعلیم کا منشا یہ ہونا چاہیئے کہ فرد کی تربیت اس طرح کرے کہ اُسے انسانی دماغ کے لچک دار اور تغیر پذیر ہونے کی فطری صلاحیت سے انکار

نہ ہو۔ اُپنشدوں میں "بے علمی" (اَوِدیا) اور "علمیت" (وِدیا) کے درمیان فرق بتایا گیا ہے۔ اُپنشدوں کے سیاق و سباق کے اعتبار سے ان دونوں لفظوں سے جو کچھ بھی معنی لئے گئے ہوں میرے نزدیک اس اعتبار سے کہ تعلیم ایک جاری رہنے اور نت نئی شکلیں بدلنے والا عمل ہے' وہ شخص جو اپنے اندر باطنی روشنی پیدا کرنے کے لئے اپنے آپ اپنی تعلیم کی کوشش نہیں کرتا' وہ خواہ بڑے سے بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو "بے علمی" کی نوبت کو پہنچ جاتا ہے۔

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی کتاب (دوام کی راہ پر) اس کی سالانہ کانفرنسوں کے کام کی نہایت عمدہ دستاویز ہے۔ اس دستاویز سے ملک میں اڈلٹ ایجوکیشن کے بدلتے ہوئے تصورات، اس کے پروگرام اور طریقۂ کار اور اس کے متعدد اور متنوع پہلوؤں کا بڑی خوبی سے پتہ چلتا ہے۔ آپ اس کے خطباتِ صدارت کا سال بہ سال مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ نیشنل اڈلٹ ایجوکیشن کے نصب العین اور حدود کے اندر رہتے ہوئے ان کی توجہ اور زور کا محور ایک مسئلے سے دوسرے مسئلے کی طرف بدلتا رہا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے ایک دوسرا مشکل اور فوری مسئلہ ہے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری آزادی جو ہم نے اپنے ملک کے لئے حاصل کی ہے' اگرچہ اس کے ذوق و شوق نے ہمیں اپنی جدوجہد کے زمانے میں ایک دوسرے سے باندھے رکھا تھا' وہی اب ہمیں سیاسی اور سماجی زندگی میں مرکز سے دور تفرقہ اور تقسیم کی طرف لئے جارہی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ رجحان ہمارے تمدن کی بنیادی وحدت کو توڑ رہا ہے یا کم سے کم وہ ہماری قومی نگاہ میں بُری طرح دھندلی ہو کر رہ گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لسانی، سیاسی اور دوسرے طبقہ وارانہ مفادات جن کے اندر ایک کو دوسرے سے الگ کرنے کے جراثیم پائے جاتے ہیں، قومی یک جہتی کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں؛ وہ قومی یک جہتی جسے کسی ملک کی آزادی کے بعد اس کی کوششوں کا قدرتی مقصد و منتہیٰ قرار پانا چاہئے تھا۔ لیکن واقعہ اس کے برخلاف ہے؛ اور اس کا الزام کسی دوسرے پر نہیں بلکہ خود ہمارے اوپر ہے۔

اس مسئلے سے اڈلٹ ایجوکیشن کا براہِ راست تعلق ہے یا ہونا چاہئے اور اُسے سوچنا چاہئے کہ کیا تدبیر کی جائے جس سے ملک کے اندر کام کرنے والی ان تفرقہ پرداز قوتوں کا — چاہے ان کا گذر مذہب، سیاست، زبان، کسی راہ سے ہوئے — مقابلہ کیا جاسکے۔ لہٰذا صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اڈلٹ ایجوکیشن یا کمیونٹی ڈیولپمنٹ وغیرہ کے تحت پروگرام مرتب کر لئے جائیں۔ سب سے زیادہ جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہماری تمام سرگرمیوں اور کاموں میں ایک کو دوسرے سے ملانے والے قومی پس منظر اور نقطۂ نظر کی کارفرمائی ہو۔ میں نہیں جانتا کہ اِسے ہمارے ملک کی "جذباتی یک جہتی" کہا جائے گا یا کیا، لیکن ضرورت بہرحال اُس بصیرت کی ہے جس کے زیر اثر اشوک نے اپنے فرمان کو پھیلایا

کی تعلیم کی غرض سے بتھروں پر کندہ کرادیا تھا۔ ہمیں اس معاملے میں اُس قسم کی جو کسی کی ضرورت ہے جو ملک کے بارے میں گاندھی جی برتتے تھے اور "ہریجن" اور "ینگ انڈیا" میں روزانہ مضامین لکھ لکھ کر عوام کو ہماری قومی زندگی کے سیاسی سماجی اور اقتصادی پہلو میں قومی اتحاد و یک جہتی کو ملحوظ رکھنے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ گاندھی جی ہی تھے جن کی رہنمائی میں قوم ایک آزمائشی ڈسپلن سے گذری تھی۔ قوم کے اندر اسی ڈسپلن کی روح پھونکنی ہے اور اڈلٹ ایجوکیشن کی پوری تحریک میں اُسی ڈسپلن کی روح کارفرما ہونی چاہیئے۔ اس لئے اڈلٹ ایجوکیشن کو منجملہ اور باتوں کے ملک کے لئے قومی یک جہتی اور ڈسپلن کی تحریک بھی بننا ہوگا۔

ہمارے تمدن کو ہمارے ملک کی طویل تاریخ نے استحکام بخشا ہے اگرچہ اُسے اکثر و بیشتر بیرونی اثرات اور روایات کی چھاپ بھی انگیز کرنی پڑی ہے۔ جو چیز تین ہزار سال سے زیادہ عرصے تک زندہ رہی ہو، ضروری ہے کہ اس کے اندر اب بھی زندہ رہنے کی قوت موجود ہوگی۔ ہمارے ملک کی آزادی کی بدولت اب موقع ہے کہ ان قدروں کی پھر سے کھوج کی جائے جنھوں نے ہماری تہذیبی زندگی کو رنگ روپ بخشا تھا۔ انہی قدروں کو ہماری قومی زندگی کی نشاۃ ثانیہ کے لئے نئے محرکات کی حیثیت اختیار کرنی چاہیئے۔ امریکہ کے ایک پروفیسر نے ایک دفعہ مجھ کو کہا تھا کہ امریکہ کبھی مفتوح نہیں ہوا ہے۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ اگرچہ ہمارے ملک کے اوپر بیرونی اقوام کے حملے ہوتے رہے ہیں لیکن مفتوح یہ بھی کبھی نہیں ہوا اس لئے کہ فاتح یا تو ملک کے سماجی نظام کا جزو بن گیا یا ملک ہی چھوڑ کر چلا گیا۔ ہمارے ملک کے دفاعی مورچے ہمارے سماجی نظام کے اندر رہے ہیں اگرچہ وقتاً فوقتاً ان کے اوپر بڑی تشویشناک افتادیں پڑتی رہی ہیں۔ ہم اپنے اسی سماجی نظام کے وسیلے سے، خواہ اس میں کتنی ہی خرابیاں ہوں، ان قدروں کو بچاتے اور منتقل کرتے رہے ہیں جنھوں نے بڑے گاڑھے وقتوں میں ہماری مدد کی ہے۔ میں یہاں ان میں سے دو پہلوؤں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(الف) ہمارے تمدن کے تمام کے تمام پیشے اور فن مشق و مہارت کی وراثتی منتقلی کے طفیل میں محفوظ رہے ہیں جن کے ماتحت باکمال باپ اپنے فن میں اپنے بیٹے کو بھی باکمال بنا دیتا تھا۔ اس طرح یہ فنون اور پیشے محفوظ بھی رہے اور ان پر جلا بھی ہوتی رہی۔ ہمارے روایتی تمدن کے احیاء اور تحقیق نو کے عمل میں یہ بات اڈلٹ ایجوکیشن کے پروگرام اور پالیسی کا جزو بن جانی چاہیئے کہ قدیم فنون اور کلاؤں کے مرکزوں کو روشنی میں لایا جائے اور انھیں ارادہ و اہتمام کے ساتھ بڑھاوا دیا جائے۔

(ب) دوسرے ہمارے تمدن کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ہم قدیم یونانیوں کی طرح، انسانی فکر کے بلند ترین

مقامات تک پہنچ گئے تھے۔ ایک طرف جہاں یہ قدغن تھی کہ وہ کتب مقدسہ جو اِن مقاماتِ بلند کی حامل تھیں، ہر شخص تک نہ پہنچنے پائیں تا آنکہ وہ فکر وعمل کے ایک مقررہ ضابطۂ تربیت سے نہ گذر لے، وہاں دوسری طرف ہم نے تبلیغ علم کی ایک ٹکنیک بھی جسے آپ چاہیں تو اڈلٹ ایجوکیشن کا ایک پیرایہ کہہ لیں ایجاد کر لی تھی اور یہ جو اس طرح وجود پذیر ہوئی تھی کہ ہم ان مرتبہ روحانی تجربات کو دیومالا، رزمیہ داستانوں، ناچ اور راگ کے توسط سے لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے اور یہ عمل اس حقیقت کے پیشِ نظر تھا کہ ہمارے اعلیٰ ترین فلسفیانہ افکار اور ہمارے عوامی فنون، ناچ اور راگ، دیومالا اور استعارات وکنایات کے درمیان ابدی حقیقت، حُسن اور مسرّت کی ایک پہلے سے جانی بوجھی اور ربطے کی گرائی ہم آہنگی موجود ہے جو فرد کے لئے تسکین وطمانیتِ قلب کا پیام لاتی ہے۔ ہم نے افسانہ گری (پُران نویسی) کا ایک نہایت حسین فن ایجاد کر لیا تھا اور اُسے اخلاقی قدروں کی تبلیغ کے لئے سواری کے طور پر استعمال کرتے تھے حالانکہ آج کے جدید دور میں افسانہ ہمیں صرف اپنے وقت کو ضائع کرنے کے تو یقیناً قابل بنا دیتا ہے۔ لیکن اس کے صحیح مصرف کی تعلیم نہیں دے پاتا۔ یونیسکو کے دستور کے الفاظ کو ایک بار دہرانے کی اجازت دیجئے کہ "چونکہ جنگیں انسانوں کے دماغوں میں شروع ہوتی ہیں اس لئے امن کے مورچے بھی انسانوں کے دماغوں ہی میں جمانے چاہئیں۔" ہمارے تمدن کا واسطہ بھی انسانوں کے دماغوں سے تھا۔ سنسکرت کا مشہور شلوک ہے کہ "یہ صرف انسان کا دماغ ہی ہے جو اس کی غلامی اور آزادی دونوں کا سبب بنتا ہے۔" اڈلٹ ایجوکیشن کا مقصد ومنشا صرف لوگوں کو خواندہ بنانا یا انھیں مستری پن سکھانا نہیں ہو سکتا۔ یہ سب کچھ تو سکھانا چاہئیے ہی لیکن اسی کے ساتھ اسے انھیں اس بصیرت کی جھلک بھی دکھانی چاہئیے جو انھیں خود ان کے نفس سے آزادی دلاتی ہے جب یہ ہوگا اُسی وقت لوگ اُس تہذیب وتمدن کے ادب و اقدار کو ایک سے دوسرے تک پہنچانے کا وسیلہ بن سکیں گے جو "دوام کی راہ پر" چلنا سکھائے ـــ دوام وہ نہیں جو اس دنیا سے پرے اور اس کے بعد آتا ہے بلکہ وہ دوام جو اسی زندگی میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ رہ سہہ کر حاصل ہوتا ہے اور جس کی نظر ایک نئے سماجی معاشرے کے قیام پر رہتی ہے۔

سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت

پنچایتی راج کا تقاضہ

مقامی نظم ونسق کے میدان میں پنچایتی راج کے نفاذ سے دیہی علاقوں میں سوشل ایجوکیشن کے پروگراموں کو پھلنے پھولنے کا ایک نیا موقع ہاتھ آیا ہے۔ تیسرے پنج سالہ پلان میں کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کی تنظیم اور نظم ونسق کے لئے پنچایتی راج کا نمونہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔

پنچایتی راج کا ارتقاء دراصل کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی انتظامی مشنری کو اس مقصد کے پیش نظر ڈھالنے کا قدرتی نتیجہ ہے کہ اس سے دیہی عوام کا تعاون حاصل کرنے کا مقصد پورا ہو جائے۔ شری بی۔ مکرجی نے کروکشیتر میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام نے جمہوری لامرکزیت پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے۔ دیہی علاقوں کی ہمہ گیر ترقی خاص طور سے گاؤں والوں کی اپنی تحریک، کوشش اور صلاحیتوں سے کام لے کر کرنا کمیونٹی ڈیولپ منٹ کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ کے طریق کار کا خاص منصب فرد اور اس بستی کی زندگی کی تعمیر کرنا ہوتا ہے، جس میں وہ فرد زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا مطمح نظر کمیونٹی کی یک جہتی کو برقرار رکھنے کے لئے اس کے ممبروں کو اشتراکِ عمل کے لئے اُبھارنا اُن میں ترقی یافتہ زندگی بسر کرنے کی بھوک پیدا کرنا غرض عام انسانوں کی صلاحیتوں کو ابھارنا اور انھیں اِس قابل بنانا کہ ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر وہ اپنی اور اپنے ملک کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے راستے پر برابر آگے قدم بڑھاتے چلے جائیں۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ کے عمل کا دارومدار چونکہ عام انسانوں کی صلاحیتوں پر ہوتا ہے اس لئے لازمی طور سے اسے جمہوری عمل ہونا چاہئے۔ اِس پس منظر میں دیکھا جائے تو جمہوری لامرکزیت اور کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کا چولی دامن کا ساتھ ہے"!

پنچایتی راج اِس اہم اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ ترقیاتی پروگراموں کے نظم ونسق کی ساری ذمہ داری

گاؤں کے لوگوں کو سونپ دی جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر وہ ایک تنظیمی ڈھانچے کی تشکیل کرتا ہے جس کے توسط سے یہ سارے کام انجام پذیر ہوتے ہیں۔

(الف) ترقیاتی پروگراموں میں تمام بالغ افراد کی براہِ راست شرکت کے لئے گرام سبھا۔

(ب) گاؤں کی مقامی انتظامی اکائی کی حیثیت سے گرام پنچایت

(ج) تعاونی اداروں کی حیثیت سے پنچایت کی مختلف ذیلی کمیٹیاں۔

(د) امدادی اداروں کی حیثیت سے نوجوانوں، عورتوں اور کسانوں کی انجمنیں۔

(ہ) بلاک کی سطح پر نظم و نسق کی اکائی کی حیثیت سے پنچایت سمیتی اور اس کی مختلف ذیلی کمیٹیاں۔

اس تنظیمی ڈھانچے میں سب سے اہم بات خود اختیاری کی ہے۔ پنچایتی راج کے مندرجہ بالا تنظیمی ڈھانچے میں گاؤں کے لوگوں کو جمہوری طریقے سے اپنے متعلق خود فیصلہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

اس طرح دیکھا جائے تو پنچایتی راج میں لوگوں کو اپنے معاملات میں خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کا جو موقع ملتا ہے، سوشل ایجوکیشن میں بذات خود اس عمل کی بہت اہمیت ہوتی ہے اس لئے کہ لوگوں کو سماجی تعلیم دینے کا یہ ایک بہت کارگر وسیلہ ہے۔ جمہوریت میں ہر شہری کو کچھ سہولتیں (حقوق) ذمہ داریاں اور اختیارات ملتے ہیں مثال کے طور جمہوری نظام میں ہر شخص کو امن و امان سے زندگی گذارنے، تحریر و تقریر اور انجمن بنانے کی آزادی اور حق رائے دہندگی کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان پر جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی پابندی کرنے اور عوامی بہبود کے کاموں میں حکومت کو تعاون دینے کی ذمہ داری بھی آتی ہے اور انہیں یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ افراد کی آزادی کی حفاظت اور نظامِ حکومت کی پالیسی بنانے اور انھیں عمل پذیر کرنے والے اداروں پر ملک و قوم کے مفاد کی خاطر نظر رکھیں۔

پنچایتی راج لوگوں کو یہ سہولت دیتا ہے کہ مقامی خود اختیار ادارے کی حیثیت سے پنچایت اور پنچایت سمیتی کے کاموں میں وہ دلچسپی لیں۔ یہ نظام گاؤں والوں کو یہ مواقع فراہم کرتا ہے کہ وہ ترقیاتی پروگراموں میں گرام سبھاؤں کے اندر براہِ راست طریقے سے اور پنچایت اور پنچایت سمیتی میں اپنے نمائندوں کے توسط سے حصہ لیں اور انہیں کامیاب بنانے میں تعاون کریں۔ شہریت کی تعلیم کا یہی سب سے موثر طریقہ ہے کہ لوگ ان باتوں کو عملی زندگی میں برت کر سیکھیں۔ اس طرح کی تعلیم سے جو نتائج نکلیں گے وہ دوررس اور دیرپا ہوں گے۔

سوشل ایجوکیشن کا پروگرام

پنچایتی راج میں سوشل ایجوکیشن کو نئی اہمیت ملی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کے پروگراموں پر تجربہ کی بنا کے لحاظ سے نئے سرے سے غور کیا جائے

۱۔ شہریت کی تعلیم

پنچایتی راج کے قیام کے ابتدائی دور میں گاؤں والوں کو ایسی تعلیم دی جانی چاہیئے جس سے ان میں اپنی نئی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جائے۔ اس لئے یہ ضروری ہو گا کہ گرام سبھا اور گرام پنچایت کے ممبروں کی تعلیم کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا جائے۔ جس سے کہ انہیں اپنے کام اور اختیارات، ذمہ داریوں اور وسائل اور پنچایتی راج کی تنظیم اور طریق کار کا علم ہو جائے۔ یہ اس سلسلے میں پہلا اہم قدم ہے۔ راجستھان اور آندھرا جہاں پنچایتی راج کا نظام سب سے پہلے قائم ہوا ہے، وہاں کا تجربہ بتاتا ہے کہ سوشل ایجوکیشن آرگنائیزر گاؤں والوں کو تبدیلی کو قبول کرنے کے لئے ذہنی برآمادہ کر سکتا ہے اور ان میں اس کے لئے حوصلہ اور امنگ پیدا کر سکتا ہے۔ مختلف کیمپ اور جلسے وغیرہ کر کے لوگوں کو پنچایتی راج کے نفاذ کی باتیں بتائی جا سکتی ہیں۔

شروع شروع میں حالانکہ شہری زندگی کی قدروں کی تربیت کرنے کا بڑے پیمانے پر انتظام کرنا ہو گا، لیکن یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ شہریت کی تعلیم مختصر مدت کے پروگرام کے ذریعہ ہی پوری نہیں ہو جاتی بلکہ اصل میں وہ زندگی کے مسلسل تجربوں سے حاصل ہوتی ہے۔ سوشل ایجوکیشن آرگنائیزر کو چاہیئے کہ وہ شہریت کی تعلیم کے پروگرام کو تعلیم کے رسمی اور غیر رسمی طریقوں سے چلائے۔ اس سلسلے میں آوازوں اور تصویروں کے ذریعے تعلیم دینے کے سامان بہت مددگار ثابت ہوں گے۔

۲۔ نوجوان کلب اور دوسری تعاونی انجمنوں کی تنظیم

پنچایتی راج کے نظام میں نوجوان کلب، مہیلا منڈل اور کسان منڈلوں کی طرح کی تعاونی انجمنوں کی بہت اہمیت ہے۔ یہ تنظیمیں دراصل ترقیاتی پروگراموں میں عوام کے رضاکارانہ تعاون دلانے کی بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ عوامی لیڈروں کی دریافت اور تربیت میں ان انجمنوں کی بہت اہمیت ہے۔ یہ انجمنیں عوامی لیڈروں کی تجربہ گاہ

دیں گی۔ جہاں سے پنچایتوں کو اچھے اور قابل رہنما مل سکیں گے۔ اِن انجمنوں میں نوجوان کلبوں کی تنظیم کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ اسے دوسری انجمنوں کی تنظیم کے مقابلے میں ترجیح دی جانی چاہیئے۔ سوسائٹی کا نوجوان طبقہ ہی ترقی اور تبدیلی کا علم بردار ہوتا ہے۔ دیہی علاقوں میں پنچایتی راج کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ نوجوانوں کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ آنے والے زمانے کے شہری ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو پوری طرح تیار کریں۔ اِن باتوں کے پیش نظر ایک طرف نوجوان کلبوں کا قیام ضروری ہو جاتا ہے جس سے گاؤں کے نوجوانوں کو منظم ہونے اور کاموں میں عملی شرکت کا موقع ملے اور دوسری طرف گاؤں کے نوجوان کارکنوں اور رہنماؤں کی تربیت کا انتظام ہو جس سے کہ گاؤں میں نوجوان کلبوں کا کام زیادہ موثر اور جاندار طریقے سے پھیلے۔ نوجوان کے کام میں چار بنیادی باتیں ضروری ہیں۔

(۱) کام رضا کارانہ اور غیر رسمی طریقے پر لوگوں کے اپنے ذوق و شوق کا نتیجہ ہو۔

(۲) کام تعمیری نوعیت کا ہو۔

(۳) گاؤں کے نوجوانوں کی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہو۔

(۴) ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ بستی کے بڑوں اور بزرگوں کی رضامندی بھی اس میں شامل ہو۔

۳۔ غیر سرکاری عہدہ داروں کی ٹریننگ

پنچایتی راج کی کامیابی کا دارومدار سب سے زیادہ اس بات پر ہے کہ پنچایت کے ممبروں کو اس بات کی تربیت دی جائے کہ عوام کے نمائندے کی حیثیت سے انھیں کس طرح پروگرام چلانا ہے۔ اِسی لئے غیر سرکاری عہدہ داروں کی ٹریننگ اِس اسکیم میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ نوجوانوں میں کام کرنے والے کارکنوں اور رہنماؤں کی ٹریننگ اور اسکول ماسٹروں کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی تعارفی ٹریننگ دینا، سوشل ایجوکیشن آرگنائیزر کے تربیتی پروگرام کا حصہ ہونا چاہیئے۔ گرام سہائیکوں کا ٹریننگ پروگرام اس تربیتی اسکیم کا لازمی جزو ہے۔

۴۔ خواندگی اور کتب خانے

کسی بھی ملک میں جمہوریت اس وقت تک کامیابی سے نہیں چل سکتی جب تک لوگوں میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہ موجود ہو۔ تجربہ بتاتا ہے کہ خواندگی سے نہ صرف لوگوں کو اظہارِ خیال کا موقع ملتا ہے بلکہ دوسروں کے خیالوں کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اسی لئے ضروری ہے کہ شہریت کی تعلیم کے ایک لازمی جزو کی حیثیت سے بالغوں میں خواندگی کو

پھیلانے کی اہمیت پر زور دیا جائے۔ اڈلٹ ایجوکیشن میں خواندگی کے پروگراموں میں کتب خانوں اور دار المطالعوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے اس لئے ان کی تنظیم بھی اس کا لازمی جزو ہونا چاہئے۔

۵۔ تفریحی اور تہذیبی پروگرام

تفریحی اور تہذیبی پروگراموں کی اس لحاظ سے بہت اہمیت ہے کہ ان کے ذریعہ لوگوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے مظاہرے کا موقع ملتا ہے۔ پھر ان کی اس لحاظ سے بھی اہمیت ہے کہ ان کے ذریعہ سوشل ایجوکیشن کے عام پروگراموں کو غیر رسمی طریقے سے پھیلانے میں مدد ملتی ہے۔ تفریحی اور تہذیبی پروگراموں کو لوگوں میں سماجی شعور کی تربیت کرنے کے ایک وسیلے کی حیثیت سے بڑھاوا دینے کی شدید ضرورت ہے۔

۶۔ سماج کے سب سے نچلے طبقے کے لئے تعلیم

سوشل ایجوکیشن کا کوئی بھی پروگرام اس وقت تک مکمل نہیں کہا جا سکتا جب تک لوگوں کے اندر سماج کے نچلے طبقے کی طرف سے اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنے کی بات اس میں شامل نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ سماجی یا اقتصادی حیثیت سے گاؤں کے پچھڑے طبقے کی بہبود کی تعلیم بھی اس میں شامل کی جائے۔ سوشل ایجوکیشن کو ایسا ماحول تیار کرنا چاہئے کہ اس سے سارے سماج میں حرکت پیدا ہو جس کے اثر سے پنچایت گاؤں کے پچھڑے طبقے کی طرف سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے عمل پذیر ہو جائے۔

۷۔ آوازوں اور تصویروں کے ذریعہ تعلیم دینے والے سامانوں کا استعمال

مندرجہ بالا پروگراموں میں آوازوں اور تصویروں کے ذریعہ تعلیم دینے والے سامانوں کے استعمال سے بہت مدد لی جا سکتی ہے۔ ان سامانوں کے استعمال سے تعلیم کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ مگر ان کے استعمال میں بنیادی بات یہ ہونی چاہئے کہ ان کے ذریعہ تعلیم اور سماجی تعلیم دینے کا کام لیا جائے اور انہیں صرف پروپگنڈا کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

اٹھارویں آل انڈیا الٹ ایجوکیشن کانفرنس کوئمبٹور

تجاویز

(۱)

یہ کانفرنس محسوس کرتی ہے کہ پنچایتی راج کا نفاذ، جمہوری نصب العین کو حاصل کرنے میں ہمارے ملک کی تاریخ کا نہایت بلند حوصلہ اور دانش مندانہ قدم ہے۔ کانفرنس کی رائے میں اس حوصلہ مندانہ اقدام کی کامیابی کے لئے اڈلٹ ایجوکیشن کے ایک جان دار، جامع اور دائمی پروگرام کی ضرورت ہے۔

(۲)

کانفرنس کو اس بات پر بڑی تشویش ہے کہ پچھلے دس سال میں خواندگی کی رفتار بہت سست رہی ہے۔ کانفرنس نے اس یقین و ایمان کا از سر نو اظہار کرتی ہے کہ انسان کی ہمہ گیر ترقی میں خواندگی کو شرط اوّل کا درجہ حاصل ہے۔ اب ضلع بلاک اور گاؤں کی سطح پر پنچایتی راج کے نفاذ سے یہ بات ناگزیر ہوگئی ہے کہ جس قدر کم سے کم مدت میں ممکن ہو بالغوں کی معقول تعداد پڑھنے لکھنے کے قابل ہو جائے۔ اس لئے کانفرنس مرکزی اور ریاستی حکومتوں اور پنچایتوں راج کے اداروں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنے ترقیاتی منصوبوں میں اس پروگرام کو سب سے زیادہ ترجیح دیں۔

(۳)

چھ سے گیارہ سال کی عمر تک کے بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دینے کا جو فیصلہ کیا گیا ہے یہ کانفرنس اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس کی یہ رائے بھی ہے کہ جب تک تسلسل کلاسوں کی شکل میں جو خصوصاً ۱۱ سے ۱۴ سال کی عمر تک کے بچوں کے لئے ہونی چاہئیں، مشتی نصابوں اور کتب خانوں کے قیام کے ذریعے اس اسکیم کو تقویت نہ پہنچائی جائے گی، اُس کے فوائد نمایاں طور پر حاصل نہیں ہوں گے۔ لہٰذا یہ کانفرنس مرکزی اور ریاستی حکومتوں اور پلاننگ کمیشن سے پر زور سفارش کرتی ہے کہ وہ اس قسم کے تعلیمی پروگراموں کے لئے اپنے بجٹوں میں معقول رقم کی گنجائش رکھیں۔

(۴)

اس کانفرنس کی نظر میں یہ بات بڑی تشویشناک ہے کہ کچھ ریاستی حکومتیں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے عہدے

ختم کر رہے ہیں یا انھیں پنچایتی افسر یا سب انسپکٹر آف اسکول کے عہدے میں مُدغم کر رہی ہیں۔ اِس بات کے پیش نظر کہ ابھی سوشل ایجوکیشن کے کام کا بہت بڑا حصہ پورا ہونا باقی ہے، یہ کانفرنس تمام ریاستی حکومتوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ڈیولپمنٹ بلاکوں میں سوشل ایجوکیشن کے عملے کا پہلے ہی جیسا نظام قائم رکھیں یعنی ہر بلاک میں ایک سوشل ایجوکیشن آرگنائزر اور ایک لیڈی سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا عہدہ بدستور باقی رہے۔

(۵)

اس کانفرنس کو اِس بات کی ضرورت کا شدت سے احساس ہے کہ جن ریاستوں میں اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن موجود نہیں ہے ان سب میں وہ قائم ہوجانی چاہیئے تاکہ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے تعاون اور اشتراک عمل سے اڈلٹ ایجوکیشن کی تحریک کو ملک کے ہر حصے میں مقبول و مستحکم بنایا جا سکے۔ لہٰذا یہ کانفرنس تمام رہنماؤں سے خواہ زندگی کے کسی شعبے سے ان کا تعلق ہے، اپیل کرتی ہے کہ وہ ان ریاستوں میں اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے قیام میں امداد و اشتراک فرمائیں۔

(۶)

یہ کانفرنس اڈلٹ ایجوکیشن سے متعلق دنیا کے تمام رہنماؤں سے اِس بات میں متفق ہے کہ انسان کی ذہنی اور روحانی نشوونما کے لئے تعلیم تاحیات جاری رہنے والے ایک عمل مسلسل کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے۔ تمام شہریوں کو حق حاصل ہو کہ انھیں لبرل ایجوکیشن کا اس کے وسیع سے وسیع تر مفہوم کے مطابق فائدہ پہنچایا جائے۔ لہٰذا یہ کانفرنس حکومتوں، عوام اور ملک کے رضاکار اداروں سے پُرزور فرمائش کرتی ہے کہ جن جن طریقوں سے اور جس قدر متنوع شکلوں میں ممکن ہو، وہ ملک کے شہریوں کے لئے تعلیم کے مواقع فراہم کریں۔ یونیورسٹیاں اس مقصد کے حصول میں نہایت مفید اور اہم کام انجام دے سکتی ہیں۔

ایک گاؤں کی کایا پلٹ

آندھرا پردیش کا کارنامہ

آندھرا پردیش میں نرساپور پنچایت سمیتی کا ایک چھوٹا سا گاؤں مگردلا ہے جسے صحت وصفائی کے نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے حالانکہ ابھی دو سال پہلے یہ اپنی گندگی کے لئے مشہور تھا۔ پنچایت سمیتی کی امداد تو بس ایک بہانہ تھا، اس کا ہاتھ اتنا تھا کہ۔ گاؤں والوں نے اپنے لئے پینے کے پانی کے لئے تین کنویں کھودلئے۔ گاؤں کی تمام گلیوں میں فرش لگایا اور زمین دوز تھائی حصہ میں نالیاں بنالیں۔

گاؤں والوں نے سب سے پہلا جو کام کیا وہ فضلے کو ٹھکانے لگانے کے لئے ایک زمین دوز حوض کی تعمیر تھی۔ اس کی پنچایت نے بھی تعریف کی ہے۔ یہ حوض ایک ہزار آٹھ سو روپے کی لاگت سے تیار کیا گیا ہے۔ اس سے اب یہ آسانی ہو گئی ہے کہ پاخانوں کو صاف کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور فلش کے پاخانوں کی طرح وہ صاف ستھرے رہتے ہیں مگر یہ پاخانہ صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہ منصوبہ اتنا کامیاب رہا کہ دوسرے گاؤں کی طرف سے بھی ایسے ہی پاخانے اور زمین دوز حوض بنانے کا مسلسل مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پنچایت سمیتی نے ایسے دو اور پاخانے بنوانے کے لئے منظوری دے دی ہے اور ان کی تعمیر کا کام جلد ہی شروع ہونے والا ہے۔

مگردلا تعلیم کے میدان میں بھی پیچھے نہیں رہا۔ اس سلسلے میں اس نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ ایک اسکول تعمیر کیا ہے جس میں آج کل تقریباً دو سو بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ تعلیم کے پروگرام کی مقبولیت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ گزشتہ دو سال کے دوران میں اسکول میں تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی ہے۔

ان لوگوں نے دو کمیونٹی سینٹر بھی کھولے ہیں جن میں منجملہ اور پروگراموں کے ہندی کی کلاسوں کا بھی انتظام ہے جن کے اوپر گاؤں والوں کو خصوصیت سے فخر ہے۔ ان کلاسوں سے ۱۵۰ اشخاص ہندی کے ابتدائی امتحان میں

شریک ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے گاؤں میں اس تعلیمی سرگرمی کے علاوہ جھیلا منڈل، نوجوانوں کا کلب اور ایک لائبریری بھی قائم کر دی ہے۔

ان سرگرمیوں نے مگر دلا گاؤں کے لوگوں میں خود اعتمادی پیدا کر دی ہے اور اب وہ بلاک کے بجٹ سے مالی امداد کے محتاج نہیں ہیں۔ جب کوئی نیا پروگرام سوچا جاتا ہے تو لوگ نقدی جنس اور رضا کارانہ محنت کی پیش کش کرتے ہیں۔ جب اسکول میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور جگہ کی قلت محسوس ہوتی ہے تو وہ پھونس کی چند جھونپڑیاں ڈال لیتے ہیں، تاکہ جگہ کی کمی کی وجہ سے تعلیم کا حرج نہ ہو۔ جب سے اسکول کے بچوں کو دوپہر کا کھانا مفت کھلانے کا فیصلہ کیا گیا ہے اُس وقت سے لوگوں میں اور جوش پیدا ہو گیا ہے چنانچہ انھوں نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی غرض سے اس کام کے لئے اپنی مرضی اور خوشی سے دل کھول کر چندے دیئے ہیں۔ چنانچہ ایکسائیز کے ایک مقامی ٹھیکیدار نے گاؤں کی حالت سدھارنے کی غرض سے پنچایت کو ۸۰۰ روپے کا دان دیا تھا جس سے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ اس فنڈ سے غریب اور مستحق کاشت کاروں کو بہت معمولی شرح سود پر قرضے دیئے جاتے ہیں۔

گاؤں کی کوآپریٹیو سوسائٹی اپنے ۱۲۰ ممبروں کی ضروریات کو تو پوری کرتی ہی ہے۔ اس کے علاوہ اور کھلونہ ساز کمپنیوں نے مل کر کھلونہ سازوں کی کوآپریٹیو سوسائٹی کے نام سے بھی ایک سوسائٹی قائم کر لی ہے۔ اس سوسائٹی کو بلاک کے بجٹ سے مالی امداد تو ملتی ہی ہے، اس کے علاوہ کھلونہ سازی کے نئے گر اور تکنیک سکھانے کی غرض سے باہر سے بھی ایک اُستاد کو بلایا گیا تھا۔ سوسائٹی کے تیار کئے ہوئے کھلونوں کی دور دور تک مانگ ہے، اور ہر مہینے سوسائٹی کو تقریباً ۶۰۰ روپے کا منافع ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی کے ایک ممبر کا بیان ہے کہ "اِس سوسائٹی کی بدولت ہماری آمدنی میں تقریباً ۲۵ فی صدی کا اضافہ ہو گیا ہے۔"

(پریس انفارمیشن بیورو، حکومت ہند)

۱۹۶۶ء تک لازمی ابتدائی تعلیم

تیسرے پنج سالہ پلان کے آخر تک ملک میں ۶ سے ۱۱ سال تک کی عمر کے بچوں کی تعداد ۴ کروڑ ۹۶ لاکھ ہو گی، اُس وقت ان میں سے تقریباً سبھی لڑکے اسکول میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ سنہ ۱۹۶۶ء کے بعد ۱۱ سے ۱۴ سال تک کے سبھی بچوں کے لئے لازمی تعلیم کا انتظام کیا جاسکے گا۔

ابتدائی تعلیم پر پہلے پنج سالہ منصوبے میں ۸۵ کروڑ روپئے اور دوسرے پلان میں ۹۲ کروڑ روپئے خرچ کئے گئے ہیں۔ تیسرے پلان میں اس پر ۲۹ کروڑ روپئے خرچ کئے جائیں گے اور ایک کروڑ ۳۵ لاکھ مزید بچے اسکولوں میں داخل ہوں گے۔ تیسرے پلان میں تعلیم کی مدوں میں سب سے زیادہ روپیہ ابتدائی لازمی تعلیم پر خرچ ہو گا۔

پہلے پلان کے شروع میں ایک کروڑ ۹۱ لاکھ بچے اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ اِس منصوبے کی مدت کے اختتام پر یہ تعداد ۲ کروڑ ۴۵ لاکھ ہو گی۔ اندازہ ہے کہ دوسرے پلان کے اختتام پر یہ تعداد ۳ کروڑ ۴۳ لاکھ تک پہنچ گئی ہو گی۔

مرکز کے زیر نگرانی خطوں میں پنچایتی راج

مرکز کے زیر نگرانی خطوں — ہماچل پردیش اور دہلی میں پنچایتیں قائم کر دی گئی ہیں۔ دہلی میں بلاک کی ترقیاتی کمیٹیوں کی جگہ پنچایت سمتیاں بن چکی ہیں۔

جزائر انڈمان و نکوبار کی پنچایتوں کا ضابطۂ قانون عمل میں آ چکا ہے۔ اور ان جزائر کے چند علاقوں میں جلد ہی ...یتیں قائم کر دی جائیں گی۔ اتر پردیش کے پنچایتی راج قانون بابت ۱۹۴۷ء کی توسیع کر کے اس کا اطلاق منی پور ...ی کر دیا گیا ہے۔

تریپورا پنچایتی راج کے قواعد بابت ۱۹۶۱ء کو قطعی شکل دی جا چکی ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس مالی ...ل کے اندر اندر انتخابات ہو جائیں گے۔

پانڈیچری اور جزائر لکادیپ و منی کوئے میں ابھی پنچایتیں نہیں ہیں۔

مدھیہ پردیش میں پنچایت سکریٹریوں کی ٹریننگ کا منصوبہ

مدھیہ پردیش کی حکومت نے پنچایت سکریٹریوں کی ٹریننگ کے لئے ہر ڈویژن میں ایک ٹریننگ سینٹر قائم کرنے کی اسکیم بنائی ہے۔ اندور اور جبل پور میں اس طرح کے دو ادارے پہلے سے قائم ہیں۔ مجوزہ اسکیم کے ماتحت ان کے علاوہ سات ادارے اور قائم کئے جائیں گے۔

آندھرا پردیش کی پنچایت سمیتی کی طرف سے ہمت افزائی

آندھرا پردیش کے ضلع کرنول میں دیور کنڈہ پنچایت سمیتی کے صدر اور دو پنچایتوں کے سرپنچوں نے گشتی کپ کے انعامات کے لئے سو سو روپے کے عطیات دیئے ہیں۔ انعامات مندرجہ ذیل پروگرام کے مطابق تقسیم کئے جائیں گے۔

(۱) ایک کپ اس کسان کو دیا جائے گا جو ایک سال میں دھان کی کاشت کا جاپانی طریقہ پورے طور پر اختیار کرے گا۔

(۲) سمیتی میں بہترین گرام سہایک کو بھی ایک کپ بطور انعام ملے گا۔

(۳) ایک کپ علاقے کے اس پرائمری اسکول کو دیا جائے گا جس میں آبادی کے لحاظ سے طالب علموں کا اوسط فی صد سب سے زیادہ ہوگا۔

راجستھان پنچایت سمیتی کی کامیابیاں

امسال ضلع اجمیر میں بہترین سمیتی کی حیثیت سے سری نگر پنچایت سمیتی کو ریاستی انعام ملا ہے۔ پچھلے سال بھی اس سمیتی نے ریاست کی بہترین سمیتی کی حیثیت سے انعام حاصل کیا تھا۔
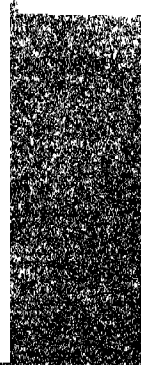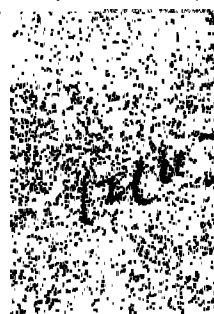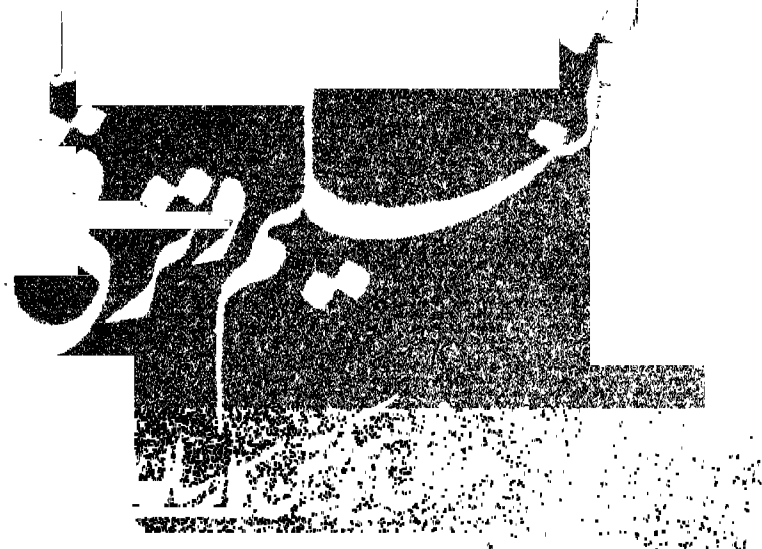
ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہانہ رسالہ

تعلیم و ترقی

نومبر ۱۹۶۱ء

جلد ۱۲ نمبر ۱۱

ترتیب

بانی: شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر:

پروفیسر محمد مجیب

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر: ماہنامہ تعلیم و ترقی۔ جامعہ نگر نئی دہلی

قیمت سالانہ چار روپئے فی پرچہ ۴۰ نئے پیسے

ٹیلیفون: ۴۴۲۴۰

پرنٹر پبلشر برکت علی فراق نے کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں چھپوا کر دفتر تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

اشارات

کمیونٹی ڈیولپمنٹ دسویں سال میں

ہندوستان کے ۶ لاکھ میں سے ۴ لاکھ گاؤں کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے حلقۂ عمل میں آچکے ہیں۔ مگر اتنے وسیع پیمانے پر یہ
پروگرام کو عوام میں جتنا مقبول ہونا چاہئے تھا، یہ پروگرام اس حد تک مقبول نہیں ہو سکا۔ آج سے نو سال پہلے جب تین
گاؤں کے ۵۵ بلاکوں میں یہ پروگرام شروع کیا گیا تھا، اُس وقت یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ اس کے اثرات کو دیکھنا
کسی ڈیولپمنٹ بلاک میں جا کر دیکھا جائے"۔ مگر اب یہ صورتِ حال نہیں ہے۔ اب کم و بیش سو سو گاؤں کے ۹۶
ملک کے مختلف حصّوں میں کام کر رہے ہیں۔ اور آئندہ دو سال کے اندر یہ پروگرام ہندوستان کی پوری دیہی آباد
اپنے حلقۂ اثر میں لے لے گا۔ اِس صورت میں ملک کے سامنے اتنے نمایاں طور پر اور کھل کر اس کے اثرات آجانے چا
کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے پروگرام سے لوگ اُسی طرح مانوس اور متعارف ہو جاتے۔ جیسے جنگ آزادی کے زمانے
"سوراج" اور اس کے الطاف و انعامات سے مانوس ہو گئے تھے۔

اس کیفیت کی ابتدا اب بہرحال ہوئی ہے اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی مقبولیت ان علاقوں میں بڑھ رہی
جہاں اس کا انتظام مقامی پنچایتوں اور پنچایت سمیتیوں کے سپرد کیا گیا ہے، مگر ان اداروں کی اپنی حدیں ہیں، اور ا
معنی میں عوام کی نمائندگی کرنے کے قابل بننے میں کچھ وقت لگے گا۔ مگر اس کے باوجود یہ پروگرام عوام میں مقبول اُسی
ہوگا جب اس کے فیض سے سماج کے سب سے نچلے طبقے کو بھی بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے موج
میں اِس کی کچھ بہت زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ اسی نقص کو دور کرنے کی غرض سے حکومت نے جے پرکاش نرائن جی
میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کی رپورٹ حکومت کے زیرِ غور ہے۔ کمیٹی کن نتائج پر پہنچی ہے وہ مکمل اور مفصل طور پر ملک
سامنے نہیں آئے ہیں۔ لیکن اس سے قطع نظر ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اسکیم کے ذریعہ لوگوں کو اپنی
بنانے کا خواب اسی وقت حقیقت میں تبدیل ہو سکتا ہے جب سماج کے سب سے نچلے طبقے کو اِس سے سب سے زیادہ بہرہ اند
ہونے کا موقع ملے۔

ڈائرکٹر کی رپورٹ

ڈائرکٹر کی رپورٹ سیمناروں کی روایت کے مطابق سیمنار کے دوران میں آخری دن
عام اجلاس میں پیش ہو جانی چاہیے تھی، لیکن کسی وجہ سے اِس روایت پر اِس سال عمل
نہ ہو سکا، اور اُسے اب نمایندوں کے پاس ڈاک سے بھیجا گیا ہے۔
ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے اس رپورٹ کے اہم حصّے ذیل میں دے رہے ہیں۔

——— ایڈیٹر

سیمنار کا موضوعِ بحث

انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن نے اس سال کے غور و بحث کے لئے نہایت مناسب موضوع مقرر کیا تھا
نہ دو سال سے پنچایتی راج کا ملک میں بہت چرچا ہے اور حکومتیں اس مقصد کے لئے اپنے اپنے یہاں قانون پاس
ہی ہیں، جن سے امید ہے کہ بستیوں کی سماجی زندگی میں بنیادی اور انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔
موضوع پر غور و بحث میں آسانی پیدا کرنے کی غرض سے حسب دستور ایک ورکنگ پیپر مرتب کر کے لوگوں کے پا
دیا گیا تھا اور یہ فرمائش کی گئی تھی کہ اس میں اگر کوئی ترمیم و اضافہ کرنا ہو تو لوگ اُسے ایسوسی ایشن کو بھیج دیں۔
لگ پیپر بہر حال سیمنار کے پہلے عام اجلاس میں پیش ہوا اور رسمی طور پر اُسے منظور کر لیا گیا۔
سیمنار میں سوشل ایجوکیشن اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی نمایندگی کرنے
لے اکسٹھ نمایندے شریک ہوئے تھے۔ اُن کے علاوہ کچھ اوپر چالیس آبزرور بھی شریکِ بحث تھے جو مقامی
ادوں سے آئے تھے۔

افتتاح اور غور و بحث

سیمنار کا افتتاح انڈین اڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کے صدر محترم ڈاکٹر موہن سنگھ مہتا صاحب نے فرمایا۔ موصوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں سوشل ایجوکیشن اور پنچایتی راج کے باہمی تعلق اور سوشل ایجوکیشن کے ترقی پذیر تصور سے متعلق بڑی بصیرت افروز تقریر کی جس سے نمائندوں کو بحث کے موضوعات پر گہرائی کے ساتھ اور خارجی نقطۂ نظر سے غور کرنے میں مدد ملی۔

سیمنار کے ڈائرکٹر شری بی۔ ایس مہتا، چیف سکریٹری حکومت راجستھان، منتخب ہوئے تھے مگر سیمنار کی بدقسمتی کہ وہ بعض اسباب کی بنا پر تشریف نہ لا سکے۔ اپنی ریاست (راجستھان) میں جسے پنچایتی راج کا قانون بنانے میں اولیت کا شرف حاصل ہے، مہتا صاحب ہی اس تجربے کے روح رواں رہے تھے اس لئے وہ آ گئے ہوتے تو ان کے خیالات و نظریات سے نمائندوں کو استفادہ کرنے کا موقع ملتا۔ مہتا صاحب کی غیر موجودگی میں نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر دہلی کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر شری ایچ۔ پی۔ سکسینہ نے ڈائرکٹری کے فرائض انجام دیئے۔

موضوعِ بحث پر سیمنار کے عام اجلاسوں میں کل تقریباً ۸ گھنٹے اور گروپوں میں قریب قریب بارہ گھنٹے بات چیت اور بحث مباحثہ ہوا۔ طریقہ بدستور سابق یہ رکھا گیا تھا کہ پہلے کھلے اجلاس میں موضوع بحث کے عنوانات پر ابتدائی اور بیشتر تشریحی بحث ہو جاتی تھی اس کے بعد مفصل بات چیت گروپوں میں ہوتی تھی۔ گروپوں کی رپورٹوں پر پھر کھلے اجلاس میں بحث ہوتی تھی تاکہ زیر بحث عنوان کے بارے میں تمام گروپوں اور نمائندوں کی مشترکہ رائے کا پتہ چل جائے۔

اس تمام بحث مباحثے اور تبادلۂ خیالات کے نتیجے کے طور پر موضوعِ بحث سے متعلق چند سفارشات اور نتائج اخذ کئے گئے جو حسب ذیل ہیں۔

نتیجے اور سفارشات

جمہوری لامرکزیت کے معنی اور پنچایتی راج کے اغراض و مقاصد

اس عنوان کے بارے میں سیمنار اس رائے پر پہنچا کہ چونکہ مختلف جماعتوں اور اداروں نے اس موضوع کی تشریح و تعبیر کر دی ہے اس لئے یہاں اس سلسلے میں کسی غور و بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

وہ سماجی قوتیں جو پنچایتی راج کے نتیجے کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی ہیں

اس سلسلے میں سیمنار کی عام رائے یہ تھی کہ اس بات کے بارے میں ابھی کوئی آخری رائے نہیں قائم کی جاسکتی اس لئے کہ اول تو کافی اعداد و شمار اور حقائق ہی حاصل نہیں ہوئے ہیں اور دوسرے اس قدر جلد ان قوتوں کو صحیح طور پر ذہن نشین کرنا بھی ممکن نہیں ہے اگرچہ کہیں کہیں کچھ رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ ان رجحانات کے بارے میں سیمنار کا خیال ہے کہ وہ دونوں طرح کے ہیں: تعمیری بھی تخریبی بھی۔ انتخابات کے وقت ان رجحانات کا دور دورہ ضرور ہوجاتا ہے اور انتخابات سے گروہ بندیاں اور اُن کی آپس کی عداوتیں بڑھ جاتی ہیں۔ مگر جب انتخابات ختم ہوجاتے ہیں اور لوگوں کو ایک دوسرے سے مل کر کام کرنے کا موقع ملتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی عداوتوں اور اختلافات کو ختم کرنا بھی سیکھ لیتے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کے اصول پر کام کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ پنچایتوں کا دائرۂ عمل چونکہ نسبتاً چھوٹا ہوتا ہے اور ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتا پہچانتا ہے اس لئے ذات برادری اور دوسرے نفاق پرور محرکات کے امکانات آگے چل کر ختم ہوجائیں گے۔ سیمنار کی رائے ہوئی کہ سوشل ایجوکیشن سماج کی تعمیری اور اتحادی قوتوں کو ابھارنے اور انھیں سہارا دینے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔

سیمنار اس نتیجے پر پہنچا کہ نیچے لکھی ہوئی چند سماجی قوتیں اور بھی ہیں جو پنچایتی راج کے نتیجے کے طور پر اُبھری ہیں:۔

(الف) لوگوں میں اپنی شخصیت اور احترامِ نفس کا احساس پیدا ہوا ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنے سماجی مرتبے اور مقام کو ہیچ اور کم رتبہ سمجھتے تھے۔

(ب) مقامی سرداری کی شکل صورت میں تبدیلی آئی ہے۔ اب پہلے کے مقابلے میں نوجوان زیادہ آگے بڑھنے اور پہل کرنے لگے ہیں۔ عورتیں اور ہریجن لوگ پہلے کی بہ نسبت اب زیادہ بڑے پیمانے پر پنچایتوں میں آنے اور اہم مرتبوں پر فائز ہونے لگے ہیں۔

(ج) پنچایتی راج سے لوگوں میں ذمےداری کا احساس بھی پیدا ہونے لگا ہے؛ اور اس کی بدولت لوگوں میں اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا عزم و اشتیاق بھی پیدا ہوگیا ہے۔

(د) بعض مقامات پر پنچایتوں اور پنچایت سمیتیوں کے درمیان اچھے ارادوں کے ساتھ مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ مہاراشٹر میں گاؤں پنچایتیں اپنے اپنے یہاں سے ناخواندگی کی لعنت کو ختم کرنے میں ایک

دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔

(۸) جوں جوں پنچایتی راج کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی ہیں، سرکاری کارکنوں کی کارکردگی میں اضافہ اور انتظامی امور میں بدمعاملگی اور بدعنوانی میں کمی ہوتی جارہی ہے۔

(۹) پنچایتوں کے قیام سے اسکولوں کے لئے لوگوں کا مطالبہ بڑھ گیا ہے اور بچوں اور بالغوں کی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کا لوگوں کو احساس ہوتا جارہا ہے۔

پنچایتی راج کے نظام میں سوشل ایجوکیشن کا کردار

سیمنار نے محسوس کیا کہ پنچایتی راج کے لئے مفید ثابت ہونے کی غرض سے سوشل ایجوکیشن کا جو پروگرام بنے اس میں اُسے اپنے حسبِ ذیل منصبوں کا بطورِ خاص خیال رکھنا چاہئے۔

(۱) لوگوں میں اِس بات کا شعور پیدا کرنا کہ پنچایتی راج کیا چیز ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے اور اسی کے ساتھ انھیں یہ جتلانا کہ پنچایتی راج کے اندر انھیں کیا حقوق حاصل ہیں اور اُن کے اوپر کیا ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔

(۲) جماعت کے باضابطہ اور بے ضابطہ گروہوں اور سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں کے درمیان سہکاری طرزِ عمل کا لوگوں کو عادی بنانا اور اِس عادت کی حوصلہ افزائی کرنا۔

(۳) لوگوں میں جماعت کے پچھڑے ہوئے طبقوں کی نیک خواہی اور ان کے معیارِ زندگی کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے کا جذبہ پیدا کرنا۔

(۴) خواندگی اور شہریت کی تعلیم کو فروغ دینا۔

(۵) لوگوں کو اپنے وسائل کا اندازہ کرنے کے گُر اور اپنی ترقی کے لئے منصوبے بنانے کا فن سکھانا۔

(۶) تعلیم کو مسلسل جاری رکھنے کی سہولتیں فراہم کرنا۔

(۷) نوجوانوں کے کلب، عورتوں کی انجمنیں، ہم خیال اور ہم مفاد لوگوں کی جماعتیں اور اسی طرح کی دوسری تنظیمیں بنوا کر اور اگر وہ پہلے سے موجود ہوں تو انھیں سہارا اور حوصلہ دلا کر لوگوں کو سرداری اور فلاحی منصوبوں کی تربیت دینا۔

پنچایتی راج کی تعلیمی ضرورتیں

خواندگی

سیمنار کی رائے ہوئی کہ سوشل ایجوکیشن کے پروگرام میں بالغوں کی خواندگی کو سب سے اونچا اور مقدم مقام ملنا چاہیے۔ پنچایتی راج نے جو فضا پیدا کر دی ہے اس کی روشنی میں ہمہ گیر خواندگی [illegible] ناخواندگی کے حق میں [illegible] دلائل پیش کئے گئے اور ان کے اوپر بحث ہوئی۔ سیمنار آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سما[illegible] سمجھداری کے ساتھ [illegible] کرنے کے لئے خواندگی بہت ضروری چیز ہے اور اس سے سماجی اختلافات اور چھو[illegible] [illegible] اور چونکہ یہی اوصاف پنچایتی راج کی کامیابی کے لئے شرط کا درجہ رکھتے ہیں اس لئے ہمہ[illegible] پنچایتی راج کو [illegible] بنانے میں دور رس نتائج حاصل ہوں گے۔ خواندگی کا میعار بہر حال وہ ہونا چا[illegible] [illegible] خواندگی [illegible] لٹریسی) کا ہوتا ہے۔

شہریت کی تعلیم

سیمنار کی رائے ہے کہ شہریت کی تعلیم سوشل ایجوکیشن کے پروگرام کا ایک اہم جزو ہونا چاہیئے۔ جمہوری ادارے اس وقت تک برگ و بار نہیں لا سکتے جب تک لوگوں میں ذمے داری کا احساس نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے شہریت کی تعلیم دینے کے دوران میں اس بات پر خاص توجہ دی جانی چاہیئے کہ لوگوں میں شہریت کے فرائض اور ان کی تعمیل کا پورا پورا شعور پیدا ہو جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے میں بے ضابطہ اور اپنے آپ بن جانے والے گروہوں اور غیر سرکاری انجمنوں اور سنستھاؤں سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔

کمیونٹی آرگنائزیشن کی تعلیم

سیمنار نے محسوس کیا کہ لوگوں کو کمیونٹی آرگنائزیشن کا گر سکھانا بہت ضروری ہے جب تک بستیوں کی چھوٹی چھوٹی تنظیموں کے ممبر اور بالخصوص اُن کے اگوؤں کو گروہوں اور جماعتوں کے اندر کام کرنے کا گر نہیں معلوم ہوگا اُس وقت تک اِن تنظیموں کے مقاصد حاصل نہیں ہو سکیں گے۔

جماعتی اتحاد و یک جہتی کی تعلیم

سیمنار کی رائے ہے کہ اگر کسی مقام پر جماعتی اتحاد و یک جہتی کی فضا نہ ہو تو وہاں یہ فضا پیدا کرنے میں سوشل ایجوکیشن کا بڑا اہم کردار ہو سکتا ہے لیکن اس مقصد کے لئے اگر خاندانی عداوتوں، ذات پات کے رواج اور طبقہ وارانہ یا سیاسی اختلافات کے اوپر براہِ راست حملہ کیا جائے گا تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اس کے بجائے ایسی سرگرمیاں منظم کر کے جو سب کے لئے یکساں طور پر مفید ہوں، لوگوں میں مشترک مفاد کا شعور پیدا کیا جا سکتا ہے۔ آگے چل کر جب لوگوں میں جمہوری طریقے پر سوچنے اور بات چیت کرنے کی عادت پیدا ہو جائے اس وقت اس مقصد کے لئے جمہوری طریقے کے بحث مباحثے کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پنچایتوں کے عہدداروں کی ٹریننگ

سیمنار نے محسوس کیا کہ پنچایتوں کے عہدہ داروں کی ٹریننگ بڑی ضروری چیز ہے اور اس میں سوشل ایجوکیشن کے کارکن ٹریننگ دینے والے دوسرے اداروں کی بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ اِس ٹریننگ میں ان عہدہ داروں کو ملک کے دستور کی اہم اور ضروری دفعات، ریاست کے بنائے ہوئے پنچایتی راج ایکٹ اور اس کے ماتحت وضع کئے ہوئے قاعدے اور ضابطے، ترقیاتی پروگراموں کو پورا کرنے کے طریقوں، سرکاری کارکنوں اور غیر سرکاری لوگوں کے باہمی تعلقات اور انسان ہونے کے رشتے سے لوگوں کے آپس کے سمبندھ وغیرہ کی معلومات بہم پہنچائی جانی چاہئے۔ سیمنار میں اس بات پر بھی سوچ بچار ہوا کہ اس ٹریننگ کی مدت کیا ہونی چاہئے۔ اِس بات پر رایوں میں بہت اختلاف تھا۔ اس لئے طے پایا کہ مدت کا فیصلہ ریاستی حکومتوں کے اوپر چھوڑ دینا چاہئے اس لئے کہ مدتِ تعلیم کا انحصار اس بات پر ہے کہ جو عہدہ دار ٹریننگ لینے کے لئے آتے ہیں ان میں اس کا کتنا شوق ہے۔ سیمنار نے اس باب میں بہر حال یہ نظریہ قائم کیا کہ اگر ٹریننگ کا نصاب کم مدت کا بھی ہو تو بھی اُسے زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنانا چاہئے اور پھر لوگوں کی دلچسپی کا پیمانہ دیکھنے کے بعد مدت کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی تعلیم

سیمنار کا خیال ہے کہ چونکہ سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کو عوام میں تبلیغ علم (ماس کمیونی کیشن) کا تجربہ ہوتا ہے اس لئے وہ آسانی سے لوگوں کو ترقیاتی پروگراموں اور ان کے لئے اپنے وسائل کو کام میں لانے کی تربیت دے سکتے ہیں اگرچہ ترقیاتی پروگراموں میں کام کرنے والے ہر ایکسٹنشن افسر کے اوپر اپنے اپنے کام سے متعلق لوگوں کی تربیت

رنے کی ذمّے داری ہے لیکن اس کے باوجود سوشل ایجوکیشن کا کارکن اِس کام میں انھیں مدد دے سکتا ہے۔

می یک جہتی کی تعلیم

اس سلسلے میں سوشل ایجوکیشن جو خدمت انجام دے سکتی ہے اس کے خاکے کے طور پر سیمینار نے حسب ذیل کاموں ور سرگرمیوں کی حمایت کی :۔

(۱) قومی تہوار اور تمام فرقوں کے سماجی اور مذہبی پیشواؤں کے جنم دن منانا۔

(۲) لوگوں میں تمام مذہبوں کی مشترک قدروں اور تعلیمات کی تبلیغ کرنا اور ان کے اندر ان قدروں اور تعلیمات کی عزت کرنے کا جذبہ بیدار کرنا۔

(۳) لوگوں کو ہندوستان کی تہذیبی میراث کی پہچان کرانا اور انھیں اِس راز سے واقف کرانا کہ ہمارے یہاں بہت سی اور مختلف قدروں کے میل سے ایکتا پیدا ہوئی ہے۔

(۴) لوگوں کو اس بات سے آگاہ کرنا اور اس کی قدر کرنا سکھانا کہ ہمارے یہاں پنچ سالہ پلانوں کی شکل میں آج کل کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور دوسرے تعمیری منصوبوں کے ذریعے جو زبردست کوشش ہو رہی ہے اس کا مقصد پورے ملک کو ایک سمجھ کر ترقی کی بلندیوں پر پہنچانا ہے۔

(۵) گاؤں کے لوگوں کے لئے دوسری ریاستوں کی سیر کے پروگرام منظم کرنا۔ سیمنار کی سفارش ہے کہ اس مقصد کے لئے ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک ریاست کے دیہی باشندے دوسری ریاستوں کے باشندے کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دیں۔

(۶) اپنے اپنے یہاں کے تفریحی اور تہذیبی پروگراموں میں دوسری ریاستوں کی مخصوص چیزیں شامل کرنا۔ سیمنار کی رائے ہے کہ سوشل ایجوکیشن کے کارکن دوسری ریاستوں کی مروجہ تفریحی اور تہذیبی چیزیں جمع کرکے محفوظ رکھیں اور ان میں سے ایک ایک دو دو چیزیں اپنے تفریحی اور تہذیبی پروگراموں میں شامل کرکے پیش کریں۔

پنچایتی راج میں سوشل ایجوکیشن کے کام کا ڈھنگ

اموں میں تال میل

سوشل ایجوکیشن کا کام سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری ادارے انجام دیتے ہیں۔ سیمنار کی رائے ہے کہ ن تمام اداروں کے کام میں تال میل قائم کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ضلع، ریاست اور مرکز کی

سطح پر اس کام کے لئے تال میل کمیٹیاں بنائی جائیں۔ گاؤں اور بلاکوں کی سطح پر یہ کام اس طرح ہو سکتا ہے کہ پنچایتوں اور پنچایت سمیتوں کی تعلیمی کمیٹیوں میں سوشل ایجوکیشن کا کام کرنے والی انجمنوں اور سنستھاؤں کے نمائندے بھی شامل کر لئے جائیں۔

خواندگی

بالغوں کی خواندگی کے ایک ہمہ گیر پروگرام کو چلانے میں مالی دشواریوں کا جو مسئلہ ہے اس کے اوپر سیمینار میں مفصل بحث ہوئی اس سلسلے میں بیان کیا گیا کہ اگر اڈلٹ ایجوکیشن کے کام کے لئے ٹیچروں کو مزید معاوضہ دیا جائے تو ناخواندگی کو ملک سے پورے طور پر ختم کرنے کے لئے اتنے سرمایے کی ضرورت ہوگی کہ ملک اسکی بار نہیں اٹھا سکے گا ان حالات کے پیش نظر اس سلسلے میں حسب ذیل سفارشیں منظور کی گئیں۔

(۱) اس بات کی کوشش کی جائے کہ ہر پڑھا لکھا شخص بغیر کوئی معاوضہ لئے چند ناخواندہ اشخاص کو پڑھا دے۔

(۲) نیم سرکاری اور غیر سرکاری سنستھاؤں سے اپیل کی جائے کہ وہ اپنے اپنے کام کے علاقوں سے ناخواندگی کا خاتمہ کرنے کی غرض سے اپنے اپنے بجٹوں میں رقم کی گنجائش رکھیں اور اس کو کام میں لا کر اپنے اپنے یہاں سے اس لعنت کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

(۳) نمائندوں کی بڑی تعداد اس بات کے حق میں تھی کہ بالغوں کو خواندہ بنانا اسکولوں کے ٹیچروں کے فرائض منصبی کا لازمی جزو قرار دیا جانا چاہیئے۔ وہ یہ کام اس طرح کر سکتے ہیں کہ اُن کے پڑھائی کے وقت میں سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ کم کر دیا جائے اور اس مدت میں ان سے کہا جائے کہ بالغوں کو پڑھائیں۔ کچھ نمائندے اس نظریئے کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ٹیچروں کے اوپر یہ کام زبردستی نہیں لادنا چاہیئے، اس کے برعکس انھیں اپنی رضا و رغبت سے یہ کام کرنے کے لئے ابھارنا چاہیئے۔ البتہ اس کام کے لئے اگر انھیں مزید وقت دینا پڑے تو اس کا انھیں معاوضہ دینا چاہیئے۔
سیمینار نے اس سلسلے میں بہرحال یہ رائے متفقہ طور سے قائم کی کہ ناخواندگی اور جہالت کے خلاف اس جہاد میں اسکولوں کے ٹیچروں کو زیادہ سے زیادہ ملانا اور اس سے انھیں قریب تر لانا چاہیئے۔

(۴) جہاں تک موسم گرما کی چھٹیوں میں اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کی خواندگی کی مہموں کا تعلق ہے سیمینار کی رائے ہے کہ یہ مہمیں بلاشبہ مفید ہوتی ہیں کم سے کم اس لحاظ سے کہ ان سے پڑھنے لکھنے کی فضا قائم ہو جاتی ہے اور سبق شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان مہموں سے فائدہ اٹھانا مقصود ہو تو خواندگی کے بعد کے مشق پروگرام

احتیاط اور سوچ بچار کے بعد منظم کئے جانے چاہئیں ورنہ اس طرح کی مہموں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

نوسکھ بالغوں کا ادب اور سماعی بصری سامانِ تعلیم

سیمنار نے اس سلسلے میں حسب ذیل تجویزیں منظور کیں :۔

(۱) جن ریاستی حکومتوں نے ابھی تک اس طرح کے تعلیمی سامان تیار کرنے والے محکمے نہیں قائم کئے ہیں انھیں چاہئے کہ جلد از جلد یہ محکمے قائم کرلیں۔

(۲) ریاستی حکومتوں کے علاوہ اس فن میں مہارت رکھنے والے اداروں کو بھی اس کام کے لئے آمادہ کرنا چاہئے اور مالی امداد دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرنا چاہئے۔

(۳) ریاستی حکومتوں کو اپنے اپنے یہاں بصری سامان تعلیم کی لائبریریاں بھی قائم کرنا چاہئے۔

(۴) ریاستی سطح کے علاوہ ضلعے کی سطح پر بھی سماعی بصری تعلیم کا منصوبہ بنانے کی غرض سے ایک کمیٹی ہونی چاہئے جس میں ضلعے کے تعلیمی حکام اور سوشل ایجوکیشن، پبلک ریلیشن اور دوسرے ترقیاتی پروگراموں کے افسر شامل ہوں۔

(۵) سماعی بصری تعلیم کے آلات کا استعمال سوشل ایجوکیشن کے آرگنائزروں کو خالصتہً تعلیم کی غرض سے کرنا چاہئے اور ان کے ساتھ ان آلات کو چلانے والے ماہر مستری مقرر کئے جانے چاہئیں۔

سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کی ٹریننگ

پنچایتی راج کے نفاذ کے بعد سے سوشل ایجوکیشن کے کارکنوں کی ٹریننگ کے پروگرام میں جو تبدیلیاں کی گئی ہیں ان پر سیمنار میں بحث ہوئی اور یہ طے پایا کہ کارکنوں کی ٹریننگ میں پنچایتی راج کے ضابطۂ کار کا جزو خاص طور پر شامل کیا جانا چاہئے۔

جنتا کالج

سیمنار نے محسوس کیا کہ اب وہ وقت آگیا ہے جب ملک میں زیادہ سے زیادہ جنتا کالج قائم کئے جانے چاہئیں۔ اگرچہ ان جنتا کالجوں کا سانچہ کم وبیش وہی ہونا چاہئے جو ڈنمارک کے فوک ہائی اسکولوں کا ہے۔ مگر اس کے باوجود

قوم کے معماروں کی تعمیر

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کا مقصد

قوم کے معماروں کی تعمیر

"میرا عقیدہ ہے کہ کمیونٹی پروجیکٹ کی اسکیم بہت بڑی اہمیت کی حامل ہے، اور میرے اس عقیدے کی بنیاد صرف یہی بات نہیں ہے کہ اس طرح کے منصوبے سے جو مادّی فائدے ہوں گے انھیں آپ اعداد وشمار کی شکل میں قلمبند کرلیں گے۔ یعنی یہ کہ اشیاء غذا کی پیداوار میں اتنا اضافہ ہوا، اور اتنے مکانات، اتنے اسکول، اتنے دواخانے، اتنی سڑکیں، اتنے تالاب، اتنے کنویں تعمیر ہوئے۔ ان مادّی کامیابیوں کی ایک فہرست آپ مرتب کرلیں گے اور اُسے دیکھ کر خوشی ہوگی ـــــ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کامیابیوں کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے ـــــ لیکن میری نظر ان کامیابیوں سے آگے اور بہت آگے اُن مردوں، عورتوں اور بچوں پر ہے۔ جو اس منصوبے کے اصل موضوع ہیں۔ ایک مکان اچھا اور خوبصورت ہوسکتا ہے، مگر مکان اور اس کے رہنے والوں کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی اس کے تعمیر کرنے والے کی ہے۔ اسی لئے میری نظر اچھے اور خوبصورت مکان کے اوپر اتنی نہیں ہے جتنی اس معمار کے اوپر ہے جو مکان کو تعمیر کرتا ہے۔ ملک میں جتنے لوگ بستے ہیں، ہم اُن سب کو ملک کا معمار بنانا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک کیمونٹی پروجیکٹ کی اسکیم کی اس قدر اہمیت صرف اس لئے نہیں ہے کہ یہ گاؤں میں مادّی سہولتیں اور آسائشیں فراہم کردے گی بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس لئے ہے کہ اس کا مطمحِ نظر جماعت اور فرد کی نشوونما ہے اور فرد کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے گاؤں کی تعمیر اور اس کے وسیع ترمعنی میں پوری قوم کی تعمیر کرسکے۔"

یہ وہ الفاظ ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو نے آج سے تقریباً دس سال پہلے (۱۰ مئی ۱۹۵۲ء) کو ڈیولپمنٹ کمشنروں کے سامنے اس وقت کہے تھے جب کمیونٹی ڈیولپمنٹ اسکیم کو عمل کے میدان میں آتارنے کی ابھی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس وقت ان الفاظ کے پیچھے فرد کی تعمیر و تربیت کے جس بلند مقصد کی روح کارفرما تھی اس کے خدوخال لوگوں کے سامنے اچھی طرح واضح نہیں تھے۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ کمیونٹی پروجیکٹ ایڈمنسٹریشن[1] نے اس بنیادی تصور کی بنیاد پر اس کا ابتدائی خاکہ تیار کر لیا تھا اور اسی کے مطابق بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کو چار مہینے کی ٹریننگ دے کر گاندھی جی کے یوم پیدائش کے موقعے پر اس خاموش انقلابی تحریک کا افتتاح کر دیا تھا۔

۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء سے ۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء تک نو سال پورے ہو گئے اور اب یہ اسکیم جو تین تین سو گاؤں کے ۵۵ ڈیولپمنٹ بلاکوں سے شروع کی گئی تھی اب دسویں سال میں داخل ہو چکی ہے اور ہندوستان کے ۶ لاکھ گاؤں میں سے ۴ لاکھ گاؤں اُس کی آغوشِ تعمیر میں آ چکے ہیں۔ اب سے ۹ سال پہلے کے حالات کی طرف پیچھے مڑ کر نظر کیجئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح یہ حوصلہ مندانہ سفر دیہی زندگی سے متعلق ہمارے خواب کو ٹھوس حقیقت میں بدلتا ہوا اپنی منزلِ مقصود کی طرف تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ آئیے اس موقعے پر ایک بار پھر دیکھیں کہ اِس قافلے کی منزلِ مقصود کیا ہے اور وہ کون سے عزم آفریں مقاصد ہیں جو اُسے اس تیزی سے آگے بڑھائے لئے جا رہے ہیں۔

فلسفیانہ بنیاد

کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اہمیت دو باتوں میں مضمر ہے ایک اس کے وہ مادّی نتائج جو ٹھوس شکل میں ہماری دیہی زندگی کو حاصل ہوں گے یعنی گاؤں میں ترقی یافتہ زندگی کی ضرورتوں اور آسائشوں کی بہم رسانی مگر جیسا کہ پنڈت نہرو کے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے۔ مقصد کا یہ وہ پہلو ہے جسے پابندِ قلم کیا جا سکتا ہے اور اس کی ٹھوس شکل دور سے نظر آ سکتی ہے۔ مگر کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی اصل غرض و غایت اس کا یہ پہلو نہیں ہے اور نہ اس معیار پر اُس کی اصل کامیابی یا ناکامی کی جانچ کی جا سکتی ہے۔ اس کی اصل غرض و غایت انسانوں (تصور کو اور قریب سے دیکھنے کے لئے گاؤں کے انسانوں کہیئے) کی تخلیق و تعمیر ہے جس کے فیض سے فرد کے اندر اپنی جماعت کے معیارِ حیات کو بلند سے بلند تر بنانے کی تحریک پیدا ہو اور وہ بستی کی ترقی کا رشتہ پوری قوم کی کوششِ تعمیر سے جوڑ دے۔

یہی وہ بنیادی اصول ہے جو کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کو ڈیولپمنٹ کے دوسرے پروگراموں سے نمایاں

---

[1] کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی وزارت جون ۱۹۵۸ء میں بنی اس سے پہلے اس اسکیم کا نام کمیونٹی پروجیکٹ ایڈمنسٹریشن تھا۔ . . .

کرتا ہے۔ اس سے پہلے بھی پیداوار بڑھانے کی تدبیریں، سڑکوں اور عمارتوں، نہروں اور تالابوں کی تعمیر اور صحت وصفائی اور تعلیم کی توسیع جیسے تعمیری اور ترقیاتی پروگرام چلائے جاتے تھے، مگر ان کی بنیاد فرد اور جماعت کی تعمیر کے تصور پر کبھی نہیں تھی اور نہ اُن کا منتہائے نظر جماعت سے فرد کی وابستگی کے جذبے کو فروغ دینا تھا۔

عملی بنیاد

(الف) زندگی کی ہمہ گیر تعمیر

جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا، کمیونٹی پروجیکٹوں کے آغاز سے پہلے جو تعمیری اور ترقیاتی کام ہوتے تھے اُن سب کی نوعیت غیر مربوط اور ٹیکنیکل کوششوں کی ہوتی تھی۔ نہر کا محکمہ الگ ہوتا تھا، پانی کی بہم رسانی کا محکمہ الگ، بیج اور کھاد کی فراہمی کا کام ایک محکمہ کرتا تھا تو قرض دینے اور واپس لینے کا انتظام ایک دوسرا محکمہ۔ ان میں آپس میں کوئی تال میل نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ تمام کام غیر مربوط طریقے پر ہوتے تھے اور ان میں باہم ٹکراؤ اور تکرار کا اکثر امکان رہتا تھا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دیہی زندگی کے جملہ مسائل کا آپس میں نہ صرف یہ کہ گہرا تعلق ہے بلکہ ایک کا دوسرے پر انحصار بھی ہے۔ پھر زندگی چاہے وہ فرد کی ہو یا جماعت کی وہ ایک ناقابل تقسیم حقیقت ہے۔ بستی کی زندگی کا معیار اسی وقت اونچا ہوگا جب اس کے تمام شعبوں میں بلندی پیدا ہو۔ زراعتی پیداوار کا تعلق جس قدر نہروں کی تعمیر، کھاد، بیج اور کھیتی کے ترقی یافتہ آلات اور طریقوں سے ہے اُسی قدر اس کا رشتہ لوگوں کی صحت، تفریح اور تعلیم کے انتظامات سے بھی ہے۔ یہی وہ عملی بنیاد تھی جس پر کمیونٹی ڈیویلپمنٹ کی موجودہ انتظامی اور فنی عمارت کو کھڑا کیا گیا ہے۔

(ب) عوام کی شرکت

اس اسکیم کا مقصد چونکہ ایک ایسے عمل کو حرکت میں لانا تھا جس کے اثر سے گاؤں کے لوگ "اپنی مدد آپ" کے اصول کی پابندی کرکے اپنی اقتصادی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے معیار کو بلند کریں اور اس طرح اپنی بستی اور اپنے ملک کی تعمیر میں پوری سرگرمی سے حصہ لیں، اس لئے اس کے پروگراموں میں عوام کا پورا پورا اشتراک حاصل کرنا ابتدا ہی سے اس کا مقصود نظر رہا ہے، لیکن وجہ جو بھی رہی ہو ان پروگراموں کی تعمیل و تکمیل میں یہ دشواری ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے کہ ڈیویلپمنٹ کے مقامی کاموں میں عوام کا تعاون حاصل نہیں ہو رہا ہے اس لئے کام مہنگا بھی پڑتا ہے اور وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہے۔ گاؤں میں ایک چھوٹی سی نہر بھی کھودنی ہو اور اس کا کام ہو رہا ہو سرکاری اہتمام میں تو سبھی جانتے ہیں کہ ٹکے کا کام روپے میں ہوتا ہے۔

لیکن اگر یہی یا اس سے بھی بڑے پیمانے کا کام خود گاؤں کے لوگ کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو ان کے پاس اتنا وقت اور اتنے وسائل ہوتے ہیں کہ اپنی مشترک محنت سے اُسے ٹکا لگائے بغیر آسانی سے انجام دے سکتے ہیں اور اس سے اپنے پیشے میں سہولتیں اور زندگی میں آرام پا سکتے ہیں۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ ایسے کاموں کی طرف لوگوں کی دلچسپی نہیں ہوتی۔ گاؤں کی گلیاں گندی حالت میں رہتی ہیں اور لوگ کیچڑ اور گندگی میں سن جانا پسند کر لیتے ہیں پھسل کر گرنے اور ہاتھ پاؤں توڑ لینے کا خطرہ مول لیتے ہیں مگر تھوڑا سا وقت نکال کر اسے ہٹانے اور صاف کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہے؟ اور مزاج کی اس افتاد کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟ لوگ اپنے گھروں کو تو صاف کرتے ہیں مگر گھر سے نکلے ہوئے اُسی کوڑے سے سامنے کی گلی کو گندا کر دیتے ہیں۔ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ اپنے گھر سے تو ان کا لگاؤ ہوتا ہے اور اُسے وہ اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ مگر بستی کے ساتھ اُن کا اس طرح کا لگاؤ نہیں ہوتا اور یہی وہ راز ہے جو ہمارے یہاں لوگوں کو اپنے گھر کے ساتھ ساتھ اپنی گلی اور اپنی پوری بستی کو "اپنا گھر" سمجھنے کی طرف مائل نہیں ہونے دیتا۔

کمیونٹی پروجیکٹ کی اسکیم کو اسی مشکل مسئلے کا حل تلاش کرنا تھا جو اس کے جملہ پروگراموں کے حق میں جسم کے لئے روح کا درجہ رکھتا ہے — اُس افسوں کی تلاش جس کے اثر سے گاؤں کے لوگ اپنے فاضل اوقات کو بستی کی تعمیر و ترقی کے لئے وقف کر دیں۔ جس سے ایک طرف مادی سہولتوں اور آسائشوں کی بدولت بستی جنت کا نمونہ بن جائے اور دوسری طرف وہ آسمانی مسرت بھی حاصل ہو جو کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنے کی بدولت دلوں کے مل کر ایک ہو جانے سے نصیب ہوتی ہے۔

خدا کا شکر ہے اور مقام مسرت کہ یہ اسکیم اُس افسوں کے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے اور وہ اسے ہاتھ آ گیا ہے۔ لیکن جادو کوئی ہو اس کا دستور ہے کہ اُس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک چلّے پر چلّا کھینچ کر اُسے جگا نہ لیا جائے۔ وہ افسوں ہی "پنچایتی راج" مگر یہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوگا جب تک عامل اُسے ریاض پر ریاض کر کے جگا نہ لے گا۔ افسوں ہاتھ آ گیا ہے اب ایک مرحلہ اُسے "جگانے" کا باقی رہ گیا ہے کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی سخت کوش اسکیم سے امید ہے کہ یہ مرحلہ بھی جلد پار کر لے گی۔

استادوں کا مدرسہ میری نظر میں

زیرِ نظر مضمون ڈاکٹر محمد اکرام صاحب نے استادوں کے مدرسے کی تقریب تاسیس کے موقعے پر طلبا کو خطاب کرتے ہوئے پڑھا تھا۔ اس مضمون میں مصنف نے استادوں کا مدرسہ (جامعہ ملیہ کے ٹیچرز کالج) کی بائیس سال کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ان روایات و اقدار پر بطورِ خاص زور دیا ہے جو جامعہ اور ٹیچرز کالج دونوں کی امتیازی خصوصیات کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مضمون سوشل ایجوکیشن کے حلقوں میں دلچسپی کا باعث ہوگا۔ —— ایڈیٹر

مدرسے کا جنم

استادوں کے مدرسے (ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ) کا جنم ۱۵ اگست ۱۹۳۸ء کو ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انڈین نیشنل کانگریس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستانیوں کی تعلیم کو ان کے مزاج اور ضروریاتِ زندگی سے قریب تر لانے کی غرض سے ایک نئے تعلیمی منصوبے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی فیصلے کے مطابق شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی صدارت میں اس منصوبے کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک کمیٹی بنی تھی جس کی رپورٹ کو کانگریس نے اپنے دوسرے سالانہ اجلاس میں منظور کیا تھا جس نے آگے چل کر بنیادی قومی تعلیم کے نام سے ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کردی تھی۔

اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جامعہ ہی نے سب سے پہلے قدم بڑھایا اور بنیادی تعلیم کے اسکولوں کے لئے اس نئے تعلیمی تصور کے مطابق استاد تیار کرنے کی غرض سے اپنے یہاں "استادوں کا مدرسہ" کے نام سے ایک ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جو آج خدا کے فضل سے "ٹیچرز کالج" کے نام سے ہندوستان میں قریب قریب ہر جگہ مقبول ہے۔

اس اعتبار سے ہمارے اس مدرسے نے آج اپنی زندگی کے بائیس سال پورے کرلئے۔ مجھے آپ کے سامنے اس ادارے کے تاریخی پس منظر کی منظر کشی کی خدمت غالباً اس لئے سپرد کی گئی ہے کہ میری معلمانہ زندگی کا آغاز بھی اس کی بسم اللہ کے ساتھ ہوا۔

جامعہ کی عمارتیں

بنیادی تعلیم کے مدرسوں کے لئے اچھے استاد تیار کرنے کا کام قرول باغ (دہلی) جہاں جامعہ نے ۱۹۲۶ء میں اپنے سفر کا دوسرا پڑاؤ کیا تھا ـــ کرائے کی ایک چھوٹی سی عمارت میں شروع ہوا تھا۔ اُس وقت جامعہ کا صرف مدرسہ ابتدائی (ریزیڈنشیل پرائمری اسکول) اوکھلے کی عمارت میں منتقل ہوا تھا، باقی تمام ادارے قرول باغ ہی میں تھے۔ ان میں سے کسی بھی ادارے کی اپنی عمارت نہ تھی۔ لیکن عمارتوں کی کمی سے جامعہ کے کاموں میں کسی قسم کی کمی یا خلل واقع نہیں ہوتا تھا۔ جامعہ کے استاد اور کارکن عمارتوں پر زور دینے سے زیادہ اپنے طالب علموں کی سیرت اور شخصیت کی تعمیر میں دلچسپی لیتے تھے۔ غالباً اسی چیز سے متاثر ہوکر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جامعہ کے طلبا کی انجمن اتحاد (اسٹوڈنیٹس یونین) کے ایک جلسے میں کہا تھا کہ

"جامعہ کی سب سے بڑی اور نمایاں خصوصیت اس کی عمارتیں نہیں، اس کے طلبا ہیں۔ انھیں قوم کی بہت سی امیدوں کو پورا کرنا ہے"!

جامعہ کی اس خصوصیت اور عمارتوں سے متعلق اس کے نظریئے کا اندازہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی اس تقریر سے بھی ہو سکتا ہے جو موصوف نے یکم مارچ ۱۹۳۹ء کو انجمن طلباء قدیم (اولڈ بوائز ایسوسی ایشن) کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے کی تھی۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ

"جب کبھی جامعہ میں کسی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جاتا ہے تو میرا دل تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ میں اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر جامعہ والوں کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ عمارتوں کی کثرت کسی ادارے کے لئے قابلِ فخر بات نہیں ہے۔ اکثر عمارتیں یا تو مقبرے ثابت ہوتے ہیں یا قید خانے اگر عمارت میں رہنے والے اصل مقصد کو بھول جائیں تو وہی عمارت ان کے مقاصد اور ارادوں کا مقبرہ بن جاتی ہے۔ اگر عمارتیں ہی اصل مقصد بن جائیں تو ان کی حیثیت جیل خانوں کی ہوجاتی ہے جن سے حوصلوں، امنگوں اور ولولوں کو نکلنے کی راہ نہیں ملتی۔ جامعہ کی پہلی عما

کا سنگِ بنیاد رکھتے وقت میں نے کہا تھا کہ کہیں ہم لوگ عظیم الشان اور فلک بوس عمارتوں میں بیٹھ کر اپنے مقاصد کو نہ بھول جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو آیندہ آنے والی نسلوں کو حق ہوگا کہ ہم کو ان عمارتوں سے دھکے دے کر نکال دیں اور ہمارے مقاصد اور ارادوں کے ان مقبروں کو گرا دیں۔ مجھے امید ہے کہ جامعہ کے طلبا، قدیم اس مقصد کو نہ بھولیں گے۔"

ایک دلچسپ واقعہ

میں اُستادوں کے مدرسے میں ۱۵ اگست ۱۹۳۸ء کو جو اس کی زندگی کا پہلا دن تھا، آیا تھا۔ میں سمجھے ہوئے تھا کہ مدرسہ کسی عالی شان عمارت میں ہوگا مگر جب آکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی کُل کائنات کرائے کا ایک منجھولے سائز کا مکان تھا اسی میں پڑھائی بھی ہوتی ہے اور نو سکھ استادوں کے قیام کا بھی انتظام ہے۔ مجھے چونکہ اپنے داخلے کی کارروائی مکمل کرانی تھی اس لئے پرنسپل صاحب کی تلاش تھی۔ اُس وقت میں نے سید انصاری صاحب کو کسی جلسے کے موقعے کے لئے فرش بچھاتے ہوئے دیکھا۔ انہی سے میں پرنسپل صاحب کا پتہ دریافت کرنے لگا۔ انھوں نے جواب دیا "آپ کو پرنسپل صاحب سے کام کیا ہے"؟

مجھے ان کے اس سوال سے اور اپنے سوال کا جواب نہ ملنے پر الجھن ہو رہی تھی۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ایک دوسرے صاحب (پروفیسر محمد عاقل صاحب) نے جو وہیں کھڑے تھے، مجھے سنبھال لیا۔ کہنے لگے آپ اپنا کام انہی کو بتا دیجئے۔ یہی آپ کے مدرسے کے پرنسپل بھی ہیں اور فراش بھی۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی مگر سید صاحب میری مدد کر کے بے حد خوش تھے۔ اُس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ جامعہ ہاتھ کے کام کی عزّت کرنے کا عملاً درس دیتی ہے، یہاں کے لوگوں میں بھائی چارہ اور مساوات کا سچّا جذبہ ہے اور یہ صحیح معنی میں آزاد خیال اور تعلیم یافتہ لوگوں کی جماعت ہے۔

مدرسے کے طلباء کا پہلا بیچ

سید انصاری صاحب پرنسپل بھی تھے اور استاد بھی۔ ان کے اسٹاف میں اُس وقت وہ اور شاید دو استاد اور پورے وقت کے تھے، باقی اساتذہ تھوڑے تھوڑے وقت کے لئے پڑھانے آتے تھے۔ پڑھائی کے معمول میں عام طور پر بحث و مباحثہ کے طریقے کو ترجیح دی جاتی تھی اور کتب خانے کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ اس نظری

تعلیم کے علاوہ یہ معمول بھی تھا کہ ہم لوگ کسی نہ کسی اُستاد کی رہنمائی میں قرب و جوار کے گاؤں میں جا کر گاؤں والوں کی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور اُن کی خدمت کا تھوڑا بہت کام کرتے تھے۔ ہمارے اساتذہ ٹرینگ کے اس پہلو پر خاص زور دیتے تھے۔

یہ تھا مختصراً وہ ماحول جس میں ہمارے بیچ کے ۲۲ طلبار نے اپنی ٹریننگ کا زمانہ گذارا تھا۔ ان ۲۲ طلبار میں سے آج سب کے سب تعلیمی کام میں مصروف ہیں اور اُن میں سے ۶ نے پی۔ ایچ۔ ڈی، اور ڈی۔ ای۔ ڈی۔ کی تعلیمی ڈگریاں حاصل کر لی ہیں، ۸ نے ایم۔ اے اور ایم۔ ایڈ کر لیا ہے اور باقی۔ انے بھی اعلیٰ تعلیم کی ایک نہ ایک منزل طے کر کے ذمے دار عہدوں پر فائز ہیں اور تعلیمی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ فنِ تعلیم میں اعلیٰ تر منازل طے کرنے کا یہ شوق غالباً نتیجہ ہے اُس ذہنی بیداری کا اور علمی ذوق و شوق کا جو زمانۂ تربیت میں جامعہ کے اساتذہ کے فیض صحبت سے ان میں پیدا ہوا تھا۔

اچھے استاد کی خصوصیت

استادوں کے مدرسے میں جب ہم نے اپنے نصاب کی تکمیل کر لی اور امتحانات ختم ہو گئے تو شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہمیں خطاب کیا اور اچھے استاد کی سیرت و شخصیت کی تعبیر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> اچھے اُستاد کی زندگی کی جڑیں محبت کے سرچشمے سے سیراب ہوتی ہیں اس لئے یہ وہاں امید رکھتا ہے جہاں دوسرے دل چھوڑ دیتے ہیں؛ وہاں تازہ دم رہتا ہے جہاں دوسرے تھک جاتے ہیں؛ اُسے وہاں روشنی دکھائی دیتی ہے جہاں دوسرے اندھیرے کی شکایت کرتے ہیں۔ یہ زندگی کی پستیوں کو بھی دیکھتا ہے لیکن اس کی وجہ سے اس کی بلندیوں کو بھول نہیں جاتا اور بڑے کی قدر کے ساتھ ساتھ چھوٹے کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتا فوق البشر کا تصور بھی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے مگر نادان اور بے بس بچے کی خدمت کو اپنی زندگی کا افتخار جانتا ہے، اور بچے کی طرف سے جب دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے: ایک اس کی ماں اور دوسرا اچھا استاد۔"

چلتے چلتے ڈاکر صاحب نے یہ ہدایت بھی کی کہ

> وہ استاد قوم کی خدمت کرتا ہے، اور قومی خدمت گار بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اچھا اُستاد سڑک پر

بیٹھ کر بچوں کو پڑھا سکتا ہے۔ اُسے دوسروں کی خدمت کرنی ہے اور اس کی عزت خدمت سے ہوتی ہے۔"

ہم ان ہدایات کی روشنی میں اپنے مدرسے باہر نکلے اور خدا کا فضل اور ان اساتذہ کا فیض کہ ہم کامیاب رہے۔ اس وقت جس عمارت میں ہم ہیں، اس کا سنگِ بنیاد، ہر مئی ۱۹۳۹ء کو جامعہ کے ایک سابق استاد اور مشہور جرنلسٹ شری کے۔ سنتانم نے رکھا تھا۔ ذاکر صاحب اس وقت یورپ میں تھے اور مجیب صاحب قائم مقام شیخ الجامعہ تھے۔ سنتانم صاحب کی تقریر کے بعد مجیب صاحب نے بھی ایک مختصر سی تقریر کی تھی جس کا ایک حصہ یہ تھا:

"۔۔۔۔ اور کہیں ہم یہ نہ بھول جائیں کہ عمارت کام کے لئے بنتی ہے ہمیں اپنا کام اس طرح بڑھانا ہے کہ اس کے لئے کوئی عمارت کافی نہ ہو۔ جامعہ جب قائم ہوئی تھی تو شاید کچھ لوگوں کو اس کی امید تھی کہ ہندوستان کو بہت جلد سوراج اور جامعہ کو اطمینان حاصل ہو جائے گا لیکن یہ غلط فہمی دور ہو گئی اور حالات نے ہمیں یقین دلا دیا کہ جامعہ جب تک صبر و استقلال کا نمونہ نہیں بنے گی، اُسے کسی خدمت کے لائق نہیں سمجھا جائے گا۔ اس لئے ہم نے طے کر لیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی دنیا کو آزمائیں گے زندگی اور محنت کو ایک تجربہ پر صرف کریں گے۔"

استادوں کے مدرسے نے اس باون سال کی زندگی میں بدلتے ہوئے حالات کے کیا کچھ کرشمے نہیں دیکھے! ہندوستان کی آزادی، ملک کی تقسیم اور اس کی بدولت اہلِ ملک کی تباہی، نفرت و تفرقے کا زہرہ گداز ماحول اور رچولہے چکّی تک کا بٹوارہ!! اس بٹوارے کا ملک کے قریب قریب ہر ادارے پر اثر پڑا ہے مگر استادوں کا مدرسہ اسی آزادی اور سکونِ قلب کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے جو تعلیمی اداروں کی خصوصیت ہوتی ہے وہ اپنے مقصد کے حصول میں لگا ہوا ہے۔ اس کا کام مسلسل آگے منھ کو بڑھ رہا ہے۔ یہ بنیادی اسکولوں کے لئے بھی استاد تیار کرتا ہے اور ثانوی مدرسوں کے لئے بھی۔ اس کے اہتمام میں تحقیق اور ریسرچ کا کام بھی شروع ہو گیا ہے اور توسیعی پروگرام بھی۔ اس کی نظر ہونے والے استادوں پر رہتی ہے اور ان لوگوں پر بھی جو ابتدائی تیاری کے بعد معلّمی کے پیشے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اسے اپنے آپ کو آزمانے اور پرکھنے میں مستقبل کی روشنی نظر آتی ہے۔ اس کے استاد جامعہ کے دوسرے استادوں کی طرح زندگی اور محنت کو تعلیمی تجربوں پر صرف کر رہے ہیں، اور مجھے امید ہے، اُس وقت تک صرف کرتے رہیں گے جب تک اپنی اصل منزل پر نہ پہنچ جائیں گے۔

تعارف

سہکاری کھیتی کی آزمائشی اسکیم

سہکاری کھیتی تیسرے پلان سے پہلے تک

چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں غریب کسانوں اور بے زمین کھیتہروں کی مشترک اور سرگرم کوششوں سے ملک کی زرعی پیداوار بڑھانے اور اس پیداوار میں ان سب کو حق دار بنا کر ان کی محنت کے مطابق ان کا جائز حصہ دلانے کے مقصد سے ہندوستان میں سہکاری کھیتی کا طریقہ اختیار کرنے کی بات سوچی گئی تھی۔

سہکاری بنیاد پر کھیتی کرنے کا طریقہ نیا نہیں ہے بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو کے قول کے مطابق اس کی روح کانگریس کی ان تجویزوں اور یقین دہانیوں میں کارفرما دکھائی دے گی جو اُس نے جنگِ آزادی کے دوران میں زرعی اصلاحات کے متعلق بار بار دہرائی ہیں۔ سہکاری کھیتی کے بارے میں بہت سی تجویزیں پہلی پنج سالہ یوجنا میں شامل کی گئی تھیں اور ریاستی حکومتوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سہکاری کھیتی کی حوصلہ افزائی کریں مگر سوائے اس کے کہ اس دوران میں سہکاری کھیتی کا کچھ چرچا ہو گیا، کوئی نمایاں کامیابی نہ مل سکی، یہاں تک کہ لوگوں کے ذہن بھی اس کی طرف سے پوری طرح صاف نہیں تھے۔

سہکاری کھیتی کے خیال کو عام ہونے میں سب سے زیادہ مدد کانگریس کے ناگپور کے اجلاس کی اُس تجویز سے ملی ہے جس میں اس نے سہکاری کھیتی کے پروگرام کا ایک خاکہ منظور کیا تھا۔ اس تجویز نے سہکاری کھیتی کے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لئے حکومت کو حوصلہ بھی دلایا اور اس کے ہاتھ بھی مضبوط کئے۔ اس تجویز کی حیثیت نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل اور پلاننگ کمیشن کے سابقہ فیصلوں کی ایک طرح سے تائید کی تھی، جسے ایک سیاسی جماعت کی ہنگامی تجویز سے زیادہ ایک مدت کی غور و فکر کا نتیجہ سمجھنا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔ مگر اس تائید سے ملک کے ایک خاصے بڑے حلقے میں اس تجربے کو آزمانے کا حوصلہ پیدا ہوا ہے۔

دوسرے پنج سالہ پلان میں سہکاری کھیتی کو ایک طے شدہ پروگرام کے ماتحت رواج دینے پر خاص طریقے سے زور دیا گیا تھا، جس سے کہ دس سال یا اُس کے آس پاس کی مدت میں ملک کی زیر کاشت زمین کے ایک قابلِ لحاظ حصے پر سہکاری

بنیاد پر کھیتی ہونے لگے۔ پلان کے مسودے میں یہ بات بہت بھروسے کے ساتھ کہی گئی تھی کہ ملک میں سہکاری کھیتی کو رواج دینے کے حق میں عام اتفاق پایا جاتا ہے، مگر جس بھروسے کے ساتھ یہ بیان دیا گیا تھا، اس منصوبے کو عملی میدان میں آگے بڑھانے میں اتنی شدت اور گرم جوشی نہیں دکھائی گئی۔ نتیجہ یہ رہا کہ دوسرے پلان کے بعد جب تیسرا پلان بنا تو بجائے اس کے کہ اس میں کچھ نئی باتیں کہی جاتیں، انھیں باتوں کو دہرا دیا گیا، مگر ایک فرق کے ساتھ۔

تیسرے پلان میں

سہکاری کھیتی کے بارے میں تیسرے پنج سالہ پلان میں ایک متوازن اور عملی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں دوسرے پنج سالہ پلان کے الفاظ کو دہرا کر اس بات کی تصدیق کی گئی ہے کہ سہکاری کھیتی کو ایک طے شدہ پروگرام کے ماتحت فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ پلان کے مسودے میں بتایا گیا ہے کہ چونکہ سہکاری کھیتی اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا بہت قریبی تعلق ہے اس لئے ضروری ہے کہ دونوں کے طریق کار میں یکسانیت ہو، یعنی لوگ اس میں اپنی مرضی سے شامل ہوں اور یہ پروگرام مقامی لوگوں کی رہنمائی میں چلے۔

سہکاری کھیتی کی آزمائشی اسکیم

تیسرے پلان کے مسودے میں ایک ٹھوس تجویز سہکاری کھیتی کی آزمائشی اسکیم ہے۔ اس کے ماتحت ملک کے ۳۲۰ ضلعوں میں یہ اسکیم چلائی جائے گی۔ ہر ضلع میں اسکیم کے ماتحت دس دس سہکاری سوسائٹیاں قائم کی جائیں گی۔ اس طرح تیسرے پنج سالہ منصوبے میں ۳۲۰۰ سہکاری کھیتی کی سوسائٹیاں قائم ہو جائیں گی جو اس اسکیم کو آگے بڑھانے میں مشعلِ راہ کا کام دیں گی۔

اس آزمائشی اسکیم کے ماتحت ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو ملک کے مختلف حصوں میں ۵۰ نئی سہکاری سوسائٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ حکومت نے ان سوسائٹیوں کو مالی اور فنی امداد بہم پہنچانے کا ایک پروگرام بنا لیا ہے۔ اس اسکیم کا تعارف کراتے ہوئے کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور کوآپریشن کی مرکزی وزارت کے ایڈیشنل سکریٹری نے لکھا ہے کہ

"ان میں بیشتر نئی سہکاری سوسائٹیاں قائم کی جائیں گی۔ پرانی سوسائٹیوں کی تعداد دس فی صدی سے زیادہ نہ ہوگی۔ نئی سوسائٹیاں بناتے وقت مندرجۂ ذیل باتوں پر خاص دھیان دیا جائے گا۔

(۱) سوسائٹی کے بیشتر ممبر چھوٹے کسان اور بے زمین کھیتہر ہوں۔

(۲) وہی لوگ ممبر بنائے جائیں جو فارم پر یا سوسائٹی کے دوسرے کام کرنے کو تیار ہوں (کھیتی کے علاوہ) دوسرے کام کرنے والے ایک چوتھائی سے زیادہ نہ ہوں۔

(۳) ریاستی حکومتوں نے فارم کا رقبہ اور سوسائٹی کے ممبروں کی جو تعداد مقرر کردی ہے اس سے کم نہ ہو۔

(۴) ممبر اپنی زمینیں ۵ سال کے لئے دیں۔ کچھ بہت غیر معمولی حالات میں زمین واپس لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

(۵) سوسائٹی کا مقصد بھرپور کھیتی کرنا ہے۔ کھیتی کے ساتھ ڈیری، مرغی پالنے اور چھوٹی چھوٹی دستکاریوں کے کام بھی شامل ہوں گے۔

(۶) سہکاری کھیتی کے لئے چک بندی ضروری ہے۔ جہاں چک بندی ہوچکی ہو یا ہو رہی ہو وہیں یہ سوسائٹی قائم کی جانی چاہئے۔

تیسری پنجسالہ یوجنا میں سہکاری کھیتی کو ایک طے شدہ پروگرام کے ماتحت چلانے کے لئے یہ آزمائشی اسکیم بہت عملی قدم ہے اس سے سہکاری کھیتی کو اپنی افادیت جتانے کا موقع ملے گا۔ ان کے نتائج اگر حوصلہ افزا نکلتے ہیں تو پھر گاؤں کے لوگ اس کی طرف خود بخود رجوع ہوں گے۔ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے والوں کے اوپر ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، اس لئے کہ ان کی کامیابی پر ہی ملک میں سہکاری کھیتی کی کامیابی کا دارومدار ہے۔

ڈائرکٹر کی رپورٹ ——— بقیہ صلا کا

بقیہ صلا کا

ان میں اپنی دیسی ضروریات و خصوصیات کے مطابق تبدیلیاں کرلینی چاہئیں۔ اگر جنتا کالجوں کی تنظیم اچھی ہو تو وہ پنچایتی راج کے لئے بہت مفید اور نتیجہ بخش ثابت ہوسکتے ہیں۔

سوشل ایجوکیشن کا انتظامی ڈھانچہ

اس سلسلے میں ۱۹۵۹ء کے دسویں نیشنل سیمینار میں جو سفارشات کی گئی تھیں سیمینار نے ان ہی کی تجدید کی۔

سیمینار نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ چند ریاستوں میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزروں کے عہدوں کو ختم کردیا گیا ہے یا انھیں دوسرے محکموں کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ سیمینار نے پرزور سفارش کی کہ ہر بلاک میں حسب سابق ایک سوشل ایجوکیشن آرگنائزر اور ایک لیڈی آرگنائزر کے عہدے برقرار رہنے چاہئیں اور انھیں محکمہ تعلیم سے منسلک کردینا چاہئے۔

کہانی

جنتا

ابھی وہ کل ہی تو آیا تھا، لیکن اُسے چاندنی رات میں تاج محل کی سیر دیکھنے کی کچھ ایسی بے چینی تھی کہ رات کاٹنی دشوار ہو گئی تھی۔ صبح ہوئی تو بیڈ ٹی اور ناشتہ وغیرہ کا بھی ہوش نہ رہا اور اسٹیشن پہنچنے کی تیاری اس بے تابی سے کرنے لگا گویا یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو نہ تاج محل کا وجود باقی رہے گا نہ پھر کبھی چاندنی رات آئے گی۔ اس کی گاڑی ایک بجے جانے والی تھی لیکن وہ صبح ہی سے جان کھانے لگا۔ میں نے ہزار سمجھایا کہ "بھئی میں بھی تو ساتھ چلوں گا تمھارے، میں یہاں کا باشندہ ہوں، تمھیں چاندنی رات میں تاج محل کی سیر دکھانے کی ذمّے داری میرے اوپر ہے، پھر اتنے اتاؤلے کیوں ہو رہے ہو۔ اطمینان سے ناشتہ واشتہ کر لو۔ پھر چلیں گے"!

"ناشتہ وہیں اسٹیشن پر کر لیں گے، بس اب چل دو!" ڈِک بولا،

"سبحان اللہ"، میں نے کہا "تم یورپ کے لوگ اوّل تو یوں ہی ہم ہندوستانیوں کے اقدارِ زندگی سے ناواقف ہوتے ہو، دوسرے تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ تمھیں کیا معلوم کہ ناشتہ نہ کیا تو میری بیوی کے دل پر کیا گذرے گی۔ بیچاری تمھارے آنے کی اطلاع پاتے ہی یورپینوں کی من بھاتی چیزیں تیار کرنے کا مطالعہ کرنے لگی تھی۔ رات کے پچھلے پہر سے تمھارے لئے ناشتہ تیار کرنے میں لگی ہوئی ہے"!

مجھے میری بیوی سے جس قدر محبت ہے اس کا حال اسے بہت پہلے سے معلوم تھا، اُسی وقت سے جب میں قیامِ یورپ کے زمانے میں اس کے یہاں پے اِنگ گیسٹ کے طور پر رہتا تھا۔ کہنے لگا "اچھا میں تمھاری بیوی کا دل نہیں توڑوں گا لیکن، دیکھو، تاج محل —— چاندنی رات !! —— اور پھر لاؤنا، جلدی ناشتہ لاؤ"!

"خدا کے بندے!" میں نے اُسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا "نہ جانے کتنی مشکلوں سے تو میں نے تمھارے لئے یورپین ٹائپ کا پاخانہ اور غسل خانہ بنوایا ہے۔ ان کا کم سے کم افتتاح ہی کر دو! ہندوستان کی سیاحت پر نکلے ہو، تمھارا کیا ٹھیک، لوٹ کر آؤ نہ آؤ۔

ڈِک میرے ان تکلفات اور فرمائشوں سے بے حد مکدر ہو رہا تھا۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو بڑی رعایت کرتا جب بھی کم سے کم "تم ہندوستانی لوگ!" کا فقرہ تو چست ہی کر دیتا۔ مگر ڈِک سے دوستی سے زیادہ برادرانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس نے شہر کے پر تکلف ہوٹلوں کو چھوڑ کر میرے گھر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ معمولات سے فراغت کر کے اور نہا دھو کر واپس آیا تو کہنے لگا "تم بڑے نالائق آدمی ہو جی، میں ہندوستان کی سیر کرنے آیا ہوں، یا یورپ کے ملکوں کی مٹر گشت کرنے!"

"یہاں کہاں میں رہو" میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ "تم نے تو ابھی اس سرزمین پر کل ہی قدم رکھا ہے، یہاں برسوں سے یہیں رہنے والے یورپین بھی قبض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کہیں بیمار ویمار پڑ گئے تو یہ تاج محل اور چاندنی رات میں اس کی سیر دھری کی دھری رہ جائے گی!"

"اچھا تو بھئی، اب تو پیشاب، پاخانہ، غسل، اور ناشتہ سبھی کچھ ہو گیا، اب تو چل دو!" اس کی بے صبری اب انتہا کو پہنچ گئی تھی۔

"چلو چلو، جلدی کرو، وہ آ گئی ہماری گاڑی۔ میں نے یورپ میں سنا تھا کہ ہندوستان کی ریلوں میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے!" وہ جمنا ایکسپریس کو پلیٹ فارم پر کھڑے ہوتے دیکھ کر اس کی طرف اس طرح لپکا جیسے خوانچے والے کی آواز سن کر میرا ننھا بچہ اس کی طرف لپکتا ہے چاہے خوانچے میں کیلے کے بجائے ہری مرچ کیوں نہ رکھی ہو۔

"پہلے اپنی گھڑی دیکھو۔ تمہاری گاڑی کا وقت ایک بجے ہے، اور ابھی ساڑھے گیارہ بجے ہیں!" میں نے اس کی بے صبری پر پھر اسے اطمینان دلایا۔

"مگر کیا یہ گاڑی آگرے نہیں جائے گی؟ لکھا تو اس پر بھی آگرہ ہی ہے!"

"جائے گی تو یہ بھی آگرے ہی، مگر ۔ ۔ ۔"

"مگر کیا، پھر اسی میں چلو!" ڈِک کے سر پر معلوم ہوتا تھا، آگرہ اور تاج محل کا بھوت سوار تھا۔

"بھئی یہ جمنا ایکسپریس ہے۔ اور ہمیں چلنا ہے دوسری گاڑی میں جو یہاں سے ایک بجے روانہ ہوتی ہے!"

"لیکن یہ کیا معمہ ہے، جب یہ بھی آگرے جاتی ہے، تو اسی میں کیوں نہ چلیں؟!"

"اس میں صرف تھرڈ کلاس کے ڈبے ہوتے ہیں، اب حل ہوا معمہ!" میں اس کی بے صبری سے تنگ تھا۔

"صرف تھرڈ کلاس ...... جنتا ایکسپریس!" وہ گہرے سوچ میں پڑ گیا، اور گاڑی نکل گئی۔

"جنتا کے تمہاری زبان میں کیا معنی ہوتے ہیں؟" ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس نے معمے کے تمام اشارے حل کر لئے تھے، صرف یہی ایک اشارہ اس کی سمجھ سے باہر تھا جس کے لئے اس نے میرا سہارا لیا تھا۔

"وہی جو انگریزی زبان میں "پیپل" کے ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جنتا ایکسپریس؟؟؟ ....." ایکسپریس کا لفظ تو وہ جانتا ہی تھا، اب اُسے "پیپل" سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا،

"تم انگریزی میں اسے "پیپلز ایکسپریس" کہہ سکتے ہو۔" میں نے اُسے ذہنی اذیت سے نجات دلانے کی غرض سے کہا۔

"ہاں، ٹھیک تو ہے "پیپلز ایکسپریس" مگر پیپلز .... تھرڈ کلاس۔ ایکسپریس" .....

"میاں چھوڑو بھی، کس گورکھ دھندے میں پڑ گئے، وہ آ گئی تمہاری گاڑی!" میں نے اسے یاد دلایا۔ مگر اُس کے اوپر گاڑی کے آنے کا مطلق کوئی اثر نہیں ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے افیم کی انٹی چڑھا گیا ہے۔ میں نے جوں توں اُسے جگایا اور گاڑی میں بٹھایا۔ لیکن اب تاج محل اور چاندنی رات کا اُس کے قلب و دماغ پر مطلق اثر نہ تھا۔ گاڑی روانہ بھی ہو گئی اور اسپیڈ میں بھی آ گئی، مگر وہ جوں کا توں ڈوبا ہی رہا۔ اب مجھے زندگی اجیرن معلوم ہونے لگی۔ اتفاق سے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں ہم تھے بھی کُل دو ہی آدمی۔

"یہ کیا بدمذاقی ہے۔ یورپین تو اتنے ....

"تم نے شاید مجھے "جنتا" کے معنی غلط بتائے ہیں" اس نے میرے سوچنے کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

"مگر یہ تم کس حماقت میں پڑ گئے! معلوم ہوتا ہے آج تاج محل اور چاندنی رات دونوں سر پیٹ کر روئیں گے اور تمہاری بدمذاقی کا ماتم کریں گے۔"

"نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ جنتا کے کچھ اور ہی معنی ہوں گے۔ یہ مجھے بے وقوف بنا رہا ہے"۔ وہ اپنی ہی ہانکے گیا۔ میری لعن طعن اس نے سُنی ہی نہیں۔

"نہیں، تم مجھے اُلو بنا رہے ہو۔ میں نے ہندوستانیوں کی انگریزی دانی کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ وہ پیپل کے لئے جنتا کا لفظ کبھی اختیار نہیں کر سکتے۔"

"اچھا، دیکھو، وہ تاج محل نظر آ رہا ہے۔ ابھی دس بارہ منٹ میں آگرے کا اسٹیشن آیا چاہتا ہے۔ اور ا

دیکھو، چاند بھی آج پورا ہے۔ وہ ادھر درختوں کی آڑ سے کس آن بان سے نکل رہا ہے۔" تاج کو دیکھ کر اوّل تو یونہی دل و دماغ پر شعریت طاری ہو جاتی ہے، کچھ میں نے جان بوجھ کر بھی اپنے اوپر شعریت طاری کی تاکہ میرا دوست فکر و فلسفے کے جنجال سے کسی طرح نکل آئے۔ مگر واہ رے فلسفی، اسٹیشن بھی آگیا، اس کی ہڑبونگ بھی شروع ہو گئی، اور وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ میرے اوپر ابھی شعریت ہی طاری ہوئی تھی، شاعری کا غلبہ نہیں ہونے پایا تھا، ورنہ فلسفہ و شعر ہمیں آگرے سے آگے نہ جانے کہاں تک پہنچا دیتے اور جب لٹ جھگڑا آتا تو غالباً ایک فلسفے کی زبان میں جواب دیتا اور ایک شعر میں۔

"تو یہ تھا تاج محل!" جب ہم تاج کی سیر کر کے اپنے ہوٹل واپس ہونے لگے تو ڈِک نے روکھے پن سے کہا۔ میں جل بھن کر راکھ ہو گیا، اور اُسے قصداً جلانے کے لئے بولا "جی ہاں یہ تھا تاج محل! یورپ میں بھی ہو کوئی ایسا شاہکار، یوں ہونے کو تو بڑے طنطنے کے بادشاہ وہاں بھی ہوئے ہیں!"

"میرے دوست، اسی کا تو مجھے غم ہے جس دیس کی شعریت اور خوش مذاقی کے ایسے ایسے زندۂ جاوید ثبوت موجود ہوں، وہاں اب ایسے کور ذوق پیدا ہوں گے، یہ بات سمجھ میں نہیں آتی!" ڈک نے پھر فلسفہ بگھارنا شروع کیا۔

"گھر سے اسٹیشن پہنچنے تک تو تمہارے اوپر تاج اور چاند کا عشق طاری تھا اور مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں زنجیروں میں جکڑ نہ دیئے جاؤ، لیکن اس کے بعد یہ تمہیں کیا ہو گیا!" ڈک کو جو ذہنی الجھان وقت کے جراثیم کی طرح کلبلائے دے رہا تھا، اس سے میں اب تک بے خبر تھا، اور اس کی شعریت شکن فیلسوفیت پر غصہ آنے لگا تھا۔ میں بے صبر ہو گیا اور بولا "آج تم نے میری قوم کی توہین کی ورنہ تاج کو آغوشِ ماہ میں رونق افروز دیکھ کر پتھر کی زبان بھی شعر اُگلنے لگتی ہے۔ بدمذاق کہیں کے!"

"میں تمہاری قوم کی توہین نہیں کر رہا ہوں، اس کے اوپر مجھے ترس آ رہا ہے اور انگریزوں کے اوپر غصہ انہوں نے تمہارے ملک کو تو ضرور آزاد کر دیا مگر ستم ظریفیوں نے تمہارے دماغوں کو اب تک جوں کا توں غلام بنا رکھا ہے!"

"یعنی؟" میں نے جھلا کر تشریح طلب کی۔

"یعنی کیا" وہ تو تھا ہی غصے کی حالت میں "یعنی یہ کہ تمہارے پڑھے لکھے اور عالی دماغ حکمراں اب بھی

جمہوریت کی روح سے واقف نہ ہو سکے اور واقف ہوں بھی کیوں کر۔ اُن کے اُوپر تو انگریز نے اپنی روایتی شاہی اور جاگیرداریت کا جادو کر رکھا ہے۔"

"بھئی ڈِک تم نے فلسفے میں ایم۔ اے کیا ہے اور میں ٹھہرا کورا افسانہ نگار جسے صرف دنیائے آب و گل سے واسطہ ہوتا ہے۔ تمھاری یہ آسمان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں" ڈک کی مستقل سنجیدگی سے اب میں کچھ مرعوب سا ہو چلا تھا۔"

"اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ سوال صرف احساس کا ہے۔ تم کہتے ہو تمھیں صرف دنیائے آب و گل سے واسطہ رہتا ہے، لیکن کیا تمھیں اس لفظ "جنتا ایکسپریس" نے چونکایا نہیں ؟ میں اب تک اسی کشمکش میں مبتلا ہوں کہ یا تو تم نے مجھے جنتا کا ترجمہ "پیپل" غلط بتایا ہے یا پھر تمھارے ملک کے اربابِ حل و عقد جان بوجھ کر اس لفظ کی توہین کر رہے ہیں" ڈک کے اوپر اس وقت بلا کی سنجیدگی طاری تھی۔

"پیپل کی توہین"!!

"اور نہیں تو کیا؟ مجھے کیا معلوم تھا یہ تو تمھی نے بتایا کہ جنتا ایکسپریس میں صرف تھرڈ کلاس کے ڈبے ہوتے ہیں۔"

"ہاں تو پھر"

"پھر یہ کہ تمھارے یہاں پیپل یا جنتا سے مراد صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہوں۔ مرے ٹوٹے غریب مفلس، میلے کچیلے اور بیمار بوں! یا کہو کوئی اور بات ہے!!"

"اور وہ لوگ جو فرسٹ، سکنڈ اور ایرکنڈیشنڈ کوچوں میں، یا ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں، وہ "پیپل" نہیں کچھ اور لوگ ہوتے ہیں! کیوں؟ اب کیوں سانپ سونگھ گیا تم کو۔ ابھی ایک منٹ پہلے تو بہت بڑھ بڑھ کر اپنی افسانہ جھاڑ رہے تھے"!

میں اپنی نظریں زمین پر گاڑے جوتے کی نوک سے فرش کو کریدنے لگا۔

"یہ بہت بڑی توہین ہے۔ ہمارے یہاں اگر ملک کے اربابِ حل و عقد اس طرح کی کوئی توہین آمیز حرکت کر بیٹھیں تو آن کی آن میں کان پکڑ کر ایوانِ حکومت سے باہر کر دیئے جائیں۔ . . . . . جنتا ایکسپریس، پیپلز ایکسپریس۔ ہہہہ!!

"یار ڈِک ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے پولیس والوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ اور تم جانتے ہی ہو، مجھے اپنی بیوی سے کتنی محبت ہے"۔

اپنا کام اپنے ہاتھ

گاؤں کا گرام بھون کیسا ہو؟

(جولائی کے پرچے سے ملا کر پڑھئے)

آپ کا گرام بھون گاؤں کی جتنی ضرورتیں پوری کرے گا اس کے حساب سے اس کا نقشہ بڑا لمبا چوڑا اور عمارت بڑی شاندار ہونی چاہئے۔ جو دیس ترقی میں ہم سے آگے ہیں اُن کے گاؤں میں جا کر دیکھئے تو گرام بھون کی عمارت گاؤں کے تمام مکانوں سے شاندار اور لمبی چوڑی ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے گاؤں ابھی پچھڑے ہوئے اور غریب ہیں۔ اس لئے ابھی اتنا ہی بہت ہے کہ ہم گرام بھون بنانے کا ارادہ کرلیں۔ کام شروع ہو جائے اور اس کے فائدے نظر آنے لگیں تو اونچے اونچے ارادے بھی پورے ہو جائیں گے۔

زمین کتنی ہو اور کہاں سے آئے؟

میں سمجھتا ہوں کہ گرام بھون کے لئے پکے بیگھے سے ایک بیگھا زمین کافی ہوگی۔ آپ پوچھیں گے "اتنی زمین کہاں سے آئے گی"؟ آپ کے گاؤں میں کچھ نہ کچھ زمین شاملات کی ضرور ہوگی۔ شاملات کی زمینیں گاؤں کی پنچایت کی ملکیت میں ہوتی ہیں۔ گاؤں کی پنچایت میں گاؤں ہی کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس لئے جب پورا گاؤں گرام بھون کا ارادہ کرلے گا تو پنچایت اس کے لئے شاملات کی زمینوں میں سے ایک نہ ایک ٹکڑا دے ہی دے گی بس

اتنی بات ضرور ہونی چاہئے کہ گرام بھون کے لئے جو ٹکڑا لیا جائے وہ گاؤں کے بیچوں بیچ ہو۔

عمارت کا نقشہ

زمین مل گئی۔ اب گرام بھون کی عمارت بنانی ہے۔ عمارت بنانے سے پہلے اسکا ایک نقشہ ضرور بنا لینا چاہئیے۔ اس سے یہ فائدہ رہتا ہے کہ جتنے حصے کا موقع ہوا، اتنا بنا لیا، باقی جب پھر ہاتھ کھلے تو اُس وقت بنوا لیا۔ بار بار سوچنا نہیں پڑتا۔

عمارت کا نقشہ ایسا ہونا چاہئے کہ آدھی زمین عمارت سے گھری ہو اور آدھی خالی رہے۔ عمارت میں ایک بڑا کمرہ جسے ہال کہتے ہیں ضرور ہونا چاہئے۔ ہال اتنا بڑا ہونا چاہئے کہ اس میں کم سے کم دو تین سو آدمی آرام سے بیٹھ سکیں۔ اُس کے ایک سرے پر ایک اونچا سا چبوترہ بنوا لیا جائے اور دائیں بائیں دو چھوٹے چھوٹے کمرے۔ اس چبوترے اور اس کے دائیں بائیں کمروں کی ضرورت اس لئے ہے کہ اس کے اوپر ناٹک اور ٹکنکیاں ہو سکیں اور دائیں بائیں کے کمروں میں سوانگ بھرا جا سکے کبھی کوئی سبھا ہو تو بھاشن یا لیکچر دینے والا اوپر کھڑے ہو کر بھاشن دے اور سب لوگ اُسے دیکھ سکیں۔ کوئی بھجن کیرتن یا مولود شریف کی مجلس ہو تو بھجن منڈلی اور مولود پڑھنے والے چبوترے پر بیٹھیں تاکہ سب لوگ انھیں آسانی سے دیکھ اور سُن سکیں۔ ہڑبونگ نہ ہو۔

اس بڑے ہال کے سامنے والے حصے میں ایک دالان یا برامدہ ہونا چاہئے جس کے ایک طرف ایک بڑا سا کمرہ گرام بھون کے منتری یا انتظام کار کے دفتر کے لئے ہو۔ دوسری طرف اتنا ہی بڑا ایک کمرہ مہمان خانے کے طور پر ہونا چاہئیے تاکہ بھاشن یا لیکچر دینے والے سجن یا بھجن منڈلی یا مولود شریف پڑھنے والے مولوی صاحب کو آرام اور آدر ستکار کے ساتھ بٹھایا جا سکے اور ان کے لئے چاء پانی کا انتظام کیا جا سکے۔

اِس برامدے اور آس پاس کے کمروں کے سامنے کھلا ہوا لمبا چوڑا ایک صحن ہونا چاہئے تاکہ گرمی کے دنوں میں جب ہال کے اندر بیٹھنا مشکل ہوتا ہے آنے جانے والے اس صحن میں بیٹھ سکیں۔ اس صحن کے ایک کونے میں پانی کے انتظام کے لئے ایک برما (ہینڈ پمپ) ضرور لگوادینا چاہئے تاکہ پانی کی تکلیف نہ رہے۔ برما نہ لگ سکے تو ایک چھوٹا سا کنواں ہی کھدوا لیا جائے۔ اس صحن کو درختوں اور پھولوں کی کیاریوں سے سجادیا جائے تو بہت ہی اچھا ہو۔ اسے جانوروں سے بچانے کے لئے اس کے گرداگرد ایک دیوار اور بیچ میں پھاٹک لگا دینا چاہئے۔

یہ تو ہو گیا ہال، منتری کا دفتر، اس کا مہمان خانہ اور صحن۔ گاؤں میں ننھے ننھے اور اسکولوں میں پڑھنے والے بچے بھی ہوتے ہیں اور یہ بچے بھی کھیلنا کودنا اور دل بہلانا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے گاؤں کے اندر کوئی معقول جگہ نہیں ہوتی اس لئے یا تو گھروں ہی میں پڑے پڑے ماں باپ کے گلے کا ہار بنے رہتے ہیں یا پھر گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان بچوں کے لئے بھی گرام بھون کی عمارت میں معقول جگہ کا انتظام ہونا چاہئے لیکن یہ شیطان ہوتے ہیں اور شور و غل بہت مچاتے ہیں۔ انھیں اس شور و غل اور کود پھاند سے روکنا بھی نہیں چاہئے نہیں تو اُن کی باڑھ رک جائے گی۔

اِن بچوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بڑے ہال کے دوسری طرف بھی کافی لمبا اور کھلا صحن چھوڑ دیا جائے تو بڑا اچھا ہوگا۔ ہال کے سامنے والے حصے میں بڑے اور جوان لوگ ہیں اور بچے دوسری طرف اپنا شور و غل مچاتے اور کود پھاند کرتے رہیں تو دونوں کی آزادی قائم رہے گی۔ ان میں کچھ بچے ایسے بھی ہوں گے جو اسکولوں میں پڑھنے جاتے ہوں گے۔ ماسٹر لوگ گھر پر ہی کرنے کے لئے بچوں کو کام دیا کرتے ہیں۔ گرام بھون میں ہال کے دوسری طرف ایک آدھ رہ اس کے لئے بھی ہونا چاہئے جہاں گاؤں کے پڑھنے والے بچے ایک جگہ مل کر بیٹھیں

اور اپنا پڑھنے لکھنے کا کام کر لیا کریں۔

اسی طرف کم سے کم دو نہیں تو ایک ہی کمرہ ایسا ہونا چاہئے جس میں گرام بھون کا سامان حفاظت سے رکھا جا سکے۔ سامان کیا یہی جاجم، ٹاٹ، اور دل بہلاؤ کا سامان جیسے فٹ بال یا والی بال اور اس کی جالی وغیرہ ہے۔ کہنے کو تو اِس وقت شروع شروع میں کوئی زیادہ سامان سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن جہاں انسان رہتے بستے ہیں، وہاں دھیرے دھیرے بہت سا سامان ہو جاتا ہے یہاں تک کہ کبھی کبھی گھر میں رکھنے کو جگہ کم پڑ جاتی ہے۔

ہاں ایک ضروری بات تو رہ ہی گئی۔ کوئی گرام بھون کتب خانے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور سونا سونا سا لگتا ہے کتب خانہ گرام بھون کے لئے بہت ضروری ہے۔ کہاں بنے؟ میری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ منتری کے دفتر کے سامنے والا کمرہ جو ہے نا، اُسی کو کتب خانے کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

گرام بھون میں پیشاب پاخانے کے لئے بھی جگہ ہونی چاہئے لیکن ہمارے یہاں تو یہ کام جنگل جھاڑ کی آڑ لے کر پورا کر لیتے ہیں۔ پھر بھی وقت بے وقت کے لئے ہال کے دوسری طرف والے صحن میں یا عمارت کے باہر کسی جگہ ایک اُٹھاؤ پیشاب گھر اور ایک ٹٹی بنا لینی چاہئے۔ اٹھاؤ ٹٹی اور پیشاب گھر وہ کہلاتا ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔ وہ لکڑی کا بنا ہوتا ہے اور اوپر تختوں ہی کی یا پھوس کی چھت ہوتی ہے اور سامنے کواڑ لگے رہتے ہیں۔ نیچے چاروں پایوں میں پہیہ لگا رہتا ہے۔ ایک جگہ زمین ذرا گہری کھود کر اُس پر یہ لکڑی کا ٹٹی گھر جما دیا۔ جب کھُدی ہوئی جگہ پیشاب پاخانے سے بھر جائے تو اُسے مٹی سے پاٹ دیا جائے اور ٹٹی گھر گھسیٹ کر دوسری جگہ جما دیا جائے۔ یہی اٹھاؤ ٹٹی گھر کہلاتا ہے اور گاؤں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔

یہ تو ہوا آپ کے گرام بھون کا نقشہ۔ اب اگلے پرچے میں ہم گرام بھون کے استعمال اور اس کا خرچ چلانے کے طریقوں کے بارے میں سمجھاؤ دیں گے۔

ادارۂ تعلیم و ترقی، جامعہ نگر، نئی دہلی

ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ماہوار رسالہ

تعلیم و ترقی

دسمبر ۱۹۶۱ء

جلد ۱۲ —— نمبر ۱۲

ترتیب

بانی:۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم

ادارۂ تحریر:۔

پروفیسر محمد مجیب

برکت علی فراق

رفیق محمد شاستری

دفتر

ماہنامہ تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی

قیمت سالانہ چار روپے فی پرچہ ۳۷ نئے پیسے

ٹیلیفون:۔ ۲۲۶۲۰

[illegible] نے [illegible] میں چھپوا کر دفتر تعلیم و ترقی جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

جے پرکاش نرائن کمیٹی کی رپورٹ

ایک ایسے ملک میں جس نے سوشلسٹ سماج کی تعمیر کا فیصلہ کر لیا ہو ترقیاتی اسکیموں کے نظام میں سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں کی خوشحالی کے لئے الگ سے تدبیریں سوچنا ایک انوکھی سی بات معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ ترقیاتی منصوبوں کی بنیاد ہی سماج کے مزدور اور پسماندہ طبقوں کی خوشحالی ہونی چاہئے۔ لیکن بہرحال ہو یہی کچھ رہا ہے چنانچہ شری جے پرکاش نرائن کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی اور اس سے فرمائش کی گئی تھی کہ وہ سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں کے بارے میں یہ مشورہ دے کہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام سے انھیں فیض پہنچانے کی کیا تدبیریں کی جاسکتی ہیں۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کا مطالعہ کیجئے تو اس میں اس انوکھے پن کا نہایت وضاحت سے اظہار ملتا ہے۔

رپورٹ میں اقتصادی پسماندگی کا جو معیار مقرر کیا گیا ہے اس کے مطابق ہماری دیہی آبادی کے ۸۰ فی صدی گھرانے (جن کی آمدنی ۱۰۰۰ روپیہ سالانہ سے کم ہے) اقتصادی اعتبار سے پسماندہ طبقوں کی فہرست میں آتے ہیں۔ اس میں بھی جو سب سے نچلی سطح پر ہیں یعنی ایسے گھرانے جن کی آمدنی ۵۰۰ اور ۲۵۰ روپیہ سال کی ہے ان کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ کمیٹی کی سفارش کے مطابق اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ ان کے لئے روزگار اور زندگی کی کم سے کم ضروریات کی بہم رسانی کی ضمانت کی جائے۔ اس نظریئے کی روشنی میں ضروری ہو جاتا ہے کہ ترقیاتی منصوبے کے تمام پروگرام اسی بنیاد پر مرتب کئے جائیں۔

رپورٹ میں اس بات پر خاص زور دیا گیا کہ جو لوگ محنت کر سکتے ہوں، اُن کے لئے روزگار مہیا کیا جائے اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب گاؤں میں مشینی صنعت کو پھیلایا جائے اور گاؤں کی پوری زمین کو پورے گاؤں کی مشترک ملکیت قرار دیا جائے۔ گاؤں میں چھوٹی صنعت کا فروغ ہی وہ وسیلہ ہے جس سے سماج کے پسماندہ اور زمین سے محروم لوگوں کو روزگار مل سکتا ہے۔ اس اعتبار سے کمیٹی کے نزدیک دیہی صنعت زراعت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اگرچہ اس کا پیمانہ بڑے پیمانے کی صنعت سے چھوٹا ہوگا۔

زراعت کی توسیع و ترقی سے نہ تو یہ ضمانت ہوتی ہے کہ اس سے چھوٹے کسانوں اور بے زمین مزدوروں کو بھی برابر کا حصہ مل سکے گا اور اس بات کا یقین ہے کہ اس سے بے زمین مزدوروں کو روزگار ملے گا۔ بلکہ اس کے برعکس زراعت جوں جوں مشینی طرز اختیار کرے گی

اسی حساب سے مزدوروں کے اوپر الٹا اثر پڑے گا اور اس کا فائدہ زیادہ تر خوشحال کسانوں اور بڑے بڑے کاشتکاروں کو ہی پہنچے گا۔ اگرچہ زرعی پیداوار میں اضافہ ملک کے غذائی مسئلہ کے حل اور اس کی ترقی پذیر صنعتوں کے لئے کچے مال کی فراہمی کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔ مگر زراعت کی ترقی پر منصوبے میں جس قدر رقم خرچ ہوتی ہے اس سے زرعی مزدوروں اور چھوٹے کسانوں کو نسبتاً بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ بھی اسی قدر اہم مسئلہ ہے جس کا ایک نیا ایک حل سوچنا ہے۔ اس مسئلے کا ایک حل کچھ تبدیلیوں کے ساتھ سہکاری کھیتی کو قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ حالت موجودہ سہکاری کھیتی کی تحریک کی رفتار اور اس کی ترقی کے معاملے کی طرف سے بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ سفارش کی گئی ہے کہ گرام دان کے بنیادی تصور کے مطابق گاؤں کے ذرائع پیداوار کو افراد کے بجائے پورے گاؤں کی ملکیت قرار دیا جا دیا جائے۔ اس بات کو اصطلاحی زبان میں ظاہر کرنے کی غرض سے کمیٹی نے "نیشنلائزیشن" کے وزن پر "ویلے جائزیشن" (VILLAGIZATION) کی ایک اصطلاح بھی وضع کی ہے۔

ہمارے خیال میں جے پرکاش نرائن کمیٹی کی یہ سفارشات نہایت معقول ہیں اور اگر "گرام سوراج" کے سنہرے خواب کو حقیقت کے حسین جامہ و پیراہن میں دیکھنا منظور ہے تو اس کی یہی ایک شکل سمجھ میں آتی ہے۔

بستی کی زندگی میں

اڈلٹ ایجوکیشن کا مقام

ذیل کا مضمون امریکہ کے مشہور مفکر اور ماہرِ تعلیم ڈاکٹر آرتھر مارگن کی کتاب "دی اسمال کمیونٹی" سے لیا گیا ہے۔ موصوف کی تصنیف، اگرچہ خالصتاً امریکی ماحول کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے تاہم کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے حلقوں میں "درسی کتاب" (ٹکسٹ بک) کی حیثیت رکھتی ہے۔ اڈلٹ ایجوکیشن سے متعلق یہ مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن جامع ہے اور اس سے اندازہ ہوگا کہ اڈلٹ ایجوکیشن جسے ہمارے یہاں بہت کم حیثیت حاصل ہے، اور صرف بالغوں کی خواندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا مقام امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی کس قدر بلند اور اہم ہے۔

—— ایڈیٹر

سماج کی ترقی کا واحد راستہ

یہ بات بھروسے سے کہی جا سکتی ہے کہ سماج صرف اڈلٹ ایجوکیشن کی بدولت ترقی کرتا ہے۔ اگر ہر نسل اپنی اولاد کو صرف وہی کچھ سکھائے جو اس نے خود اپنے بچپن میں سیکھا تھا تو ہماری ترقی کی رفتار ہی رک جائے۔ اگر ہم چاہیں کہ اپنی آنے والی نسل کے لئے اس تمدن سے جو ہم نے اپنے بچپن میں حاصل کیا تھا، کسی بہتر تمدن کا ترکہ چھوڑیں تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب پختگی کی عمر کو پہنچنے کے بعد ہم اپنے اندازِ فکر میں تبدیلی اور نقطۂ نظر میں وسعت پیدا کریں۔

دو خاص مقصد

سرداری کے وصف کو کارگر اور موثر بنانے کے لئے اڈلٹ ایجوکیشن ضروری ہے۔ مان لیجئے بستی کا کوئی شخص جت کر کے معاملہ

کے کسی موضوع میں مہارت حاصل کرتا ہے۔ اب اگر کوئی ایسا وسیلہ نہیں ہے جس سے وہ اپنی معلومات کو بستی کے دوسرے افراد تک پہنچا سکے تو بستی اس کی محنت اور کوشش کا کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اڈلٹ ایجوکیشن کا ایک خصوصی مقصد یہ ہے کہ وہ ایسے امکانات فراہم کرے کہ اگر کوئی شخص محنت اور کوشش کر کے اہم اور مفادِ عامہ سے متعلق کوئی معلومات حاصل کرے تو لوگ ان حقائق اور معلومات سے واقف اور بہرہ اندوز ہو سکیں۔ قریب قریب ہر بستی میں چاہے وہ دس پانچ ہی درجن اشخاص پر مشتمل ہو ایسی خواتین اور مرد ضرور ہوتے ہیں جو اپنے ہمسایوں کو کام کی باتیں بتانے کے قابل ہوں۔ ہر بستی میں ایک نہ ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے کہ وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے اور جو لوگ ان کی اہلیت و مہارت سے کچھ سیکھنا چاہیں ان کے لئے ان ماہرین کی خدمات حاصل کرے۔

بستی کی کمیونٹی کاونسل (گرام منڈل) میں ایک کمیٹی ایسی ہو سکتی ہے جس کے ذمے بستی کے لئے مختلف قسم کے پروگرام منظم کرنا ہو۔ یہ کمیٹی ایک طرف بستی میں آنے جانے والے لائق اور قابلِ قدر مقرروں، معلموں اور لیڈروں سے ربط و ضبط رکھے اور دوسری طرف مقامی تنظیموں اور اداروں سے تعلق رکھے جنھیں اپنے پروگراموں کے لئے مقرروں، معلموں اور لیڈروں کی ضرورت ہو۔ اسی کے ساتھ اس کمیٹی کو یہ اہتمام بھی کرنا چاہئے کہ اس طرح کا کوئی باہر کا عالم بستی میں آجائے تو بجائے اس کے کہ کوئی چھوٹی سی جماعت ہی اس سے مستفید ہو اس کی باتیں سننے کے لئے پوری بستی کو مدعو اور آمادہ کیا جائے۔

اڈلٹ ایجوکیشن کا ایک دوسرا مقصد لوگوں کو جمہوریت کے آداب و اطوار سکھانا ہے۔ اچھی رہنمائی سے لوگوں میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہونے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ لوگ اتفاقیہ طور پر جمہوری الخیال نہیں بن جاتے، اسی طرح جیسے کوئی اتفاقیہ طور پر موسیقار یا نجار نہیں بن سکتا۔ جمہوری الخیال بننے کے لئے جمہوریت کا آرٹ سیکھنا پڑتا ہے اور اگر رہنما عقلمند ہو تو وہ اس آرٹ کو اڈلٹ ایجوکیشن کے ذریعے کامیابی سے سکھا سکتا ہے۔

تعلیم: اڈلٹ ایجوکیشن کا پہلا منصب

اڈلٹ ایجوکیشن کا اولین منصب "تعلیم" دینا ہے۔ جیسا کہ ہیری، اے اووراسٹریٹ اور بونارو ڈبلیو اووراسٹریٹ نے اپنی کتاب "لیڈرز فار اڈلٹ ایجوکیشن" میں لکھا ہے:

"ہم نے اپنے یہاں بات چیت کے طریقے (ڈسکشن میتھڈ) کے نام پر طرح طرح کی جاہلانہ باتوں کو ایک جگہ پر جمع کر دیا ہے اور اس کو اپنی جمہوری رواداری کہہ کر ہم اپنے آپ کو خوش کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ملک تنگ آگیا ہے۔ اس میں تو شک نہیں ہے کہ جمہوریت میں ہر شخص کو بولنے اور بات کرنے کا موقع ہونا چاہئے چاہے بولنے اور بات کرنے والے کو یہ پتہ نہ ہو کہ وہ کس سلسلے میں اور کیا بول رہا ہے۔ لیکن بالغوں کے معلم کا منصب

یہی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو بولنے اور بات کرنے کے موقعے فراہم کرے۔ بلکہ اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن کے اثر سے لوگ صحیح معنی میں بولنے اور بات کرنے کا ڈھنگ سیکھ لیں مگر اس سے پہلے اڈلٹ ایجوکیشن کے لیڈر کے اندر ایسے حالات پیدا کرنے کا مادّہ اور صحیح طریقے سے بولنے اور بات کرنے کی لیاقت ہونی چاہیے۔ اس کے لئے صرف زبانی جمع خرچ سے کام نہیں چلے گا۔"

اڈلٹ ایجوکیشن کے موضوع سے متعلق کتابوں کا ایک دریا سا امنڈ آیا ہے جس میں خاتمۂ ناخواندگی سے لے کر یونیورسٹی ایکس ٹنشن کی اعلیٰ تعلیم تک قریب قریب تمام مسائل پر ایک نہ ایک تصنیف موجود ہے۔ صرف ایک کتاب میں ان تصنیفات اور مقالات کی جو فہرست دی گئی ہے وہ کچھ نہیں تو تین چار سو کتابوں پر مشتمل ہے۔

بھلا اس ڈھیر کو اپنے سامنے دیکھتے ہوئے ایک چھوٹی سی بستی کا کوئی فرد جو اڈلٹ ایجوکیشن کی راہ سے اپنے آپ کو بستی کے کسی کام کا بنانا چاہے، اپنا راستہ کس طرح نکال سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اگر حضرت شعیاء بالغوں کو تعلیم دینے کا پروگرام شروع کرنے سے پہلے اس فہرست کتب کو دیکھ لیتے تو یہ سوچ کر کہ جب تک میں ان میں سے دو ڈھائی سو کتابیں نہ پڑھ لوں، لوگوں کو تلقین کرنے کے کام کا اہل نہیں بن سکوں گا، اپنا فریضۂ نبوت چھوڑ بیٹھے۔ اور اگر یہ صورتِ حال واقع ہو جاتی تو دنیا اُن کا پیغام کبھی نہ سُن سکتی۔

مطالعہ تو اس میں شک نہیں ضرور کرنا چاہئے ایسی کتابیں جیسے سینڈرسن کی کتاب "لیڈرشپ فار رورل لائف" ہے اور ولاسٹرٹیڈ کی کتاب "لیڈرز فار اڈلٹ ایجوکیشن" ہے اور فولیٹ کی کتاب "دی نیو اسٹیٹ" ہے، ان کے مطالعے سے ایک شخص کو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جن کی بنیاد پر اڈلٹ ایجوکیشن کا کام بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی ایک اور کتاب والزر کی "دی آرٹ آف کانفرنس" ہے۔ ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد کام شروع کیا جا سکتا ہے اور اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی بالغوں کے کسی منجھے ہوئے معلّم کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا جائے تو اس سے بھی بہت مدد مل سکتی ہے۔ اسی طرح کوئی اچھی کتاب ہاتھ آ جائے تو اسے بھی پڑھ لینا چاہئے لیکن اچھی کتاب نکلتی بہت کم ہے۔ اور سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ کارکن کا اپنا تجربہ اس کا سب سے اچھا معلّم ثابت ہوتا ہے۔

سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقوں کی خوشحالی

جے پرکاش کمیٹی کی رپورٹ

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے ماتحت سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقے کی خوشحالی کے اقدامات تجویز کرنے کے لئے حکومت ہند نے دسمبر ۱۹۶۲ء میں جے پرکاش نرائن کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی کمیٹی کی رپورٹ حکومت کے سامنے زیر غور ہے۔ ہم یہاں اس رپورٹ کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

—— ایڈیٹر

مقصد و منشا

سماج کے کمزور اور پچھڑے طبقے کی بہبودی اور خوشحالی ہندوستانی سماج کے تمام پہلوؤں میں ایک عظیم اور پر امن انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔ اس عظیم ہندوستانی انقلاب کی ایک سب سے بڑی خصوصیت یہاں سے ذاتوں کی تقسیم کے نظام کا جڑ سے خاتمہ ہونا چاہئے، جس کے بغیر سماج کے نچلے طبقے کبھی ابھر ہی نہیں سکتے۔

تشویشناک مسئلہ

دیہی علاقوں کے ۸۰ فی صدی گھرانوں کی آمدنی ۱۰۰۰ روپئے سالانہ سے کم ہے۔ اس میں سے بھی ۵۰ فی صدی کی آمدنی ۵۰۰ سے بھی کم ہے۔ اس آخری طبقے میں کھیت مزدور، بہت چھوٹے کاشت کار، چھوٹے موٹے کام کرنے والے کاریگر اور دستکار شامل ہیں۔ ایک خاصی بڑی تعداد ایسے گھرانوں کی ہے جن کی سالانہ آمدنی ۵۰۰ روپئے سال سے بھی کم ہے۔ انہیں کنگال کہنا مناسب ہوگا۔

رپورٹ میں آمدنی کی کسوٹی پر اقتصادی حالت کو پرکھنے کا اصول مانا گیا ہے، جس کے مطابق ایک مقررہ روپئے سے کم آمدنی والے خاندان کمزور طبقے میں آتے ہیں اور اس میں بھی گاندھی جی کے "انت اودے" (سب سے نچلے والے کا سب سے پہلے بھلا) کے تصور کے مطابق سب سے پہلے وہ خاندان لئے جائیں جن کی سالانہ آمدنی ۵۰۰ روپئے سے بھی کم ہو۔ یہاں بھی کام ان خاندانوں کو لے کر شروع کیا جائے جو سب سے نیچی سطح پر ہیں۔ شیڈول جاتیوں اور قبائلی جاتیوں کے اوپر اس کا اطلاق نہ کرکے ان سب کا سماج کے کمزور طبقے میں شمار کیا جانا چاہئے۔

سماج کے ان کمزور اور پچھڑے لوگوں کے لئے سماج میں ایک باعزت مقام اور زندگی کی گذر بسر کی کم سے کم سہولت کی ضمانت ضرور ہونی چاہئے، جس میں کام کاج، رہنے کے لئے مکان، پینے کے لئے صاف پانی، تعلیم، صحت، اقتصادی لوٹ کھسوٹ سے نجات، سماجی اور تہذیبی پستی سے نجات، نقصان دہ اور فضول خرچ عادتوں اور رسم و رواج میں اصلاح وغیرہ شامل ہوں۔

زراعت

تیسرے پلان میں زراعت کی ترقی کو اولیت دی گئی ہے۔ جو اس میں شک نہیں بہت ضروری ہے۔ مگر آراضی کی تقسیم، کاشت کاری کا موجودہ نظام اور گاؤں میں پرانے جاگیردارانہ نظام کے اثرات کی وجہ سے زراعت کی عام ترقی کا سب سے زیادہ اور براہِ راست فائدہ بڑے اور منجھولے کاشت کاروں کو ہی پہنچ پاتا ہے۔ چھوٹے کاشت کاروں کے پاس آراضی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں اس لئے اصلاح آراضی کی اسکیموں سے انھیں نسبتاً کم فائدہ پہنچتا ہے۔

پھر یہ ضروری نہیں کہ زراعت کی اصلاح و ترقی کا کھیت مزدوروں کے اوپر بھی بہتر اثر پڑے۔ زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں کے چلن سے ضروری نہیں ہے کہ لوگوں کو کھیت پر زیادہ کام ملنے لگے۔ ترقی یافتہ اور مشینی کھیتی کا زیادہ فائدہ بڑے کسانوں کو ہی پہنچتا ہے۔

گاؤں میں پھیلی ہوئی چھوٹی کاشت کاریوں سے ایک طرف پیداوار کے بڑھانے میں دقت ہے تو دوسری طرف ان کے کاشت کاروں کی اقتصادی زندگی بھی بہت پست بنی ہوئی ہے۔ یہ بہت تشویشناک صورتِ حال ہے۔ اس سے نجات کی صورت کیا ہو؟

ایک صورت تو یہ بتائی جا سکتی ہے کہ ان چھوٹے کاشت کاروں کو کچھ اور زمینیں دے دی جائیں، جو ایک ناممکن سی بات ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ گاؤں کی تمام زمین کو یکجا کر کے اقتصادی لحاظ سے اُن کے مناسب چھوٹے بڑے ٹکڑوں کے

اچھے اور ترقی پسند کسانوں میں تقسیم کردی جائے (جس سے کہ ہر خاندان کو اپنی گذر بسر کے لئے پیداوار مل سکے اور زراعتی پیداوار مجموعی طور پر بڑھائی جا سکے) اور باقی ماندہ لوگوں کو شہروں کی گندی بستیوں میں ڈھکیل دیا جائے۔ یہ بات سب مانیں گے کہ یہ علاج خود مرض سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ اس کے خواہ جو بھی نتائج نکلیں سماج کے نچلے طبقے کا کوئی بھلا نہیں ہوگا جن کی خوشحالی کے لئے یہ تدبیر سوچی گئی ہے۔ سہکاری کھیتی کے پاس اس کا حل کسی حد تک موجود ہے، مگر سہکاری کھیتی کی ترقی کی رفتار اتنی سست ہے کہ اندیشہ ہے کہ علاج شروع ہونے سے پیشتر ہی مریض جاں بحق ہو جائے۔

اس سماجی اور اقتصادی مسئلہ کا واحد حل گاؤں کو اپنی ملکیت آپ بنانا ہے یعنی گاؤں کی تمام اراضی گاؤں کی ملکیت اور انتظام میں ہو۔ زراعت کے مسئلے کو سلجھانے کی یہ تدبیر ایک ساتھ سماجی انصاف اور زراعتی ترقی کے ذریعہ گاؤں میں صنعتوں کے پھیلاؤ کے لئے سازگار حالات پیدا کرنے، دونوں لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ اس ضمن میں دو تجویزیں زیرِ غور رکھی گئی ہیں۔

(الف) کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کا ایک مقصد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مدد سے کام کرنے اور ایک دوسرے کا حصہ بٹانے سے لوگوں میں بستی کی زندگی سے وابستگی کا احساس پیدا کرے جس سے ایک ایسا ماحول بن جائے کہ لوگ اپنی مرضی سے پیداوار کے بنیادی ذرائع پر بستی کا حق تسلیم کرلیں جیسے زمین۔۔۔"

مگر کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے حلقوں میں اور یہاں تک کہ اس کے غیر سرکاری معاونوں نے بھی اس مقصد کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ زمین کی مشترکہ ملکیت کے خیال کی تبلیغ ہمارے تعلیمی پروگرام کا ایک ضروری حصہ ہونا چاہیئے۔

(ب) کمیونٹی ڈیولپمنٹ کی وزارت سماجی عدل اور زراعت اور صنعتیت کی بقا اور ترقی کے نقطۂ نظر سے گاؤں کی زمین کو قانون کے ذریعہ مشترک ملکیت بنانے کا ایک مناسب پروگرام تیار کرنے کے لئے ایک سائنٹفک تحقیق کرے

روزگار کی ضمانت

حکومت کو چاہئے کہ وہ ان سب لوگوں کے لئے جو جسمانی محنت کرنے کے قابل اور اس کے لئے تیار ہوں، روزگار کی ضمانت دے۔ اس یقین دہانی سے ایک ایسا نفسیاتی ماحول تیار ہوگا جو ہندوستان کے لاکھوں خاندانوں سے ناامیدی اور پست ہمتی کو دور کر کے ان کی زندگی میں ایک ایسا جوش اور حوصلہ پیدا کریگا جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا ہوگا۔

دیہی صنعت کو فروغ

گاؤں کی اقتصادی زندگی کو بہتر بنانے اور سماجی اور اقتصادی اعتبار سے پچھڑے طبقوں کی زندگی کا معیار اونچا اٹھانے کے نقطہ نظر سے گاؤں کی صنعتیں بہت ضروری ہیں۔ کئی لحاظ سے اس کی زراعت سے بھی زیادہ اہمیت ہے۔ زراعتی ترقی کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہے مگر اس کی ترقی کی اپنی ایک حد ہے۔ دوسری طرف صنعتیں ہیں خواہ اس کا پھیلاؤ شہری علاقوں میں ہو یا دیہی علاقوں میں، اس میں پھیلنے کی بہت زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ یہاں دیہی صنعتوں سے گرام ادیوگ یا زراعتی پیداوار کو محفوظ کرنے والی صنعتیں مراد نہیں ہیں، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے کافی محدود ہوتی ہیں۔ ہمارے گاؤں میں مختلف النوع اور سادی حیثیت سے سارے ملک میں پھیلی ہوئی بے شمار صنعتیں قائم ہو سکتی ہیں اور انھیں قائم ہونا چاہیئے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ گاؤں کی صنعتوں پر سب سے زیادہ توجہ دے اور اس کے لئے ایک با اختیار جماعت (خواہ وہ موجودہ جماعتوں کو ملا کر ہی قائم ہو) مقرر کرے جو گاؤں میں صنعتوں کی منصوبہ بندی اور حوصلہ افزائی کرے۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام

کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود اس کی حیثیت صحیح معنوں میں کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے مقابلے میں عام ترقیاتی پروگرام کی ہی بنی ہوئی ہے۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ کی بنیاد میں "اپنی مدد آپ" کا اصول کارفرما ہوتا ہے جس میں حکومت اور دوسرے ادارے بھی اپنا تعاون دیتے ہیں۔ "یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ لوگ اپنی کوشش سے منظم ہو کر اور حکومت کی امداد حاصل کرکے اپنی بستی کی اقتصادی، سماجی اور تہذیبی حالت کو سدھارتے ہیں اور ان بستیوں کو قومی زندگی سے ہم آہنگ کرکے اس قابل بناتے ہیں کہ وہ قومی ترقی میں اپنا پورا پورا تعاون دینے لگیں۔"

کمیونٹی ڈیولپ منٹ صرف ایک طریق کار ہی نہیں بلکہ اپنی جگہ ایک مقصد بھی ہے۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام اور اس کے منصوبی بجٹ کو اسی بنیادی اصول کے مطابق ڈھال لینے کی ضرورت ہے۔ یعنی کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کا مقصد ہو بستی کی مجموعی حیثیت سے ترقی۔

سماج کے پسماندہ اور کمزور طبقے کے لوگ اپنی اقتصادی حالت میں اپنی تنہا کوششوں سے اصلاح نہیں کر سکتے ہیں، ساری بستی کو ان کی اس کوشش میں مدد دینی ہوگی۔ خوشحال طبقے کے اندر اس نقطۂ نظر کی تربیت کرنے کی ضرورت ہے کہ سماج کے نچلے طبقے کی زندگی میں خوشحالی پیدا کرنا ان کے فرائض میں داخل ہے۔

تیسرے پنج سالہ پلان میں امداد اور قرضے کے لئے جو رقمیں رکھی گئی ہیں وہ لازمی طور سے ایسے پروگراموں کے لئے وقف ہونی چاہیئں جو ساری بستی کی امداد اور تعاون سے پورے کئے جانے والے ہوں اور جن کا فائدہ خاص طور سے سماج کے نچلے

پہنچنے والا ہو۔ خوشحال کسانوں کو انفرادی طور پر امداد اور قرض وغیرہ دینے کی اسکیموں کو بڑھاوا نہیں دیا جانا چاہیئے جہاں کہیں انفرادی طور پر امداد یا قرض وغیرہ دینے کی اسکیم ہو وہاں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ان سے سماج کے کمزور اور پسماندہ طبقوں اور خاص طور سے شیڈول اور قبائل جاتیوں کو ہی فائدہ پہنچے۔

تمام ڈیولپمنٹ بلاکوں کی ترقی میں یکسانیت قائم رکھنے کے لئے لازمی ہوگا کہ اقتصادی اعتبار سے پچھڑے علاقوں کے ڈیولپمنٹ بلاکوں کو کچھ مزید امداد دی جائے۔ ہر بلاک سے ایک مقررہ رقم ۱۰۰۰۰ ہزار روپئے ہو سکتی ہے، ضلع پریشد کے پاس جمع کر دی جائے جسے اختیار ہو کہ وہ اس محفوظ رقم میں سے پچھڑے علاقوں کی اقتصادی حالت کو دیکھتے ہوئے ڈیولپمنٹ بلاکوں کو مزید امداد دے دے۔

دوسرے شعبہ جاتی پروگرام

جہاں تک زراعت، آب پاشی، پشو پالن، ماہی گیری اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں وغیرہ پیداواری اسکیموں کے لئے قرض دینے کا تعلق ہے اس کے قواعد وضوابط میں ترمیم کر کے اس بات کے لئے گنجائش نکالنا ضروری ہے کہ ان سے پسماندہ طبقوں کو خاص طور فائدہ اٹھانے کا موقع ہو اور انھیں اس میں ترجیح بھی دی جائے۔ جو امداد وغیرہ دی جائے وہ اتنی ہو کہ پیداواری کاموں کی ضرورت پوری کر سکے۔ جس سے کہ انھیں مزید رقم حاصل کرنے کے لئے مہاجنوں کے جنگل میں نہ پھنسنا پڑے۔

سوشل سروس، مکانوں کی تعمیر اور مقامی ترقیاتی کاموں سے پسماندہ طبقوں کو فائدہ اٹھانے کا سب سے زیادہ موقع دیا جانا چاہیئے۔

آبپاشی اور اصلاح آراضی، ڈیری، مرغی اور سور وغیرہ پالنے کے کاموں میں پسماندہ طبقوں کی ضرورت اور فائدے کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ گاؤں کی پیداوار کا منصوبہ بناتے وقت چھوٹے کسانوں کے مسائل پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہوگی۔ پسماندہ طبقوں کے لئے کھولنے اور مختلف پیشوں کی تعلیم اور تربیت کی سہولتیں فراہم کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

سہکاری کھیتی

سہکاری کھیتی کی سوسائیٹیوں کو مندرجہ ذیل سہولتیں دینے کی ضرورت ہوگی۔

(۱) زمین ۵ کے بجائے کم سے کم ۱۰ سال کے لئے یک جاکی جائے

(۲) کھیتوں پر کام کرنے والے مزدوروں کو قرض دیا جائے تاکہ وہ سہکاری کھیتی کی سوسائٹی میں اپنا حصہ خرید سکیں۔

(۳) ایک عام اصول یہ مان لیا جانا چاہیئے کہ پیداوار کا ۵۰ فی صدی (مزدوری، لگان، سود اور دوسرے اخراجات

نکال لینے کے بعد زمین کے مالکوں کو ادر ۴۰ فی صدی مزدوری کرنے والوں میں تقسیم کردی جائے اور ۲۰ فی صدی پیداوار محفوظ رکھ لی جائے۔

زمین یک جا کرنے سے پہلے اس کی قیمت کا اندازہ یونٹوں میں کرلیا جائے تاکہ جب سوسائٹی اس کے اوپر روپیہ خرچ کرکے اس میں اصلاح کرے تو زمین کی قیمت بڑھی ہوئی یونٹوں کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اگر زمین کی اصلاح کا کام ٹھیک ڈھنگ سے ہو تو پھر زمین کی قیمت کا بڑھنا یقینی ہے۔ زمین کی قیمت کی اس بڑھی ہوئی یونٹ میں بے زمین مزدوروں کو بھی شریک کیا جائے۔ بڑھی ہوئی یونٹ میں ایک تہائی حصہ زمین کے مالکوں کو دیا جائے اور دو تہائی یونٹ میں بے زمین کسانوں کو زمین میں حصہ دار بنایا جائے۔

پنچایتی راج کے اداروں کا منصب

دیہاتی سماج کے کمزور طبقوں کے لئے کام کرنا پنچایتی راج کے اداروں کا خاص منصب ہونا چاہئے۔ پنچایتوں پر یہ ذمہ داری ہونی چاہئے کہ وہ

(۱) سب کے لئے روزگار فراہم کریں۔
(۲) گاؤں کے سماج میں ایک کم سے کم سماجی خدمات کا انتظام کریں۔

پنچایتوں اور پنچایت سمتیوں کو چاہئے کہ وہ قرض وغیرہ دے کر پسماندہ طبقے کے لوگوں کو کوآپریٹیو سوسائٹیوں کا ممبر بنالیں۔ کمزور طبقوں کی خوشحالی کو ہی گاؤں کے پیداواری اور ترقیاتی منصوبوں کا معیار مقرر کیا جائے۔ کام کی ترقی کا سالانہ اندازہ لگاتے وقت اس کا خاص طور سے خیال رکھا جانا چاہئے۔

بالغوں کی خواندگی

کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور محکمۂ تعلیم کی مشترک ذمہ داری

۱۔ مسئلہ

بالغوں کی خواندگی یا اڈلٹ لٹریسی کا پروگرام سوشل ایجوکیشن کا ایک حصہ رہا ہے مگر اس سلسلے میں اب تک جتنی کوششیں کی
ا ہیں وہ سب ایک دوسرے سے الگ تھلگ اور غیر منظم رہی ہیں۔ اس دوران میں اس میں شک نہیں کہ کچھ ایسے اہم کام انجام پذیر
ئے ہیں جن کی حیثیت مشعلِ راہ کی ہوتی ہے۔ پہلے پنجسالہ پلان میں سوشل ایجوکیشن کو "بستی کی کوششوں سے بستی کی ترقی کا ہمہ گیر
دگرام" قرار دیا گیا تھا اور اسی لحاظ سے اس میں خواندگی، اچھی زندگی گذارنے کی تعلیم، شہری آداب کی تربیت، بستی کی تنظیموں کی
صلہ افزائی اور اقتصادی کارکردگی کے بڑھانے میں لوگوں کی رہنمائی کرنے کے کام شامل کئے گئے۔ سوشل ایجوکیشن کے تصور میں
رگی کے اتنے مختلف شعبوں کا احاطہ کیا گیا ہے اس کے پیچھے یہ حقیقت کارفرما ہے کہ جمہوری نظام میں منصوبہ بند ترقی کی کامیابی کے
لئے ضروری ہے کہ لوگوں میں سماجی تعلیم کی تبلیغ اور ترقی پسند نظریے کی اشاعت اور شہری زندگی میں اشتراک و تعاون کا جذبہ بیدار
گذشتہ دس سال میں سوشل ایجوکیشن کے دوسرے پروگراموں جیسے کمیونٹی سنٹروں کی تنظیم، گاؤں میں کتب خانوں اور دارالمطالعوں
یام، نوجوانوں اور عورتوں کی سرگرمیاں اور گاؤں پنچایتوں اور کوآپریٹیو تحریک کو ٹھوس بنیادوں پر کھڑا کرنے میں کسی حد
تو کامیابی ہوئی ہے مگر خواندگی کی رفتار تشویشناک حد تک سست رہی ہے۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۱ء کے درمیان خواندگی ۱۷ سے
کر ۲۴ فی صدی ہو گئی ہے اور یہ اضافے کی کیفیت مردوں میں ۲۵ سے ۳۴ فی صدی اور عورتوں کے درمیان ۸ سے ۱۳ فی صدی
ی ہے۔ ہمارے ملک میں ناخواندہ لوگوں کی آبادی تقریباً ۳۳ کروڑ ہے جس میں سے ۱۴ سے ۴۰ سال کی عمر کے لوگوں کی تعداد تقریباً

۲۰ کروڑ ہے یہی وہ طبقہ ہے جس کے لئے ہمیں خواندگی کی تحریک خاص طور سے چلانی ہے۔

نئے تقاضے

پنچایتی راج کے قیام سے ضلع، بلاک اور گاؤں کی سطح پر جمہوری اداروں کو جو اہم ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور کوآپریٹیو تحریک کو جو اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس کے پیشِ نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ کم سے کم مدت میں بالغوں کی آبادی کا ایک قابلِ لحاظ حصہ پڑھنا لکھنا سیکھ جائے۔ یہ بات ان لوگوں کے لئے انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ ساری بستی کے حق میں بھی مفید ثابت ہوگی۔

تیسرے پلان میں خواندگی

بالغوں میں خواندگی پھیلانے کا ایک جامع اور ہمہ گیر پروگرام کا خاکہ اگر تیسرا پنج سالہ پلان مرتب ہونے سے پہلے تیار ہو گیا ہوتا تو اس صورت میں شاید ممکن ہوتا کہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں اس کے لئے کچھ زائد وسائل فراہم کرتیں۔ پلان کے موجودہ خاکے میں سوشل ایجوکیشن کے لئے ۵ کروڑ روپئے فراہم کئے گئے ہیں، جس کی تفصیل اس طرح ہے :۔

مرکز میں ۹۲ لاکھ ریاستوں میں ۵ کروڑ ۴۰ لاکھ کمیونٹی ڈیولپ منٹ پروگرام کے ماتحت اندازاً ۱۹ کروڑ۔

(مگر یہ رقم لٹریسی کے لئے مخصوص نہیں ہے مثال کے لئے) مرکزی وزارتِ تعلیم کے پروگرام میں نیشنل فنڈامنٹل ایجوکیشن سنٹر کے کاموں کی توسیع، نوخواندہ بالغوں کے ادب کی حوصلہ افزائی، رضاکار اداروں کی امداد اور کتب خانوں کی توسیع کے پروگرام شامل ہیں۔ ریاستوں کے تعلیمی منصوبوں میں کتب خانوں، تسلسلِ تعلیم کی کلاسوں اور کسی حد تک بالغوں کے اسکول (اڈلٹ اسکول) کا قیام اور لٹریسی پھیلانے کی دوسری اسکیمیں شامل ہیں۔ کمیونٹی ڈیولپ منٹ کے ماتحت کچھ رقم عورتوں کے پروگرام کے لئے مخصوص کردی گئی ہے۔ لٹریسی کے لئے یہاں کوئی رقم مخصوص نہیں کی گئی ہے۔ مختلف کاموں کے لئے رقم کا تعین کرنے کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں اور پنچایت سمیتیوں کو سونپی گئی ہے۔

۳۔ وسائل کی یک جائی اور تقسیم

اڈلٹ لٹریسی کے مسئلہ پر خاطر خواہ اثر ڈالنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے جہاں سے جو بھی وسائل فراہم ہو سکیں یا ہو سکتے ہوں ان سب کو یک جا کر لیا جائے۔

(الف) بلاک کی سطح پر کمیونٹی ڈیولپ منٹ، شعبۂ تعلیم اور رضاکار اداروں کو ایک مشترک نظم اپنانا چاہیئے اور تعلیم بالغان

اور ٹیکنیکل مشترک پروگرام بنا کر کام کرنا چاہیے۔

(ب) سوشل ایجوکیشن کے بجٹ میں سے ایک قابل لحاظ رقم لٹریسی کے لئے مخصوص کر دینے کا مشورہ ریاستی حکومتیں بلاک کونسلوں اور پنچایت سمتیوں کو دے سکتی ہیں۔

(ج) پنچایتوں اور پنچایت سمتیوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے کہ وہ بالغوں کی خواندگی کے پروگرام میں مقامی لوگوں کو دلچسپی دلائیں اور مقامی طور پر کارکنوں اور وسائل کی فراہمی کریں۔

۴۔ انتظامی ذمہ داری اور کام کرنے والوں کو یکجا کرنا

لٹریسی پروگرام میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر اور بلاک ایجوکیشن آفیسر یا انسپکٹر آف اسکول کا ایک مخصوص منصب پہلے سے متعین ہو۔

(سوشل ایجوکیشن آرگنائزر پر سوشل ایجوکیشن کے مختلف کاموں کے لئے ذمہ داری ہے اور سب انسپکٹر آف اسکول یا بلاک ایجوکیشن آفیسر پر پرائمری اسکولوں کی خاص طور سے ذمہ داری ہے۔ ان کے موجودہ کاموں کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ انھیں خاص لٹریسی کے کام میں کس حد تک ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے؟)

بہت سی ریاستوں میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا تعلق محکمہ تعلیم سے ہے۔ لٹریسی پروگرام کی کامیابی میں یہ بات مددگار ثابت ہوگی کہ سب انسپکٹر آف اسکول اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر دونوں اپنے آبائی محکمہ شعبہ تعلیم سے وابستہ ہوں۔ بالغوں کی خواندگی کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں یہی شعبہ دونوں درجے کے افسروں کی مناسب رہنمائی کر سکتا ہے۔

لٹریسی پروگرام میں محکمہ تعلیم اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا تعلق

بالغوں کے ادب کی تیاری، خواندگی کے نصاب کا تعین اور لٹریسی کلاس کی تنظیم کی عام نگرانی یہ سارے کام ریاستوں کے محکمۂ تعلیمات کے مخصوص دائرۂ عمل میں آتے ہیں۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ اس پروگرام میں اس طرح معاون ہو سکتا ہے کہ وہ خواندگی کے پروگرام کو اس علاقے کی مخصوص اقتصادی اور سماجی زندگی سے ہم آہنگ کر دے جس سے لٹریسی کلاسوں کی تنظیم مقامی لوگوں کی کوشش اور اشتراک و تعاون سے کی جا سکے۔ خاص طور سے علاقے کی گاؤں پنچایتوں، کواپریٹو سوسائٹیوں اور دوسرے اداروں کو اس کام کے لئے آمادہ کرنا۔

اسکولوں اور تعلیمی اداروں کا تعاون

سوشل ایجوکیشن اور خاص طور سے لٹریسی کا پروگرام اُسی وقت کامیابی کے ساتھ چل سکتا ہے جب وہ پنچایتوں، کوآپریٹیو سوسائٹیوں اور مقامی رضاکار اداروں کی مدد سے مختلف تعلیمی درسگاہیں اپنے توسیعی پروگرام کی حیثیت سے چلائیں۔ اس میں سب سے زیادہ اہمیت گاؤں کے اسکول اور اس کے استاد کی ہے۔ سب انسپکٹر آف اسکول اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کو مل جل کر ایسا انتظام کرنا ہوگا جس سے بلاک کے پرائمری اسکولوں اور دوسری تعلیمی درسگاہوں کے اساتذہ لٹریسی پروگرام میں موثر اور کارگر طریقے پر حکومت، پنچایتوں اور پنچایت سمیتیوں کی امداد سے اپنا تعاون دے سکیں۔

اس پروگرام میں سب انسپکٹر آف اسکول اور سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کے کام

ایک مشترک پروگرام کی حیثیت سے خواندگی کا پروگرام موثر طریقے سے چلانے کے لئے محکمۂ تعلیم اور کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا محکمہ ریاستی سطح پر اگر ضروری سمجھے تو ضلع اور بلاک کی سطح پر ان کے تال میل کا پوری طرح انتظام کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں سوشل ایجوکیشن آرگنائزر کا مقامی کام ہوگا کہ وہ گاؤں پنچایتوں اور دوسری رضاکار جماعتوں کے تعاون سے بالغوں کی خواندگی کی جماعتیں قائم کرنے میں مدد دے۔ بلاک ایجوکیشن افسر یا سب انسپکٹر آف اسکول کا کام یہ ہوگا کہ وہ بلاک کی تعلیمی درسگاہوں اور خاص طور سے ان درسگاہوں کے اساتذہ کی مدد کرے کہ وہ بالغوں کی تعلیم کے رضاکار حلقوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔

سب انسپکٹر آف اسکول پر کام کا جس قدر بار ہے اس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ لٹریسی کی تمام کلاسوں کی نگرانی اور رہنمائی کر سکے، سوائے اس کے کہ وہ ان میں سے کچھ مرکزوں کو دیکھ لے اور مواد تعلیم، طریقۂ تعلیم اور عام انتظامی اور فنی معاملات میں کچھ مشورہ دیتا رہے۔ اس صورتِ حال میں ضروری ہوگا کہ اڈلٹ لٹریسی کا پروگرام چلانے والے پرائمری مڈل اور ہائی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کی مدد لی جائے۔

۵۔ پنچایتی راج کے اداروں کا منصب

اوپر جو باتیں کہی گئی ہیں، اڈلٹ لٹریسی کے پروگرام میں پنچایتی راج کے ادارے بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں:۔

(الف) تال میل پیدا کرنے والی جماعت کی حیثیت سے پنچایت سمیتی کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ لٹریسی پروگرام کی ٹھیک منصوبہ بندی ہوئی ہے اور تمام وسائل یکجا کر لئے گئے ہیں۔

(ب) گاؤں پنچایت گرام سبھا کی مدد سے گاؤں کے لوگوں میں جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل ہوں لٹریسی پروگرام کی طرف سے دلچسپی اور جوش و خروش پیدا کرے۔ اُسے پانچ سے دس سال کی مدت تک کا ایک باقاعدہ پروگرام بنانا چاہئے جس کے اندر گاؤں کی آبادی کی ایک بڑی اکثریت خاص طور سے ۴۰ سال سے کم عمر کے تمام مرد و عورت پڑھنا لکھنا سیکھ لیں۔

(ج) ضلع پریشد اور اس کی تعلیمی اور سوشل ایجوکیشن کمیٹی ضلع میں چلنے والے پروگراموں کا جائزہ لے سکتی ہے اور پنچایت سمیتی کے سامنے کچھ تجویزیں رکھ سکتی ہے۔

۶۔ اڈلٹ لٹریسی کا پروگرام

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے مندرجہ بالا تجاویز پہلی جماعت تک کی خواندگی کے معیار کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے، جس میں مجموعی طور پر ۵۰ گھنٹے تک کی تعلیم شامل ہو گی۔ گذشتہ تجربوں کی بنیاد پر یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ بالغوں کی خواندگی کے پروگرام میں نشانے مقرر کر کے کام کرنے سے نہ صرف یہ کہ اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ اور بہت سی برائیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ لٹریسی پروگرام کی کامیابی کے لئے اس بات پر سب سے زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے کہ (۱) ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ لٹریسی پروگرام بستی کے اندر عوام کی سرگرم تحریک بن جائے (۲) حکومت اور تعلیمی اداروں کی طرف سے بستی کی اس محسوس ضرورت کی منظم اور موثر طریقے سے تکمیل کی جائے۔

جہاں کہیں کچھ لوگوں کا ایک گروپ بن جائے کہ ۲۰ آدمیوں کا گروپ پڑھنا لکھنا سیکھنے کا خواہش مند ہو وہاں مقامی اسکولوں کو لٹریسی کلاس چلانے کا انتظام کرنا چاہئے۔ یہ کام وہ اپنے اسکول کے کسی استاد کو سونپ سکتے ہیں جس کے لئے اسے معقول معاوضہ ملنا چاہئے کوئی ۱۰ سے لے کر ۱۵ روپئے مہینے تک۔ استاد کے معاوضے کی یہ رقم شروع میں بلاک کے بجٹ سے فراہم کی جائے۔ اس کے علاوہ لیمپ، رجسٹر اور کچھ دوسرے سامان بھی لٹریسی کے بجٹ سے فراہم کئے جائیں۔

محکمۂ تعلیم اس کے لئے مزید وسائل فراہم کرے۔ پرائیوٹ اسکولوں کو اس پروگرام کے لئے امدادی گرانٹ دی جانی چاہئے۔ بستی کو بھی اس میں اپنا ایک کم سے کم حصہ دینا چاہئے جس میں روشنی کے لئے تیل کا انتظام اور لیمپ کی مرمت اور درستی وغیرہ شامل ہوں۔ محکمۂ تعلیم بالغوں کو کم قیمتوں پر کتابیں فراہم کرے۔

چار سے لے کر پانچ مہینے تک چلنے والے کورس پر بستی کو ۴۰ سے لے کر ۵۰ روپئے اور حکومت کو تقریباً ۱۰۰ روپئے فراہم کرنا ہوگا۔

یہ پروگرام بستی کے پڑھے لکھے لوگ رضاکارانہ طور پر بھی چلا سکتے ہیں۔ ایسے مرکزوں کو بھی مندرجہ بالا سہولتیں فراہم کی جانی

چاہیے۔ مگر یہ پروگرام جبری اسکولوں اور اس کے اساتذہ کی مدد سے چلایا جانا چاہیے۔ رضاکار اداروں اور کارکنوں کا کام اس پروگرام کی تو سیع و اشاعت میں مدد دینا ہے۔ رضاکار اداروں کے انتظار میں اس پروگرام کو روکے رکھنا اور رضاکار کارکنوں کو اسکول کے اساتذہ کا بدل سمجھنا غلط ہوگا۔

شہری علاقوں میں

شہری علاقوں میں ناخواندگی کو ختم کرنے کے امکانات گاؤں کے مقابلے میں زیادہ روشن ہیں۔ خاص طور سے عورتوں سے ناخواندگی دور کرنے کے لئے استانیاں مل سکتی ہیں۔ مندرجہ بالا سہولتیں شہروں میں بھی فراہم کی جانی چاہئیں۔ شہروں اور بڑے بڑے گاؤں میں اڈلٹ اسکول بھی قائم کئے جا سکتے ہیں۔

ضلع اور ریاست کی سطح پر امدادی خدمات

مندرجہ بالا پروگرام چلائے جائیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ضلع اور ریاست کی سطح پر کچھ ایسی تنظیم ہو جس سے کارکنوں کو مفید مشورہ، اچھی کتابیں اور دوسرے سامان مل سکیں۔ اس میں کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے قیام کی بہت اہمیت ہے۔

اڈلٹ لٹریسی کے لئے مزید وسائل

اڈلٹ لٹریسی کا پروگرام اگر بستی کی ایک جاندار تحریک کی حیثیت سے حکومت اور پنچایتی راج کے اداروں کا پورا تعاون اور رہنمائی حاصل کر کے پروان چڑھتا ہے تو اس پروگرام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس کے لئے مزید وسائل فراہم کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہ رقم کمیونٹی ڈیولپ منٹ اور تعلیم کے ماتحت ملنے والی رقموں کے علاوہ ہوگی۔ اگر ٹھیک نہج پر کوشش کی گئی اور اس میں پنچایتی راج اور تعلیمی ادارے دونوں پوری تندہی سے شامل ہوں تو پھر کام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ یہ ادارے ضرورت کے مطابق اپنے سالانہ منصوبوں میں مالی اور انتظامی مدد کی گنجائش نکال سکتے ہیں۔

کتب خانہ بہ حیثیت معلّم کے

کتب خانے کا نیا منصب

"کتابیں تو ہمارے پاس بہت ہیں مگر کوئی پڑھتا ہی نہیں!" یہ ہے وہ عام شکایت جو ہمارے یہاں کتب خانوں میں سننے میں آتی ہے۔ اگر کوئی لائبریرین زیادہ ترقی پسند ہوا اور اس شکایت میں اُسے قدامت کی بو محسوس ہوئی تو وہ اس کے بدلے یہ کہے گا "موجودہ دور میں زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ مطالعہ کا کسی کو ہوش ہی نہیں رہتا۔ دن بھر کا تھکا ہارا انسان گھر آکر آرام کرے گا یا کتب خانے میں آکر کتابوں سے الجھے گا!"

لیکن دنیا کی موجودہ تیز رفتاری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں شکایتیں اب قصۂ ماضی بن چکی ہیں۔ جس طرح موجودہ دور کا کارخانہ دار صرف مال ہی تیار نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے خریدار بھی پیدا کرتا ہے، بالکل اُسی طرح کتب خانے کا منصب الماریوں کو کتابوں سے بھر دینا ہی نہیں بلکہ کتاب پڑھنے والے بھی پیدا کرنا ہے اور جو کتب خانہ اس منصب پر پورا نہیں اُترتا اس کی جگہ اس لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھنے والی دنیا میں نہیں بلکہ پرانی اور از کار رفتہ چیزوں کے عجائب گھر میں ہوتی ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں کی سند

۱۔ امریکہ

کولمبیا یونیورسٹی کے ایک عالم کا بیان ہے کہ

"سمجھ بوجھ کے ساتھ پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرنا تعلیم کا عین مقصد ہے؛ اور صحت مند مطالعے کا ذوق پیدا کرنا

کتب خانے کا اولین منصب اہم اور کارآمد مضامین پر آسان زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کی فراہمی سے مٹلے کو حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے لیکن مطالعے کی راہ کی رکاوٹیں دور کرنا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا اس وقت تک کتب خانے کی موثر سے موثر خدمات سے بہت سے بالغ محروم رہ جائیں گے۔"

"کتابوں کی دنیا سے صرف وہی اشخاص ناآشنا نہیں ہوتے جو اچھی طرح پڑھ نہیں سکتے بلکہ اگر پڑھنے کی رفتار سست ہو، الفاظ کا خزانہ محدود ہو، پڑھتے وقت توجہ مرکوز نہ ہو سکتی ہو، اور طبیعت اکتائی ہوئی ہو تو کسی عمر، کسی صلاحیت، اور کسی معیارِ تعلیم کا آدمی کیوں نہ ہو، پڑھنا اس کے لئے اجیرن ہو جاتا ہے۔ یہ نقائص کئی وجہوں سے پیدا ہو سکتے ہیں مثلاً تعلیم کا کم ہونا، طریقۂ تعلیم کا نقص، غیر تعلیمی ماحول، دماغ کا کچا پن وغیرہ۔ مگر اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ہے جو ان نقائص میں مبتلا ہے اور اس لحاظ سے لوگوں کو مطالعے کے فن کی ٹریننگ دینا اولین تعلیمی ضرورت ہے (جو بہ وجوہ کتب خانہ ہی پوری کر سکتا ہے)"

ایک اور مصنف جس نے اب سے بیس پچیس سال پہلے امریکہ کے کتب خانوں کے کام کا جائزہ لیا تھا، اس نے اپنی ایک کتاب میں اپنے جائزے کا نچوڑ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"ان کتب خانوں کا زور کتابیں جاری کرنے کے اوپر زیادہ نہیں ہے، ان کی توجہ خاص طور پر اس بات پر رہتی ہے کہ افراد میں ایسے کاموں اور مشاغل سے دلچسپی پیدا ہو جو ان کی علمی اور ذہنی نشو و نما میں مددگار ثابت ہوں۔ ایسے لائبریرین جو معلم کی شان رکھتے ہیں، ان کی توجہ کتابوں کے پڑھے جانے کے اوپر اتنی نہیں ہوتی جتنی اس بات پر ہوتی ہے کہ لوگوں میں علم کی بھوک پیدا ہو اور وہ یہ سمجھنے لگیں کہ ان کی اس بھوک کو تسکین دینے کا ایک ذریعہ کتابیں ہیں۔"

۴۔ برطانیہ

کتب خانہ بالعموم افراد کی علمی خدمت کا ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر برطانیہ میں تعلیم ہو یا عوام کی فلاح کا کوئی دوسرا پہلو، سب افراد اور گروہ دونوں کے اوپر زور دیتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اُن کے یہاں گروہ کے اوپر زیادہ زور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں لوگوں کے ایک جگہ جمع ہونے کے موقعے جہاں جہاں بھی ممکن ہو، نکالے جاتے ہیں تاکہ وہ ایک دوسرے سے قریب آئیں اور ان میں جماعتی شعور بیدار ہو۔

برطانوی مزاج کی یہ خصوصیت اس کے کتب خانوں کے منصب سے بھی نمایاں ہے چنانچہ جہاں کتب خانے کا منصب لوگوں کے

اندر علمی ذوق کو ابھارنا قرار پایا ہے وہاں اسی کے پہلو بہ پہلو اس کا ایک اہم منصب یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے ایک مقام پر جمع ہونے کے زیادہ سے زیادہ موقعے بھی فراہم کرے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ برطانیہ میں کتب خانے بالغوں کی تعلیم کا کام ان اداروں کے مقابلے میں جو خاص اسی مقصد کے لئے قائم ہیں، اگر زیادہ نہیں تو کم بھی انجام نہیں دیتے۔ برطانیہ کے ایک ماہر لائبریرین ایڈورڈ سڈنی کا کہنا ہے کہ:

"پبلک لائبریری کا بنیادی منصب کتابوں کی فراہمی اور اس سے متعلق دوسری خدمات بہم پہنچانا ہے کیونکہ جب تک کتابوں اور اُن کی فراہمی کے وسائل سے لیس نہ ہو، کتابوں کی پہچان کے لئے ان کی تعارفی فہرستیں اور دوسرے ساز و سامان نہ فراہم کرلے، اطلاعات اور معلومات کا شعبہ منظم کرلے اور پڑھنے والوں کی رہنمائی کرنے کا انتظام نہ کرلے اُس وقت تک اُسے غیر رسمی تعلیم (تعلیم بالغان) اور ترغیب کا کام کرنے پر آمادہ نہیں کرنا چاہئے۔ ان بنیادی اور خاموش خدمات کو قربان کرکے کوئی دوسرا ضمنی کام خواہ وہ کتنا ہی جاذبِ نظر کیوں نہ ہو کتب خانے کے اوپر عائد نہیں کیا جانا چاہئے۔

"لیکن اس اصول کے باوجود کتب خانہ کتابوں کے علاوہ دوسرے ذرائع کو کام میں لاکر لوگوں میں ذوق و شوق پیدا کرنے کا کام کرتا ہے اور ان تک اونچے معیار کے تہذیبی و تعلیمی خیالات و افکار پہنچانے میں پیش پیش رہتا ہے۔ اس طرح کے مسلسل پروگراموں کے ذریعے وہ بہت سے ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جو اگر یہ پروگرام نہ چلتے تو کبھی کتب خانے کا منہ بھی نہ دیکھتے۔ کتب خانے کی ان سرگرمیوں کی بدولت لوگوں میں طرح طرح کے شوق بیدار ہوجاتے ہیں اور کتابوں کے استعمال میں انھیں اپنے اس نئے شوق کی تسکین کا سامان نظر آنے لگتا ہے۔

"اس کے علاوہ کتب خانے کی چہار دیواری کے اندر مختلف مضمونوں اور شوق سے دلچسپی رکھنے والے گروہوں کے ایک ساتھ جمع ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لائبریرین اور افراد کے درمیان ذاتی اور بے تکلفی کے تعلقات پیدا ہوجاتے ہیں جو ان دنوں میں جب کہ انسان طرح طرح کے افکار و مسائل سے گھرا رہتا ہے بے حد مشکل ہوتا ہے حالانکہ کتب خانے کے وسائل سے جی بھر کے مستفید ہونے کے لئے یہ چیز اسی قدر ضروری ہے۔"

کتب خانے کے نئے منصب سے متعلق یہی نقطۂ نظر ہے جس کے پیشِ نظر اب برطانیہ کے قریب قریب ہر کتب خانے میں تھیٹر، لکچر ہال، میٹنگ روم، نمائش گاہیں، پیانو، ارگن باجا، فلم یونٹ اور اسی طرح کی اور بہت سی سہولتیں فراہم کی گئی ہیں تاکہ کتب خانہ

تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بن جائے۔ یہ سرگرمیاں جو ان کتب خانوں میں منظم کی جاتی ہیں ضروری نہیں کہ کتب خانے ہی کے اہتمام میں منعقد ہوں، وہ کتب خانے کے زیر اہتمام بھی منعقد ہوتی ہیں اور مقامی گروہوں اور جماعتوں کے اہتمام میں بھی نمونے کے طور پر ایک کتب خانے کی سالانہ رپورٹ سے ایک نقشہ اعداد پیش کیا جاتا ہے جس سے کتب خانے کے کام کے صرف اُس پہلو کا اندازہ ہوتا ہے جو علمی و تہذیبی سرگرمیاں منعقد کرنے سے متعلق ہے۔ واضح رہے کہ یہ سب کام محض کتب خانے کے اہتمام میں نہیں ہوئے ہیں بلکہ ان میں سے بیشتر کام مقامی گروہوں اور جماعتوں نے کئے ہیں، کتب خانے نے محض کشادہ دل میزبان کا کردار ادا کیا ہے۔

کام کی نوعیت		حاضرین کی تعداد (کل میزان)
۱۔ ڈراما خوانی کا گروپ	۳۲۲ بیٹھکیں	۲۳,۰۰۹
۲۔ ناٹک اور ڈرامے		۲۹,۲۷۰
۳۔ بحث مباحثے کا حلقہ	۲۵۲ بیٹھکیں	۸,۵۸۳
۴۔ گراموفون بجائے گئے	۱۵۱ مرتبہ	۱۱,۰۹۶
۵۔ محفل موسیقی وغیرہ		۹,۱۶۵
۶۔ لیکچر	۳۵	۲,۶۸۴
۷۔ فلم شو	۳۱	۲,۶۴۵
۸۔ نمائشیں	۴۵	۷۰,۹۷۴
حاضرین کی کل تعداد		۱۰۵۷,۴۲۶

ان اعداد سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ نیا کتب خانہ تعلیم بالغان کے حق میں کیا کچھ خدمت انجام دے سکتا ہے چنانچہ سٹڈنی اگر یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اڈلٹ ایجوکیشن کی کوئی اسکیم ہو اس کے لئے ایک معقول اور کام کی دھنی پبلک لائبریری ریڑھ کی ہڈی کا حکم رکھتی ہے" تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

۳۔ ڈنمارک

ڈنمارک کی ترقی اور خوشحالی کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس ملک کے اوپر تعلیم بالغان کا بہت بڑا احسان ہے بلکہ یہاں تک کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تعلیم بالغان نے فوک ہائی اسکولوں کا روپ دھار کر اس کے حق میں فرشتہ نجات کا کردار ادا کیا ہے۔ اس لئے اس کا

قومی زندگی میں اگر قدم قدم پر تعلیم کا چرچا آتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ڈنمارک کے ایک ماہر لائبریرین کارل ٹامسن کا بیان ہے کہ

"پبلک کتب خانے تعلیمی کام سے الگ رہ کر اپنی ذمّے داریوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ کتب خانے کے فرائض کی حدیں بہت دور تک پہنچتی ہیں یہاں تک کہ جہاں کہیں اور جب کبھی آبادی کی خدمت کی ضرورت محسوس ہو، کتب خانے کی خدمات ناگزیر ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے کتب خانے کو اپنی چہار دیواری سے باہر نکل کر بھی خدمات انجام دینی ہوتی ہیں۔ کتب خانہ یہ خدمات کس حد تک انجام دیتا ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ لائبریرین نے تعلیمی کام کرنے والے دوسرے اداروں سے کس حد تک اپنے تعلقات قائم کئے ہیں۔"

چنانچہ یہی اصول ہے جسے کتب خانے کے عملے خصوصاً مہتمم کتب خانہ (لائبریرین) کے تقرر میں خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

"اگر پبلک کتب خانے کسی ملک کے عام نظامِ تعلیم کا ایک ضروری جز دبن سکتے ہیں تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کے عملے کے انتخاب میں یہ بات پیشِ نظر رکھی جائے کہ امیدوار میں کتابوں کی دنیا اور آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان ربط و اتحاد کی کڑی بننے کی صلاحیت کہاں تک ہے نہ یہ کہ وہ کتنا بڑا عالم ہے اور کتابوں کی ترتیب و تنظیم کا فن کہاں تک جانتا ہے۔"

"کتب خانے کے تعلیمی کام کا پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ آبادی کے ہر فرد کو کتاب دستیاب ہو سکے اور اُس کے سامنے وہ کتاب اس انداز میں پیش کی جائے کہ اسے پڑھنے کا اس کے دل میں اشتیاق پیدا ہو جائے۔ ۔ ۔ ۔ پبلک کتب خانوں کو تعلیمی کام کی ضروریات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینا چاہیئے اور کتابوں کی خریداری انھی ضروریات کے اعتبار سے کرنی چاہیئے۔ اس کے علاوہ اپنے حلقۂ عمل میں جہاں جہاں اور جو جو تعلیمی کام ہو رہا ہو، اُس سے کتب خانے کو ہمہ وقت عملاً ربط و اتحاد قائم رکھنا چاہیئے۔"

ہم نے کتب خانے کے نئے منصب سے متعلق مذکورہ بالا تین ملکوں سے جو سندیں پیش کی ہیں، وہ صرف نظریئے کی حد تک ہیں۔ اس نظریئے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ان ملکوں کے کتب خانے اور دوسرے تعلیمی ادارے کیا کچھ کرتے ہیں، اس کی داستان بہت لمبی ہے اس کا یہاں موقع نہیں ہے اور نہ ابھی ہمارے ملک کے حالات اس کی اجازت دیں گے کہ ہمارے کتب خانے وہ سب کام آن کی آن میں شروع دیں لیکن اپنے حالات کو دیکھتے ہوئے ہم جتنا کچھ کر سکتے ہیں، وہ ہمیں کرنا چاہیئے۔

ہمارے کتب خانے

ایک تجویز

ہمارا ملک ترقی کی راہ پر چل پڑا ہے، البتہ ہماری رفتار سُست ہے۔ اس سُست رفتاری کی وجہ کچھ ہماری ناواقفیت ہے اور کچھ سوڈیڑھ سو سال کی محکومی جس کے اثر سے ہمارے اعضا کچھ ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر ہم سچے دل سے اپنے ملک کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں تو ہمارے اعضا کا ڈھیلا پن بہت عرصے تک ہمارے راستے کو نہیں روکے گا اور ہم آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔

ترقی کے اس سفر میں ہم نے تعلیم کی راہ سے بھی خاصہ کام کر لیا ہے۔ ان پڑھوں کو خواندہ بنایا ہے، ان کے مطالعے کے لئے کتابیں تیار کروائی ہیں اور مزید ادب پیدا کرنے کی غرض سے مصنفوں کی ہمت افزائی کی ہے۔ ان کوششوں سے اتنا ہو گیا ہے کہ بازار میں بھی نوخواندہ اور نیم تعلیم یافتہ بالغوں کے مطالعے کی کتابیں ملنے لگی ہیں۔ لیکن نوسکھ اور کم پڑھے بالغوں کو یہ کتابیں پڑھنے پر آمادہ کرنے کے لئے ہم نے کتنا کام کیا ہے اور کر رہے ہیں، اس کا جواب اطمینان بخش نہیں ہے۔

یہ کام دراصل کتب خانوں کا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اوّل تو ہم نے اس مقصد کے لئے ضرورت کے مطابق کتب خانے قائم ہی نہیں کئے ہیں اور جو تھوڑے سے کتب خانے قائم ہوئے ہیں، وہ کتب خانے کے نئے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نوسکھ اور نیم خواندہ بالغوں کے لئے جو ادب تیار ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ گوداموں اور تہہ خانوں میں پڑا خراب ہو رہا ہے۔ ان کتابوں کی تصنیف و اشاعت کے پیچھے جو مقصد تھا، اُسے حاصل کرنے کے لئے ہمارے کتب خانے فی الحال جو کم سے کم کام کر سکتے ہیں وہ ہماری تجویز کے مطابق حسب ذیل ہیں:

۱۔ "کتابوں کی پہچان" کے جلسے

جن ملکوں کے کتب خانوں سے ہم نے کتب خانے کے نئے منصب کی سندیں پیش کی ہیں، ان کے یہاں کتب خانوں کے خاص اپنے اہتمام میں وقتاً فوقتاً کتابوں کی پہچان کے جلسے منعقد کئے جاتے ہیں اور جلسے کے دن ان کتابوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ کم سمجھ بوجھ کے لوگوں کو کتابوں کی فائدہ مندی کا پتہ چل جاتا ہے جو کتب خانے کے اندر رکھی ہوئی کتاب کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے سے بھی نہیں حاصل ہوتا۔ اس سلسلے میں یہ بہر حال ضروری ہے کہ کتابوں کا تعارف کرانے والا شخص ایسا ہو جو نہ صرف آسان زبان میں کتابوں کا تعارف کرانے کی قابلیت رکھتا ہو بلکہ علاقے میں ہونے والے تعلیمی کام سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔

۲۔ "کتابوں کی دنیا" کے عنوان سے ریڈیو پروگرام

ہمارے یہاں ریڈیو سے دیہاتی پروگرام بڑی تیاری اور اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ریڈیو بڑی اچھی خدمت انجام دے رہا ہے۔ لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اس پروگرام میں کم خواندہ اور نوسکھ بالغوں کے پڑھنے کے لائق کتابوں کا کبھی کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ ہماری رائے میں ریڈیو کو اپنے دیہاتی پروگرام میں یہ حصّہ بھی ضرور شامل کرنا چاہیئے۔

لیکن یہ کام کتب خانوں کو اپنے سے الگ کرکے نہیں کرنا چاہئے۔ ہونا یہ چاہئے کہ ہر ریاست میں ریڈیو کا محکمہ متعلقہ کتب خانوں سے خط و کتابت کرکے یہ اطمینان کرے کہ جن کتابوں کا تعارف کرایا جائے گا، وہ کتب خانوں میں موجود ہوں گی۔ اس کے بعد مہینے میں کم سے کم دو بار دیہاتی پروگرام کے موقعے پر دو دو تین تین کتابوں کی پہچان کرائی جائے۔

ریڈیو چونکہ مرکزی محکمہ ہے اس لئے وہ اتنے وسائل مہیا کرسکتا ہے کہ موثر انداز میں کتابوں کا تعارف کرا سکے۔ ہمارے خیال میں پہل ریڈیو ہی کو کرنا چاہئے۔ اس کے بعد اس کی دیکھا دیکھی مقامی کتب خانے اپنے طور پر بھی یہ سلسلہ آسانی سے شروع کرسکیں گے۔

یہ دو کام کم سے کم ہیں جن سے ہم نئے کتب خانے کی تحریک شروع کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ اتنا کام اور ہونا چاہئے کہ کتب خانے کی عمارت اتنی وسیع ہو کہ اس میں کم سے کم ایک ہال اور ایک ٹمنگ روم کی گنجائش بھی نکل سکے۔ اور کتب خانے کے مہتمم (لائبریرین) کے انتخاب میں یہ شرط رکھی جائے کہ وہ اپنے علاقے کے تعلیمی کام کرنے والے خصوصاً تعلیم بالغان کے تمام اداروں سے گہرا تعلق رکھے گا اور ان کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنے کتب خانے میں تندہی اور شوق سے اہتمام کرے گا۔

دہلی میں سوشل ایجوکیشن ڈے

پہلی دسمبر کو ہر سال پورے ملک میں سوشل ایجوکیشن ڈے منایا جاتا ہے۔ دہلی میں حسب دستور اس سال سوشل ایجوکیشن ڈے کی تقریب دہلی پبلک لائبریری میں منعقد ہوئی۔ تقریب کے موقع پر مہمان خصوصی کے طور پر وزارتِ تعلیم کے سکریٹری شری کرپال صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔

جلسہ ۲ بجے شروع ہوا۔ سب سے پہلے ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ دہلی ایڈمنسٹریشن کے مددگار ڈائرکٹر برائے سوشل ایجوکیشن شری نیکی رام گپتا صاحب نے دہلی میں سوشل ایجوکیشن کی رفتار کے عنوان سے سال بھر کے کام کی ایک مختصر مگر جامع رپورٹ پیش کی اس کے بعد جناب کرپال صاحب نے حاضرین کو جس میں بیشتر سوشل ایجوکیشن اور ڈیولپمنٹ کے کارکن شامل تھے خطاب کیا اور ملک کی ترقی و تعمیر کے سلسلے میں سوشل ایجوکیشن کی اہمیت کو واضح کیا۔ شری کرپال نے ملک کی مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس اہم پروگرام کے لئے جتنے سرمائے کی ضرورت ہے وہ تو یقیناً میسر نہیں ہے لیکن تعلیم کا کام ہمیشہ اور ہر زمانے میں کارِ خدمت سمجھ کر کیا جاتا رہا ہے اور اگر ہمارے کارکن اور معلم اس روایت کو مدِ نظر رکھ کر کام کریں گے تو یہ دشواری ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالے گی۔

کرپال صاحب کی تقریر کے بعد دہلی کے مختلف تعلیمی اداروں کی طرف سے چھوٹے بڑے متعدد تہذیبی پروگرام پیش کئے گئے جن میں گانے، ناچ اور آلاتی موسیقی وغیرہ شامل تھی۔

آخر میں ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ کے دیہی تعلیمی سینٹر کے اہتمام میں سنٹر کے انچارج جناب عبدالستار صاحب کا لکھا ہوا اور انہی کی ہدایت کاری میں تیار کیا ہوا ڈراما "یہ دتی ہے" پیش کیا گیا۔

دہلی یونیورسٹی میں مراسلاتی نصاب کا آغاز

اڈلٹ ایجوکیشن کے میدان میں یونیورسٹیوں کا جو کردار ہونا چاہئے اس کو ادا کرنے میں دہلی یونیورسٹی کو غالباً اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب اس یونیورسٹی نے عوام کے لئے شہر کے مختلف حصوں میں توسیعی لیکچروں کا [illegible]

آپ کے گاؤں کا گرام بھون

(نومبر کے پرچے سے ملا کر پڑھئے)

گرام بھون کا نقشہ تو سمجھ میں آگیا۔ اس کے لئے زمین بھی شاید مل جائے۔ لیکن عمارت کچی ہو یا پکی، پھونس کی ہو، یا کھپریل کی، اس کے بنانے پر کچھ نہ کچھ خرچ ہوگا، سوال یہ ہے کہ یہ رقم کہاں سے آئے؟

عمارت بنانے کے لئے خرچ کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ عمارتی سامان اور ہاتھ پیر کی محنت جسے عام طور پر مزدوری کہتے ہیں۔ جہاں تک ہاتھ پیر کی محنت کا سوال ہے، میں سمجھتا ہوں اس کے اوپر نقد رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خرچ شرم دان کے ذریعے نکل آنا چاہیئے۔ ہر گاؤں میں گھر پیچھے دو جوان تو ہوتے ہی ہیں جس دن گرام بھون کا کام ہونے والا ہو، اس دن ان میں سے ایک گھر کا کام دیکھے اور دوسرا گرام بھون کے کام پر جُٹ جائے۔ بیماری لاچاری کی بات دوسری ہے۔ اگر کوئی گھر خدا نہ خواستہ ایسا ہے جس کے اوپر اس طرح کی کوئی مصیبت پڑی ہو تو اُسے الگ کیا جاسکتا ہے اور اس سے کام میں کوئی بہت بڑی کمی بھی نہیں آئے گی۔

مثل مشہور ہے "دس کی لاٹھی، ایک کا بوجھ"۔ پورے گاؤں سے ایک ایک جوان کام پر جٹ جائیں تو دس دن میں ہونے والا کام ایک دن میں پورا ہو جائے۔

اب رہا خرچ کا دوسرا پہلو، عمارتی سامان ۔ میں سمجھتا ہوں پہلے پہل گرام بھون ایسے سامان سے بنے جو تھوڑا تھوڑا ہر گھر سے مل سکتا ہو ۔ یعنی نیچے سے اوپر تک پھونس کا، دیواریں بھی پھونس کی، چھت بھی پھونس کی؛ اس کے لئے تھوڑی سی لکڑی، بانس اور پھونس کی ضرورت ہوگی ۔ ویسے تو لکڑی اور بانس بھی ہر گھر سے تھوڑا تھوڑا مل سکتا ہے، لیکن اس کے بجائے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گاؤں کی پنچایت سے اجازت لے کر شاملات کی زمین سے لکڑی اور بانس بھی حاصل کر لیا جائے ۔ پھونس ضرور اچھے قسم کا ہونا چاہئے تاکہ اس سے بنی ہوئی دیواریں اور چھتیں دو چار سال ٹِک جائیں ۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح کا پھونس ہر گھر میں نہ ملے ۔ یہ مشکل اس طرح حل ہو سکتی ہے کہ جس کے پاس پھونس ہو وہ پھونس دے دے، جس کے پاس بانس ہوں، وہ بانس دے دے، جس کے پاس لکڑی ہو وہ لکڑی دے دے اور جس کے پاس پیسے ہوں، وہ پیسے دے دے ۔

اس طرح کام شروع کرنے کے لئے پھونس کا گرام بھون آسانی سے بن سکتا ہے جب لوگ اس کا فائدہ آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو اینٹ گارے اور پکی چھت کی عمارت بھی آسانی سے بن جائے گی ۔ اُس وقت گاؤں میں چہل پہل دیکھیں گے تو بکا س کنڈوا ۔ بھی اُس کی طرف دھیان دیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کے بار بار انکار کرنے پر بھی وہ خوشامد کر کے آپ کو گرام بھون کی عمارت کے لئے پیسہ اور سامان دے دیں ۔

گرام منڈل

گرام بھون تو بن گیا ۔ لیکن اب اسے آباد رکھنے کا سوال ہے ۔ اگر وہ آباد نہ رہا اور اس کا استعمال نہ ہوا تو ساری محنت اکارت گئی ۔ ہمارے گاؤں کے بھائی اتنے شاہ خرچ

ہیں کہ ان کی اس طرح کی محنت اکثر اکارت جاتی ہے لیکن انھیں پرواہ نہیں ہوتی۔ ہم نے بہت سے گرام بھَوَن دیکھے ہیں جو بنائے تو گئے تھے بڑے شوق اور چاؤ سے۔ محنت اور روپیہ بھی اس کے اوپر دل کھول کر خرچ کیا گیا تھا، لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اُجاڑ پڑے رہتے ہیں اور انسانوں کی جگہ چڑیوں اور گیدڑوں کی چہل پہل رہتی ہے۔ اُنہی کی بھجن منڈلیاں اور پنچایتیں جُڑتی ہیں۔ گاؤں کے لوگ اُس کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے۔ اس لئے گرام بھون کا بنا لینا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اس کا بسائے رکھنا مشکل ہے۔

گرام بھَوَن اُجاڑ اِس لئے پڑے رہتے ہیں کہ اُن کو بسائے رکھنے کے لئے انتظام کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اس لئے ہونا تو یہ چاہئے اور یہی اچھا رہے گا کہ گرام بھون کی عمارت بنوانے سے پہلے ہی گاؤں کے لوگوں کی مرضی اور پسند کا ایک گرام منڈل بن جائے۔ یہ گرام منڈل بہت بڑا نہیں ہونا چاہئے گاؤں کی آبادی کے لحاظ سے ہر دس آدمی پر ایک ممبر چُن لیا جائے اس طرح اگر گاؤں کی آبادی ۱۵۰ آدمیوں کی ہے تو پندرہ ممبر ہوتے ہیں ہاں ایک سو پچاس سے اوپر کی آبادی پر حساب کو بڑھا دینا چاہئے۔ یوں سمجھئے کہ ۵۰۰ کی آبادی میں ۲۰ آدمیوں پر ایک ممبر۔ اس حساب سے ۲۵ ممبر ہوئے۔

ان ممبروں کے چناؤ میں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ گاؤں کے پڑھے لکھے آدمی زیادہ ہوں اور گاؤں کی ہر برادری کے ایک ایک دو دو ممبر آجائیں۔ عورتوں کی نمائندگی کرنے کے لئے دو تین عورتیں بھی ہونی چاہئیں۔ گاؤں کی پنچایت کے پردھان جی یا سکرٹیری صاحب، اور بکاس کھنڈ اسکول اور سہکاری سوسائٹی کے بھی ایک ایک کارکن ضرور ہوں۔

لیکن پندرہ بیس آدمیوں کی جماعت بھی انتظام کا اصل کام نہیں کر سکتی۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ یہ گرام منڈل اپنے میں سے پانچ سات آدمیوں کی ایک انتظامی کمیٹی چن لے۔ اس میں ایک

پردھان، ایک منتری، ایک خزانچی عہدہ دار ہوں اور باقی لوگ انہیں کام میں مدد اور مشورہ دینے کے لئے ہوں۔ یہ انتظامی کمیٹی وہی کام کرے گی جس کا فیصلہ گرام منڈل کی بیٹھک میں ہوچکا ہوگا۔ اگر کوئی کام ایسا آپڑے جس کے بارے میں گرام منڈل کا فیصلہ صاف نہ ہو تو وہ کام انتظامی کمیٹی اپنے اختیار سے کرے لیکن اس کا انتظام رکھے کہ منڈل کی اگلی بیٹھک میں اس کام کی منظوری لے لی جائے۔

گرام بھون کا سارا انتظام اور اُسے آباد رکھنے کے لئے ہر قسم کے پروگرام بنانے اور چلانے کی ذمّے داری اسی انتظامی کمیٹی کے اوپر ہو جس کے فیصلوں کے مطابق منڈل کا منتری کام کرے گا۔ اس طرح گرام بھون آباد رہے گا اور اس سے گاؤں کے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔

(گرام بھون کا پروگرام کیا ہو اس کے بارے میں ہم اگلے پرچے میں لکھیں گے)

(بقیہ خبریں صـ۲۶)

ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور وہ غالباً اب بھی جاری ہے۔
اب اس یونیورسٹی نے اپنے یہاں مراسلاتی کورسوں کا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کورسوں کو شروع کرنے کے لئے
یونیورسٹی چارٹر میں ترمیم کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ ترمیم لوک سبھا نے منظور کر دی ہے اور اب اگلے تعلیمی سال کے آغاز سا سے مراسلاتی
کورسوں کا یہ سلسلہ شروع کر دیا جائے گا۔
سردست بی۔ اے۔ کے سہ سالہ نصاب کے پہلے سال میں ۳۰۰ طالب علم داخل کئے جائیں گے جو آرٹس کے مختلف مضامین کی تعلیم
حاصل کریں گے۔ آگے چل کر حالات نے اجازت دی تو سائنس کے مضامین کی تعلیم بھی شامل کر لی جائے گی۔